خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

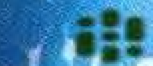
مئی 2016





READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

سائرہ رضا کا مکمل ناول
پھر بھی دل دھڑکتا ہے







خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER	
APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرۂ خصوصی ——— امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے




آپ سے کیا پردہ


خاتون کی ڈائری




مجھ سے ملیے


انٹرویو


ناول


مکمل ناول


ناولٹ


افسانے


نظمیں غزلیں











مئی 2016
جلد 44 شمارہ 1
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کہی ان کہی

خواتین ڈائجسٹ کا مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انسان عدم سے وجود میں آتے ہی خود کو مختلف رشتوں میں منسلک پاتا ہے۔ یہ خونی رشتے ہوتے ہیں اور ان کی محبت ہمیں قدرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔ مگر کچھ رشتے شعوری طور پر وہ خود بھی اپناتا ہے۔ یہ محبت خلوص اور دوستی کے رشتے ہوتے ہیں۔ جو لوگ ہم سے محبت کرتے ہیں' ہمارے دل میں بھی ان کی محبت کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ یہ لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے کہ انشاء جی سے چھوٹے اور محمود ریاض صاحب کے بڑے بھائی اپنے بھائیوں سے جا ملے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ہ

ریاض صاحب کو اپنے بہن بھائیوں سے بہت پیار تھا' خاص طور پر انشاء جی سے لیکن اس پیار میں احترام کا جذبہ غالب تھا جبکہ چودھری سردار محمود صاحب سے محبت کے ساتھ دوستی کا بھی رشتہ تھا۔ چودھری صاحب لاہور کے باسی تھے اور ریاض صاحب شروع سے کراچی میں رہتے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں رابطے کی وہ سہولیات میسر نہ تھیں جو آج زندگی کا حصہ ہیں مگر محبت کرنے والوں کے درمیان مکانی فاصلے کبھی اہمیت کے حامل نہیں رہے۔

"سردار بھائی جان کراچی آ رہے ہیں۔"

یہ اطلاع دیتے ہوئے ریاض صاحب کے چہرے پر جو چمک ہوتی' وہ ان کے دل کی خوشی کا پتا دیتی تھی۔ وہ جب کراچی آتے تو ریاض صاحب کی خوشی دیدنی ہوتی۔ وہ ہمیشہ ریاض صاحب کے پاس ٹھہرتے۔ جتنے دن کراچی میں رہتے' دونوں بھائی ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارتے۔

سردار محمود صاحب کی لاہور واپسی کے بعد چند ماہ گزرتے پھر ریاض صاحب لاہور کے لیے رخت سفر باندھ لیتے۔ ریاض صاحب کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد چودھری صاحب بجھ سے گئے تھے۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ اپنے دوست' بھائی کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد تنہا ہو گئے ہیں۔ وہ اکثر خیریت' حال احوال پوچھنے کے لیے فون کرتے لیکن ان کی آواز میں پہلے جیسی توانائی اور جوش محسوس نہ ہوتا۔

اب یہ آواز کبھی سنائی نہ دے گی۔ اب کبھی ان کا فون نہیں آئے گا۔ ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ایک بار پھر باپ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گیا ہوں۔

جو لوگ دنیا سے رخصت ہو جائیں' ان کے لیے بہترین تحفہ ہماری دعائیں ہوتی ہیں۔ پروردگار سے دعا ہے کہ انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرے۔ آمین قارئین سے درخواست ہے کہ سردار محمود صاحب کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیں۔

محمود ریاض صاحب کی برسی

زندگی ایک مہلت وقت۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ زندگی ختم ہوتی جاتی ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دنیا سے رخصت ہو بھی جائیں تو ان کے کام' ان کا نام زندہ رکھتے ہیں۔

محمود ریاض صاحب کو دنیا سے رخصت ہوئے 15 سال گزر گئے۔ اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ ان کے جلائے چراغ آج بھی روشنی پھیلانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

10 مئی کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعا کی درخواست ہے۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم ،سنن ابوداؤد ،سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

تہمت لگانا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جو شخص اپنے مملوک (غلام' باندی) پر بدکاری کی تہمت لگائے تو قیامت والے دن اس (مالک) پر حد قائم کی جائے گی' مگر یہ کہ وہ (مملوک) ایسا ہی ہو جیسے اس نے کہا (پھر مالک پر حد لاگو نہیں ہوگی۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ مالک پر قیامت والے دن حد قذف (زنا کی تہمت لگانے کی سزا) اس لیے قائم کی جائے گی کہ دنیا میں مالک اپنے مملوکین پر ہر طرح کا ظلم کر لیتے ہیں اور ان کی داد رسی نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت والے دن جب بے لاگ انصاف فرمائے گا تو اس مظلوم طبقے کے ساتھ بھی انصاف کا اہتمام ہوگا اور جو مالک دنیا میں سزا سے بچ رہے ہوں گے' انہیں قیامت والے دن سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

2۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہہ ہے جو اپنے مالکانہ اختیارات کے گھمنڈ میں اپنے غلاموں اور نوکروں چاکروں پر ظلم کرتے ہیں۔

فوت شدہ کو برا کہنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"فوت شدہ لوگوں کو برا بھلا مت کہو' اس لیے کہ انہوں نے (اچھے یا برے) جو عمل آگے بھیجے' وہ اس کو پہنچ گئے۔" (بخاری)

فائدہ : مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انہوں نے اچھے یا برے جو عمل بھی کیے' اس کے مطابق وہ جزا یا سزا کے مستحق ہوں گے۔ ہمیں اب انہیں برا کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے کسی بھی فوت شدہ پر سب و شتم نہ کی جائے۔ بالخصوص کسی کا نام لے کر سوائے اس مصلحت شرعی کے جس کا ذکر عنوان باب اور اس کے فوائد کے تحت میں گزرا۔

تکلیف پہنچانے سے ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"اور وہ لوگ جو بغیر کسی قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، انہوں نے یقیناً" بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب 58)

مسلمان کون ہے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"(کامل) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔"
(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ کہنے کو تو ہر وہ شخص مسلمان ہے جس نے کلمہ پڑھ کر توحید و رسالت محمدیہ کا اقرار کر لیا۔ لیکن کامل مسلمان وہ ہے جس کا کردار اتنا بلند ہو کہ اس کی زبان یا ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔
مہاجر تو اصل میں وہ ہے جو اللہ کے لیے اپنے وطن اور خویش و اقارب کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ آسانی سے اللہ کے دین پر عمل کر سکے۔ لیکن وہ شخص بھی مہاجر ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق نافرمانی والے کاموں کو ترک کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ ہجرت کے معنی ترک کرنے کے ہیں، وطن کو ترک کر دے یا معاصی کو ترک کر دے۔

جنت کے لیے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ جہنم سے دور اور جنت میں داخل کر دیا جائے تو چاہیے کہ اس کو موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" (مسلم)

بغض رکھنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مومن تو بھائی بھائی ہیں۔" (الحجرات۔10)
نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "(مومن) مومنوں پر نرم ہیں اور کافروں پر سخت۔" (المائدہ۔54)
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں، آپس میں مہربان۔" (الفتح۔29)

تین دن سے زیادہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ، نہ آپس میں تعلق منقطع کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (کسی مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال چھوڑے رکھے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، کا مطلب ہے کہ ایسا کام یا بات نہ کرو جس سے دلوں میں کدورت اور بغض پیدا ہو۔ حسد نہ کرو، یعنی کسی مسلمان کو کوئی نعمت اور شرف و فضل حاصل ہو تو اس کے زوال کی آرزو مت کرو۔ ایک دوسرے کو پیٹھ مت دکھاؤ، یعنی ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہو تو سلام کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے احتراز کرتے ہوئے کنی کترا کر مت نکلو۔ یہ تمام چیزیں ممنوع ہیں کیونکہ ان سے افتراق اور انتشار پیدا ہوتا ہے، اسی لیے تین دن سے زیادہ ترک تعلق اور بول چال بند رکھنا جائز نہیں ہے۔

پیر اور جمعرات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"پیر اور جمعرات کے روز جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر اس بندے کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو' سوائے اس آدمی کے کہ اس کے اور اس کے (کسی مسلمان) بھائی کے درمیان دشمنی ہو۔ کہا جاتا ہے ان دونوں کو مہلت دی جائے یہاں تک کہ یہ صلح کرلیں' ان دونوں کو صلح کرنے تک مہلت دی جائے۔" (مسلم)

فائدہ : اس میں بھی باہم دشمنی اور بغض و عناد کو جنت سے محرومی کا سبب بتلایا گیا ہے۔

حسد حرام ہے

اور یہ کسی صاحب نعمت سے زوال نعمت کی آرزو کرنے کا نام ہے' وہ نعمت دینی ہو یا دنیوی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "کیا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس نعمت پر جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دی۔" (النساء 54)

حسد سے بچو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"حسد سے بچو' اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھاجاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھاجاتی ہے۔" یا فرمایا: خشک گھاس کو (کھاجاتی ہے) (ابوداؤد)

ٹوہ لگانا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ٹوہ مت لگاؤ۔" (مسلمانوں کے عیبوں اور کمزوریوں کو تلاش مت کرو۔) (الحجرات 12)۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور وہ لوگ جو بغیر قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں' انھوں نے یقیناً" بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔ 58)

بدگمانی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم بدگمانی سے بچو' کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ اور عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ اور نہ جاسوسی کرو اور نہ دوسرے کے حق غصب کرنے کی حرص اور اس کے لیے کوشش کرو' نہ ایک دوسرے سے حسد کرو' نہ باہم بغض رکھو' نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ۔ اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی ہوجاؤ' جیسے اس نے تمہیں حکم دیا ہے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے'

نہ اس پر ظلم کرے' نہ اسے بے یارومددگار چھوڑے' نہ اس کو حقیر سمجھے۔ تقویٰ یہاں ہے۔ تقویٰ یہاں ہے۔۔۔" اور اپنے سینے کی طرف اشارہ فرماتے "آدمی کے برُے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر خون' عزت اور مال حرام ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے نہ تمہاری صورتوں کو' وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔" (مسلم)

بھائی بھائی

ایک اور روایت میں ہے۔ "ایک دوسرے سے حسد نہ کرو' باہم بغض نہ رکھو' جاسوسی نہ کرو' عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ' محض دھوکا دینے کے لیے بولی بڑھا کر مت لگاؤ' اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔" (مسلم)

اور ایک روایت میں ہے۔

"ایک دوسرے سے قطع تعلقی نہ کرو' نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ' اور باہم بغض نہ رکھو' نہ باہم حسد کرو اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی بن جاؤ۔"

بول چال بند نہ کرو

ایک اور روایت میں ہے "ایک دوسرے سے بول چال بند مت کرو اور تم میں سے کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ بدگمانی سے مراد کسی مسلمان کی بابت ایسا گمان ہے۔ جس کا کوئی ظاہری سبب نہ ہو' اسی طرح وہ خیال ہے۔ جو بغیر کسی دلیل کے دل میں پیدا ہو۔

2۔ نجش کا مطلب ہے کسی سودے کی بولی میں اس لیے اضافہ کرنا تاکہ دوسرے لوگ دھوکا کھا جائیں' اس کا مقصد خریدنا نہ ہو۔

3۔ اس حدیث میں جو ہدایات دی گئی ہیں' ان کا مقصد مسلمان کی عزت کا تحفظ ہے' بلاوجہ بدگمانی' عیبوں اور کمزوریوں کی تلاش' مسلمان کی عزت کے منافی ہے' اس لیے ان سے روک دیا گیا۔ دوسرا مقصد اخوت اسلامیہ کی پاسداری ہے' اسی لیے ظلم کرنے سے' دست گیری کے وقت بے یار و مددگار چھوڑ دینے سے' حقیر سمجھنے سے اور تکبر کرنے سے روک دیا گیا ہے اور مسلمان کی جان' مال اور عزت کو دوسرے مسلمان پر حرام کر دیا گیا ہے۔ بولی میں اضافے اور سودے پر سودا کرنے کی ممانعت بھی اسی لیے ہے کہ ان سے بھی بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے۔

عیب تلاش کرنا

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"اگر تو مسلمانوں کے عیبوں کی تلاش میں رہے گا تو تو ان کے اندر بگاڑ پیدا کرے گا یا قریب ہے کہ تو ان کے اندر فساد پیدا کر دے۔" (یہ حدیث صحیح ہے' اسے امام ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فائدہ : جب ایک شخص دوسروں کے عیوب کی تلاش میں اور ان کی کمزوریوں کے تعاقب میں لگا رہے گا تو پھر دوسرے لوگ بھی اس کی بابت یہی انداز اختیار کریں گے' اس سے معاشرے میں جو فساد پیدا ہو گا وہ ظاہر ہے' اس لیے شریعت نے اس سے منع کر دیا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی لایا گیا اور اس کے بارے میں کہا گیا کہ "یہ فلاں آدمی ہے' اس کی داڑھی سے شراب کے قطرے گر رہے ہیں۔"

انہوں نے فرمایا: "ہمیں ٹوہ لگا کر عیب تلاش کرنے سے منع کیا گیا ہے' البتہ اگر کوئی کمزوری ہمارے سامنے آئے گی تو ہم اس پر اس کی گرفت کریں گے۔" (اسے ابوداؤد نے ایسی سند سے روایت کیا ہے جو بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس عمل کا ایک نمونہ ہے۔ جس کی ہدایت اسلام نے دی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یقیناً" اسلام کے اوامر و نواہی کے پابند تھے۔

2۔ محض شبہ پر حد یا تعزیر عائد نہیں ہو گی' اس کے لیے واقعی ثبوت ضروری ہے۔

بدگمانی کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے ایمان والو! زیادہ بدگمانی کرنے سے بچو' اس لیے کہ بعض بدگمانی گناہ ہے۔" (الحجرات۔12)

سب سے بڑا جھوٹ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم بدگمانی سے بچو' اس لیے کہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ یہ روایت اس سے قبل کے باب میں گزر چکی ہے۔ اس میں بھی بدگمانی سے' خاص طور پر اہل خیر و

صلاح کے بارے میں بدگمانی سے بچنے کی تاکید ہے' اس لیے کہ یہ جھوٹ کی بدترین قسم ہے۔ علاوہ ازیں شرعی احکام اور سزائیں یقین پر نافذ ہوتی ہیں' محض ظن و تخمین پر نہیں۔

2۔ عام حالات میں ہر مسلمان کی بابت اچھا خیال رکھنا ضروری ہے' الا یہ کہ کوئی واضح ثبوت اس کے برعکس موجود ہو۔

مسلمان کو حقیر جاننا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم سے استہزا نہ کرے' ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے استہزا کریں' ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور اپنے (مومن بھائیوں) کو عیب مت لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام (رکھنا) اللہ کی حکم عدولی ہے۔ اور جو توبہ نہ کریں' پس وہی لوگ ظالم ہیں۔" (الحجرات۔11)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ہر اس شخص کے لیے خرابی ہے جو طعنہ زنی کرنے والا' عیب جو اور چغل خور ہے۔" (الھمزہ۔1)

کافی ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔" (مسلم)

غرور

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ایک رائی کے برابر بھی کبر ہوگا۔"

ایک آدمی نے عرض کیا "ایک آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو' اس کی جوتی اچھی ہو (کیا یہ بھی کبر ہے؟) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بے شک اللہ تعالیٰ خوب صورت ہے' خوب صورتی کو پسند فرماتا ہے۔ کبر' حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔" (مسلم)

عمل برباد

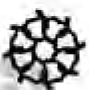
حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک آدمی نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔

تو اللہ عزوجل نے فرمایا۔ "کون ہے جو مجھ پر اس بات کی قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا۔ بے شک میں نے اس کو بخش دیا اور تیرے عمل میں نے برباد کر دیے۔" (مسلم)

فائدہ :

1۔ بعض لوگوں کو اپنی عبادت اور زہد و تقویٰ پر گھمنڈ ہو جاتا ہے' جو انہیں دوسروں کی بابت بدگمانی میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ بڑے یقین سے اس بات کا اظہار کر دیتے ہیں کہ فلاں شخص کو تو اللہ نے کبھی معاف نہیں کرنا' حالانکہ یہ اللہ کی شان میں بے ادبی کا مظاہرہ اور اپنی بابت حد سے زیادہ خوش گمانی کا نتیجہ ہے۔ یہ رویہ اللہ کو پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اس عابد و زاہد و متقی کے سارے عمل برباد کر کے اسے جہنم میں پھینک دے اور اس گناہ گار کو معاف کر کے جنت میں بھیج دے جس کی بابت یہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ اسے اللہ معاف نہیں کرے گا۔ اس لیے انسان کو اپنی عبادت پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے اور دوسروں کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔



خلاصے بڑے کام کی چیز ہیں'

انشاءجی

جوں جوں یونیورسٹی میں امتحانات قریب آرہے ہیں۔ہماری ڈاک میں طالب علموں کے خطوط کی بھرمار ہو رہی ہے۔کوئی کچھ پوچھتا ہے' کوئی کچھ' بہتر ہوتا کہ اس سلسلے میں طالب علم حضرات پہلے اپنے اساتذہ سے رجوع کرتے۔ہمارا حال یہ ہے کہ یونی ورسٹی سے نکلے(ہم اپنی مرضی سے نکلے تھے۔) ہمیں اتنی مدت ہوئی ہے کہ بہت سارا پڑھا لکھا ذہن سے اتر گیا ہے۔کیا عجب کسی سوال کے جواب میں ہم سے لغزش ہوجائے۔ آج کی ڈاک میں جو سوالات موصول ہوئے ہیں' ان سے ان کی متنوع نوعیت کا اندازہ ہوجائے گا۔

(1) اسمٰعیل میرٹھی کہاں کے رہنے والے تھے (جالندھر کے' کلکتے کے' میرٹھ کے)۔

(2) یہ مصرع کس کا ہے۔ع۔غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔(غالب کا ہے یا خستہ ہاپوڑی کا)۔

(3) اہرام مصر کس ملک میں واقع ہیں۔(جاپان میں' فرانس میں' مصر میں)۔

(4) مقبرہ جہانگیر میں کون سا مغل بادشاہ دفن ہے۔(سکندر اعظم۔ہنری ہشتم' جہانگیر)۔

(5) ایک درجن میں کتنے عدد ہوتے ہیں۔ (5-12-6-78)۔

(6) زلیخا آدمی تھا یا عورت۔

(7) سورج دن کو نکلتا ہے یا رات کو۔اگر رات کو تو کیوں؟

(8) افغانستان کی سب سے مشہور بندرگاہ کون سی ہے؟

معلوم ہوتا ہے ہمارے متعلق طالب علموں کو یہ حسن ظن پیدا ہوگیا ہے کہ ہم عقل کل ہیں اور جملہ علوم پر حاوی ہیں۔اس مختصر زیست میں کسی فانی انسان سے ایسی توقع وابستہ کرنا زیادتی ہوگی۔سوال نمبر3 معلومات عامہ پر عبور کا متقاضی ہے۔سوال نمبر4 کا تعلق آثار قدیمہ سے ہے۔جب تک کھدائی نہ کی جائے کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟پانچویں کے لیے ریاضی کی ڈگری چاہیے۔اور ریاضی ہمیشہ ہمارا سب سے کمزور مضمون رہا ہے۔ چھٹے سوال کا قطعی جواب ممکن نہیں۔یہ امر ہمیشہ سے متنازعہ فیہ چلا آرہا ہے۔نمبر7 کے لیے علم ہیئت کا مطالعہ چاہیے اور علم ہیئت کبھی بھی ہمارا مضمون نہ تھا' نہ اسکول میں نہ کالج میں۔ آٹھویں کا تعلق جغرافیہ سے ہے۔ہمیں اپنے ملک کی بہت سی باتیں نہیں معلوم' افغانستان تو پھر غیر ملک ہے۔



درسی کتابیں پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے جوشاندہ پینا۔ آج کل جوشاندہ کوئی نہیں پیتا۔لوگوں نے ساری ادویات کے عرق یا ست نکال رکھے ہیں۔یورپ میں تو ایسی گولیاں بن گئی ہیں کہ دو گولیاں کھاؤ ساری تاریخ یورپ یاد۔ایک انجکشن لو اور جیومیٹری کی تمام اشکال پر حاوی ہوجاؤ۔ہمارے ہاں تو ان ایجادوں کے آنے میں ابھی شاید وقت لگے۔ ہاں کسی نے پچھلے دنوں کراچی میں اعلان تو کیا تھا کہ اب امتحان پاس کرنے کے لیے پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ہم پہلے سمجھے کہ مشتہر صاحب نقل کرانے کے ماہر ہیں یا یونی ورسٹی کے قریبی حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔پرچہ آؤٹ کرادیں گے لیکن پتا چلا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔وہ تو ہپناٹزم یعنی نظر بندی کا علم سکھاتے ہیں۔ ممتحن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں(دھول جھونکنے کی بجائے) اور اس نے چپکے سے 100 ر 100 نمبر دے دیے۔سنا ہے۔مشتہر کا یہ دعوا ہے کہ میں نے خود ایک لفظ نہیں پڑھا۔ لیکن ڈگریاں رکھتا ہوں۔سارے



امتحان یوں ہی پاس کیے۔ ہمارے ایک دوست ان سے ملے تھے۔ تصدیق کرتے ہیں کہ دعوا ان کا سچا معلوم ہوتا ہے۔ یہ صاحب کسی طرف سے پڑھے لکھے نہیں لگتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔



علمی دنیا میں جو ہر ریاست کا استعمال کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارے پاس ریویو کے لیے اتنی کتابیں آتی ہیں کہ سب پڑھنی پڑیں تو مصیبت ہو جائے۔ اس کا ست نکال کر پہلے سے گرد پوش کے اندرونی صفحے پر لکھا ہوتا ہے۔ اطمینان سے نقل کر لیجئے۔ لوگ بھی خوش' ریویو کرانے والا بھی خوش۔ یہ عبارت عموماً" مصنف کی اپنی لکھی ہوتی ہے اور ظاہر ہے۔ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ تعلیمی میدان میں یہ کام خلاصے دیتے ہیں۔

خلاصہ کیا چیز ہوتی ہے۔ ایک مثال سے واضح ہو جائے گا۔ کوئی شخص حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان بیان کر رہا تھا کہ یوں ہوا پھر یوں ہوا۔ ایک سننے والے نے کہا کہ حضرت آپ نے اس قصے میں ایک گھنٹہ لے لیا۔ یوں کیوں نہ کہہ دیا کہ "پدرے بود پسرے داشت گم کرد' باز یافت" یعنی ایک بڑے میاں کا ایک بیٹا تھا' کھو گیا اور پھر مل گیا۔ ایسا ہی واقعہ ان دو محبان صادق کا ہے کہ کھانے پر بیٹھے تھے' ایک ان میں خان صاحب تھے' دوسرے لکھنوی میر صاحب۔ خان صاحب نے لکھنوی دوست سے پوچھا کہ "آپ کے والد صاحب کا انتقال کیسے ہوا۔" وہ کھانا چھوڑ کر بیٹھ گئے اور قبلہ گاہ کی علالت' تشخیص' اسپتال' نسخوں' تیمار داری' بچوں کی فکر مندی' وصیت' جنازے میں ہزاروں آدمی شریک ہونے' قطعات' تاریخ اور لوح مزار وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ اس کے بعد یکایک نظر دسترخوان پر گئی تو بس آدھا نان باقی تھی۔ انہوں نے سٹپٹا کر کہا۔ خان صاحب اب کچھ اپنے بزرگوار کی وفات حسرت آیات کا حال بھی سنائیے۔ فرمایا!۔

"خو بڈھا بیمار ہوا' مر گیا۔" یہ کہہ کر اس آدھی روٹی کو بھی لقمہ کیا۔ دیکھا جائے تو خلاصہ لکھنوی بزرگ کی داستان کا بھی یہی تھا کہ بڈھا بیمار ہوا مر گیا۔ باقی تو لفظوں کے طوطا مینا ہیں۔ جب سے کتابوں کی فلمیں بننے لگی ہیں' خلاصوں کی ضرورت بھی کم ہو گئی ہے۔ اب کون اکبر کے عہد کے واقعات اور فتوحات پڑھتا پھرے۔ "مغل اعظم" دیکھ لیجئے' ساری تاریخ ذہن پر نقش ہو جائے گی۔ ہم ایک بار نور جہاں کے علم و فضل کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک صاحبزادے بول اٹھے' یہ آپ ملکہ نور جہاں کا ذکر کر رہے یا ملکہ ترنم نور جہاں کا۔ ہم نے وضاحت کی تو بولے' اچھا وہ خاتون جو فلم عدل جہانگیر میں کبوتر اڑاتی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بعض اوقات فلمی ضروریات کے تحت فلم بنانے والے اصلی کہانی میں تھوڑی سی ترمیم بھی کر لیتے ہیں لیکن اکثر اس سے حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریزی کی ایک فلم' علی بابا چالیس چور' میں ہم نے دیکھا کہ علی بابا چوروں کا سردار ہے۔ غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ صحیح یہی ہے۔ علی بابا کو یہی رول بجتا ہے۔ ترمیم اگر ہونی چاہیے تو الف لیلہ میں۔

روشنی باقی ہے

بنت سحر

دنیا کسی پلیٹ فارم کی طرح ہے، جہاں لوگ آتے ہیں... چلے جاتے ہیں... اور ہمارے حصے میں صرف اور صرف "یادیں" ہی آتی ہیں۔

محمود ریاض صاحب کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے تو بس ان کے کام کو دیکھا ہے۔ وہ تو پودے لگا کر چل دیے... موسم بدلے... بیج پھوٹے اور پودے سر اٹھانے لگے اور آج وہ پودے تناور درخت بن چکے ہیں۔

آسان تو نہیں، ہوناسوچوں کو بدلنے کے لیے، اچھی تفریح کے لیے نئی ادبی کی بنیاد رکھنا اور پھر اول روز کی طرح دل جمعی اور محنت سے کام کرنا... مگر کچھ خاص اشخاص ایسا کر جاتے ہیں۔

محمود ریاض صاحب نے خواتین، شعاع، کرن کا اجرا کیا... جس سے ہر صاحب ذوق نے حظ اٹھایا، استفادہ کیا۔ صاف ستھرے جریدے، ناپختہ اذہان کو شعور کی دہلیز پر لے آئے۔

محمود ریاض صاحب کو ہم سے بچھڑے پندرہ سال ہو گئے۔ کتنا لمبا وقت ہوتا ہے نا...

آپ نے جانے کتنی **مصنفات** کو دریافت کیا۔ ان کی صلاحیتوں کو سامنے لائے۔

افسوس... بے چاری بنت سحر آپ کی شفقت سے محروم رہ گئی... اتنی جلدی چلے گئے۔

باقی سب کو اپنے مشوروں اور رہنمائی سے نوازا اور جب میری باری آئی تو ایسے دیس گئے جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں۔

کاش... آپ حیات ہوتے تو میں آپ کے آفس ضرور آتی... جانے کتنی باتیں کرتی...

گاؤں میں صبح اترنے کے قصے، شام ڈھلنے کے قصے، گندم پر چڑھتے شباب کے قصے اور چاندنی کے — فسوں کے قصے... مجھے باتیں کرنے کا بڑا شوق ہے۔

کبھی کبھی تخیل کے رتھ پر سفر کا ارادہ کر کے پندرہ سال پہلے ماضی کے منظر میں قدم رکھتی ہوں۔

میں محمود ریاض کے آفس کے باہر کھڑی ماتھے پر آیا پسینہ، دوپٹے سے پونچھ کر اندر داخل ہوئی ہوں۔

نفاست سے جمے بال، نفیس سی عینک، ذہین آنکھیں میری طرف اٹھتی ہیں۔

ٹیبل پر فائلز کا انبار، کمرے کی واحد کھڑکی سے دھوپ پگھل پگھل کر گرتی ہے۔

وہ میرا خیر مقدم کرنے کو اٹھے۔ مسکرائے اور سامنے رکھے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ میں وہیں بیٹھ گئی تھی۔ میں ایک نظر میں سارے کمرے کا جائزہ لے چکی تھی۔

اور اب — میں ان سے بلا جھجک باتیں کر رہی تھی۔

"ایک بات بتایئے سحر..."

"جی پوچھیں سر..."

"یہ کہانیاں تم ہی لکھتی ہو نا... سیکنڈ ایئر کی طالبہ اور ایسی منظر نگاری...؟"

"جی... بس اللہ کا کرم ہے..." میں نے عاجزی سے کہا۔

"تمہارے گاؤں میں ہر رات پورے چاند کی رات ہوتی ہے کیا؟"

"نہیں تو..."

"تمہاری ہر تحریر میں چاندنی کی سی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے اور تمہارا فلسفہ سحر طاری کرتا ہے، تم سحر ہو نا!" مگر یہ تعریف تھی تو لاجواب تھی۔

"اگر میں کہوں کہ مجھے اپنے گاؤں کی کوئی سوغات



دِلوں میں چھوڑ گیا اپنی داستاں وہ شخص

بھیجو تو کیا بھیجو گی؟" ذہین آنکھوں میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

میں سوچ میں پڑ گئی ہوں۔

"ہمارے گاؤں میں جگنوؤں کی بہتات ہے۔۔۔ کہیں تو وہ بھیج دوں۔"

"کیسے بھیجو گی۔۔۔؟" انہوں نے مجھے امتحان میں ڈالا۔

"پارسل کر کے بھیج دوں گی۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"سحر۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ اگر جگنو پارسل ہو سکتے تو تم ضرور بھیجتیں، بلکہ ساتھ لے کر آتیں اپنے گاؤں کی سوغات اور میرے کمرے میں ہر طرف جگنو ہی جگنو اڑ رہے ہوتے۔۔۔"

باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ چونکے۔

"اچھا یہ بتاؤ کیا لو گی؟ چائے یا ٹھنڈا۔۔۔"

"نہیں آئس کریم سوڈا پلاتے ہیں۔ یہ صرف کراچی میں ہی ملتا ہے۔" امتل نے مداخلت کی۔

"مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ یہ تکلفات رہنے دیں؟" میں نے کہا تو وہ ہنس دیے۔

"کھانا کھلائے بغیر تو نہیں جانے دیں گے تمہیں۔۔۔ اتنی دور سے آئی ہے ہماری چھوٹی سی رائٹر۔۔۔" انہوں نے شفقت سے کہا۔ ہم ڈھیروں باتیں کرتے رہے۔۔۔ کتابوں کی، موسموں کی، تتلیوں کی۔۔۔ دھوپ اب بھی کمرے کی واحد کھڑکی سے گر رہی تھی۔



یہ ملاقات تخیّل کی دین تھی۔ لیکن میں جانتی ہوں۔ آج میں جب آفس میں کھڑی کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی ہوں گی۔۔۔ تو اندر سے۔۔۔
"یس کم ان" کی آواز نہیں آئے گی۔
وہ ذہین آنکھوں والا شخص اب وہاں نہیں ہے۔
جو چاند نگر کا باسی تھا۔ چاند کے پار چلا گیا ہے۔
میں کمرے میں اکیلی 'ایک بازگشت کے حصار میں کھڑی رہوں گی۔
کمرے کی واحد کھڑکی پندرہ سال سے بند ہے۔۔۔
کورے کاغذوں پر پین کی نب سے گری سیاہی سوکھ چکی ہے۔
بند کھڑکی پر دھوپ گر رہی ہے۔ فائلز کا ڈھیر ویسے ہی ٹیبل پر دھرا ہے۔
"میں جگنوؤں جیسے شخص کے لیے جگنو لائی ہوں۔۔۔ تحریروں کی شکل میں۔۔۔"
میں جو بنت سحر ہوں' طفل مکتب ہوں۔۔۔
میں جو آج اس ادارے کا حصہ ہوں جس نے مجھے عزّت بخشی ہے۔۔۔ شناخت دی ہے۔
محمود ریاض صاحب نے اپنے پرچوں سے روایات' ثقافت' اقدار جیسی چیزوں کو زندہ رکھا ہے۔
آج جانے کتنی ہی مصنفات ان پرچوں کی بدولت معاشرے میں قابل قدر جانی جاتی ہیں۔
وقت بدلا ہے۔۔۔ سوچ بدلی ہے۔۔۔ روایات بدلی ہیں۔
معیار کا سانچہ مکمّل ہے' بڑھ رہا ہے۔
بہت عظیم ہوتے ہیں وہ انسان جو دوسروں کے لیے کچھ "خاص" کرتے ہیں۔
اور محمود ریاض صاحب وہ خاص ہستی تھے۔
ہم نے آپ کو نہیں دیکھا۔۔۔ مگر اپنی دعاؤں کا ایک حصہ آپ کے نام کرتے ہیں۔
مجھے' میرے قلم کو' اس شفیق انسان کے ادارے میں کام کرنے پر فخر ہے۔
شاید زندگی ایک چھوٹا سا رانا سا قصّہ ہے' جو کبھی بھی' کہیں بھی' کسی بھی وقت' ختم ہو سکتا ہے۔
مگر دوسروں کے دلوں میں جگہ بنانے کا فن ضرور آنا چاہیے' جیسا کہ محمود ریاض صاحب آج ہر دل میں زندہ ہیں۔ یاد کے دیوں میں روشنی باقی ہے اور رہے گی۔

☼



1 "پورا نام؟"
"ازیکا ڈینیل۔"

2 "مذہب؟"
"عیسائی۔"

3 "پیار کا نام؟"
"ازیکا ہی کہتے ہیں۔ نام بگڑا نہیں۔"

4 "نام کا مطلب؟"
"دیواروں کی طاقت .... یہ نام میرے دادا نے رکھا اور مجھے اپنے نام سے بہت پیار ہے۔ یونیک ہے میرا نام کہیں اور سنا بھی نہیں۔"

5 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"یکم جولائی 1992ء / کراچی۔"

6 "بہن بھائی اور آپ کا نمبر؟"
"ہم دو بہن بھائی تھے۔ میرے بھائی کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہوا ہے۔ تو بس میں ہی ہوں اکلوتی۔"

ڈرامہ سیریل نور جہاں کی نور جہاں

ازیکا ڈینیل سے باتیں

شاہین رشید

7 "قد / ستارہ؟"
"5 فٹ ساڑھے 5 انچ / کینسر۔"

8 "تعلیم؟"
"گریجویٹ ہوں اور ماسٹرز کرنے کا ارادہ ہے۔"

9 "کیا بننے کا ارادہ تھا؟"
"ڈاکٹر بننے کا ارادہ تھا مگر فیلڈ میں آکر اتنی مصروف ہو گئی کہ بس...."

10 "شادی؟"
"اس بارے میں ہم پھر کبھی بات کر لیں گے۔"

11 "پہلا کمرشل / پہلا ڈرامہ؟"
"اولیور زکا / چھوٹی۔"

12 "وجہ شہرت؟"
"کمرشلز اور سدا سکھی رہو۔"

15 "صبح کا آغاز؟"
"سات یا ساڑھے سات بجے اٹھ جاتی ہوں۔"

16 "رات کا اختتام؟"
"بارہ یا بہت ہوا تو ساڑھے بارہ بجے .... دیر تک نہیں جاگ سکتی۔"

17 "صبح کی روٹین؟"
"ورزش جو کہ بہت ضروری ہوتی ہے .... پھر ناشتہ کرتی ہوں۔ اپنی تین عدد بیٹیوں کو دیکھتی ہوں۔ ان کے ناز نخرے اٹھاتی ہوں.... گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتی ہوں، ان سب کاموں میں ساڑھے نو بج جاتے ہیں پھر گاڑی آجاتی ہے اور میں شوٹ پہ چلی جاتی ہوں۔"

18 "گھر کے کاموں سے دلچسپی؟"
"بالکل ہے اور کھانے بہت اچھے پکاتی ہوں۔"

19 "شکر گزار ہوتی ہیں؟"

"اپنے رب کی کہ جس نے ایک مکمل انسان بنایا ہے۔"

20 "جب بھوک لگتی ہے تو؟"

"بہت چڑچڑی ہو جاتی ہوں۔"

21 "کس دن کا انتظار کرتی ہیں؟"

"نہیں کسی دن کا نہیں میں تو اپنی برتھ ڈے بھی اہتمام سے نہیں مناتی۔"

22 "فخر کا کوئی لمحہ؟"

"جب عام لوگوں میں ہوتی ہوں اور وہ میری تعریفیں کر رہے ہوتے ہیں.... تو بیان نہیں کر سکتی کہ کیا فیلنگز ہوتی ہیں۔"

23 "کس جگہ جانے سے انکار نہیں کرتیں۔"

"سمندر پر... مجھے سمندر بہت پسند ہے۔"

24 "خوشی کے اظہار کا بہترین طریقہ؟"

"ایک اچھی اور خوب صورت مسکان۔"

25 "بچپن کی ایک بری عادت جو ابھی بھی موجود ہے؟"

"بچپن میں غصے کی بہت تیز تھی۔ مگر اب ایسی نہیں ہوں۔"

26 "ضدی ہیں؟"

"جی میں ضدی ہوں.... دوسروں کے معاملے میں نہیں اپنے معاملے میں کہ یہ کام کرنا ہے تو کرنا ہے۔"

27 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"انٹرنیٹ...."

28 "پسندیدہ دن سات دنوں میں؟"

"ہفتہ۔"

29 "بارہ مہینوں میں پسندیدہ مہینہ؟"

"دسمبر۔"

30 "مردوں کی بری بات، عادت؟"

"کہ وہ عورت کو بدلنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔"

31 "اور اچھی بات؟"

"کہ خیال رکھتے ہیں عزت کرتے ہیں۔"

32 "کوئی مسلسل گھورے تو؟"

"اب اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیوں گھور رہے ہیں۔ اب برا نہیں لگتا۔"

33 "غصے میں رد عمل؟"

"چپ ہو جاتی ہوں.... کیونکہ منہ سے نکلے الفاظ واپس نہیں لیے جا سکتے۔ اس لیے چپ رہنا بہتر ہے۔"

34 "کبھی پرائز بانڈ نکلا؟"

"کبھی نہیں.... بچپن میں بہت لیتی تھی، جب نہیں نکلے تو لینا چھوڑ دیا۔"

35 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"اپنے ہی غصے سے.... کہ کبھی کبھی آتا ہے مگر شدید آتا ہے۔"

36 "بچت کس انداز میں کرتی ہیں؟"

"بچت کرنا بہت مشکل کام ہے.... مگر جب کرتی ہوں تو گولڈ کی صورت میں کرتی ہوں۔"

37 "کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟"

"کہیں کی نہیں.... میں پاکستانی ہوں اور پاکستان میں ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

38 "ملک سے باہر جانے کا اتفاق ہوا؟"

"بالکل ہوا.... کافی ممالک گھوم چکی ہوں مگر سکون پاکستان میں ہی ملتا ہے۔"

39 "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"

"اپنے کراچی کا برنس روڈ۔"

40 "کس ایئر لائن میں سفر کرنا پسند ہے؟"

"قطر ایئر ویز۔"

41 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟"

"بالکل.... ایسے ہی بستر پر پڑے رہنا مجھے پسند نہیں، صبح کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔"

42 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"

"گھر میں.... بہت سکون اور آرام کے ساتھ۔"

43 "لباس میں کیا پسند ہے؟"

"شلوار قمیص بھی پسند ہے۔ ویسٹرن بھی پہنتی ہوں اور ساڑھیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ مگر ابھی تک ڈراموں میں ہی پہنی ہیں۔"

44 "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"

"اس کے ساتھ سفر پہ جانا چاہیے۔"

45 "ذہین اور حسین کس کو ہونا چاہیے مرد کو یا عورت کو؟"
"عورت حسین ہونی چاہیے اور مرد ذہین ہونا چاہیے۔"

46 "ڈھیر سارا فارغ وقت مل جائے تو؟"
"تو کتابیں پڑھوں گی' کھانے پکاؤں گی۔ اپنے آپ پر دھیان دوں گی۔ ورزش کروں گی۔ موویز کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ مگر دیکھتی ضرور ہوں۔"

47 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"چھت پر۔"

48 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتی ہیں؟"
"SMS کے جواب نہیں دوں گی.... اگر بہت ضروری نہ ہو تو۔"

49 "کس کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"ہم نہیں دیں گے تو کہیں اور سے مل جائے گا۔ ویسے پچھتائی کبھی نہیں۔"

50 "آپ کے بیگ کی تلاشی لی جائے تو کیا کیا نکلے گا؟"
"سن گلاسز.... ٹریولنگ کٹ جس میں میری تمام ضروری چیزیں ہوں گی.... دو مذہبی کتابیں...."

51 "اگر پاور میں آجائیں تو کیا کریں گی؟"
"مشکل ہے کچھ کرنا کیونکہ میں سیاسی ہوں نہیں۔"

52 "کیسی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"چھوٹی چھوٹی چیزیں جو خوب صورت ہوں.... چھوٹی چھوٹی خوشیاں بس.... یہی کچھ۔"

53 "نصیحت بری لگتی ہے؟"
"بری لگتی ہے تو خاموش ہو جاتی ہوں.... اور اچھی ہو تو عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

54 "کن لوگوں پر خرچ کرنا اچھا لگتا ہے؟"
"اپنے ابو کے لیے خرچ کرنا اچھا لگتا ہے۔"

55 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟ اپنی کمائی سے؟"
"گولڈ...."

56 "کھانے کا مزہ کہاں آتا ہے۔ اپنے بیڈ پہ' چٹائی پہ یا ڈائننگ ٹیبل پہ؟"
"بہترین جگہ بیڈ ہے۔ مگر بیڈ پہ کھانا ہے بھی تو بری بات۔"

58 "دنیا سے کیا لینا چاہتی ہیں؟"
"محبتیں۔"

59 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے لگاؤ؟"
"کوئی خاص نہیں .... مگر رابطے میں رہنے کے لیے (سوشل میڈیا سے) تھوڑی دلچسپی لے لیتی ہوں۔"

60 "اپنے آپ کو کب ساتویں آسمان پہ محسوس کرتی ہیں؟"
"مجھے کھانے پکانے کا بہت شوق ہے تو جب کوئی میرے کھانے کی تعریف کرتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تو تب اپنے آپ کو ساتویں آسمان پر دیکھتی ہوں۔"

61 "اداکاری کے علاوہ کس فیلڈ میں جانا چاہتی ہیں؟"
"بزنس کا شوق ہے تو شاید چلی جاؤں۔"

62 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"نہیں نہیں بالکل بھی ڈر نہیں لگتا۔"

63 "کیا محبت اندھی اور گونگی بہری ہوتی ہے؟"
"اگر محبت آپ کے حواسوں پہ سوار ہو جائے تو پھر سب کچھ ہوتی ہے۔"

64 "رویے کب دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"
"جب آپ کے اپنے بدل رہے ہوں۔"

65 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"مہندی۔"

66 "تحفہ یا کیش؟"
"تحفہ دینا چاہیے' تاکہ آپ کی کوئی نشانی تو ہو ان کے پاس۔"

67 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"
"ناشتہ اپنے ہاتھ کا اور کھانا پھوپھو کے ہاتھ کا۔"

68 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"شام کے صدر سے اور ہیلری کلنٹن سے۔"

69 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"
"بے شمار مرتبہ... مگر اب چار سال سے ایک ہی نمبر ہے۔"

70 "فوبیا ہے؟"
"کھلے دروازوں اور کھلی کھڑکیوں سے ڈر لگتا ہے۔"

71 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"اپنا سیل فون، سن گلاسز اور اپنا بیگ۔"

72 "لوگ ملتے ہیں تو بے ساختہ کیا کہتے ہیں؟"
"ارے آپ تو اتنی کمزور اور دبلی ہیں۔ اسکرین پہ تو اچھی خاصی صحت مند نظر آتی ہیں۔"

73 "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"
"اللہ ہی رحم کرے اور ملک سلامت رہے اور ہمارے حق میں سب بہتر ہو۔"

74 "اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتی ہیں؟"
"غلطی کا احساس فورا" ہو جاتا ہے۔ ہاں اعتراف کرنا تھوڑا مشکل لگتا ہے۔"

75 "اپنی کوئی اچھی عادت؟"
"خوش اخلاق ہوں، سب سے اچھی طرح ملتی ہوں۔"

76 "اور بری عادت؟"
"غصے میں خاموش ہو جاتی ہوں اور اس کی وجہ سے دوسرے لوگ بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔ دل میں رکھتی ہوں سب کچھ۔"

77 "دل کی سنتی ہوں یا دماغ کی؟"
"سنتی تو دل کی ہوں اور دماغ سے کہتی ہوں آپ بھی کچھ کہیں۔"

78 "بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی آپ کے پاس محفوظ ہو؟"
"ایک گڑیا ہے، جو آج تک میرے پاس ہے۔"

79 غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"ہاں کئی بار... مگر پھر بھوک لگی تو کھا لیتی ہوں۔"

81 "شہرت مسئلہ بنتی ہے؟"
"جب آپ دکاندار سے ڈسکاؤنٹ کی بات کریں۔"

82 "بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے؟"
"نہیں جی کروٹیں بدلتی رہتی ہوں۔"

83 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟"
"لیمپ، پانی... اسکرپٹ وغیرہ... سیل فون بھی۔"

84 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"جب خود کو تنہا محسوس کرتی ہوں۔"

85 "کس چیز کے بغیر کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"
"چاول ہونا بہت ضروری ہیں۔"

86 "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت؟"
"دونوں سے۔"

87 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"تو ہڑبڑا کے اٹھ جاتی ہوں۔ مگر کہتی کچھ نہیں ہوں۔"

88 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"جب دوسروں کو دکھ نہیں دینا چاہتی۔"

89 "بدلہ لیتی ہیں؟"
"نہیں اللہ پہ چھوڑ دیتی ہوں۔"

90 "اگر ڈھیر سارا پیسہ ہاتھ آجائے تو؟"
"دنیا گھوموں گی۔"

91 "کب فریش محسوس کرتی ہیں؟"
"صبح کے وقت۔"

92 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"میک اپ اتاروں۔"

93 "ایک مسئلہ جو اب حل ہو جانا چاہیے؟"
"دہشت گردی۔"

94 "آئینہ دیکھ کر خیال آتا ہے کہ...؟"
"مجھے آئینہ دیکھنا پسند نہیں۔"

95 "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"
"بلیک کافی۔"

96 "کوئی خواب بار بار دیکھتی ہیں؟"
"نہیں ایسا کوئی خواب نہیں ہے۔"

97 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"
"بیس روپے۔"

99 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"یہ تو ہونا ہے... اس سے کیا ڈرنا... مگر زوال نہ آئے تو اچھا ہے۔"



خبرناک کی پہچان

میر محمد علی سے ملاقات

شاہین رشید

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پروگرام کی وجہ سے چلتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے پروگرام چلتے ہیں۔ "میر محمد علی" کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جن کی وجہ سے پروگرام چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے "میر محمد علی کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔۔۔ پرفیکٹ پیروڈی کرنا آسان نہیں ہوتا مگر میر محمد علی بڑی آسانی سے یہ کام کرلیتے ہیں۔ عجز و انکساری کے ساتھ بات کرنے والے "میر محمد علی" کی کامیابی کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان میں غرور و تکبر نہیں ہے

"میر محمد" سے انٹرویو کرنا ہماری دیرینہ خواہش تھی۔ جو کہ پوری ہوئی۔ اور اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

"کیا حال ہیں جی۔۔۔؟"

"الحمد للہ۔۔۔!"

"کچھ اپنے بارے میں بتایئے۔ پھر انٹرویو کا آغاز کرتے ہیں؟"

"بنیادی طور پر میرے خاندان کا تعلق مظفر آباد اور آزاد کشمیر کے نواحی گاؤں "سید پور" سے ہے اور ہمارے خاندان کے بیشتر افراد حصول علم کے لیے بہت پہلے مظفر آباد آگئے تھے۔ اور پڑھ لکھ کر بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔۔۔ میں 14 جولائی 1982ء میں مظفر آباد میں پیدا ہوا۔ میرے والد "میر علی اکبر" آزاد کشمیر کے وزیر جنگلات بھی رہے اور انہوں نے قانون ساز اسمبلی کے رکن اور پارلیمانی سیکریٹری کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔۔۔ اور جلدی ہی ریٹائرمنٹ لے کر وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔۔۔ چند ماہ قبل ان کا انتقال ہوا ہے۔۔۔ والدہ میری ماشاء اللہ سے حیات ہیں۔۔۔ وہ ڈائریکٹر ایجوکیشن کے عہدے سے ریٹائر ہوئی ہیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ میری تین

بہنیں ہیں اور تینوں مجھ سے بڑی ہیں۔ میری بڑی بہن گرلز ہائی اسکول مظفر آباد میں پرنسپل ہیں اور ان کے شوہر چیف انجینئر ہیں۔ دوسری بہن پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ میں ہوتی ہیں۔ ان کے شوہر ایک آئی ٹی کمپنی کے منیجر ہیں۔ تیسری بہن ڈاکٹر ہیں ان کے میاں بھی ڈاکٹر ہیں اور وہ امریکا میں رہتی ہیں.... مجھ سے چھوٹا ایک بھائی ہے جو ایل ایل بی سے فارغ ہو کر اب کچھ عرصے سے پریکٹس کر رہا ہے۔ اور میرے خیال سے مجھے اپنا تعارف کرانے کی تو ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ بتادوں کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی میں بیچلرز کیا ہے میں نے۔"

"سب بہن بھائی کی الگ الگ فیلڈ ہے۔ مگر آپ کی بہت الگ ہے۔ تو کیا اس فیلڈ میں آنے کا سوچا تھا؟"

"بس جی.... مجھے شوق تھا اس فیلڈ میں آنے کا.... اور میں سمجھتا ہوں کہ ٹیلنٹ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا کرم بھی ہونا چاہیے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ صرف اللہ کا کرم ہوتا ہے جو انسان کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے.... میرا زندگی میں جن لوگوں سے بھی واسطہ رہا ہے۔ وزیر اعظم سے لے کر کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں تک .... میں نے دیکھا ہے کہ ٹیلنٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی صرف اللہ تعالیٰ کا کرم ہوتا ہے.... دیکھیں نا اچھا خاصا آپ کا کام چل رہا ہوتا ہے اور پھر ایک دم سے زوال آجاتا ہے تو آپ تو وہی ہوتے ہیں نا.... مگر پھر آپ اچانک سے اپ ہو جاتے ہیں.... تو آپ خود حیران ہوتے ہیں کہ عروج کے وقت بھی میں ہی تھا اور زوال کے وقت بھی میں ہی ہوں۔ تو یہ عروج و زوال آپ کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ کوئی ہاتھ ہے۔ کوئی ہستی ہے جس کی وجہ سے آپ کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ ورنہ میں نے کتنے کتنے باصلاحیت لوگوں کو دیکھا ہے جو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ انہیں موقع ہی نہیں ملتا آگے بڑھنے کا یا وہ ایکسپلور ہی نہیں کرپاتے کہ میں یہ بھی کرلیتا ہوں، یہ بھی کر سکتا ہوں۔ یوں بھی کر سکتا ہوں.... کیونکہ ہمارے یہاں کا سیٹ اپ ہی یہی ہے کہ ماں باپ نے اس بات پر بچوں کو فوکس کیا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بننا ہے یا انجینئر تو پھر بچے بھی یہی سوچتے ہیں اور پھر مواقع بھی کم ہوتے ہیں۔

میں ہر سال یونیورسٹی سے کامیاب طلبہ کو نکلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اتنی مقدار میں طلبہ ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں تو انہیں جاب کہاں ملیں گی، مگر اللہ تعالیٰ کا سسٹم ہے کسی کو اچھی اور کسی کو معمولی جاب ملتی ہے.... کوئی بہت اعلا عہدے پر چلا جاتا ہے کچھ اچھے دنوں کے انتظار میں ہی رہتے ہیں.... تو میں تو لوگوں سے یہی کہتا ہوں کہ جب آپ کامیاب ہو رہے ہوں تو آپ کو خوشی سے پاگل نہیں ہونا چاہیے اور جب آپ ناکام ہو رہے ہوں تو آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ کامیابی اور ناکامی کو سر پر سوار کرنے سے انسان نفسیاتی ہو جاتا ہے.... تو میانہ روی بہت ضروری ہے۔"

"آپ کا نام "میر محمد علی" ہے۔ "میر خلیل الرحمن" فیملی سے کوئی تعلق ہے آپ کا؟"

"ہم بھی کشمیر کے ہی "میر" ہیں ہمارا کوئی ریلیشن (رشتہ) نہیں ہے، لیکن کام کے حوالے سے ہمارا بڑا زبردست ریلیشن ہے.... بہت شفقت اور پیار ملتا ہے مجھے یہاں سے...."

"آپ بہت حقیقی پیروڈی کرتے ہیں۔ کسی نے فرمائش کر کے بھی اپنی پیروڈی کروائی؟"

"بہت سارے لوگ ہیں جو ایس ایم ایس بھی بھیجتے ہیں اور پرسنلی بھی کہتے ہیں، مگر میری ایک عادت ہے کہ میں کسی سے بہت زیادہ تعلقات نہیں رکھتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ کی کسی سے بہت زیادہ دوستی ہو جاتی ہے تو پھر محدود ہو جاتے ہیں اور کھل کر اپنی مرضی سے کچھ کر نہیں سکتے۔ ابھی آپ نے میری تعریف کی کہ میں نے مصطفیٰ کمال کی پیروڈی بہت اچھی کی تو اگر میرے ان سے تعلقات ہوتے تو میں

کبھی بھی کھل کر پیروڈی نہ کر سکتا۔ لوگ بہت کوشش کرتے ہیں کہ مجھ سے ذاتی دوستی کریں۔۔۔ مگر میں خود ہی ان سے دور رہتا ہوں۔۔۔ اس لیے کوئی مجھ سے ناراض بھی ہوتا ہے تو وہ اپنا فیڈ بیک ڈائریکٹ چینل کو دیتے ہیں مجھے نہیں۔۔۔ میرا تعلق تو بس اتنا ہوتا ہے کہ کوئی پروگرام میں آگیا تو میری ہیلو ہائے ہو جاتی ہے۔ اور

ویسے بھی بائے نیچر میں بہت خاموش اور شرمیلا انسان ہوں۔ کہیں زیادہ ادھر ادھر نہیں جاتا۔"

"مگر آپ ایسے لگتے تو نہیں۔۔۔ پروگرام میں تو بہت بولڈ نظر آتے ہیں اور بے ساختہ بھی بول رہے ہوتے ہیں؟"

"اگر آپ ان لوگوں سے جو مجھے بہت قریب سے جانتے ہیں پوچھیں گی تو وہ بھی میرے بارے میں یہی کہیں گے۔۔۔ آپ یقین کیجیے جب میں پروگرام میں جاتا ہوں تو میرے لیے سب سے مشکل کام لوگوں کے سامنے کھڑا ہونا ہوتا ہے۔۔۔ میں جب پروگرام کا اسٹارٹ لیتا ہوں تو بڑی مشکل سے اپنی نیچر کو مار کر اور دل پہ جبر کر کے لوگوں سے مخاطب ہوتا ہوں اور پھر بڑے اچھے انداز میں پروگرام ہو جاتا ہے اور میں خود حیران ہوتا ہوں کہ یہ کس طرح ہو جاتا ہے۔۔۔ آپ اس بات پر بھی یقین کریں کہ جب میری کوئی تعریف میرے منہ پر کرتا ہے تو شرمندگی کے مارے سر سے پاؤں تک پسینے میں ڈوب جاتا ہوں۔۔۔ دل چاہتا ہے کہ کہیں بھاگ جاؤں۔۔۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کرتا ہوں۔"

"پہلے آفتاب اقبال آئے پھر نعیم بخاری۔۔۔ اور اب آپ خود میزبانی کر رہے ہیں تو یہ سب کچھ کیسا لگ رہا ہے؟ اس سیٹ پہ بیٹھنا کیسا لگ رہا ہے؟؟"

"مجھے ہوسٹنگ کرنی پڑ رہی ہے، مگر میں اس میں Comfortable نہیں ہوں۔ چونکہ اب اس وقت کوئی نہیں ہے تو مجھے میزبانی کرنی پڑ رہی ہے اور میزبانی میں آپ کھل کے پرفارم نہیں کر سکتے۔ آپ کو بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پورے پروگرام کو



کیری کرنا پڑتا ہے، سب کو پراپر ٹائم دینا ہوتا ہے۔ آپ کا دھیان بہت ساری چیزوں پہ بٹا ہوتا ہے۔۔۔ جبکہ جب آپ پیروڈی کر رہے ہوتے ہیں یا ایک وقت میں ایک کام کر رہے ہوتے ہیں تو آپ کا سارا فوکس اپنے کام پہ ہوتا ہے اور ریلیکس ہوتا ہے اور مزہ بھی آتا ہے تو یہ بھی ایک تجربہ ہے کہ انسان کو کبھی کبھی ایک ساتھ بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔"

"ایک ساتھ دو، دو تین ڈمیز کے روپ دھار کر کام کرنا واقعی ایک مشکل کام ہے؟"

"جی۔۔۔ جی بالکل۔۔۔ بہت زیادہ محنت کا کام ہے۔ اور یہ سب اللہ کی مہربانی ہے کہ میں یہ سب کام کر لیتا ہوں۔۔۔ ورنہ بندہ کس قابل ہے۔"

"ساری زندگی اسی کام میں رہنا ہے یا کوئی اور فیوچر پلاننگ ہے؟؟"

"میری کوئی فیوچر پلاننگ نہیں ہے۔۔۔ نہ میں اتنا لمبا چوڑا آگے کی طرف دیکھتا ہوں اور نہ ہی اس معاملے میں سنجیدہ ہوتا ہوں۔۔۔ میرا فوکس آج کے دن پہ ہوتا ہے۔۔۔ جس دن میری ریکارڈنگ ہوتی ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ اس کو اپنا سو فیصد دوں۔۔۔ اور اس کے

لیے مجھے جتنی بھی محنت کرنی پڑے میں کرتا ہوں۔۔۔ دوسری بات یہ کہ میرا تعلق مظفر آباد سے ہے' جہاں بہت بڑا زلزلہ آچکا ہے' اسے دیکھ کر میرا زندگی پر سے اعتبار اٹھ چکا ہے کہ زندگی تو کچھ لمحوں کا گیم ہے۔ "آنا فانا" میں تباہی آئی اور سب کچھ ختم ہوگیا۔ اور سب کچھ تاریخ کا حصہ بن گیا ہے۔ ہر گھر سے کوئی نہ کوئی اس آفت کا شکار ہوا۔۔۔ تو مجھے احساس ہوا کہ زندگی اتنی اہم چیز نہیں ہے کہ اسے اتنا زیادہ سیریس لیا جائے۔۔۔ کہ۔۔۔ اگلے پندرہ سال کی پلاننگ کرکے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگلے پندرہ منٹ کا تو بھروسا نہیں ہے۔"

"بے شک۔۔۔ مگر پلاننگ تو پھر بھی کرنی پڑتی ہے۔ اب اگر کل کو خبرناک بند ہو جاتا ہے تو پھر آپ کیا کریں گے۔۔۔؟ کوئی پلاننگ تو ہوگی نا؟"

"اس کے لیے میں آپ کو بتاؤں کہ میں تو "جیو میں ایمپلائی" ہوں۔ اور 2007 سے ہی جیو کی "مینجمنٹ" میں ہوں۔۔۔ میرا عہدہ "کریٹو منیجر" کا تھا۔۔۔ اور اب میں شو کا اینکر ہوں۔۔۔ تو اگر "خبرناک" بند بھی ہوتا ہے تو جیو کا کوئی اور پروجیکٹ کرلیں گے۔۔۔ میں ہوں تو مینجمنٹ میں ہی۔۔۔ پروگرام تو چلتے رہتے ہیں۔ بند ہوتے ہیں تو کوئی دوسرا پروجیکٹ آجاتا ہے۔ میں آپ کو کسی کمرشل' کسی ڈرامے میں نظر نہیں آؤں گا کیونکہ میں جیو کے ساتھ ہوں۔۔۔ اور جب تک جیو ہے' اللہ کا کرم ہے۔"

"دوسرے چینلز سے آفرز آتی ہیں۔۔۔؟ اور کب سے وابستہ ہیں جیو سے؟"

"جی۔۔۔ بہت آفرز آتی ہیں اور یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ مجھے لوگ بلاتے ہیں' مگر میں شکریہ ادا کرکے انکار کردیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میں بہت خوش ہوں۔۔۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ میں بہت خوش ہوں اور میں 2003 سے اس چینل سے وابستہ ہوں۔ تو بارہ سال زندگی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے ویسے یہاں میرے تعلقات سب کے ساتھ بہت اچھے ہیں۔۔۔ اور میری خواہشات بہت محدود ہیں۔ گاڑی' بنگلہ اور اس قسم کی خواہشات کو نہیں پالا ہوا میں نے۔ گھر کا چولہا آسانی سے جل جاتا ہے۔ بس یہی کافی ہے۔۔۔ میرے والدین اور میری بہنیں بتاتی ہیں کہ میں نے بچپن میں کبھی اپنے والدین سے کسی کھلونے کی فرمائش بھی نہیں کی تھی۔ امی بتاتی ہیں کہ جب مجھے کوئی چیز اچھی لگتی تھی تو میں اسے بار بار پلٹ کر دیکھتا تھا مگر کبھی خود سے نہیں کہتا تھا کہ یہ مجھے چاہیے' گھر والے خود ہی سمجھ جاتے تھے کہ اسے یہ پسند ہے۔۔۔ اور یقین کریں کہ آج تک مجھے گھر والوں سے اس بات پر ڈانٹ پڑتی ہے کہ "عید کے کپڑے" تو بنالو۔ میری کوئی خواہشات نہیں۔۔۔ بس تھوڑا بہت اماؤنٹ مل جائے یہی کافی ہے۔ بہت سمپل لائف ہی گزری۔"

"آفتاب اقبال کے جانے سے ویورشپ میں فرق پڑا؟"

"ظاہر ہے۔۔۔ کیوں نہیں پڑے گا۔۔۔ پانچ سال ان کے ساتھ کام کیا' پانچ سال ناظرین نے انہیں دیکھا تو لوگوں کو بھی عادت ہوگئی۔ اور ناظرین بھی یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ یہ اس طرح جواب دے گا تو یہ ری ایکشن آئے گا اور پھر ان کی جو ٹیم تھی۔ وہ بھی ان کے ساتھ چلی گئی سوائے میرے۔۔۔ یا وہ لوگ رہے جن کا جیو کے ساتھ کوئی ایسوسی ایشن تھی۔۔۔ تو فرق تو پڑا۔۔۔"

"آپ کی کیمسٹری کس سے ملتی تھی۔۔۔؟"

"دونوں قابل احترام تھے اور ہیں۔ میرے سینئر ہیں۔ مجھ سے بڑے ہیں دونوں میرے بڑے بھائیوں کی طرح ہیں۔۔۔ دونوں کے پرابلمز مینجمنٹ کے ساتھ تھے۔۔۔ میرا ان سے ذاتی کوئی اختلاف نہیں تھا۔۔۔ دونوں کے ساتھ کیمسٹری بہت اچھی تھی۔ اور مجھے ان دونوں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔"

"آواز تو آپ خواتین و حضرات کی بنالیتے ہیں۔ لیکن کیا "علی سلیم" کی طرح آپ کا بھی دل چاہتا ہے کہ آپ خواتین کا روپ دھاریں یا ان کی پیروڈی کریں؟"

"میں نے اپنی زندگی کا یا اپنے کیریئر کا سب سے پہلا گیٹ اپ "بے نظیر بھٹو" کا کیا تھا اور وہ بہت ہٹ ہوا تھا۔ اور میں چاہتا تو اس چیز کو مستقل رکھ سکتا تھا مگر میں کبھی بھی فی میل کیریکٹر میں اپنے آپ کو کمفو ٹیبل محسوس نہیں کرتا۔۔۔ اور ایسے گیٹ اپ سے دور بھاگتا ہوں۔۔۔ اور میں تو ویسے بھی بہت شائے (شرمیلا) ہوں۔۔۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ میں پیروڈی کیسے کرتا ہوں تو سچ پوچھیں تو مجھے کچھ پتا نہیں ہے میں تو بس "تکے" مارتا ہوں۔ اللہ کی مہربانی سے کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے' اب جیسے مصطفیٰ کمال کی پیروڈی سے پہلے اس کی ویڈیو دیکھی' اس کا اسٹائل دیکھا اور پیروڈی کر دی۔۔۔ اب مجھے نہیں پتا تھا کہ اچھی ہو گی یا بری ہو گی۔"

"آواز نکالنا تو آپ کے لیے مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ یہ بتائیں کہ کس کے گیٹ اپ میں بہت دیر لگتی ہے اور کس کا گیٹ اپ جھٹ پٹ ہو جاتا ہے۔"

"سب سے زیادہ آسان گیٹ اپ وہ ہوتا ہے جس میں کوئی داڑھی مونچھ نہ ہو۔ داڑھی مونچھ میں بہت ٹائم لگ جاتا ہے۔ سب سے آسان گیٹ اپ بلاول بھٹو کا ہوتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔"

"آپ کی شکل بھی ملتی ہے۔۔۔" ہم نے بات کاٹی؟

"جی جی۔۔۔ بہت زیادہ ملتی ہے۔۔۔ میں ایک دفعہ اپنے روم میں ہی بغیر گیٹ اپ کے بیٹھا ہوا تھا تو ہمارا کولیگ آیا اور کہنے لگا۔۔۔ "علی بھائی آج آپ بلاول بنے ہوئے ہیں۔۔۔ میں نے کہا کہ خیر ہے۔ میں نے تو کوئی گیٹ اپ نہیں کیا ہوا۔۔۔ "کامران خان" کا بہت آرام سے گیٹ اپ ہو جاتا ہے صرف سائیڈ سے مانگ نکالنی ہوتی تھی۔۔۔ راجہ پرویز اشرف بھی کلین شیو تھے بس بال بنانے ہوتے تھے' بلاول کے لیے تو بال بھی نہیں بنانے پڑتے۔ سب سے زیادہ ٹائم "اسلم رئیسانی" کے گیٹ اپ میں لگتا تھا۔ ایک تو وہ دبلے ہیں' اس پر وہ گنجے بھی ہیں۔۔۔ پھر ان کی داڑھی اتنی بڑی ہے کہ منہ پر صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی ہوتی ہیں۔۔۔

ان کے بولنے کا انداز بھی بہت مشکل ہے۔ تو اس ہیوی میک اپ میں اگر آپ کو پسینہ آرہا ہے۔ یا آپ کو کہیں خارش ہو رہی ہے تو بہت مشکل ہو جاتی ہے' تو اس گیٹ اپ میں تو پورا دن اکڑا ہی رہتا ہے بندہ۔۔۔ جب گیٹ اپ اترتا ہے تو سکون ملتا ہے۔ اور گیٹ اپ اترنے میں بھی کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔"

"آپ کہتے ہیں کہ بچپن میں ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ یہ بننا ہے یا وہ بننا ہے' تو میں آپ کا انٹرویو کہیں پڑھ رہی تھی کہ آپ نے اس فیلڈ میں آنے کے لیے بہت جدوجہد کی۔۔۔ تو ایسا تھا؟"

"اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ میں ایبٹ آباد میں فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔۔۔ یہ بات ہے 1998ء کی' آوازیں تو مختلف شخصیات کی تو بچپن سے ہی نکالتا تھا۔۔۔ اور گھر کے افراد کی بھی۔۔۔ پھر جب کالج میں آیا تو سیاست دانوں کی آوازیں بھی نکالنے لگا۔ مطلب یہ کہ اسکول میں کوئی اہم دن ہے تو میں آوازیں نکال کر (اسٹیج پر) لوگوں کو انٹرٹین کر رہا ہوتا تھا تو یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے سیاست دانوں کی آوازوں تک جا پہنچا۔۔۔ تو جس دن ہمارا پیرنٹس ڈے تھا اس دن میں نے انڈین اداکاروں کی اور کچھ سیاست دانوں کی آوازیں نکالیں۔۔۔ مخدوم جاوید ہاشمی ہمارے چیف گیسٹ تھے۔ اس دن پہلی بار میں نے کالج کے اسٹیج پر پرفارم کیا تھا اس میں مجھے اتنا زبردست رسپانس ملا کہ پیرنٹس ڈے تو ایک طرف رہ گیا اور میری واہ واہ شروع ہو گئی۔ اور پھر تو یہ عادت ہی بن گئی۔۔۔ جس سے بھی ملتا تھا دس منٹ کے بعد اس کی آواز بنا لیتا تھا۔۔۔ تو اس وقت تو چینلز بھی نہیں آئے تھے' شاید اے آر وائی تھا اور پی ٹی وی تو تھا ہی۔۔۔ تو بس اپنی اس کوالٹی کو دیکھتے ہوئے میرا دل چاہتا تھا کہ میں پی ٹی وی پہ جاؤں اور ایکٹر بنوں۔۔۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میں ہاسٹل میں رہتا تھا تو ہاسٹل میں رہنے کے پیسے تو مجھے والد صاحب بھیج دیا کرتے تھے۔ مگر دیگر ضروریات کے لیے مجھے پیسے مانگتے ہوئے شرم آتی تھی' کیونکہ مجھے مانگنے کی عادت ہی نہیں تھی' تو بس اس وجہ سے جدوجہد کرتا تھا کہ آمدنی کا کوئی ذریعہ ہو جائے۔ اور جذبہ سچا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آہستہ آہستہ میری جگہ بنا دی۔"

"آپ کے بارے میں یہ بھی سنا ہے کہ آپ کو لکھنے کا بھی شوق ہے تو جب پروگرام بنتا ہے تو آپ کو اتنی اجازت ہوتی ہے کہ آپ اسکرپٹ کو تھوڑا تبدیل کریں۔۔۔ یا خود لکھیں۔۔۔"

"جی بالکل اجازت ہے کہ میں اسکرپٹ میں کچھ چینج کرلوں۔ مجھے ایسا رائٹر کبھی بھی نہیں ملا جس نے یہ کہا ہو کہ میری لائن ادھر سے ادھر نہ ہو' اور ابھی بھی "خبرناک" کی تحریر میں "ٹیم خبرناک" لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ہم سارے مل کر کونٹینٹ بناتے ہیں' سب اپنی اپنی رائے دیتے ہیں کہ یہ ہونا چاہیے اس طرح ہونا چاہیے۔۔۔ کس نے کب کس طرح اپنی لائن بولنی ہے' سب کے مشورے سے ہوتا ہے' جس کے دماغ میں جو لائن آتی ہے وہ بولتا ہے۔۔۔ یہی پیٹرن آفتاب اقبال کے ساتھ بھی تھا اور نعیم بخاری صاحب کے ساتھ بھی تھا۔۔۔ ہاں اس سے قبل جو شوز میں کرتا تھا جیسے "ایویں شو" یا پولیٹیکل کارٹون تو وہ میں خود لکھا کرتا تھا۔"

"یعنی رونق میلہ لگا رہتا ہے۔۔۔ آپ اتنے سوشل نہیں ہیں۔ شرمیلے ہیں۔۔۔ ملتے نہیں لوگوں سے۔۔۔ تو ویسے مزاج کے کیسے ہیں۔ نرم یا گرم؟"

"اگر آپ کسی سے کہیں کہ میں نے "میر" کو غصے میں دیکھا ہے تو وہ آپ کی بات کا کبھی بھی یقین نہیں کرے گا۔۔۔ میری پہچان ہی انتہائی دھیمے اور حد سے زیادہ نرم مزاج کی ہے۔۔۔ اس حد تک کہ۔۔۔ کہتے ہیں کہ آپ اتنے میٹھے ہو کہ کوئی کھا کر آپ کو نگل جائے گا آرام سے۔۔۔ خطرناک حد تک نرم مزاج ہوں۔"

"سب سے زیادہ مزے تو آپ کی شریک حیات کرے گی۔ آپ کی نرم مزاجی کے۔۔۔"

ہنستے ہوئے۔ "اس لیے تو ڈرتا ہوں شادی کرنے

بقیہ صفحہ نمبر 281

آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی.... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔
معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔
فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ، وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے، آئے کت اور وسامہ، معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے، اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔
کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں تین بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔
صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے، رامین، کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔
شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہجہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں عرف مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔



باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں.... خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور تیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیرِ زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

پانچویں قسط

گھر کا بڑا کچن وہ مرکز تھا جس کے گرد روشن آرا کی پوری زندگی گردش کرتی تھی۔ صبح آنکھ کھلنے کے ساتھ جو کام شروع ہوتا تو سارا دن ہی کھانے پکانے اور سمیٹنے میں نکل جاتا تھا۔

اس روز بھی جب گھر کا آخری فرد بھی ناشتہ کر کے اور میز پر جھوٹے برتن چھوڑ کر جا چکا تو انہوں نے کچن سمیٹنا شروع کیا۔ سارے برتن اکٹھے کر کے سنک میں رکھے۔ پلیٹوں میں بچا ہوا کھانا ایک طرف کیا۔ چولہے صاف کیے اور جب تک وہ ان کاموں سے فارغ ہوئیں، ماہ نور دو کپ چائے اور ایک پراٹھے پر اچار کی پھانک رکھ کر ان کے انتظار میں بیٹھی رہی۔

ہر مشقت والے کام میں ان کی سنگی ساتھی۔ ان کی پیاری ماہ نور۔

وہ سامنے آ کر بیٹھیں تو واضح طور پر انہوں نے محسوس کیا۔ ماہ نور کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس نے روشن



آرا کے آکر بیٹھنے کا نوٹس بھی نہ لیا اور حسب عادت کاموں کی اس نہ ختم ہونے والی بیگار سے ان کا دھیان ہٹانے کے لیے کوئی اور موضوع بھی نہ چھیڑا۔ وہ خوش نصیب کی طرح بغیر کوما' فل اسٹاپ کے بولنے کی عادی نہیں تھی لیکن اس کی دھیمی آواز اور نرم لہجہ اپنی ایک حیثیت رکھتا تھا۔

"کیا بات ہے۔" انہوں نے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے بنا ماہ نور کو مخاطب کیے سوال داغا۔ "کوئی پریشانی ہے کیا؟"

ماہ نور اس سوال پر گڑبڑا گئی۔ جو بحث اس کے ذہن میں چھڑی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا' اس کا عکس بھی چہرے پر دکھائی نہیں دے رہا ہو گا لیکن سامنے روشن آرا تھیں۔ اس کی پیاری روشن امی۔ جو بنا کہے دل کا حال جان لیا کرتی تھیں اور ماہ نور آج تک یہ گتھی سلجھا نہیں پائی تھی کہ وہ کیسے اسے اتنا اندر' دل کی گہرائیوں تک جانتی ہیں۔

"نہیں' کوئی... کوئی پریشانی نہیں۔" وہ فوری طور پر ڈھنگ سے جھوٹ بھی نہیں بول پائی تھی۔

"اچھا... " روشن آرا نے اگلا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسی ہی بات ہے تو اب کی بار پراٹھے کا نوالہ توڑلو۔ تم پچھلے تین منٹ سے دسترخوان کا نوالہ توڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

انہوں نے جتنے آرام سے کہا تھا ماہ نور اتنی ہی بری طرح چونکی اور دیکھا تو پتا چلا' واقعی اپنے دھیان میں گم وہ دسترخوان کو پراٹھا سمجھ کر نوالہ توڑنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔

وہ جھینپ کر مسکرائی۔ روشن آرا اسے مسکراتا دیکھ کر مسکرائیں۔

"اماں کو ناشتہ کروا دیا؟" وہ اب چائے کا کپ اٹھا رہی تھیں۔

"ناشتہ کروانے گئی تھی لیکن نانی کا دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے وہیں رکھ آئی ہوں..."

"خوش نصیب اٹھ گئی؟"

"پتا نہیں... میں جگا کر تو آئی تھی... یہ بھی کہا تھا کہ نانی کو تھوڑی دیر تک ناشتہ کروا دے۔"

"خوش نصیب کو کہا ہے... بس پھر تو ہو چکا کام۔"

"روشن امی...!"

"ہوں؟"

"ایک بات ہے..." وہ الجھن آمیز انداز میں بولی جیسے طے نہ کر پا رہی ہو کہ بتائے یا نہیں۔

روشن آرا مسکرائیں۔ اپنی اندازے کی درستی پر۔ "کہو۔"

"پہلے آپ وعدہ کریں آپ ڈانٹیں گی نہیں۔"

انہوں نے الجھ کر ماہ نور کو دیکھا۔ "تمہیں تو کبھی ڈانٹنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی... یہ تو خوش نصیب کا خانہ ہے۔"

ماہ نور کو اس بات پر بے ساختہ ہنسی آگئی کیونکہ بات سو فیصد درست تھی۔

"اسی لیے تو مجھے زیادہ ڈر لگ رہا ہے کہ آپ اسے ڈانٹیں گی۔"

"اب کیا کارنامہ انجام دیا ہے خوش نصیب نے؟" وہ چائے کا گھونٹ بھر رہی تھیں' دہل کر کپ ہی واپس رکھ دیا۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں کیا..." وہ انگلی کی پور سے پیشانی مسلتے ہوئے بولی۔ "لیکن ارادہ کیے بیٹھی ہے... کہ کوئی نہ کوئی کارنامہ کرے گی ضرور..."

"کیا مطلب؟ مجھے پوری بات بتاؤ ماہ نور۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔
"پوری بات مجھے بھی نہیں پتا۔۔۔ لیکن کل وہ کہہ رہی تھی۔۔۔ کمرے سے نکالے جانے پر سب سے بدلہ لے گی۔ کچھ ایسا کرے گی کہ۔۔۔ سب کو اپنی نانی یاد آجائے گی۔" اس نے جھجکتے ہوئے خوش نصیب کے الفاظ دہرا دیے۔
روشن آرا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ پھر گہری سانس بھر کر بولیں۔ "پہلے تو اس لڑکی کو میں اس کی نانی یاد دلاتی ہوں۔"
"امی! امی! پلیز اسے ڈانٹیے گا مت۔" وہ منت سے ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی کیونکہ جانتی تھی خوش نصیب کو ڈانٹ پڑ جانے کے بعد بھگتان بھی اسے ہی بھگتنا پڑے گا۔
"اس پر میری کسی ڈانٹ کا اثر ہوتا تو ایسے ارادے باندھتی ہی نہیں۔" وہ زچ ہو کے بولیں۔
ماہ نور کو ماں کی ناراضی اور خوش نصیب سے متعلق جھلاہٹ بھی تکلیف پہنچا رہی تھی۔
"آپ اسے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کیوں نہیں دلوا دیتیں۔" ماہ نور نے مسئلے کے حل کے طور پر کہا۔ "فارغ دماغ شیطان کا کارخانہ یوں ہی تو نہیں مشہور۔۔۔ مصروف ہو جائے گی تو سب سے لڑنا جھگڑنا بھی چھوڑ دے گی۔"
"تم بھی تو اسی ماحول میں رہی ہو ماہ نور! تمہیں بھی میں نے اسی طرح پالا ہے، جس طرح خوش نصیب کو۔۔۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم دونوں کی سوچ اور طرز عمل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی تھیں۔
"ہر انسان کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔۔۔ تربیت کا ایک کلیہ اگر ایک انسان پر سو فیصد درست ثابت ہوا ہے تو ضروری نہیں کسی دوسرے پر بھی فٹ رہے۔۔۔ یہ آپ خود ہی تو کہتی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی تو روشن آرا نے آنکھوں میں محبت سمو کر اسے دیکھا اور دل سے اسے دعا دی۔
"کتنی صابر بیٹی ہو تم۔۔۔ ایسی اچھی اولاد ضرور میری کسی نیکی کا صلہ ہے۔ اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔۔۔ آمین۔"
"میری اتنی تعریف نہ کریں۔۔۔ اگر جو ابھی خوش نصیب نے سن لیا تو گھر کے باقی افراد کے ساتھ ساتھ ہم دونوں سے بھی ناراض ہو جائے گی۔" وہ ہنس کر شرارت سے بولی۔
"ہونے دو۔۔۔ اس کی بدگمانی تو کسی طور ختم نہیں کی جا سکتی۔" وہ تھوڑا جھنجلائی ہوئی تھیں۔ "نہ کسی کام کو ہاتھ لگاتی ہے نہ کوئی ڈھنگ کی بات کرتی ہے۔۔۔ ہاں لڑائیاں جتنی مرضی کروا لو۔ ہر ایک سے بیر باندھے رکھنے کی عادت نجانے کہاں سے آگئی اس لڑکی میں۔"
"روشن امی! اب ایسے بھی نہ کہیں اکیڈمی کھولنے کا ارادہ تو بڑے خلوص سے کیا تھا اس نے۔" ماہ نور نے فوراً بہن کی طرف داری کی۔
"اور کیا وہ نہیں جانتی تھی اس ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کتنے محاذوں پر لڑنا پڑے گا؟ یہ جو ہم کمرہ بدر کیے گئے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک سزا ہے۔" ان کی نرم لہجے میں تلخی سی گھل رہی تھی۔
ماہ نور کو افسوس سا ہوا۔ "اچھا چھوڑیں نا اس بات کو خوش نصیب کے ایڈمیشن کا بتائیں۔" اس نے موضوع بدلا۔
"ایڈمیشن کروانے جتنے وسائل ہوتے میرے پاس تو ہرگز دیر نہ کرتی۔" وہ افسردہ سی ہو گئی تھیں۔ "تمہیں خود بھی پتا ہے تمہارے تایا چچا یونیورسٹی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پیسے نہیں دیں گے ہمیں۔"
"لیکن امی! ہر مہینے تو تایا ابو رقم دیتے ہیں اس میں سے کچھ نہ کچھ بچایا بھی تو جا سکتا ہے۔"
"اس رقم میں سے بیشتر کی تو کمیٹیاں ڈال رکھی ہیں میں نے کل کلاں کو تم دونوں کو بیاہنا بھی ہے۔ اور فی زمانہ

صرف خاندانی شرافت اور اچھی شکل کی بنیاد پر رشتے نہیں ہوتے... اور بھی بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔" وہ دوٹوک لہجے میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"خوش نصیب کو سمجھا دینا... بدلے وٹے کا خیال دل سے نکال دے... ایسا بھی کوئی ہماری جائیداد پر قبضہ نہیں کرلیا ان لوگوں نے کہ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں سوچی جائیں۔"

ان کا اچھی خاصی ناراضی سے بھرا ہوا لہجہ ماہ نور کو اتنی اجازت نہیں دے رہا تھا کہ آگے سے کچھ کہے سو خاموشی سے اثبات میں سرہلا دیا۔



کانسٹیبل اسلم نے اپنی گن پر ہاتھ مضبوط کیے اور سہما سہما جاکر چوکیدار کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈر کے مارے دل بے ہنگم انداز میں دھڑک رہا تھا اور رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اس نے فوراً" سے پیشتر با آواز بلند آیت الکرسی کا ورد کرنا شروع کیا اور اس کے ساتھ اسے جو بھی قرآنی آیات یاد آئیں وہ پڑھتا چلا گیا۔

دھند کے مرغولوں میں چھپی ہوئی وہ رات... ایک مشکل رات تھی۔

اور وہ چاہتا تھا جلد از جلد اس رات کی صبح ہو جائے لیکن ظاہر ہے یہ بھی اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔

اس نے بیٹھے بیٹھے محتاط انداز میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں جتنی دور تک نگاہ جاسکتی تھی اس نے دیکھا۔ فلک بوس کا بیرونی حصہ سناٹے اور اسرار کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ کانسٹیبل کچھ اور سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا' پھر اسے کچھ خیال آیا تو اس نے اٹھ کر لکڑی کا پھاٹک کھول دیا۔ اور اپنی کرسی گیٹ کے بالکل قریب رکھ دی۔ یہ پیش بندی تھی۔ اگر اندر سے اسے کسی ان دیکھی مخلوق کا حملہ برداشت کرنا پڑتا تو وہ یقیناً" آرام سے راہ فرار اختیار کرسکتا تھا۔ لیکن اس پیش بندی سے بھی اس کے دل کی حالت پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا البتہ یہ ہوا کہ قرآنی آیات کے ورد سے اس کے ڈر میں قدرتی طور پر کمی واقع ہونے لگی اور اس نے خود کو قدرے پرسکون محسوس کیا۔

پرسکون ہوتے ہی اس کا ذہن اس کھانے کے بارے میں سوچنے لگا جو دوپہر میں اس نے کھایا تھا۔ مسور کی ثابت دال کے ساتھ بڑے لذیذ چاول تھے' جن کے ساتھ اس کی بیوی نے بھرے ہوئے بینگن کا سالن بنا کر بھجوایا تھا۔ واہ... کیا لذیذ کھانا تھا۔ اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ دوپہر کے بعد سے وہ بھوکا ہے اور اس نے دوبارہ کچھ نہیں کھایا۔ اس کی نظر فلک بوس کی طرف گئی۔ مکینوں کو کم سے کم اس سے رات کے کھانے کے متعلق تو پوچھ لینا چاہیے تھا۔

لیکن جتنی بڑی عمارت تھی اتنے چھوٹے دل کے مکین۔ اسے باہر بٹھا کر وہ لوگ تو جیسے بھول ہی گئے تھے۔ مرے پر سو درے اسی وقت سوائے ایک کو چھوڑ کر باقی تمام لیمپ پوسٹ بجھا دیے گئے۔ فلک بوس کا لان مکمل تاریکی میں ڈوب گیا اور پائن کے درخت مزید قد آور اور خوفناک لگنے لگے۔ کانسٹیبل اسلم کا دل ایک بار پھر ان دیکھے آسیب کے خوف سے کانپنے لگا۔ ذرا سی ہوا چلی' سوکھے پتے لرزے تو وہ پورا کا پورا لرز گیا لیکن اگلے ہی پل وہ اپنی بیوقوفی پر جھینپ کر ہنسنے لگا۔

"یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں... آج تک اس بدروح کو دیکھا کس نے ہے' جو میں اتنا ڈر رہا ہوں... او ہمت کر یار۔" اس نے خود کو حوصلہ دیا۔ بندوق کو احتیاط سے گود میں رکھا اور کرسی سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گوکہ اس کے دل میں ابھی بھی خوف کی ہلکی سی رمق باقی تھی لیکن بظاہر وہ خود کو پرسکون ظاہر کر رہا

تھا۔ اور ظاہر کرنے سے زیادہ وہ خود کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ ڈر نہیں رہا۔
رات دھند کے لبادے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اسلم نے یونیفارم کے اوپر ایک گرم کوٹ اور گرم ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے اسے نیند کے جھونکے آنے لگے۔ ہڑبڑا کر اس نے نیند کو بھگایا اور چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ لیکن یہاں سب کچھ معمول کے مطابق ہی لگنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ خوف کا عنصر جو اسے فلک بوس کی حدود سے دور رہنے کی تلقین کر رہا تھا ماند پڑنے لگا اور اسے اونگھ آگئی۔
آنکھوں کے مکمل بند ہونے تک وہ دیکھ نہیں سکا کہ فلک بوس کی آرائشی گھنی باڑھ کے پیچھے اس سے کوئی سات فرلانگ کے فاصلے پر ایک سایہ دبے پاؤں جیسے پانی پر تیرتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کانسٹیبل اسلم کا شک صحیح تھا۔ آج کی رات واقعی اس کی زندگی کی ایک بری رات ثابت ہونے والی تھی۔
آسمان پر بجلی کڑکی اور گھنے بادلوں میں شگاف پڑ گیا کانسٹیبل اسلم کی آنکھ کسی عجیب سے احساس سے کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی اسے ایسا لگا جیسے اس کے پیچھے ہلچل سی ہوئی ہے۔ اس نے تیزی سے مڑ کر پیچھے دیکھا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ روش پر بکھرے سوکھے پتے ہوا سے ادھر اُدھر اُڑتے پھر رہے تھے۔ بادلوں کی سفیدی نے اتنی روشنی پھیلا رکھی تھی کہ وہ دور تک غیر واضح مناظر دیکھ سکتا تھا۔
اس جگہ سے بہت دور وہاں جہاں تالاب کے بیچ و بیچ سفید پری پنکھ پھیلائے کھڑی تھی۔ وہیں کوئی اور بھی تھا۔
جس وقت بجلی کڑکی اور پورا ایشام آسمان سے کوندتی ہوئی اس تیز روشنی میں نہا گیا۔ تب اسلم نے واضح طور پر وہاں کسی کو دیکھا۔ لمبا سفید چغہ جھکا ہوا چہرہ اور چہرے کے اطراف میں پھیلے کندھوں سے نیچے تک جاتے ہوئے بال۔
ایک بجلی آسمان پر کڑکی ایک اس کے اعصاب پر گری۔
یہ منظر اتنا دہشت ناک کہ وہ بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ گود میں رکھی بندوق اس کے پیروں میں گر گئی لیکن وہ اتنا حواس باختہ ہو چکا تھا کہ اسے بندوق اٹھانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس وقت سفید چغہ پوش نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اسلم کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر اس کے وجود میں حرکت نمودار ہوئی۔ اس کا پورا وجود اپنی جگہ سے چند انچ اوپر ہوا میں اٹھا اور ہوا میں تیرتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اسلم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا دل جیسے حلق میں آگیا۔ وہ تیزی سے گیٹ کی طرف پلٹا۔ ہیجانی انداز میں باہر آکر اس نے گیٹ بند کیا لیکن گیٹ مکمل طور پر بند نہیں ہوا۔
اسلم نے اسے ایسے ہی چھوڑ دیا۔ وہ بھول گیا کہ وہ اس وقت ڈیوٹی پر ہے۔ یاد رہا تو صرف اتنا کہ اسے فلک بوس کے آسیب سے اپنی جان بچانی ہے۔ وہ بھاگتے ہوئے قدموں کے ساتھ تیز تیز ڈھلوانی سڑک پر چلنے لگا۔ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے فلک بوس کا آسیب اس کے تعاقب میں ہی ہے۔
اچانک وہ ٹھٹک کر رکا۔ اسے غرانے کی آواز سنائی دی تھی اور آواز واضح طور پر درختوں کی طرف سے آرہی تھی۔ معاً" گھنے درختوں کے جھنڈ سے ایک جست لگا کر ایک جنگلی جسیم کتا اس کے عین سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا اور اب دانت نکوس کر غرا رہا تھا۔

اسلم کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ وہ واپس نہیں جا سکتا تھا اور آگے بڑھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
اس نے منہ سے آوازیں نکال کر کتے کو بھگانے کی کوشش کی لیکن یہ جنگلی کتا تھا کوئی عام کتا نہیں کہ اس کی معمولی آوازوں سے گھبرا کر رستہ چھوڑ دیتا۔ وہ ذرا سا نیچے جھکا اپنے پنجے مٹی پر رگڑے اور جسم کی پوری طاقت کے ساتھ اسلم پر حملہ آور ہوا۔ اسلم نے دہشت زدہ ہو کر بھاگنا چاہا لیکن اس کوشش میں منہ کے بل گرا۔ گرتے

ہوئے اس نے دیکھا' سفید چغہ پوش فلک بوس کے پھاٹک نما گیٹ کے باہر ہوا میں معلق تھا۔
کتے کے پنجے اور دانت ایک ساتھ اسلم کی کمر میں اُترے تھے اور اس کی چیخوں سے بشام کا جنگل لرز اٹھا تھا۔



جب خوش نصیب آنکھیں ملتی کچن میں آئی تب تک سارا ہی کام سمیٹا جا چکا تھا۔
"ناشتہ دے دیں۔" وہ کرسی پر ڈھے گئی اور بازو پھیلا کر بولی۔ "اف... آج سو کر اتنی تھکن ہو رہی ہے کہ بس...!"

"تھکن اتارنے کے لیے تھوڑی دیر اور سو جانا تھا..." روشن امی نے طنز سے کہا۔ خوش نصیب نے فوراً" کھٹک کر ماں کو دیکھا اور سادگی سے پوچھا۔
"طنز کر رہی ہیں؟"
"نہیں نہیں... میری اتنی مجال کہاں۔" انہوں نے ایک اور بھگو کر لگائی۔
خوش نصیب نے کن انکھیوں سے ماہ نور کو دیکھا وہ تندہی سی پتیلی مانجھ رہی تھی اور دانستہ خوش نصیب کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔
"کیا بات ہے روشن امی! آپ اس طرح کیوں بات کر رہی ہیں؟" اس نے ڈرے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ماں نرم لہجے میں بات کرنے کی عادی تھیں لیکن دونوں بیٹیوں پر رعب بہت تھا ان کا۔
"اس طرح بات نہ کروں تو کس طرح کروں؟ تم میں کوئی احساس ذمہ داری ہے یا نہیں۔" وہ ڈپٹ کر بولیں۔
"جب دیکھو تم کسی نہ کسی اوٹ پٹانگ کام میں مگن ہی ملتی ہو... کبھی دیواریں پھلانگ رہی ہو' کبھی درختوں پر ٹنگی ہوئی ملو گی اور کچھ نہیں تو سارے گھر کو زچ کرنے کے نت نئے بہانے سوچتی رہتی ہو... تم نے کبھی سوچا ہے خوش نصیب! سارے گھر کو تم سے کتنی شکایتیں ہیں؟"
نت نئے بہانوں والی بات پر خوش نصیب نے فوراً" ماہ نور کو دیکھا۔ اس نے اور بھی رخ موڑ لیا۔ خوش نصیب فوراً" سمجھ گئی کہ معاملہ کیا ہے۔ ایکا سامنہ بنا کر بولی۔
"مجھے کسی کی شکایتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا... کیا اس گھر کے کسی فرد نے کبھی سوچا ہے مجھے ان سے کتنی شکایتیں ہیں؟"
"تمہیں فرق نہیں پڑتا لیکن مجھے پڑتا ہے' ہم سب کو پڑتا ہے۔" وہ بہت ہی ناراض تھیں۔
"شاہجہان کے کبوتر اُڑا دیے' کبوتروں کی کنالیاں توڑ دیں۔ اتنا بدلہ لینا کافی ہے... ماہ نور نے مجھے بتایا ہے کہ اب کوئی اور کھچڑی پک رہی ہے تمہارے دماغ میں' ایک بات میری کان کھول کر سن لو' اب تم نے کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"
"جی!" اتنی زور سے ڈانٹ پڑی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہی آ گئے۔ آنسو چھپانے کے لیے اٹھ کر کچن سے جانے لگی تو روشن امی نے مزید ڈپٹ کر کہا۔
"اب نخرے کرنا بند کرو اور چپ چاپ بیٹھ کر ناشتہ کرو۔ ملازم نہیں ہے کوئی تمہارا کہ ناشتے کی ٹرے سجا کر پیچھے لے لے کر پھرے۔"
وہ بیٹھ گئی۔ آنسو چھپانے کے لیے زور زور سے آنکھیں جھپکیں' ہونٹ بھی زور سے بھینچ لیے اور ایسا کرتے ہوئے بالکل چھوٹی سی بچی لگنے لگی۔

ماہ نور کو افسوس ہوا خواہ مخواہ بیچاری کو نہار منہ ڈانٹ پڑوادی۔
اس نے سفارتی تعلقات بحال کرنے کے لیے تازہ پراٹھا بنا کر سامنے رکھا' زیادہ دودھ اور تیز چینی والی کڑک چائے بھی بنائی لیکن خوش نصیب نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ سچ مچ ناراض ہو گئی تھی۔



فلک بوس کے اندر یہ چیخیں سب سے پہلے آئے کت کی سماعت سے ٹکرائی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر وسامہ کے پاس آئی۔
"یہ... یہ کیسی آوازیں ہیں وسامہ؟"
وسامہ اپنی پریشانی کم کرنے کی غرض سے آتش دان کے قریب ایزی چیئر پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔
"کیا ہوا ہے آئے کت؟"
"یہ کیسی آوازیں ہیں... جیسے کوئی زور زور سے چیخ رہا ہو۔" آئے کت نے پریشانی سے کہا۔
وسامہ نے کان لگا کر سنا۔ "ہاں کوئی چیخ رہا ہے۔" وہ پریشان ہو کر بیساکھی کے سہارے کھڑا ہوا۔
"ہمیں باہر جا کر دیکھنا چاہیے۔" آئے کت تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ وسامہ نے اسے روک دیا۔
"پاگل مت بنو... ہم اس وقت باہر نہیں جا سکتے۔"
آئے کت حیران رہ گئی۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں... یہ انسانی چیخوں کی آواز ہے۔ کوئی مشکل میں ہے' اسے ہماری مدد کی ضرورت ہو سکتی ہے۔"
"باہر جا کر ہم خود کسی مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔" اس نے آئے کت کا ہاتھ جھٹک کر کہا اور بیساکھی ٹیکتا ہوا تیزی سے کھڑکی کی طرف گیا۔ اس نے پردے کا کونا ذرا سا سرکا کر احتیاط سے باہر جھانکا۔ باہر ہر طرف اندھیرا حاوی تھا۔

"میں بابا کبیر کو بلاتی ہوں۔"
"کبیر سے کہو... دروازہ ہرگز نہ کھولے۔"
"لیکن وسامہ..."
"جو کہہ رہا ہوں وہ کرو آئے کت!" اس نے ڈپٹ کر کہا۔ آئے کت کو اس کے ایسے لہجے کی عادت نہیں تھی وہ رونکھی سی ہو کر باہر نکل گئی اور چند لمحے بعد بابا کبیر کے ساتھ واپس آئی۔
اس دوران وسامہ مستقل باہر دیکھتا رہا تھا۔
"مجھے باہر جا کر دیکھنے دیں صاحب! یہ آوازیں جنگل کی طرف سے آ رہی ہیں... ضرور کوئی مشکل میں ہے۔"
بابا کبیر نے منت سے کہا۔
لیکن کھڑکی کے پاس وسامہ جیسے شاکڈ سا کھڑا تھا۔ ابھی جب بجلی چمکی تو اس نے بھی اس سفید لبادے میں لپٹے ہوئے وجود کو دیکھا۔ جو چلتا نہیں تھا۔ ہوا میں تیرتا ہوا آگے بڑھتا تھا۔
جسے پہلی نظر میں اپنا گمان سمجھ کر وسامہ نے نظر ہٹانی چاہی' اسے اپنا وہم سمجھا لیکن اسی وقت بجلی چمکی اور منظر واضح ہوتا چلا گیا۔ وہ دم بخود رہ گیا لیکن جوں ہی آسمانی بجلی کا زور کم ہوا ہر منظر اپنا روپ گنوا بیٹھا۔ وسامہ ہکا بکا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ پردہ ہی برابر کر دے۔
"کیا بات ہے وسامہ! کیا ہوا ہے آپ کو؟" وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"وہ... وہاں... وہ... وہاں کک... کوئی تھا... اب... ابھی دیکھا میں نے۔" وہ بول بھی نہیں پا رہا تھا۔
آئے کت اور بابا کبیر تیزی سے کھڑکی کی طرف آئے لیکن باہر کوئی نہیں تھا۔ انہیں کوئی نظر نہیں آیا۔
"مجھے تو کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔"
"وہ غائب ہو گیا... وہ... وہ سایہ غائب ہو گیا۔" وسامہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔
"آپ کا وہم ہے... باہر کوئی بھی نہیں ہے۔"
"میں نے خود دیکھا ہے۔" اس نے چیخ کر کہا اس کی یہ ہیجانی چیخ فلک بوس کی دیواروں سے ایسے ٹکرائی جیسے بہت سی چمگادڑیں مل کر چیختی ہوں۔ بابا کبیر اور آئے کت چپ کے چپ رہ گئے۔
"اٹھو... جلدی کرو آئے کت! ہم... ہم یہاں نہیں رہیں گے... وہ آگئی ہے اس کی روح فلک بوس میں بھٹکتی پھرتی ہے۔" وہ پاگل سا ہو رہا تھا۔ آئے کت پریشان ہو گئی۔
"کیا ہو گیا ہے آپ کو وسامہ!"
"مجھے کچھ نہیں ہوا... لیکن اگر ہم یہاں رہے تو ضرور کچھ ہو جائے گا... کچھ ایسا جس کا مداوا ہم دونوں نہیں کر سکیں گے۔" اس نے سہمے ہوئے انداز میں آئے کت کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
وسامہ کا انداز آئے کت کو مزید پریشان کر گیا۔
"ہم اس وقت یہاں سے کیسے نکل سکتے ہیں؟" وہ روانکھی ہو کر بولی۔ "آپ جانتے ہیں' رات کے وقت اس پہاڑی علاقے میں سفر کرنا آسان نہیں ہوتا۔"
وسامہ کا اصرار ماند پڑ گیا۔ اسے جیسے اس بات کا خیال نہیں رہا تھا۔
"صاحب!" بابا کبیر کی آواز پر وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ "یہاں آئیے صاحب۔" وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور کھڑکی سے باہر ان دونوں کو کچھ دکھانا چاہتا تھا۔
"وہ دیکھیے درخت کی شاخ سے ایک سفید چادر لٹک رہی ہے۔ شاید اسے ہی آپ بدروح سمجھے ہوں۔"
اور وسامہ دم بخود رہ گیا۔ درخت کی شاخ سے واقعی ایک چادر لٹکی ہوئی تھی اور ہوا سے لہرا رہی تھی۔
"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے خود یہاں کسی کو چلتے ہوئے دیکھا تھا۔"
"آپ کا وہم ہو گا صاحب! ایسے موسم اور ایسی جگہوں پر اکثر نظریں دھوکا کھا جاتی ہیں... وہم ہو جاتے ہیں۔" بابا کبیر نے نرمی سے کہا۔
وسامہ ششدر سا کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کے لیے سمجھنا مشکل ہو گیا تھا کہ کیا واقعی اسے وہم ہوا تھا یا واقعی کچھ دیر قبل وہاں کوئی تھا۔ چیخوں کا اسرار خود بخود دم توڑ گیا۔ اب وہ نئی الجھن میں پھنس گیا تھا۔
اسی وقت بجلی ایک بار پھر کڑکی اور تیز ہوا سے چادر کا شاخ میں پھنسا ہوا کونا آزاد ہو کر ہوا میں لہراتا گھاس پر جا گرا۔ آئے کت نے آگے ہو کر کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔



جس وقت وہ دونوں چھت پر آئیں۔ پوری چھت تیز دھوپ سے زرد ہو رہی تھی۔ داہنی ہاتھ والی دیوار کے ساتھ ساتھ رکھے کبوتروں کے بند ڈربے ہری ترپال سے ڈھانپے گئے تھے لیکن کسی نہ کسی ڈربے میں کوئی کبوتر ذرا سا بولتا تو اس کی آواز کسی بھولی بسری یاد کی طرح محسوس ہوتی۔

"ہائے کتنی گرمی ہے یہاں... تم لوگ کیسے رہو گے خوش نصیب!" فریحہ کو چھت سے گزر کر کمرے میں

جانے تک کی مختصر مدت میں ہی غش آنے لگے تھے۔
"جیسے نیچے والے کمرے میں رہتے تھے ویسے ہی اس کمرے میں بھی رہ لیں گے۔۔۔ وہاں کون سے ڈھائی ٹن کے اسپلٹ اے سی لگے ہوئے تھے ہمارے لیے۔" وہ حلق تک کڑوی تھی اور یہ کڑواہٹ اگلنے کا بس بہانہ ہی چاہیے ہوتا تھا سو اس وقت بھی پورے جی جان سے متنفر لہجے میں بولی۔
"میری مانو۔۔۔ ایک چکر تم بھی باباجی کے پاس لگا ہی لو۔" کمرے میں اس کے پیچھے داخل ہوتے ہوئے فریحہ نے کہا۔ کمرے میں گو تمام اسباب زندگی 'نانی سمیت' موجود تھے۔ چھت پر ٹنگا پنکھا بھی پوری طاقت سے گھوم رہا تھا مگر ہوا کا زور بتاتا تھا 'پنکھا اپنے آخری دموں پر ہے۔ پھر بھی باہر کی بہ نسبت کمرے میں سکون تھا اور اس کی واحد وجہ روشن امی کی وہ عقل مندی تھی جو گندم کی خالی خس کی بوریوں کو پانی میں بھگو کر کھڑکیوں میں لٹکانے کا سبب بنی تھی۔ ہوا جب ان چٹائی نما بوریوں سے گزرتی تو ٹھنڈک کا ایک احساس کمرے میں پھیل جاتا تھا۔
"تایا ابو نے کہا ہے پنکھا تو نیا لگوا دیں گے۔" فریحہ کو منہ اٹھائے پنکھے کی طرف دیکھتا پا کر خوش نصیب نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ گو کہ اپنے چچا تایا کے ناروا سلوک اور حق تلفیوں کے متعلق جتنی گل افشانیاں وہ اب تک کر چکی تھی اس کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت رہ تو نہیں جاتی تھی۔ پھر بھی اس وقت اسے بہت سے بھی کچھ زیادہ ہی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔
"میرا تو نہیں خیال۔۔۔" فریحہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "اب تک تم لوگوں کے پاس جو کچھ تھا وہ تمہارے تایا چچا نے لیا ہی ہے نئی کوئی چیز کہاں لے کر دے سکیں گے۔" خوش نصیب اب کی بار خاموش ہی رہی لیکن اس کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ فریحہ سے سو فیصد متفق ہے۔
"تم باباجی کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔" وہ دھپ سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ پرانے زمانے کا پلنگ تھا سو طرح کی موسیقی سنا کر خاموش ہوا۔
"کون سے باباجی؟"
"وہی۔۔۔ بیری پیر والے۔۔۔"
"وہ نمک اور گندی چینی والے باباجی؟" خوش نصیب کو وہ قصہ یاد آتے ہی ابکائی آنے لگی۔
"ایسے بدتمیزوں کی طرح ناک چڑھا کر مت بولو باباجی کے لیے۔۔۔ وہ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ کوئی پتا نہیں ان کا کوئی موکل یہیں آس پاس ہی موجود ہو۔"
"میں ایسے موکلوں کی ٹانگیں توڑ سکتی ہوں جو اتنے کم ہمت تھے کہ ان گندے چوڑے باباجی تک کے قابو میں آ گئے۔۔۔ بتاؤ ان باباجی کی طرف تو دیکھنے کو دل نہیں کرتا ان کے منہ کی گندی چینی کون کھائے گا۔" اس نے نفرت سے کہا۔
"اسی گندی چینی کی کرامت ہے کہ ثمرین کی ساس نندیں تیر کی طرح سیدھی ہو گئی ہیں۔ کل ہی امی کو فون پر کہہ رہی تھیں کہ رخصتی کی تاریخ طے کرنے جلد ہی آئیں گی۔۔۔ ثمرین تو اتنی خوش ہے کہ بس۔" فریحہ نے کہا۔
"ثمرین سے کہو خواہ مخواہ خوش ہو کر اپنا وزن نہ بڑھائے۔ گندی چینی ساس نندوں کو کھلانے کی بجائے ہر روز چار لفظ شیرینی میں ڈوبے ہوئے زبان سے نکال لیتی تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔۔۔ اونہہ تم دیکھ لینا یہ تیر ایک دن ثمرین کو ضرور لگے گا۔"
"فٹے منہ تمہارا! انسان بات ہی اچھی کر لیا کرے۔" فریحہ کی جان ہی جل کر خاک ہو گئی۔ ایک تو ایسا اعلیٰ مشورہ دیا اوپر سے خوش نصیب کی باتیں۔

"ارے اچھی بات کرنے کے چکر میں کیا انسان سچ بھی نہ بولے؟" اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔ "اچھا بتاؤ۔۔۔ کچھ کھاؤ گی؟ ویسے نہ ہی کھاؤ تو اچھا ہے کیونکہ اتنی دھوپ سے گزر کر مجھے نیچے کچن میں جانا پڑے گا۔۔۔ اور دوبارہ دھوپ میں جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔۔۔ ویسے بھی تم بے شک میری دوست ہو لیکن اب مجھے اتنی بھی عزیز نہیں ہو کہ میں بار بار تمہارے لیے دھوپ میں چکر لگاؤں۔"

"اللہ معاف کرے مجھے۔۔۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ تم جیسی کام چور لڑکی نہ میں نے آج تک دیکھی ہے نہ ہی اس کے بارے میں سنا ہے۔۔۔" اس نے شرمندہ کرنا چاہا لیکن وہ خوش نصیب ہی کیا جو آرام سے قابو میں آجائے۔

"اور میرے جیسی کوئی تمہیں ملے گی بھی نہیں۔۔۔ میں ون اینڈ اونلی ہوں" ہاتھ نچا کر بڑے فخر سے بولی۔ "میرے بارے میں ہی تو علامہ اقبال نے کہا تھا۔۔۔ بڑی مشکل سے ہوتی ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔"

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔" فریحہ نے لفظوں پر زور دے کر کہا۔

"اکثر لوگ غلط پڑھتے ہیں یہ مصرعہ۔۔۔ اصل مصرعہ تو یوں ہے۔۔۔ بڑی مشکل سے ہوتی ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔" اصرار دم توڑنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

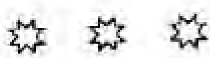
"بس کردو۔۔۔ میرے کان پک گئے تمہاری تعریفیں سنتے سنتے۔" فریحہ چڑ کر بولی۔ "اور بابا جی کے پاس چکر لگاؤ... بڑی کرامات ہیں ان کی۔ بگڑے کام بنا دیتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ بابا جی ادھر عمل شروع کریں گے اور ڈھائی ٹن کا اے سی خود چل کر میرے گھر پہنچ جائے گا نا؟"

"اب یہ مجھے نہیں پتا۔۔۔ صرف یہ پتا ہے کہ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔"

"اچھا۔۔۔" وہ ایک دم کچھ سوچنے لگی۔ "اگر اتنے ہی پہنچے ہوئے ہیں تمہارے بابا جی تو چلو میرے ساتھ۔۔۔ تمہارے بابا جی کی "پہنچ" چیک کرتے ہیں۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ فریحہ پریشانی سے ارے ارے ہی کرتی رہ گئی۔



اگلی صبح جب وادی کے لوگوں کا گزر فلک بوس اور جنگل کی درمیانی سڑک سے ہوا تو انہیں اس سڑک پر کانسٹیبل اسلم کی بھنبھوڑی ہوئی لاش ملی۔ وادی میں جیسے کہرام سا مچ گیا۔ ستر فیصد مقامی آبادی کا خیال تھا یہ فلک بوس کے آسیب کا کام ہے۔ تیس فیصد میں عقل باقی تھی اور چونکہ اسلم کی لاش کے پاس کتے کے نشانات بھی ملے تھے اس لیے انہوں نے تحقیقات کے نتائج آنے تک کوئی بھی رائے دینے سے گریز کیا۔ کچھ کا کہنا تھا کانسٹیبل اسلم نے فلک بوس کے بیرونی حصے کا گشت شروع کیا تو ایک ان دیکھی طاقت نے اس کے ہاتھ سے بندوق لے کر فلک بوس کے اندر چھوڑ دی۔ اس کے بعد کانسٹیبل اسلم خود بخود چلتا ہوا باہر آیا۔ گیٹ کے باہر آیوشمتی کھڑی تھی۔ اس کے ٹھوڑی تک لٹکتے ہوئے لمبے دانت اور چار چار انچ تک کے لمبے ناخن تھے۔ کانسٹیبل اسلم کسی جادو کے اثر سے گیا اور جا کر آیوشمتی کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ آیوشمتی نے اس کا یہ حال کر دیا۔

کچھ کہتے "آیوشمتی کو اسلم کی فلک بوس کے سامنے پہرہ دینے والی بات پسند نہیں آئی۔ اس نے رات کے تیسرے پہر کانسٹیبل کو ایک ہاتھ پر اٹھایا اور فلک بوس سے باہر پھینک دیا۔ نتیجتاً" اس کی موت واقع ہو گئی۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی افواہیں بشام میں گردش کرنے لگیں۔ فلک بوس کے مکینوں کا بشام کے لوگوں سے کوئی اتنا ملنا ملانا نہیں تھا اس لیے یہ ساری افواہیں ان تک مکمل صورت میں نہ پہنچ سکیں۔ لیکن انہیں انکوائری بھگتنا پڑی اور چونکہ اسلم کو فلک بوس کے باہر تعینات کیا گیا تھا اور فلک بوس کے اندر جانے یا اندر سے کسی کے باہر آنے کے

ایسے کوئی واضح ثبوت بھی نہ مل سکے تھے' اس لیے کانسٹیبل اسلم کی موت کے کیس کو حادثہ قرار دے کر اس کی فائل ہمیشہ کے لیے بند کردی گئی۔

فلک بوس کے سامنے والی سڑک پر سرخرو پر کیے گئے حملے کے بعد یہ دوسرا بڑا حادثہ تھا جس کا مجرم فلک بوس کے آسیب یعنی آیوشمتی کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ وادی میں کچھ عرصہ افواہیں گردش کرتی رہیں اور پھر ظاہر ہے ان افواہوں کا زور قدرے ماند پڑ گیا۔ لیکن سب کی باہمی رائے یہی تھی کہ اس سے پہلے کہ وہ آسیب فلک بوس کے مکینوں کو کوئی نقصان پہنچائے انہیں وہاں سے چلے جانا چاہیے۔

جو بھی ہوا وہ معمولی بات نہیں تھی۔ خبر اردشیر ازی تک بھی پہنچ گئی۔ وہ ملک کی ایک نامور سیاسی پارٹی سے وابستہ تھے۔ کچھ عرصہ وزیر اطلاعات بھی رہے تھے۔ فلک بوس ان کی جاگیر کا ایک معمولی سا حصہ تھا لیکن چونکہ فلک بوس ان کے والد کو بطور انعام دیا گیا تھا سو اس سے کئی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ اس سے دستبردار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

دوسری جانب وہ اپنی سابقہ بیوی اور اس کے گھر والوں کے لیے کوئی اچھے جذبات بھی نہ رکھتے تھے۔ جب معاویہ نے ان سے وسامہ کو فلک بوس میں ٹھہرانے کی اجازت مانگی تو وہ اس بات کے حق میں نہیں تھے لیکن اتنی معمولی چیز کے لیے انکار کر کے وہ معاویہ کو ایک بار پھر ناراض بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پہلے ہی اس کے دل میں ان کے لیے بہت شکایتیں تھیں۔ انکار کر کے وہ ان شکایتوں کو بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن کانسٹیبل اسلم کی موت کی خبر سن کر انہوں نے معاویہ کو بلوایا۔ معاویہ اپنے کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں مصروف تھا۔ اس نے آنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے معاویہ کو ساری حقیقت بتائی اور اس سے کہا کہ وہ خود بشام جا کر اس معاملے کی تحقیقات کرے۔

"سیدھا سادا جنگلی کتے کے حملے کا کیس ہے.... میں اب وہاں جا کر کیا تحقیقات کروں؟" وہ چڑ کر بولا۔

"معاویہ! وہ تمہاری پراپرٹی ہے.... وہاں کیا ہو رہا ہے کیا نہیں' تمہیں اس بارے میں سب پتا ہونا چاہیے۔" وہ تحمل سے بولے گو کہ وہ اتنے تحمل کے عادی نہ تھے۔

"بابا! ابھی فوراً میں وہاں نہیں جا سکتا۔" اس نے دو ٹوک کہا۔

"ٹھیک ہے پھر تم وسامہ کو فون کر کے کہو فلک بوس خالی کر دے.... میں اسے ہوٹل بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" انہوں نے اب سنجیدگی سے کہا۔

معاویہ نے ایک دم ان کو حیران ہو کر دیکھا۔ "آپ کا پہلے تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"نہیں.... میں کافی عرصے سے اس پلان پر غور کر رہا ہوں۔"

"لیکن آپ نے پہلے ذکر نہیں کیا....؟" اس نے زور دے کر کہا۔

"میں نے ضروری نہیں سمجھا ہو گا۔" انہوں نے آرام سے کہا۔

معاویہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "فلک بوس کو آپ بہت پہلے میرے نام کر چکے ہیں.... وہاں وسامہ رہے گا یا ہوٹل بنے گا' یہ میں فیصلہ کروں گا۔"

اردشیر ازی نے غور سے بیٹے کو دیکھا اور انہیں احساس ہوا کہ وہ بہت پہلے اپنے بیٹے کو کھو چکے ہیں۔ وہ ان سے زیادہ اپنے ماموں طالب حسین کا بیٹا تھا۔ وہ وسامہ طالب کا بھائی تھا۔ انہوں نے کیسے سوچ لیا وہ ان کے کسی ارادے کو وسامہ پر فوقیت دے سکتا ہے۔

انہوں نے خود کو سمجھایا اور مسکرا کر معاویہ کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے.... فلک بوس کے بارے میں تم ہی فیصلہ کرو گے.... لیکن بہتر ہو گا کہ تم ابھی بشام جاؤ اور ساری

صورت حال کا جائزہ لو... میں نے اپنے کانٹیکٹس کے ذریعے کیس بند کروادیا ہے۔"
"آپ انکوائری ہونے دیتے... ایک انسان مارا گیا ہے۔ چھان بین تو ہونی چاہیے تھی۔" معاویہ کو جیسے ان کی ہربات رد کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔
"تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے اگر اس معاملے کی بھنک میڈیا کو پڑ جاتی تو ہمارے خاندان کو کیا کچھ برداشت کرنا پڑ سکتا تھا۔" اردشیرازی نے گہری سانس بھر کر کہا۔
معاویہ نے ایسے سر جھٹکا جیسے اسے کسی چیز کی پروا نہ ہو۔
"بہرحال تم بشام جاؤ... اور اس کانسٹیبل کے گھر والوں سے ملو... تھوڑی بہت مالی امداد کر کے ان کے منہ بند کرواؤ۔ جتنا نامور خاندان ہوتا ہے اتنے دشمن تاک میں ہوتے ہیں... میں نہیں چاہتا کسی کو الٹی سیدھی بات کہنے کا موقع ملے۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں کہہ کر فون اٹھالیا۔
معاویہ ناراضی سے انہیں دیکھ کر باہر نکل گیا تھا۔



مزار پر معمول کا رش تھا زائرین کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔
یہ وہ جگہ تھی جہاں فریحہ ہمیشہ ذوق و شوق سے آتی تھی' صرف اس لیے نہیں کیونکہ اسے مزار والے مرحوم بزرگ یا وہاں پیر صاحب بن کر بیٹھے ہوئے کسی ڈھونگی بابا جی سے عقیدت بہت تھی بلکہ اس لیے کیونکہ اس نے اپنی اماں' بہن اور گھر کے تمام بزرگوں کو ایسے ہی عقیدت اور محبت سے یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا۔
یہ عقیدت نسل در نسل منتقل ہوئی تھی سو اس سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔ لیکن خوش نصیب آج گھر سے تہیہ کر کے نکلی تھی کہ ڈھونگی بابا جی کا راز فاش کرے گی۔ فریحہ کے سامنے انہیں ایسا نیچا دکھائے گی کہ دوبارہ کبھی فریحہ ان کا نام لینے کی بھی روادار نہ رہے گی۔
"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کر کیا رہی ہو؟"
خوش نصیب لوگوں کے جمگھٹے میں پھنسی پنجوں کے بل اچک کر چلتی ہوئی بابا جی تک رسائی کا راستہ تلاش کر رہی تھی۔ فریحہ نے چڑ کر اس سے پوچھا۔
"اگر تمہیں امپلٹ اے سی کے لیے تعویذ ہی چاہیے تھا تو ہم شام کو بھی آسکتے تھے... اتنی دوپہر میں آنا ضروری تو نہیں تھا۔" وہ سخت جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔
"کیوں؟ دوپہر میں کیا تمہارے بابا جی کی "پہنچ" میں کمی آجاتی ہے یا ان کے موکل کام کاج چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں؟" وہ اچک اچک کر دیکھتے ہوئے بولی۔
"اف... خدارا خوش نصیب! آہستہ بولو... کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تمہارے گلے میں اسپیکر فٹ ہے۔ خواہ مخواہ محلے والے مرگ کا اعلان کروانے مسجد جاتے ہیں۔ تمہیں ہی بتا دیا کریں ہر طرف خبر پہنچ جائے گی۔" اس نے کان پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
خوش نصیب کے ذہن میں جیسے کوئی گھنٹی بجی۔ "ارے واہ... مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا کتنا منافع بخش کام ہو سکتا ہے... ہر اعلان کے بدلے میں دو چار سو روپے بھی وصول کرلیا کروں گی۔" اس نے بالکل ایسے خوش ہو کر کہا جیسے شیخ چلی اپنی پہلی مرغی خریدتے ہوئے خوش ہوا ہوگا۔
فریحہ نے اسے گھور کر دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "تم نہیں سدھر سکتیں۔"
"اس میں سدھرنے کی کیا بات ہے۔" ہتھیلی پر ہاتھ مار کر حسب عادت وہ زور سے ہنسی۔ "میں تو تمہیں اپنے

بزنس میں پارٹنر شپ بھی آفر کرنے والی تھی' آرڈرز تم ہی نوٹ کیا کرنا۔" اس دوران وہ لوگوں کے ہجوم میں گھستی ہوئی بابا جی تک پہنچ گئی تھیں۔
فریحہ نے اسے ٹھوکا دیا۔ "کوئی بد تمیزی نہ کرنا... میری اماں کو خبر ہو گئی کہ بابا جی کی شان میں کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہے تو مجھے جان سے مار دیں گی۔" وہ اس کے کان میں گھسی۔
خوش نصیب نے سرہلا کر اسے تسلی دی اور بابا جی کے سامنے احترام سے بیٹھ گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا بناوٹی احترام صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ فریحہ نے بابا جی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر سلام کیا۔
"بابا جی! یہ میری سہیلی ہے خوش نصیب۔" وہ آہستگی سے بولی۔ بابا جی نے اپنی میلی آنکھیں اٹھا کر ذرا کی ذرا خوش نصیب کو دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں اور بارعب آواز میں کہا۔
"حق اللہ... حق۔"
"بابا جی! میرا ایک مسئلہ ہے۔" خوش نصیب جلدی سے بولی۔ فریحہ نے زور سے اس کی پنڈلی پہ چٹکی بھری۔
"آ... " خوش نصیب بلبلا اٹھی۔ "کیا تکلیف ہے تمہیں؟"
فریحہ نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کان میں گھس کر دانت کچکچا کر بولی۔
"یہ صاحب ولایت بزرگ ہیں... تمہاری گلی سے گزرنے والا کوئی عام فقیر نہیں' جو ان سے ایسے بات کر رہی ہو۔"
خوش نصیب نے کھینچ کر اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کرایا اور چڑ کر بولی۔
"اب اگر تم نے مجھے ٹوکا ناں... تو یقین کرو ان ہی بابا جی سے عمل کروا کے تمہیں مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دوں گی..."
"خوش نصیب!..." فریحہ کو بری طرح تاؤ آیا لیکن اس سے پہلے کہ جملہ مکمل کر پاتی' بابا جی کی سرور میں ڈوبی آواز نے اسے خاموش کرا دیا۔
"نہ میری بچی! نہ... اسے نہ ٹوک۔"
خوش نصیب نے بابا جی کی آواز پر گردن اکڑا کر فریحہ کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ اب بول کر دکھاؤ لیکن بابا جی کی اگلی بات نے اسے چونکا دیا۔
"اس نمانی نے ابھی زندگی میں بڑا لمبا سفر طے کرنا ہے۔ بہت کچھ جھیلنا ہے... بہت کچھ برداشت کرنا ہے۔ اسے ہمت جمع کرنے دے... ابھی سے خاموش کرا دیا تو اس کا حوصلہ آدھے سے بھی کم رہ جائے گا۔ اسے بولنے دے' ہر غم سے دل کی جھولی خالی کرنے دے۔"
بھکشوؤں والا نارنجی میلا جھبلا پہنے گندا میلا بابا' ایک لے میں بولتا چلا گیا تھا۔ نہ اس کی شکل بدلی' نہ لباس نہ گندے میلے بال۔ لیکن کہیں کوئی ایسی تبدیلی ضرور آئی تھی جو بیان نہیں کی جا سکتی تھی مگر محسوس ہوتی تھی۔
"آپ کو کیسے پتا کہ مجھے زندگی میں لمبا سفر کرنا ہے؟" خوش نصیب متاثر نہیں ہوئی تھی' صرف چونکی تھی۔
بابا جی کے چہرے پر پُراسرار' معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ انہوں نے آنکھیں موندیں اور منہ آسمان کی طرف ذرا سا اٹھا کر بولے۔
"مجھے تو یہ بھی پتا ہے تیرے ذہن کی الجھن تجھے یہاں کھینچ لائی ہے... تجھے بابے کی باتوں پر اعتبار نہیں لیکن بابا سب جانتا ہے... تیرے دل اور دماغ کی ہر جنگ سے واقف ہے۔" بابا نے آنکھیں کھولیں اور اپنی میلی آنکھیں خوش نصیب کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔
خوش نصیب کو ایسا لگا جیسے ارد گرد یک لخت سناٹا چھا گیا ہے۔ اس بھری دنیا میں وہ اکیلی کھڑی ہے اور بابا جی

شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی۔
بابا جی مسکرائے اور آنکھیں دوبارہ بند کرلیں۔
خوش نصیب کے اردگرد پھیلا غبار چھٹ گیا۔ وہ ایسے چونکی جیسے انسان گہری نیند سے جاگتا ہے۔ بے ساختہ اس نے اردگرد دیکھا۔ وہ مزار پر تھی اور اس کے اردگرد زائرین کا مجمع۔ اس نے کہا نہیں لیکن وہ شاکڈ ہوئی۔ وہ کہاں تھی' کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟
یہ چند لمحے پہلے جو واردات اس پر گزری' وہ کیا تھی؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ پھر اس نے اپنا سر جھکا اور اس سے قبل کہ کچھ بولتی بابا نے کہا۔
''جا چلی جا... بابا کی دعا ہے۔ آج تیرے من کی مراد پوری ہوگی...''
خوش نصیب اٹھی اور ایک معمول کی طرح چلتی دربار کے احاطے سے باہر نکلتی چلی گئی۔
فریحہ اس کے پیچھے دوڑی چلی آئی لیکن خوش نصیب چلتی چلی جارہی تھی۔
''خوش نصیب... خوش نصیب!''
فریحہ کی آواز کافی دیر بعد اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی جب فریحہ بھاگتی ہوئی اس کے سامنے آگئی۔
خوش نصیب عجیب سے انداز میں چونکی۔
''تم کہاں جارہی ہو خوش نصیب؟'' وہ حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔
''پتا نہیں۔'' خوش نصیب نے اس سے زیادہ حیران ہو کر کہا وہ اپنی حالت سمجھنے سے قاصر تھی' پھر جیسے اس کے سر پر انکشاف کا بھاری پتھر آن گرا۔ اس نے بے ساختہ اپنے سر پر ہاتھ مارا۔
''میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کہاں جارہی ہوں کیا کررہی ہوں؟ تمہارے ان بابا جی نے جادو کیا ہے کیا مجھ پہ؟'' وہ سر پکڑ کر وہیں ایک مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔
''میں نے تمہیں منع کیا تھا' بابا جی کا مذاق مت اڑاؤ... وہ ضرور ناراض ہوگئے ہیں تب ہی تمہاری یہ حالت ہو رہی ہے... ورنہ بابا جی کے پاس جا کر تو اتنا سکون ملتا ہے ایسا لگتا ہے انسان سارے جہاں کی پریشانیوں سے آزاد ہو گیا ہو۔'' فریحہ کی اپنی فلاسفی تھی لیکن خوش نصیب بری پھنسی تھی۔ گوکہ اسے فریحہ کی کسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا اور یقین کرنے کی کوشش بھی وہ نہ کرتی اگر وہ کالی گاڑی اسے نظر نہ آجاتی۔ جس نے کئی روز تک اس کی نیند اڑائے رکھی تھی۔
اس تنگ گلی کے اختتام پر جو برجی کی طرف جانے والا چوراہا تھا اور وہیں اسے کالی گاڑی کے پاس کھڑا شامیر نظر آگیا۔ اب صحیح معنوں خوش نصیب کے سر پر آسمان گرا تھا۔ اس کے کانوں میں بابا جی کی آواز گونج رہی تھی۔
''جا چلی جا... بابا کی دعا ہے' آج تیرے من کی مراد پوری ہوگی۔''
اور من کی مراد پوری ہوگئی۔ وہ حیران نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ ڈھونگی بابا کا راز فاش کرنے آئی تھی لیکن اس روز جب دربار کی حدود سے نکلی تو اس کا اپنا عقیدہ ڈگمگا چکا تھا۔



''معاویہ آرہا ہے۔'' وسامہ نے فون بند کرتے ہوئے آئے کت کو بتایا۔
آئے کت اسی وقت خاتون بی بی کو رات کے کھانے کے لیے ہدایات دے کر باہر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ گیلے تھے جنہیں وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھ رہی تھی۔
''اچھا ہے...'' آئے کت نے فوراً'' کہا۔ ''معاویہ آئے گا تو آپ بہتر محسوس کریں گے... مجھے ایسا لگ رہا ہے

آپ اس حادثے کے اثر سے نکل نہیں پا رہے۔" وہ آ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ وسامہ نے اپنی وھیل چیئر اس کی طرف موڑی اور عجیب سے انداز میں بولا۔

"معاویہ کو آیوشمتی کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔" آئے کت حیران رہ گئی۔

"لیکن کیوں؟ فلک بوس اس کی ملکیت ہے اور اسے پتا ہونا چاہیے یہاں کیا کچھ ہو تا رہا ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"میں نہیں چاہتا وہ یہاں سے پریشان ہو کر واپس جائے۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"آپ اس سے بات کریں گے تو آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔" اس بار آئے کت نے بہت نرمی سے کہا تھا۔

"مذاق ایک طرف لیکن جس بری طرح آپ اس آسیب کے خیال سے ڈرنے لگے ہیں' یہ باتیں میرے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔۔۔ میں سارے فلک بوس میں پھری ہوں' مجھے یہاں ایسا کوئی اثر محسوس نہیں ہوا جس کی بنیاد پر ہم سارا وقت کانپ کانپ کر گزار دیں۔" وہ بیزار لگ رہی تھی۔ "اسی لیے میں آپ سے کہہ رہی ہوں' معاویہ سے اس بارے میں خود بات کریں یا مجھے کرنے دیں۔۔۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی حل نکال لے گا اور کچھ نہیں تو ہمیں یہاں سے نکال کر کہیں اور لے جا سکتا ہے۔۔۔ اتنی پراپرٹی ہے اس کی۔ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ ہمیں دے دینے سے کون سی کمی ہو جائے گی اس کی جائیداد میں۔"

"اس کے مجھ پر پہلے ہی بہت احسانات ہیں۔" وسامہ رونے کے قریب تھا۔ "میں خود کو اور زیر بار نہیں کر سکتا۔"

"تو ٹھیک ہے۔۔۔ اس کا احسان نہ لیں۔ ہم یہاں سے چلتے ہیں۔"

"یہاں سے نکلیں گے تو کہاں رہیں گے؟ ابو بھی مجھے نہیں رکھیں گے اور میں تمہیں بھی مزید خوار کرنا نہیں چاہتا۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"آپ یہاں سے نکلنے کا ارادہ کریں۔ اللہ کوئی نہ کوئی سبب ضرور بنا دے گا۔۔۔ اتنی بڑی دنیا ہے اللہ کی۔ ہمیں بھی ضرور کوئی نہ کوئی ٹھکانہ مل جائے گا۔" آئے کت نے دو ٹوک لفظوں میں کہا۔

"مجھے اس بارے میں سوچنے دو۔۔۔ لیکن پلیز معاویہ سے آیوشمتی کے بارے میں کوئی بات مت کرنا۔۔۔ اسے میری ریکویسٹ سمجھ لو۔"

آئے کت ناراضی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اتنا ڈرنے کے باوجود اتنی احتیاط پسندی' اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ لیکن اس نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ معاویہ سے بات ضرور کرے گی وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ تقدیر ان تینوں کے لیے کوئی اور ہی ارادہ کیے بیٹھی ہے۔



اس شام جب خوش نصیب ذرا ستانے کے لیے لیٹی (اور اس کام کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتی تھی) تو اسے خیال آیا یہ عجیب واقعہ تھا جو اس کے ساتھ پیش آیا۔

وہ زکوٹا جن۔۔۔ ہاں یہ درست نام ہے۔۔۔ اس نے سوچا۔ تو وہ زکوٹا جن جیسے فقیر بابا کی ہرگز ہرگز عقیدت مند نہیں بن سکتی تھی نہ اسے بابا کی کسی کرامت پر بھروسا تھا لیکن اس ایک نظر نے کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور کی تھی۔ اور اس ایک نظر سے بھی زیادہ گڑبڑ شامیر نامی اس بندے کی ایک جھلک نے کر دی تھی۔

خوش نصیب صبح بیدار ہونے کے بعد سے اس کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ نجانے کیوں وہ خود اور اس کی

وہ لاجواب گاڑی اسے بار بار یاد آتی رہی تھی۔ کہیں دل کے کسی کونے میں انجانے میں ہی اس نے یہ بھی خواہش کی تھی کہ وہ اسے کہیں نظر آجائے لیکن یہ دعا اتنی شدید نہیں تھی۔ یہ بس ایسی ہی دعا تھی کہ کسی کو یاد کرلیا اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے "کاش" کا لفظ بول دیا۔

سوال یہ تھا کہ بابا نے اسے دعا کیسے دے دی اور انہیں کیسے پتا چلا کہ وہ شامیر کے بارے میں سوچتی رہی ہے۔ یہی سب سوچتے سوچتے وہ سو گئی اور ایسی گہری نیند سوئی کہ اگلی صبح ماہ نور کے جھنجوڑ کر جگانے پر ہی اس کی آنکھ کھلی۔

پوری طرح بیدار ہونے تک وہ پچھلے روز کا واقعہ بھول بھال چکی تھی۔

ماہ نور نے بستر سمیٹتے ہوئے اسے کن اکھیوں سے دیکھا۔ اس کی ناراضی بھی مہنگی پڑجاتی تھی اور پھر وہ ماہ نور کو عزیز بھی بہت تھی۔ سو طویل مدت کی ناراضی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

"تم مجھ سے ناراض ہو؟" ماہ نور نے کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

خوش نصیب نے سستی سے اسے دیکھا پھر گردن موڑ کر بولی۔ "نہیں... بہت خوش ہوں میں تم سے... روشن امی کی چچی بن کر ہر بات انہیں جا کر بتا دیتی ہو..."

"اسی میں تمہاری بھلائی ہے خوش نصیب!" ماہ نور نے رسان سے کہا۔

"کیا بھلائی ہے میری؟" وہ اب ناراضی سے بولی۔ "بدلہ لے کر دل کو سکون آجاتا۔"

"ایسے وقتی سکون کا کیا فائدہ جو لانگ ٹرم پریشانیوں کا باعث بنے۔"

"تمہاری اور روشن امی کی لاجکس میری سمجھ سے باہر ہیں۔" اس نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔ "لیکن یہ جو تم نے روشن امی کو بتا کر میرے ساتھ دشمنی مول لی ہے نا... یاد رکھنا معاف میں ہرگز نہیں کروں گی۔"

ماہ نور کو زور سے ہنسی آگئی۔ خوش نصیب کا بچپنا کسی طور ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"پورے گھر میں کسی کو تو چھوڑ دو جس کا تم پر کوئی نہ کوئی قرض نہ ہو اور جس سے بدلہ لینے کی تم نے دل میں نہ ٹھان رکھی ہو۔"

"باقی سب کو تو پھر بھی چھوڑ دوں گی، تمہیں اب نہیں چھوڑوں گی... تم تو آستین کا سانپ نکلیں... میر جعفر کا فی میل ورژن۔"

وہ اتنے غصے میں تھی لیکن ماہ نور کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

"کرو گی کیا... یہ تو بتاؤ۔"

"ہنس لو... ہنس لو بیٹا! ہنس لو... میں ابھی جا کر سب کو بتاتی ہوں کہ تم طوطے بھائی کے جان لیوا عشق میں گرفتار ہو... اور نہ صرف چھپ چھپ کر انہیں دیکھتی ہو بلکہ فلم اسٹار شبنم کی طرح ان کے لیے آہیں بھی بھرتی ہو۔" وہ انتقامی جذبہ کے تحت اٹھتے ہوئے بولی۔

ماہ نور کی ہنسی ایسے گم ہوئی جیسے کوئی جادو کی چھڑی گھمائی گئی ہو۔

"کس قدر جھوٹی ہو تم خوش نصیب۔" وہ بیچاری ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"اب جھوٹی ہوں یا جو بھی ہوں... خبر تو میں سب کو ضرور دوں گی۔" ہونٹوں کے کنارے پھیلا کر دانت نکال کر وہ کمینگی سے بولی۔

"اور جب تک تمہاری شادی طوطے بھائی سے نہیں کروا دیتی مجھے سکون نہیں ملے گا... وہ طوطا تم ان کی طوطی... اوہ سوری مینا... اور تم دونوں کے بچوں کا نام رکھوں گی میں... بڑا بیٹا ہوگا مکاؤ اور چھوٹے والا فشر... اللہ نے کرم کیا تو ان شاءاللہ پہلے چار سال میں ہی پرندوں کا پورا خاندان تیار ہوجائے گا۔"

پورے کمرے میں گھومتی وہ یا آواز بلند پلاننگ کر رہی تھی اور اس کی آواز تکیے کی زوردار ضرب نے بند کروائی جو ماہ نور نے اسے کھینچ کر مارا تھا۔

"طوطے بھائی کے عشق میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے میں خودکشی کرلوں۔"

خوش نصیب نے دیکھا' دوسرا تکیہ پکڑے' ایک ہاتھ کمر پر رکھے' ماہ نور بڑی ہی جذباتی ہوئی کھڑی تھی۔ لیکن یہ جذباتی پن اسے خوش نصیب کے عتاب سے ہرگز نہیں بچا سکتا تھا۔

اس نے بھی تکیہ اٹھایا اور ماہ نور پر چڑھ دوڑی۔ ذرا دیر میں ان دونوں نے سارے تکیے بستر اپنی جگہوں سے ہلا دیے تھے اور کمرہ میدان جنگ کا منظر پیش کرنے لگا تھا اور اس میدان جنگ میں سب سے دل فریب ان دونوں کی وہ ہنسی تھی جو بیک گراؤنڈ میوزک کی طرح گونج رہی تھی۔

زندگی اتنی بھی بری نہیں تھی جتنی بعض اوقات لگنے لگتی تھی۔



ایک سنہری صبح معاویہ فلک بوس آپہنچا۔

آئے کت اور وسامہ اس کے استقبال کے لیے مرکزی دروازے تک آئے۔ لکڑی کے خودکار پھاٹک سے جیپ اندر داخل ہوئی اور ڈھلوانی روش پر بڑھتی ان کے سامنے آکر رکی۔ جیپ کے دروازے کھلے۔ ڈرائیونگ سیٹ سے بابا کبیر اترا' دوسری طرف سے معاویہ۔

لمبا قد' بھرپور جسامت' مضبوط ہاتھ پیر' وہ وجاہت میں تو با کمال تھا سو تھا۔ اپنی عمر سے بڑا بھی دکھائی دیتا تھا لیکن وہ بے مثال مسکراہٹ جو اس کے چہرے کا حصہ تھی اس کا راز کھولتی تھی۔ شریر بچوں کا سا تاثر دیتی تھی۔ زندگی سے بھرپور آنکھیں تھیں اس کی۔

تھوڑا سا سنجیدہ' تھوڑا سا لاابالی۔ زندگی کے اس مقام پر یہ تھا معاویہ شیرازی کا مکمل اور بھرپور تعارف۔

آئے کت نے دیکھا' اس سنہری صبح میں وہ سیاہ رنگ کی جیکٹ میں ملبوس تھا۔ لمبے سفر نے اسے تھکا دیا تھا لیکن جواں عمری کا جوش اسے نڈھال ہونے نہ دیتا تھا۔ وہ وسامہ کی طرف ذرا سا جھکی اور سرگوشی میں بولی۔

"تمہارا بھائی حسن کے دیوتا کا دوسرا روپ معلوم ہوتا ہے..... مجھے ڈر ہے کہ کہیں آیوشمتی کی بھٹکتی روح اس پر عاشق نہ ہو جائے۔" نظریں معاویہ پر ٹکائے' وسامہ کی طرف جھکی' وہ شرارت سے گویا ہوئی تھی۔ وسامہ نے اس بات پر ناپسندیدگی سے اسے دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ اسے سرزنش کرتا معاویہ والہانہ انداز میں بازو پھیلائے ان کے سر پر پہنچ گیا۔

"تم لیلیٰ مجنوں' ایک دوسرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کرو۔" وسامہ کو آئے کت کی طرف دیکھتا پاکر اس نے جو بھی مطلب اخذ کیا ہو اس کا اظہار اسی طرح کیا تھا۔ وہ تینوں ہی اس بات پر ہنس پڑے تھے اور معاویہ وسامہ کے گلے لگ گیا تھا۔

"یا اللہ..... تم تو پہلے سے زیادہ منہ پھٹ ہوگئے ہو۔" آئے کت نے ہنس کر معاویہ سے کہا۔

"اور تم پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگئی ہو۔" معاویہ نے بھی دوبدو کہا۔

"لیکن یہ تعریف ہے اور میں اس بات پر خوش ہوں۔" آئے کت مصنوعی انداز میں اترا کر بولی۔

"دنیا کی کونسی بے وقوف عورت ہے جو ایسی باتوں پر خوش نہیں ہوتی ہوگی۔" معاویہ نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔

اس بات پر وہ تینوں ایک بار پھر ہنسے۔ پھر معاویہ نے وسامہ کو دیکھا' بغور دیکھا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے

دور نہیں ہوئی لیکن آنکھوں میں الجھن کا عکس پھیل گیا۔
"کیا بات ہے؟ اتنے کمزور کیوں ہو رہے ہو؟ تم نے میرے بھائی کا خیال نہیں رکھا۔" اس نے آئے کت کو دیکھا۔ آئے کت بوکھلا گئی تو وسامہ نے جلدی سے کہا۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آئے کت میرا بہت خیال رکھتی ہے۔"
"میں دیکھ رہا ہوں' کتنا خیال رکھتی ہے۔" معاویہ سر جھٹک کر بولا۔ "خیال رکھتی تو تمہارا یہ حال نہ ہوتا۔" اس نے خشمگیں نظروں سے آئے کت کو دیکھا۔
"تم بالکل مڈل کلاس ساسوں کی طرح ایکٹ کر رہے ہو۔" آئے کت نے ناک چڑھا کر کہا۔ معاویہ جھینپ سا گیا اور اس نے ناراضی سے آئے کت کو دیکھا۔ وسامہ البتہ ہنس پڑا۔ چند لمحوں بعد وہ تینوں ہی ہنس رہے تھے۔
"ساری باتیں کیا یہیں ہوں گی۔ اندر نہیں چلنا کیا؟ بابا کبیر! معاویہ کا سامان اس کے کمرے میں پہنچا دیں.... اور خاتون بی بی سے کہیں معاویہ کے لیے فریش جوس لے آئیں۔" آئے کت نے ہدایات جاری کیں۔
وہ تینوں باتیں کرتے اندر کی طرف چل پڑے۔
کچھ دیر بعد معاویہ فریش ہو کر آیا تو وسامہ اور آئے کت سٹنگ روم میں اس کے منتظر تھے۔
"گھر میں سب کیسے ہیں؟" معاویہ اپنا جوس کا گلاس لے کر ابھی بیٹھا بھی نہیں تھا جب وسامہ نے بے قراری سے پوچھا۔
"سب ٹھیک ہیں۔"
"تم گئے تھے ساہیوال؟"
"ہاں... پچھلے مہینے دو دن کے لیے گیا تھا... زیادہ دن نہیں رک سکا کیونکہ یونیورسٹی میں مڈ ٹرم اسٹارٹ ہو گئے تھے۔" معاویہ نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔
"مجھے ذرا جلدی جلدی اس حادثے کے بارے میں بتاؤ۔ بابا نے مجھے اسی لیے بھیجا ہے کہ میں خود معلومات حاصل کروں۔" وہ ذرا بیزار لگ رہا تھا۔
"لیکن کیس تو بند کر دیا گیا ہے نا؟" آئے کت نے سوالیہ نظروں سے وسامہ کو دیکھا تو معاویہ بولا۔
"بے شک بند کر دیا گیا ہے' لیکن بابا کو کون سمجھائے۔ انہیں لگتا ہے اس حادثے نے ان کی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے اور اب اس کانسٹیبل کی فیملی کو فنانشلی سپورٹ کر کے وہ اس نقصان کی تلافی کرنا چاہتے ہیں... اچھا خاصا میں اپنے دوستوں کی ساتھ آؤٹنگ پلان کر رہا تھا کہ بابا نے یہ نیا آرڈر دے دیا... حالانکہ میں نے سمجھانے کی کوشش بھی کی... مرنے والا مر گیا' اب بار بار ایک ہی بات کو دہرانے کا کیا فائدہ ہے۔" وہ بہت بیزاری سے بول رہا تھا۔
آئے کت کو اس کا انداز بہت ناگوار گزرا۔
"کسی کا مر جانا اتنی معمولی بات نہیں ہوتی معاویہ! کہ تم اسے معمول کی بات سمجھو۔"
"یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے۔" معاویہ نے پھر لاپروائی سے بولا۔ "دنیا میں روزانہ لاکھوں لوگ مر جاتے ہیں۔ ان لاکھوں لوگوں میں ایک وہ کانسٹیبل بھی تھا۔"
آئے کت کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' وسامہ نے بات بدل دی۔
"وہاں سب کیسے ہیں؟ مجھے یاد کرتا ہے کوئی؟" وسامہ نے حسرت سے پوچھا۔
معاویہ اور آئے کت' دونوں نے اس وقت اس کی اداسی کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔
"تم دونوں باتیں کرو... میں ذرا ناشتے کا انتظام دیکھ لوں۔" آئے کت نظریں چرا کر وہاں سے چلی گئی۔ وسامہ کو

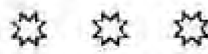
دکھ ہوا۔ آئے کت اس کی زندگی میں شامل ہر حسرت کی وجہ خود کو سمجھتی تھی۔ یہ ـــــ کہیں نہ کہیں درست بھی تھا۔

"ہاں سب یاد کرتے ہیں۔" معاویہ نے کہا تو سامہ کا دھیان آئے کت سے ہٹ گیا۔

"جھوٹ... تم جھوٹ بول رہے ہو نا؟" سامہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ سچ کہہ رہا ہوں۔ سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ ہاں ماموں اپنے منہ سے نہیں کہتے لیکن یاد تو وہ بھی تمہیں کرتے ہیں۔" معاویہ اسے یقین دلانے میں مصروف تھا اور کچن میں کھڑی آئے کت بڑی ناگواری سے خاتون بی بی سے کہہ رہی تھی۔

"یہ معاویہ بہت عجیب انسان ہے جسے انسانی زندگی کی قدر ہی نہیں معلوم' اس سے کسی اچھائی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔" اسے دراصل معاویہ کے رویے سے بڑا دکھ پہنچا تھا۔ خاتون بی بی چپ ہی رہی۔ وہ یوں بھی سیدھی سادی خدمت گزار عورت تھی۔ اسے ایسی باتوں کی سمجھ نہیں تھی۔



"اس سے آگے تو پھر آپ خود سمجھ دار ہیں لیکن۔" کیف نے ایک لے میں بولتے بولتے یک دم... سر اٹھا کر دیکھا۔ عرفات ماموں اس حد تک کتاب پڑھنے میں مگن تھے کہ اسے ایسا لگا کہ انہوں نے اس کی کوئی بات سنی ہی نہیں ہوگی۔

کیف کو سخت مایوسی ہوئی۔

"میں اتنی دیر سے بول رہا ہوں؟ آپ نے میری کوئی بات سنی بھی ہے یا میں نے اپنی انرجی ہی ضائع کی ہے؟" اس نے سخت ناراض انداز میں پوچھا۔

عرفات ماموں نے بے ساختہ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ذرا سا گڑبڑائے کہ دوست جیسے بھانجے کو ناراض کرنے کی غلطی وہ ہرگز نہیں کر سکتے تھے اور پھر بولے۔

"کمال کرتے ہو یار! ایک ایک لفظ سنا ہے تمہارا۔"

"اچھا تو بتائیں... اتنی دیر سے میں کیا بول رہا تھا۔" وہ امتحان لینے پر ہی تل ہو گیا۔

"کلاس روم میں سرپرائز ٹیسٹ لینے سے پہلے بھی پانچ منٹ تیاری کے لیے دیے ہی جاتے ہیں۔" انہوں نے جلدی سے کہا۔

"وہ پانچ منٹ نالائق اسٹوڈنٹس کے لیے ہوتے ہیں اور آپ نالائق ہرگز نہیں ہیں۔" کیف کرسی پر ذرا سا آگے ہوا' ان کے ہاتھ سے کتاب لے کر بند کی اور میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

عرفات ماموں نے گہری سانس بھرتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ "دیکھو... یہ سیدھا سادا ہائی کورٹ کا معاملہ ہے... اور ہائی کورٹ' تم جانتے ہو اس گھر کی ہائی کورٹ کی فاضل جج تمہاری والدہ ماجدہ ہیں لہٰذا میں بھی اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"یوں نہ کہیں ماموں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "کیونکہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں ہائی کورٹ کی فاضل جج کی جان جس پرندے میں ہے وہ آپ ہیں کیونکہ آپ میری والدہ ماجدہ کے چھوٹے لاڈلے بھائی ہیں۔" وہ مسکرا کر معنی خیز انداز میں بولا۔

"یار کیف! کیوں مشکل میں ڈالتے ہو یار!" وہ بے بسی سے بولے۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے' آپا سخت برا مناتی ہیں اگر میں روشن یا اس کی بیٹیوں کے معاملے میں بولوں۔

انہیں لگتا ہے ابھی بھی میرے دل میں روشن کے لیے کوئی نہ کوئی جذبہ باقی ہے۔"
"تو اس میں غلط کیا ہے؟" وہ حیران ہوا۔ "جو محبت وقت کے ساتھ ختم ہو جائے' وہ پھر محبت تو نہ ہوئی۔۔۔"
"خدا نہ کرے کہ محبت کے سفر میں' میں جن حالات سے گزرا ہوں ان سے تمہیں گزرنا پڑے۔" انہوں نے سادگی لیکن صدق دل سے کہا۔ "لیکن اگر کبھی ایسا ہوا تو تم ضرور سمجھ جاؤ گے۔۔۔ جس عمر میں' میں ہوں اس عمر میں محبت کی یاد بھی ملامت بن جاتی ہے۔"
"کیسی عجیب بات کر رہے ہیں ماموں!" وہ چڑ کر بولا۔ "کیا ہوا آپ کی عمر کو؟ وقت سے پہلے بڑھاپا طاری نہ کر لیا ہوتا تو یقین کریں میں خود آپ کا روشن چچی سے نکاح کروا دیتا۔۔۔"
"بکومت۔" وہ ڈپٹ کر بولے۔ "یہ فضول بات اب کہہ دی ہے تو دوبارہ کسی کے سامنے منہ سے مت نکالنا۔۔۔ میں تو پھر بھی جیسے تیسے کسی نئی بحث سے بچ جاؤں گا' روشن کی جان مصیبت میں آجائے گی۔"
"اتنی فکر ہے آپ تو ان کی۔۔۔ پھر بھی کہتے ہیں امی یہ نہ سمجھیں کہ آپ کے دل میں ان کے لیے کوئی فیلنگ ہے؟" وہ جیسے ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔
"کیف!" انہوں نے گھور کر دیکھا۔ "اٹھو' نکل جاؤ میرے کمرے سے۔" وہ سخت ناراض ہو گئے تھے۔
"جسے دیکھو مجھ سے ناراض ہو رہا ہے۔۔۔ پہلے ابو' پھر خوش نصیب اور اب آپ۔" وہ دل برداشتہ سا کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔
عرفات ماموں نے پھر بے بسی سے اسے دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ واقعی اسے ناراض نہیں کر سکتے تھے۔
"اچھا بیٹھ جاؤ' کچھ سوچتے ہیں۔" ذرا نرمی سے کہا۔
"سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ماموں! صرف ایک ہی حل ہے کہ امی کو راضی کیا جائے کہ وہ روشن چچی وغیرہ کو ہمارے پورشن میں شفٹ ہونے دیں۔"
"آپا سے بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے میں خود جاؤں اور کہوں۔۔۔ آبیل مجھے مار۔" وہ بے بسی سے بولے۔
"یعنی میں یہ سمجھوں۔۔۔ آپ امی سے ڈرتے ہیں؟" وہ ناراضی سے بولا۔ اپنی طرف سے بڑا انہیں غیرت دلانے کا ارادہ کیا تھا۔
"بیل سے تو ہر کوئی ڈرتا ہے میرے دوست!" انہوں نے بے ساختہ اور ہنسی دبا کر کہا۔
"کون ہے جو تمہاری امی سے نہیں ڈرتا' تمہارے ابو' میں اور خود تم بھی۔" وہ جتا کر بولے پھر دونوں نے ایک دوسرے کو گھور کر دیکھا اور ہنس دیے۔ تھوڑی دیر دونوں ہی اپنی جھینپ مٹانے کو ہنستے رہے پھر کیف ہی بولا۔
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم کسی بھی طرح روشن چچی والوں کی مدد نہیں کر سکتے۔ میرا خیال تھا امی کے بجائے ابو سے بات کروں لیکن انہوں نے بھی صاف انکار کر دیا۔۔۔ اب امی سے بھی بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ کوئی ایک بھی فرد ذرا لچک دکھا دیتا تو معاملہ سنبھالا جا سکتا تھا لیکن اب۔۔۔" ہنسنے کے باوجود وہ بہت ہی دل گرفتہ نظر آرہا تھا۔
"وہ اس لیے کیونکہ ایسے معاملات کا کبھی بھی گھر کے کسی ایک فرد پر انحصار نہیں ہوتا۔" اب کی بار وہ نرم اور اثر انگیز لہجے میں بولے۔ "نہ تمہاری امی اس حق میں ہیں کہ روشن ان کے پورشن میں شفٹ ہوں نہ تمہارے ابو۔۔ اور وہ دونوں ایسا اس لیے نہیں کر سکتے کیونکہ شفق اور فضیلہ بھابھی ایسا ہونے نہیں دیں گے۔۔۔ یہ تو سیدھا سیدھا ان سے بغاوت والی بات ہو جائے گی۔"
"ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے بزرگ شفق چچا اور فضیلہ چچی سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں۔" وہ بری طرح چڑ گیا۔

"دیکھو ڈرنا کوئی نہیں ہے۔" عرفات ماموں نے فوراً" کہا وہ نہیں چاہتے تھے کہ کیف کے دل میں ماں باپ کے لیے کوئی بدگمانی سر اٹھائے۔

"بس ایک بھرم ہوتا ہے جسے انسان اپنے سے چھوٹوں کے ہاتھوں ٹوٹتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"میں یہ لاجکس سنتے سنتے پک چکا ہوں۔" اس نے بے زاری سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور میں بننے چلا ہوں اینکر پرسن۔۔۔ اپنے گھر والوں کو تو حق بات پر قائل کر نہیں سکتا۔ دنیا کے بخیے خاک ادھیڑوں گا۔" وہ بہت ہی مایوس ہو گیا تھا۔

"اس لیے تم یہ خیال اپنے دل سے ہی نکال دو۔۔۔ تمہاری جگہ اینکر پرسن میں بن جاتی ہوں۔" خوش نصیب کمرے میں داخل ہوئی اور خوب دانت نکال کر کہا۔

"بات تو صحیح ہے۔۔۔" عرفات ماموں پرُسوچ انداز میں بولے۔ "خوش نصیب کسی کو قائل کر سکے گی یا نہیں۔۔۔ چپ ضرور کروا دیا کرے گی۔"

"بالکل صحیح۔۔۔" وہ اپنی ہتھیلی پر ہاتھ مار کر بولی۔ "آج تک جتنے ٹاک شوز میں نے دیکھے ہیں' ان کے اینکر پرسن صرف یہ ہی تو کر رہے ہوتے ہیں۔" کیف مسکرا بھی نہیں سکا۔ اسے بہت برا لگ رہا تھا' یہ سوچ کر کہ ابو کو راضی نہیں کر پایا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔" اس نے عرفات ماموں کو دیکھا۔

"اتنی جلدی؟" وہ حیران ہوئے۔ "چائے تو پیتے جاؤ' خوش نصیب بنائے گی چائے۔"

"ایسی لاجواب چائے بناؤں گی کہ ساری زندگی نہیں پی ہو گی۔" اس کا موڈ کچھ زیادہ ہی خوش گوار ہو رہا تھا۔

"اس کے ہاتھ کی چائے پینے سے اچھا ہے میں زہر ہی پی لوں۔" کیف نے کہا۔

"چلو مرضی ہے تمہاری۔" وہ کندھے اچکا کر بولی۔ "شادی کے بعد جو صیام کے ہاتھ کی چائے پینا پڑے گی' اس سے تو یہ ہی بہتر ہے کہ شادی سے پہلے ہی زہر پی لو۔" وہ ٹھٹھا لگا کر ہنسی۔

"بکو مت۔۔۔" کیف بدک کر بولا۔ وہ اکثر اسے ایسے ہی چڑاتی تھی۔

"میں پھر آؤں گا ماموں!"

"اسلام آباد کب جانا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔۔۔ شاید کل یا پرسوں چلا جاؤں۔" وہ بے زار لگ رہا تھا۔

"ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" خوش نصیب پرُسوچ انداز میں بولی۔ "تم گئے' پھر واپس آ گئے۔۔۔ اب دوبارہ جانے کی بات کر رہے ہو؟ جب واپس ہی آنا تھا تو گئے کیوں تھے؟"

"مجھے لگا تھا کسی کو یہاں میری ضرورت ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔

"تمہیں کیوں لگا تھا؟" وہ جرح کرنے لگی۔

"میرے دل نے کہا تھا۔" وہ زور دے کر بولا۔

"اگلی بار دل کی نہ سننا۔۔۔ ایسے ہی خوار کیے رکھے گا تمہیں۔۔۔" وہ مزے سے کہہ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور کیف اسے دیکھ کر رہ گیا' پھر بولا۔

"میں چلتا ہوں۔"

"میں ابھی آئی۔" عرفات ماموں سے کہہ کر وہ کیف کے پیچھے دوڑی۔

برآمدے میں ستمبر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ پھیلی تھی اور ستون سے لپٹی بیل اداس سی لگتی تھی۔

"سنو کیف۔۔۔"

وہ رک گیا اور پلٹ کر اسے دیکھا۔
"دل میں بدگمانی لے کر مت جاؤ۔۔۔ تم نے ہماری مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب اللہ ہی کو منظور نہیں کہ ہم اس کمرے سے نکلیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ بہرحال تمہارا شکریہ کہ تم نے تو ہمارا احساس کیا۔" وہ سادگی سے بولی اور واپس چلی گئی۔
کیف تھوڑا حیران، تھوڑا بے یقین سا رہ گیا۔ وہ عجیب پہیلی سی لڑکی تھی۔ کبھی اتنی بدگمان کہ شکل تک دیکھنے کی روادار نہ ہوتی اور کبھی اتنی صابر کہ روشن چچی کا ر تو لگتی۔
وہ آہستگی سے ہنسا اور کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔



مرکزی گول کمرے کے بیچ و بیچ چھت سے لگا ہوا فانوس ہولے ہولے لرز رہا تھا اور معاویہ کی آواز سارے فلک بوس میں گونج رہی تھی۔ وسامہ کے ساتھ اس کی باتیں کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ زندگی سے بھرپور آواز جس نے فلک بوس کے سناٹے کو توڑ دیا تھا۔
وسامہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ معاویہ کے آنے سے فلک بوس میں جیسے زندگی بیدار ہو جاتی تھی۔ ان دونوں کی آپس میں دوستی بھی بہت تھی۔ بچپن سے اب تک' معاویہ جب تک اپنی اسکول' کالج' یونی ورسٹی کی ہر بات اس کے گوش گزار نہیں کر دیتا تھا' اسے سکون نہیں آتا تھا۔ وہ ہمیشہ وسامہ کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا تھا۔ آئے کت کا وسامہ کی زندگی میں آجانے کے بعد' اس معمول میں الجھاؤ آگیا تھا اور اس چیز سے معاویہ سخت جھنجلایا بھی تھا۔ جب وسامہ نے آئے کت میں دلچسپی لینا شروع کی' اس وقت معاویہ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا حتی کہ آئے کت سے کورٹ میرج کو بھی صحیح فیصلہ قرار دیا تھا لیکن بعد میں وہ اس سے چڑنے لگا تھا اور آئے کت کے لیے اپنی ناپسندیدگی کو چھپا بھی نہیں پایا تھا۔ سب یہاں تک کہ آئے کت بھی جانتی تھی کہ وہ اسے ناپسند کرتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی بہت افسردہ ہو جاتی تھی اور کبھی ہنس کر ٹال دیتی تھی اور اکثر معاویہ کے سامنے اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ اگر وہ اسے ناپسند کرتا ہے تو آئے کت خود بھی اسے کچھ خاص پسند نہیں کرتی۔ ایسے بگڑے ہوئے لڑکے کو کوئی پسند کر بھی کیسے سکتا ہے۔
معاویہ کو بھی اس بات کی کچھ خاص پروا نہیں تھی' یعنی مل ملا کر وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے ناپسندیدہ اور ناقابل برداشت تھے۔ وسامہ ان دونوں کی اس بات پر ہنستا تھا اور ایک دوسرے کے لیے ناپسندیدگی کو ان کا بچپنا گردانتا تھا۔
بہرحال وہ معاویہ کی آمد سے خوش تھا' لیکن پھر وہ ہوا جس نے ذہنی طور پر وسامہ کے پرخچے اڑا دیے۔ اسے یقین ہو گیا کہ فلک بوس میں ہونے والے عجیب و غریب واقعات آیوشمتی کی موجودگی کا نتیجہ ہیں۔ یہ سب سننے میں عجیب اور کمزور اعتقاد کی نشانی معلوم ہوتا تھا' لیکن اس نے آیوشمتی کی موجودگی کو باقاعدہ محسوس کیا تھا۔ وہ اس کی انگلیوں کے لمس' سانس کی آواز تک کو پہچاننے لگا تھا۔
وہ جانتا تھا' اب نہیں تو کچھ روز بعد سب اسے پاگل قرار دینے لگیں گے' یہاں تک کہ آیوشمتی اپنی موجودگی کا احساس انہیں بھی نہ دلا دے۔ وہ اکثر سوچتا' ممکن ہے یہ سب اس کا وہم ہی ہو۔ وہ بچپن سے ذرا ڈرپوک واقع ہوا تھا۔ اندھیرے سے اسے فطری طور پر خوف آتا تھا' لیکن آیوشمتی کی موجودگی اس کا وہم تھا تو کان پر لگا ہوا زخم کس چیز کی علامت تھا؟ کیا وہ کسی ایسے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو چکا ہے جس میں خود کو جسمانی ایذا پہنچانا انسان کو سکون دیتا ہے؟

ایک بار پھر وہ یہ سب سوچ سوچ کر ہلکان ہونے لگا۔
اسی وقت سنگل صوفے پر سکڑ سمٹ کر سوئی ہوئی آئے کت کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور وسامہ کو دیکھا' پھر اسے جاگتا پا کر جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"اٹھ گئے آپ؟ اب کیسی طبیعت ہے؟" وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور آکر وسامہ کے پاس بیٹھ گئی۔
وسامہ نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور پیار سے اس کے چہرے پر سے بال ہٹائے۔ وہ اس کی محبت تھی۔ اس کے عشق کا جنون۔ اپنے لیے اسے فکرمند دیکھنا وسامہ کو تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔
"میں کیا پوچھ رہی ہوں وسامہ! آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" وسامہ کی خاموشی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں۔"
"تو۔۔ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں؟" وہ الجھی ہوئی تھی' ڈھنگ کا سوال بھی نہ پوچھ سکی۔
وسامہ ہنس دیا۔ "تو کس طرح بیٹھوں؟" یہ اس کا مخصوص انداز تھا۔
آئے کت یک دم مزید الجھ گئی' اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز سی ہو کر وسامہ کو دیکھنے لگی۔
"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"
"آپ کو پتا ہے' میں آپ کی وجہ سے کتنی پریشان ہوں۔"
وسامہ نے شرمندگی سے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن اس کے انداز میں بے بسی تھی۔ آئے کت اسے دیکھتی رہی' پھر وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور اس نے وسامہ کے کندھے سے اپنا سر لگا دیا۔ وسامہ نے ذرا سی گردن جھکا کر اسے دیکھا' پھر جھک کر اس کے سر کو چوما اور اپنی کل کائنات کو اپنے بازو کے حصار میں لے لیا۔
اس کی محبت اس کے ساتھ تھی۔ زندگی سے اس سے بڑھ کر کسی عنایت کی توقع اور کی بھی کیسے جا سکتی تھی۔



خوش نصیب واپس آئی تو عرفات ماموں اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔
"اچھا ہوا تم خود ہی آگئیں۔ میں شیرو کو بھیجنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ تمہیں بلا کر لائے۔"
"اور میں کب سے سوچ رہی تھی کہ آپ کے پاس چکر لگا کر آؤں۔۔۔ بہت دن ہوئے آپ سے بات نہیں ہو سکی اور جو پتا ہوتا کیف بھی یہیں ہے تو بہت پہلے آچکی ہوتی۔" وہ فلور کشن گھسیٹ کر ان کے پاس لائی اور ان کی کرسی سے کچھ دور ہی بیٹھ گئی۔
"خیریت تو ہے۔۔۔ آج کیف پر اتنی مہربانی کیوں؟" انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے چشمے کے اوپر سے اسے دیکھا تو خوش نصیب ہنس دی۔
"آپ کا یہ دوست۔۔۔ خود کو بڑی چیز سمجھتا ہے۔۔۔ لیکن دراصل ہے نہیں۔۔۔" وہ جملے کو توڑ مروڑ کر اسی طرح لفظوں پر زور دے کر بولی تھی۔
"اچھا۔۔۔" وہ اس کے اندازے سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔
"تمہیں ایسا کیوں لگا؟"
"آپ نے دیکھا نہیں۔۔۔ کیسے ایک ذرا سے معاملے میں جذباتی ہوا پھر رہا ہے۔۔۔ آپ دیکھیے گا۔۔۔ ابھی یہ اپنی امی سے بھی جھگڑا کرے گا۔" وہ سو فیصد پُر یقین لہجے میں کہہ رہی تھی' ایسے جیسے کیف کی رگ رگ سے واقف ہو۔

"یہ تو پھر بری بات ہو گی۔"

"بہت بری بات ہو گی۔" وہ بڑے مدبرانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔ "روشن امی کہتی ہیں' اپنے ماں باپ سے جھگڑا کرنے والے سیدھے جہنم میں جاتے ہیں اور کیف کے کھاتے میں تو پہلے ہی کوئی نیکیاں نہیں ہیں۔ اماں ابا کو بھی ناراض کر دے گا تو آخرت بھی ہاتھ سے جائے گی۔"

عرفات ماموں اس کی بات پر بے ساختہ اور زور سے ہنسے کہ خود خوش نصیب کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی' لیکن وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ایسی کیا بات کہہ دی جو ماموں اتنی زور زور سے ہنس رہے ہیں۔ اس کے حساب سے تو آج وہ بڑی اچھی باتیں کر رہی تھی۔ بس دل میں ایک الجھن تھی جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مزار والے زکوٹا بابا جی' شامیر اور اس کی گاڑی' کسی طور دماغ سے نکلتے ہی نہ تھے۔ ماہ نور کو بتانے کا مطلب تھا' سیدھا روشن امی کی عدالت میں پیشی اور اب وہ مزید کسی پیشی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

سو عرفات ماموں کے پاس چلی آئی' لیکن زبان کھولے تو کس طرح؟ اسے خدشہ تھا' دربار پر جانے کی اطلاع ہر ایک کو ناگوار گزرے گی' سوائے فضیلہ چچی اینڈ فیملی کے۔

جب وہ دیر تک ہنس چکے اور آنکھوں کا پانی پونچھنے لگے تو خوش نصیب نے انہیں کن اکھیوں سے دیکھا۔ دل ہی دل میں سوچا اور ہونقوں کی طرح بولی۔

"آپ اتنا کیوں ہنس رہے ہیں؟ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی۔"

"ارے ہرگز نہیں۔" وہ جلدی سے بولے مبادا برا مان جائے۔ "اٹھو ذرا۔۔۔ وہ سامنے میز پر ایک لفافہ پڑا ہے' وہ اٹھا کر مجھے دو۔"

خوش نصیب مستعدی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور لفافہ اٹھا لائی۔

"مجھے مت دو۔۔۔ یہ تمہارے لیے ہے۔"

"لیکن اس میں ہے کیا؟" خوش نصیب نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"میری خواہش ہے کہ تم یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لو اور اپنے خواب پورے کرو۔۔۔ لیکن میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔ یونی ورسٹی کے اخراجات تمہاری اماں تمہیں مجھ سے لینے نہیں دیں گی۔ اس لیے پرائیویٹ ایڈمیشن فارم منگوا دیا ہے۔۔۔ کم سے کم پرائیویٹ امتحان کی فیس تو تم مجھ سے لے سکتی ہو نا۔" انہوں نے سادہ سے لہجے میں کہا تھا' لیکن خوش نصیب ششدر سی رہ گئی۔ فوری طور پر اسے یقین ہی نہیں آیا کہ جو وہ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔

"میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے خوشی کے مارے۔

عرفات ایک بار پھر ہنس دیے اور اس کے سر پر چپت لگا کر بولے۔

"آئندہ اپنی آنکھوں میں آنسو نہ آنے دینا۔۔۔ اس سے بڑا شکریہ اور کوئی نہیں ہو گا میرے لیے۔"



"میں نے سارے فلک بوس کا جائزہ لیا ہے۔ تمام ملازمین سے بھی انکوائری کی ہے۔ مجھے یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ملی' جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ یہاں کوئی آسیب وسیب بھی رہائش پذیر ہے۔" ناشتے کی میز پر معاویہ نے ان دونوں کو اطلاع دی۔

وسامہ کا دل فوراً" ہی ناشتے سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ ہاتھ روک کر بے بسی سے معاویہ کو دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے' تم دونوں میرے ساتھ چلو۔۔۔ اسلام آباد میں ہم کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے۔۔۔"

"مجھے پتا تھا تم یہ ہی کہو گے۔" وسامہ نے ہیجانی انداز میں اس کی بات کاٹی۔ "لیکن مجھے کسی سائیکاٹرسٹ کی

ضرورت نہیں ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں' میں نے آیوشمتی کی موجودگی کو محسوس کیا ہے۔ وہ یہیں ہے ہمارے آس پاس۔۔۔ اسی جگہ۔۔۔"

"وسامہ! میری بات سنو۔۔۔" معاویہ نے نرمی سے کہنا چاہا' لیکن وسامہ کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ وہ جیسے ایک دم ہر چیز سے بے زار ہو گیا تھا۔

"تمہیں یاد ہے۔۔۔ ایک بار بچپن میں بھی تمہیں وہم ہو گیا تھا کہ کوئی تمہارے آس پاس رہتا ہے۔۔۔ تم ایک عجیب سا نام لیتے تھے' اس مخلوق کا کہ یہ میرا دوست ہے اور مجھ سے ملنے آتا ہے؟" معاویہ نے رسان سے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔ "شروع شروع میں ماموں جان' ممانی جان اور ہم سب اس بات پر ہنستے تھے کہ تم نے ایک فرضی دوست بنا رکھا ہے' لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہاری اس ان دیکھے دوست سے متعلق باتیں بڑھتی چلی گئیں تو سب کو پریشانی ہونے لگی تھی۔۔۔ ماموں تمہیں اس وقت بھی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر گئے تھے۔" معاویہ بولتا چلا جا رہا تھا اور آئے کت کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

"وہ بچپن تھا معاویہ!" وسامہ نے جھنجلا کر کہا۔ "بچپن میں ہر دوسرے بچے کے ایسے خیالی دوست ہوتے ہیں۔ تم بھول رہے ہو نہ' میں بچہ ہوں' نہ وہ بدروح میرے دوست کا کردار نبھا رہی ہے۔ وہ میرے پیچھے لگی ہوئی ہے' وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔"

معاویہ نے جیسے لاجواب ہوتے ہوئے وسامہ کو دیکھا' پھر بولا۔ "تمہیں یہ کیوں لگتا ہے وہ نقصان ہی پہنچائے گی؟ اگر واقعی اس کا کوئی وجود ہے تو کیا پتا' وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہو۔" معاویہ نے تصویر کا ایک نیا رخ اسے دکھایا۔ آئے کت کو غصہ آیا' بجائے یہ کہ وسامہ کو اس سارے عذاب سے نکالا جاتا معاویہ اسے نئی راہ پر ڈال رہا تھا۔

وسامہ بھی حیران ہو کر معاویہ کو دیکھ رہا تھا اس نے اس نہج پر نہیں سوچا تھا۔

"میں جن بھوت، روح بدروح، آسیب وغیرہ جیسی باتوں کو نہیں مانتا... لیکن تمہارا اعتقاد ہے، شاید اسی لیے وہ روح تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے... ہو سکتا ہے، وہ تم تک کوئی پیغام پہنچانا چاہتی ہو۔ میری بات مانو وسامہ! اگر اگلی بار تمہیں اس روح کی موجودگی محسوس ہو تو ڈرنے کی بجائے اس سے بات کرنے کی کوشش کرنا... مجھے یقین ہے، کوئی نہ کوئی پوزیٹو بات ضرور سامنے آئے گی۔" معاویہ نے بے حد سنجیدگی سے باری باری ان دونوں کو دیکھا تھا۔ "اور اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو میرے ساتھ سائیکاٹرسٹ کے پاس چلو... مجھے یقین ہے، جس پریشانی سے تم خود نہیں نکل پا رہے، ایک بہترین سائیکاٹرسٹ کے ساتھ تین چار سیشنز تمہیں ضرور نکال دیں گے۔" وسامہ خاموشی سے سر جھکائے اپنی پلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آئے کت بے زار بیٹھی تھی۔ معاوٗسامہ نے سر اٹھا کر معاویہ کی طرف دیکھا۔

"معاویہ!"

"ہوں؟" وہ رغبت سے چھری کانٹے کی مدد سے فرنچ آملیٹ کھا رہا تھا۔

"اگر مجھے کچھ ہو گیا تو آئے کت کا خیال رکھنا۔" اس نے کہا۔ اپنی وہیل چیئر کے وہیلز گھمائے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ دونوں ششدر رہ گئے تھے، وسامہ کے کمرے سے نکل جانے کے کچھ دیر بعد تک بھی جیسے "صم بکم" بیٹھے رہے، پھر آئے کت نے ہاتھ میں پکڑا کانٹا پلیٹ میں پٹخ دیا۔

"مجھے لگا تھا تمہارے آنے سے وسامہ کی ذہنی حالت میں کچھ بہتری آئے گی، لیکن تم نے اسے نیا راستہ دکھا دیا ہے۔" وہ سخت ناراض ہو گئی تھی۔

"دیکھو... مجھے تو اس مسئلے سے نمٹنے کا یہی راستہ سمجھ میں آیا ہے... یا اسے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے چلو یا اسے اپنا علاج خود کرنے دو..." معاویہ نے ابھی بھی رسان سے کہا تھا۔

"لیکن یہ کیسے ہو گا؟ پہلے وہ آیو شمتی کی موجودگی سے سے خائف تھا، اب اس پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا کہ اس منحوس روح سے بات کیسے کی جائے۔"

"تم وسامہ کے لیے پریشان مت ہو۔" معاویہ نے کہا۔ "وسامہ جب تمہارے جیسی چڑیل کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کا فیصلہ کر سکتا ہے تو اس بدروح سے بات بھی کر لے گا... مجھے یقین ہے اسے زیادہ وقت نہیں ہو گی۔" اس نے سنجیدگی اور بے ساختگی سے کہا۔ آئے کت کو اس کی بات سمجھنے میں چند سیکنڈ لگے اور پھر اس نے ناراضی سے کانٹا اٹھا کر معاویہ کو کھینچ مارا۔

معاویہ نے اس کانٹے کو ہنستے ہوئے کیچ کر لیا تھا۔

"وسامہ کی حالت بلاشبہ پریشان کن ہے، لیکن یہ وقتی فیز ہے... گزر جائے گا... اگرچہ مجھے اپنے بھائی کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے، لیکن تم اتنی پریشان ہو اس لیے بتا رہا ہوں... وسامہ کو بچپن سے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کا شوق رہا ہے اور اپنا یہ شوق پورا کرنے کے لیے وہ اکثر من گھڑت کہانیاں سنایا کرتا تھا... آج میری ماموں سے بات ہوئی تھی انہوں نے ہی مجھے یہ بات یاد دلائی ہے۔" آئے کت کے لیے یہ ایک اور دھچکا تھا۔ وہ سمجھتی تھی وسامہ اس کے لیے کھلی کتاب کی طرح ہے، لیکن اب آکر اسے احساس ہو رہا تھا، اس کھلی کتاب کے کئی باب پڑھنا ابھی باقی تھے۔

"اور کان کے اس زخم کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"تمہیں یاد نہیں... تم نے خود کہا تھا، وہ کسی کیڑے کے کاٹنے کا زخم تھا۔" معاویہ نے اسے یاد دلایا۔

"معاویہ!" آئے کٹ نے یک دم جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں نے صرف وسامہ کی پریشانی دور کرنے کے لیے ایسا کہا تھا۔ وہ زخم واقعی کسی تیز دھار چیز کے کاٹنے سے بنا تھا۔" اب معاویہ کو دھچکا لگا۔ وہ یک دم پریشان ہوا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وسامہ نے اپنے آپ کو خود ہی زخم پہنچایا ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! اس وقت کمرے میں وسامہ اکیلا تھا۔ بعض نفسیاتی مریض ایسا کرتے ہیں' وہ خود کو ایذا پہنچاتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے انہیں سکون ملتا ہے۔"

"کیا تم نے وسامہ کے مزاج میں کچھ اور بھی تبدیلیاں نوٹ کی ہیں؟"

"میں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔۔ میں خود الجھی ہوئی ہوں۔"

"میں اسلام آباد جا رہا ہوں' وہاں کسی سائیکاٹرسٹ سے وسامہ کا کیس ڈسکس کروں گا۔ تب تک تمہیں وسامہ کا خیال رکھنا ہے۔ سائے کی طرح اس کا خیال رکھنا ہو گا' تاکہ وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔"

"میں پوری کوشش کروں گی۔" وہ دونوں ہی خاموش ہو گئے اور راہ داری میں' دروازے کے پیچھے رکا ہوا وسامہ سوچ رہا تھا' اس کے اتنے قریبی لوگ اسے پاگل کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا۔



منفرا پارک کا تیسرا چکر لگا کر اپنے مخصوص بینچ پر آکر بیٹھی تو اس کا تنفس تیز ہو رہا تھا۔ بینچ پر بیٹھ کر اس نے اپنا پسینہ پونچھا اور کمر کے گرد بندھی بیلٹ کے ساتھ جڑی بوتل کو کھول کر اس سے پانی کے چند گھونٹ اپنے حلق میں اتارے۔ ساتھ ساتھ وہ پارک میں یہاں وہاں بھی نظریں دوڑا رہی تھی اور ذہن میں ان سب چیزوں کو ترتیب دے رہی تھی جو اسے اپنے ساتھ مونٹوک لے جانی تھیں۔

سینٹ فرانس میں سمسٹر ختم ہونے کے بعد سات دن کی چھٹی کا اعلان کیا گیا تھا اور منفرا یہ چھٹیاں مونٹوک میں اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ نی بی اس کے اس ارادے سے کچھ خاص خوش دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ ہاسٹل میں رہ کر ان چھٹیوں کو پُرلطف بنانا چاہتی تھی اور اس کے لیے اس نے پہلے سے پورا پلان تیار کر لیا تھا' یہ پلان گھومنے پھرنے' شاپنگ کرنے اور موویز دیکھنے پر مشتمل تھا' لیکن منفرا نے مونٹوک جانے کا ارادہ کر کے اس کا سارا پلان خراب کر دیا تھا۔

"میں ضرور رک جاتی' لیکن اس بار میں مام کو منع کرنا نہیں چاہتی۔ پہلے ہی کئی ہفتوں سے میں انہیں ٹال رہی ہوں۔" منفرا نے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ نی بی تھوڑی سی ناراضی دکھا کر مان گئی' ویسے بھی وہ منفرا کی اتنی اچھی دوست تھی کہ ایک دوسرے کو راضی رکھنے کے لیے ان دونوں کو ایک دوسرے کو لمبی چوڑی وضاحتیں نہیں دینا پڑتی تھیں۔

بہرحال منفرا ان چیزوں کے بارے میں سوچ رہی تھی' جو اسے ساتھ لے جانی تھیں۔ یوں بھی اگلے ہفتے میں مام اور بابا کی شادی کی سالگرہ تھی اور منفرا اس تقریب کو یادگار بنانے کی تیاری بروکلن سے کر کے جانا چاہتی تھی۔ اپنی پارٹ ٹائم جاب سے اس نے اتنے پیسے جمع کر لیے تھے کہ لانگ آئس لینڈ پر سمندر کے کنارے ایک چھوٹی سی سرپرائز پارٹی کا اہتمام کر سکتی تھی۔ مام کے لیے اس نے ایک خوب صورت پتھر کا نیکلس خریدا تھا۔ وہ کوئی قیمتی پتھر نہیں تھا' لیکن دیدہ زیب تھا۔ بابا کے لیے اس نے گرم اونی ٹوپی لی تھی اور ایڈم' اس کا چھوٹا بھائی' اسے وہ مونٹوک سے ہی شاپنگ کروانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ مونٹوک جانے کے لیے اس نے جتنے پیسے جمع کیے تھے' وہ کافی تھے۔ واپسی پر اسے وقت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی' کیونکہ بہار کا موسم شروع ہونے والا تھا اور بہار مونٹوک میں

سیاحوں کا موسم مانا جاتا تھا۔ واپسی کے لیے وہ موننوک آئے ہوئے سیاحوں کے ساتھ بطور گائیڈ کچھ وقت گزار کر بھی پیسے جمع کر سکتی تھی اور ظاہر ہے' کچھ نہ کچھ روپے اسے بابا بھی دے ہی دیتے۔

یہ سب سوچتے ہوئے اسے سامنے والے ٹریک پر معاویہ پر نظر آیا۔ منفرا بے ساختہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔ کم سے کم آج تو معاویہ کو اس سے خوش اخلاقی سے ملنا چاہیے۔ منفرا نے سوچا اور اس کی سوچ منہ کے بل زمین پر آگری' جب معاویہ ایسے ہی اجنبی انداز میں جاگنگ کرتا ہوا اس کے سامنے سے گزر گیا۔

منفرا کا دل چاہا' کوئی چیز اٹھا کر اسے کھینچ مارے۔ پتا نہیں وہ معاویہ نامی اس عفریت سے اتنی زیادہ امیدیں کیوں وابستہ کر بیٹھی تھی۔ وہ بندہ نہ اسے دیکھتا تھا' نہ وہ اسے دیکھنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ ڈاکٹر ریمسن کے آفس میں بھی وہ بس ایسے ہی مسکرا کر اس سے ملا تھا' جیسے کسی کے متعارف کروانے پر انسان ہنس کر دیکھ لیتا ہے۔ ہر بار جب بھی منفرا نے یہ سوچا تھا کہ وہ اپنائیت بھری نظروں سے اسے دیکھے گا یا اس کی آنکھوں میں کہیں منفرا کو اپنے لیے پہچان کے رنگ ہی نظر آجائیں گے' اسے مایوسی کا ہی سامنا کرنا پڑا تھا۔

اس بار بھی ایسا ہی ہوا تو وہ بے زار ہو کر اٹھی۔ اٹھتے ہوئے اس نے دیکھا' معاویہ وہاں سے بہت دور پارک میں ایک مستقل آنے والی خاتون ایلسی سے بات کر رہا تھا اور بڑا ہنس ہنس کر بات کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں منفرا کو اپنے نظر انداز کیے جانے سے بھی زیادہ بری بات لگی یہ۔

اس نے سر جھٹکا' اپنا ورزش کے ساز و سامان والا بیگ اٹھایا اور پارک کے بیرونی گیٹ کی طرف آگئی۔ اس دوران وہ حتی المقدور کوشش کرتی رہی کہ معاویہ کو اپنے ذہن سے جھٹک دے اور اپنا نظر انداز کیا جانا اپنی بے عزتی تصور نہ کرے' مگر اس کے لیے یہ آسان نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ شخص اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔

دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے پارکنگ میں اس نے ایک گاڑی کے بیک ویو مرر میں ذرا چپکے سے اپنا

چہرہ دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ اچھی خوش شکل لڑکی ہے' بقول فی بی وہ خوب صورت چہروں میں شمار کی جا سکتی تھی اور جب وہ بات کرتی تھی تو اس کی شخصیت اور زیادہ سحر انگیز لگنے لگتی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ معاویہ اسے مستقل نظر انداز کر رہا تھا۔

"شاید فی بی کا تجزیہ درست ہے۔ وہ مغرور اور انا پرست معلوم ہوتا ہے۔ اگر کبھی وہ میرے سامنے آیا تو میں بھی اسے ایسے ہی نظر انداز کروں گی' جیسے وہ مجھے کرتا ہے۔" اپنی سائیکل اسٹینڈ سے نکالتے ہوئے اس نے پکا تہیہ کر لیا تھا' لیکن جوں ہی وہ سائیکل لے کر مڑی اس کا اپنے آپ سے کیا ہوا عہد منہ کے بل زمین پر جا گرا' کیونکہ اس کے بالکل پیچھے معاویہ کھڑا تھا اور منفرا کو دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

منفرا ایسا چونکی کہ اس کے ہاتھوں سے سائیکل لڑکھڑا گئی۔ اگر سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر معاویہ اسے نہ روکتا تو یقیناً" سائیکل اس سے ٹکرا جاتی۔

"ہائے ڈاکٹر!" وہ مسکرایا اور ایسا پیارا مسکرایا کہ بہت ہی پیارا لگا۔

"ہیلو....." منفرا نے دل ہی دل میں اپنی گڑبڑاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیسی ہیں آپ ڈاکٹر....! خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔ میں اکثر یہاں آتا ہوں۔"

منفرا کو اب پھر مایوسی ہوئی کہ معاویہ نے اس کا پہلے کبھی نوٹس نہیں لیا۔

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔" وہ تکلفاً" مسکرا کر بولی۔

"اوہ' آئی ایم سو سوری....." وہ ایک دم شرمندہ ہو کر بولا۔

"اس روز ڈاکٹر ریمسن کے آفس میں ملاقات ہوئی تھی تو میرے ذہن میں رہ گیا کہ آپ بھی ڈاکٹر ہیں۔ ہر روز ہم اتنے لوگوں سے ملتے ہیں کہ یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس پروفیشن سے تعلق رکھتا ہے۔" اس نے شرمندہ شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

منفرا کا دل اور تڑخا۔ تھوڑا تو وہ باقی ملنے ملانے والوں سے اسے اوپر کا درجہ دے سکتا تھا۔ پھر اس نے اپنے دل کو ایک تھپڑ لگایا اور ذرا تمیز اختیار کرنے کی تاکید کرتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں... ایسی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔" (اب میں تمہیں کیا بتاؤں، پہلی بار دیکھنے پر تم مجھے کیا لگے تھے۔) وہ مسکرائی اور اس نے دل میں سوچا۔

"بائے دا وے... آپ کا Prescription (نسخہ) میرے پاس ہے... اس روز ڈاکٹر ریمسن کی سائیکاٹری سے نکلتے ہوئے مجھے لفٹ کے فرش پر پڑا ملا تھا۔"

"کیا واقعی؟" وہ بیک وقت اتنا زیادہ بے یقین اور خوش ہوا کہ کسی ایک تاثر کو سمجھنا مشکل ہو گیا۔

"شکر ہے خدا کا کہ پریسکرپشن مل گیا۔ میں اسی غلط فہمی میں آپ کے پاس آیا تھا کہ ممکن ہو تو مجھے دوائیاں لکھ دیں..."

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ میڈیسن کھا سکتے ہیں۔ یہ آپ کے مسلز کو پرسکون کرے گی اور بہتر نیند آنے میں مدد دے گی۔"

معاویہ نے جھجکتے ہوئے گولیاں اس سے لے لیں اور اسی انداز میں بولا۔ "لیکن... ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر میں انہیں کیسے استعمال کر سکتا ہوں؟"

"میں نے اسی لیے پہلے کہا... اگر آپ مناسب سمجھیں تو..." وہ مسکرائی۔ "ویسے ڈاکٹر ریمسن نے مجھ سے آپ کی کیس ہسٹری ڈسکس کی تھی اور میں نے آپ کا Prescription بھی پڑھا تھا۔ میں لکھ کر نہیں دے سکتی، لیکن دوائیاں Suggest تو کر سکتی ہوں۔"

معاویہ نے ذرا مطمئن ہو کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور وہ پریسکرپشن؟"

"آپ کسی بھی وقت آ جائیں۔" اس نے ہاسٹل کا پتا بتاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا، آپ کل صبح وہ نسخہ یہیں پارک میں لے آئیں؟ میں آپ سے لے لوں گا۔"

"اوہ، ضرور... کیوں نہیں۔"

"تھینکس... کیا میں آپ کو کہیں ڈراپ کر دوں؟"

"نہیں شکریہ... میں چلی جاؤں گی۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کو گڈ بائے کہہ کر اپنے اپنے راستے چل دیے تھے۔ لیکن منفرا اب مسکرا رہی تھی اور خود کو ایک ایسے بے وقوف کی طرح لگ رہی تھی جو اپنے مفروضوں کی بنیاد پر افسردہ اور خوش ہوتا رہتا ہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

امۃ العزیز شہزاد



میں۔ جب پہلی بار اس سے ملی تھی تو وہ مجھے پہلی ملاقات ہی میں بہت اچھا' بہت نیک اطوار اور بحیثیت انسان ایک مخلص شخص دکھائی دیا تھا۔

صاف' شفاف نتھری ہوئی آنکھیں اس کے اجلے باطن کو ظاہر کررہی تھیں۔ جہاں اس کے لبوں پر ہمہ وقت کھیلتی مسکراہٹ اس کی خوش مزاجی کا پتا دیتی تھی وہیں اس کے سانولے' مگر جاذب نظر نقوش والے چہرے پر چھایا نرم سا تاثر اس کی ہمدرد طبیعت کا عکاس تھا۔

میں آفس سے چھٹی کے بعد گھر جانے کے لیے اپنی کار میں بیٹھی' مگر کار نے اسٹارٹ ہوکر نہ دیا گوکہ میرے لیے بڑھتا ہوا اندھیرا یا تیزی سے خالی ہوتی پارکنگ کچھ ایسا مسئلہ نہیں تھا' مگر پھر بھی مجھے اس خیال ہی سے پریشانی ہونے لگی تھی کہ اب یا تو فون کرکے مکینک کو بلوایا جائے' یا ٹیکسی لے کر گاڑی یہیں لاک کرکے گھر جایا جائے۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں مبتلا کھڑی ہی تھی کہ مجھے اپنے قریب نرم سی آواز سنائی دی۔ ''کیا ہوا میم؟'' میں چونک کر بے ساختہ مڑی۔

یہ فیضان تھا۔ فیضان الحق!

یہ کچھ عرصہ قبل ہی ہماری فرم میں جونیئر اکاؤنٹنٹ کی پوسٹ پر تعینات ہوا تھا۔

''کیا کوئی مسئلہ ہوگیا؟ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟'' وہ میرے نزدیک آتا ہوا تشویش سے پوچھنے لگا۔

''نہیں بس وہ میری کار اسٹارٹ نہیں ہورہی۔'' میں نے نپے تلے لہجے میں بتایا۔ اپنے سے بہت جونیئر کے سامنے میں اس طرح اپنی پریشانی کا اظہار کرتی اچھی لگتی کیا۔۔۔

''اوہ یہ تو مسئلہ ہوگیا۔۔۔'' وہ مجھ سے زیادہ پریشان دکھائی دینے لگا۔ ''یہاں تو قریب میں کوئی مکینک بھی نہیں ملے گا اور اب تو رات ہونے والی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کو اپنی بائیک پر گھر ڈراپ کردوں یا ایسا کرتا ہوں' آپ کو ٹیکسی کروا دیتا ہوں۔''

''ارے نہیں۔۔۔ تم فکر مت کرو۔'' میں اس کے خلوص پر شرمندہ سی ہوگئی۔ ''گاڑی میں نے لاک کردی ہے' یہاں سے ٹیکسی لے کر گھر چلی جاؤں گی۔''

''ارے ایسے کیسے۔۔۔ میں کروا دیتا ہوں نا آپ کو ٹیکسی۔'' پھر اس نے میرے نہ نہ کرنے کے باوجود نہ صرف مجھے ٹیکسی کرکے دی بلکہ احتیاطاً ٹیکسی کا نمبر بھی نوٹ کرلیا۔ مجھے ہنسی آنے لگی۔ لو بھلا بتاؤ میں کوئی نوعمر ڈری سہمی دوشیزہ تھی کیا۔۔۔

دوسرے دن میں آفس میں تھی تب ہی اس نے بتایا کہ اس نے مکینک کا انتظام کردیا ہے۔۔۔ میں اس کی ممنون ہونے لگی تو وہ بولا۔

''اس میں شکریہ کی کیا بات ہے آپا! آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔'' یہ کہہ کر گویا اس نے بات ہی ختم کردی۔

اس واقعے سے چند روز بعد کی بات ہے۔ سینئر اکاؤنٹنٹ رضوان واسطی صاحب بوجوہ آج کل کچھ زیادہ ہی چھٹیاں کررہے تھے۔ پھر عمر کے تقاضے کی وجہ سے ان سے کام میں اب غلطیاں بھی زیادہ ہونے لگی



تھیں۔

بہرکیف..... انہیں اس ماہ تنخواہ کی مد میں نہایت قلیل رقم ادا کی گئی۔ اب ظاہر ہے' تنخواہ کا اتنا بڑا حصہ کٹ جانے کا دکھ ایک تنخواہ دار ملازم ہی پوری طرح محسوس کرسکتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

لنچ ٹائم میں میری نظر رضوان صاحب کے ساتھ متفکر سے کھڑے فیضان پر پڑی۔ رضوان صاحب ہاتھ ہلا ہلا کر غصے مگر ہلکی آواز میں نجانے کیا کہہ رہے تھے۔ (یقیناً" کمپنی کے لیے اپنی خدمات اور کمپنی کے خون نچوڑ لینے والے اصول و قواعد کے خلاف ناراضی کا اظہار کررہے ہوں گے) فیضان کا سر مسلسل اثبات میں ہل رہا تھا بلکہ اس کے روشن چہرے پر لحہ بہ لحہ پریشانی بھی بڑھتی چلی جارہی تھی۔.... میں ان کے نزدیک سے گزرتی ہوئی اپنے آفس میں چلی آئی اور اسی دن چھٹی کے بعد میں نے دیکھا کہ فیضان بصد اصرار ضوان صاحب کو کچھ روپے تھمارہا تھا۔

عجیب تھا یہ شخص!

خود اسے کون سی لاکھوں روپے تنخواہ مل رہی تھی' مگر وہ کوئی شاعر جو کہہ گیا ہے ناکہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے تو شاید اس نے یہ شعر فیضان جیسے لوگوں ہی کے لیے کہا ہوگا۔

میں اب فیضان سے بہ طور خاص سلام دعا کرتی تھی۔ بے شک وہ ایک اچھا انسان تھا۔ آفس میں بھی سب کے کام آتا۔ سب سے اچھے طریقے سے پیش آتا۔ تقریباً" آفس میں سب ہی سے اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔

☆ ☆ ☆

مغیث اپنے سمسٹر بریک میں پاکستان آیا ہوا تھا۔ سو میں نے آفس سے کچھ دن کی چھٹیاں لے لیں کہ میں یہ چند دن صرف اپنے بیٹے کے ساتھ گھومنے پھرنے' اس کی اچھی اچھی باتیں سننے' اس کے لیے کوکنگ کرتے ہوئے گزارنا چاہتی تھی۔

یہ چند دن پر لگا کر کیسے اڑے کچھ پتا ہی نہ چلا....

اس کے جانے پر میں بے حد اداس تھی سو اسی لیے اس کی روانگی کے اگلے روز ہی سے میں نے آفس جوائن کرلیا۔ آفس میں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی لوگ.... وہی روٹین.... ہاں' مگر فارہ حسن نیا اضافہ تھی۔

دبلی پتلی' کم عمر' کچھ کنفیوز' سہمی سہمی سی....

کوئی مخاطب کرلیتا تو یوں چونک اٹھتی گویا کسی نے کان کے قریب بم دھماکا کردیا ہو۔ باس کے سامنے اوٹ پٹانگ حرکتیں اس سے سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ (حسینہ معین کی ہیروئن کی طرح) مگر وہ حسینہ معین کی ہیروئن جیسی خوش قسمت نہ تھی۔ اس لیے اچھی خاصی ڈانٹ کھانے کے بعد اس روز بھی وہ اپنے کیبن میں بیٹھی رو رہی تھی.... جب فیضان اس کے پاس جاکر نرمی سے پانی کا گلاس اسے تھما آیا پھر کچھ دیر بعد جاکر رونے کی وجہ تسمیہ دریافت کی۔

"باس نے ٹائپ کرنے کے لیے کچھ پیپرز دیے تھے۔ میں نے بہت سے الفاظ کی اسپیلنگ غلط لکھی ہیں۔" وہ صفحہ اس کی جانب بڑھاتی ہوئی بولی۔

"بس اتنی سی بات...." وہ صفحہ تھام کر مسکراتا ہوا اپنے کیبن تک گیا۔ منٹوں میں غلطیوں سے مبرا صفحہ حاضر تھا۔

فارہ کو حلیہ درست کرکے باس کے پاس جاکر کاغذات دینے کی ہدایت کرتا ہوا وہ اطمینان سے واپس اپنے کیبن میں جا بیٹھا۔ اب کی بار جب فارہ باس کے روم سے لوٹی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"آئندہ بھی اگر کوئی مسئلہ ہو تو تم بلا جھجک مجھے تکلیف دے سکتی ہو۔" فیضان بھی مسکرا کر بولا۔

پھر اس کے بعد تو واقعی جیسے فارہ نے اس پر مکمل تکیہ ہی کرلیا۔ وہ دونوں ہر جگہ.... ہر وقت ساتھ ساتھ دکھائی دینے لگے۔

یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ آفس میں سوائے اس کے کوئی دوسری لڑکی نہیں تھی۔ ایسی صورت حال میں وہی ہوا جو ہوسکتا تھا۔ فیضان کے لیے تو نہیں' مگر فارہ کے لیے آفس بھر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

"ارے صاحب... جب ذرا سا مسکرا دینے سے سارے کام بن سکتے ہوں تو کوئی کیوں نہ مسکرا مسکرا کر کام نکلوائے... مجھے تو لگتا ہے یہ لڑکی اپنے گھر کے کام بھی اب فیضی سے کروانے لگی ہوگی۔" یہ ایڈمن کے فاروقی صاحب تھے۔ مجھے یہ سب سن کر بے حد رنج بھی ہوا اور فطری طور پر غصہ بھی آیا۔ اسی لیے میں نے فیضان اور فارہ' دونوں کو اپنے آفس میں بلا کر ان کو سرزنش کرنے کی ٹھانی۔ ساری بات سن کر فیضان سنجیدگی سے بولا۔

"فارہ کے والد ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں اپاہج ہوچکے ہیں۔ اس کی چار چھوٹی بہنیں ہیں جو بالترتیب نویں' دسویں' گیارہویں' بارہویں کی اسٹوڈنٹس ہیں۔ امی اس کی گھریلو خاتون ہیں۔ چھوٹا بھائی ہے جو ابھی صرف پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ ایسے میں اس نے اپنے گھر کو سپورٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا... یہاں جاب اسٹارٹ کی... بے چاری کو دفتری ماحول اور رویوں کا کچھ اندازہ نہیں' میں بس اسی لیے اس کی ہیلپ کردیتا ہوں اور بس۔"

وہ جو اس دوران سر جھکائے بیٹھی تھی' ہکلاتے ہوئے بولی۔ "میں آئندہ خیال رکھوں گی۔"

"بہت اچھی بات ہے فارہ... کیوں کہ ہم چاہے برف کی مانند شفاف ہی کیوں نہ ہوں۔ دنیا کی الزام تراشی سے نہیں بچ سکتے۔ پھر تم پر تو دہری ذمے داری ہے۔ تم بڑی بہن ہو' تمہیں تو اپنی چھوٹی بہنوں کے لیے رول ماڈل بھی بننا چاہیے۔"

بہرحال یہ نشست برخاست ہوئی۔

میرے سمجھانے کا یہ اثر ہوا کہ کچھ دن تو وہ دونوں دور دور رہے' مگر اس کے بعد پھر ان کی وہی مصروفیات شروع ہوگئیں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اب فارہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اب اس کی شخصیت سنور گئی تھی۔ اس میں اعتماد آگیا تھا۔ اب نہ وہ جھجکتی تھی' نہ ڈری سہمی رہتی اور نہ ہی اب وہ کسی کی پروا کرتی تھی۔ خیر وہ جو بھی کرتے مجھے کیا' مگر مجھے تھوڑا سا افسوس ضرور ہوا تھا کہ فیضی نے بھی میری بات نہیں مانی۔



میں ایک روز اپنے آفس میں کام میں مصروف تھی کہ فیضی چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہرے رنگ کا ایک کارڈ تھا۔

"میری چھوٹی بہن کی شادی ہے میم اور آپ کو ضرور آنا ہے۔" وہ کارڈ میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"تمہارے گھر میں کون کون ہوتا ہے؟" میں نے رسماً" پوچھا۔

"سب ہیں الحمدللہ امی' ابو' بڑے بھائی' چھوٹی دو بہنیں..." اس نے بتایا۔ گھر والوں کے متعلق بتاتے ہوئے اس کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

"دیکھو بھئی کوشش تو میری پوری ہوگی۔" میں نے کہا۔

"کوشش نہیں آپ کو ضرور آنا ہے۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اور آفس سے کون کون انوائیٹڈ ہے۔" میں نے یوں ہی پوچھا۔

"صرف آپ اور فارہ... فارہ اس لیے کہ میں اسے اپنے گھر والوں سے ملوانا چاہتا ہوں۔" وہ بشاشت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"ارے!" مجھے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ "اچھا تو معاملہ بالآخر یہاں تک پہنچ گیا۔ چلو بہت اچھی بات ہے۔"

"جی آپا بہت اچھی لڑکی ہے وہ... نرم خو' ملنسار' خوش مزاج پھر ہماری انڈر اسٹینڈنگ بھی ہوگئی ہے تو بس اسی لیے۔" اس نے بتایا۔

"دیکھ لو بھئی' اپنے فیصلے پر قائم رہنا' اب لڑکی کو یونہی گھما پھرا کر چھوڑ مت دینا۔ آخر اس کی عزت کا سوال ہے۔" میں نے نصیحت ضروری سمجھی۔

وہ بیٹھا اثبات میں سرہلانے لگا۔



آفاق بہت عرصے سے اپنا تبادلہ ہیڈ آفس میں کروانا چاہتے تھے۔ ان کا تبادلہ اسلام آباد ہوگیا۔ میں بھی ان کے ساتھ آگئی۔ آفس ظاہر ہے مجھے چھوڑنا پڑا۔ آفس چھوڑنے کا خاص افسوس یوں نہ ہوا کہ اسلام آباد میں میرے کافی رشتے دار تھے جن کے ساتھ اچھا وقت گزرتا۔ پھر کچھ عرصے ہی کی تو بات تھی۔ آفاق سب کچھ وائنڈ اپ کرکے مغیث کے پاس انگلینڈ ہی شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دو سال یوں گزرے کہ پتا ہی نہ چلا۔ ہمارا انگلینڈ کا ویزہ لگ گیا۔ اب کراچی والے گھر کو بیچنے ہم کراچی آئے ہوئے تھے۔

میں کراچی آئی تو دیگر یادوں کے ساتھ اپنے آفس اور آفس کے ساتھ ہی فیضی کی یاد آئی۔ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ جو بہ ظاہر معمولی دکھائی دیتے ہیں مگر ان کی شخصیت ہمیشہ کے لیے ذہن پہ اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے۔

اس کی بہن کی شادی میں تو میں نہیں جاسکی تھی، مگر اس کا کارڈ میرے پاس آج بھی موجود تھا۔ سو اس کارڈ پر سے پتا دیکھ کر میں نجانے کیوں اس سے ملنے چلی گئی۔



"بڑے بھائی سعودیہ شفٹ ہوگئے... بہنوں کی شادی کردی... ابو کا انتقال ہوگیا... امی میرے ساتھ رہتی ہیں۔" وہ اپنے ازلی مخصوص نرم لہجے اور جگمگاتی مسکراہٹ سمیت میرے سامنے صوفے پر براجمان تھا۔

"تمہاری شادی ہوئی؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جی ہاں، پچھلے سال ہی کی ہے۔ ارے بھئی بیگم! اب چائے لے بھی آؤ۔ اس نے آواز لگائی اور آنے والی کو دیکھ کر مجھے ازحد حیرانی ہوئی۔

وہ جو کوئی بھی تھی مگر فارہ نہ تھی۔

"تو یہ ثابت ہوا فیضی... کہ تم بھی عام مردوں جیسے ہی نکلے۔ اس معصوم لڑکی کو اپنے ساتھ گھماتے پھراتے اسے خواب دکھا کر اس کے خواب توڑتے، تمہیں شرم نہ آئی۔" میں نے ازحد غصے سے کہا۔ کم از کم مجھے اس جیسے انسان سے اس گھٹیا حرکت کی توقع نہ تھی۔ فیضان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"ویسی بات نہیں ہے میم!" اس نے دھیمی آواز میں کچھ کہنا چاہا۔

"پھر کیسی بات ہے؟" میں چمک کر بولی۔

"دیکھا جائے تو غلطی میری ہی تھی۔" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ "میں نے ہی اسے اپنا اس قدر عادی بنا دیا تھا کہ وہ بھی میری طرح مجھ سے محبت کر بیٹھی... مگر مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ بچپن سے ہی اپنے چچازاد سے منسوب تھی... مگر میری خاطر وہ ہر تعلق توڑنے کو تیار تھی... مگر میم..."

وہ مجھے دیکھنے لگا۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا نا کہ اسے اپنی چھوٹی بہنوں کے لیے مثال قائم کرنی چاہیے لہٰذا آپ خود سوچیے کہ اگر میں اسے پانے کے لیے اسے کسی انتہائی قدم پر مجبور کر بھی دیتا تو کیا اس کے اور میرے گھر والے اس کی ویسی ہی عزت کرتے جیسا کہ اس کا حق تھا... حالانکہ میں جانتا ہوں گواہ ہوں کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے کتنی مشقت اٹھا رہی تھی اور میں صرف اس کے وجود کی طلب میں اس کی ساری قربانیوں، نیک نامی کو مٹی میں ملانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور پھر محبت صرف پالینے ہی کا نام تو نہیں... کیوں میم...؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

اس کی آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی تھی۔

اور میں اس کی بات سن کر دم بخود تھی۔

"بھلا دیکھا ہے آپ نے کبھی اپنی محبوبہ کی عزت کی خاطر اپنی محبت کو قربان کردینے کا حوصلہ رکھنے والا شخص...؟ نہیں نا... مگر میں اسے اپنے سامنے دیکھ رہی تھی... مجھے لگا جیسے... اس کے وجود کی خوشبو نے پورا کمرہ معطر کردیا ہے...

وہ واقعی لاجواب تھا۔

کھرے معاملات

کاشفہ حسین

"ایک تو آپ اتنے سیدھے ہیں پوری دنیا میں بھی لوگوں کو آپ ہی ملتے ہیں چونا لگانے کے لیے۔"

عرشیہ کپڑے تہ کرتی جارہی تھی اور بولتی جارہی تھی اس کے شوہر نامدار موبائل ہاتھ میں لیے کینڈی کرش میں بظاہر مشغول نظر آرہے تھے، مگر جواب سے اندازہ ہوا کہ اتنے بھی مشغول نہ تھے۔

"ابتدا تو تمہارے ابا نے کی تھی۔" عرشیہ کی پہلے تو سمجھ میں ہی نہ آیا کیا تیر چلادیا انہوں نے، مگر جب سمجھ میں آیا تو غم کے مارے وہ کھڑی نہ رہ سکی۔

"کیا مطلب آپ کا؟ میرے ابا نے کون سا چونا لگایا آپ کو؟ غضب خدا کا مجھ جیسی بیوی نہ ملتی تو چار دن گھر نہ چلتا آپ کا۔"

بیگم کا واویلا سن کر میاں صاحب گھبرا گئے فوراً وضاحت کی۔ "ارے بھئی ایسے ہی ایک لطیفہ یاد آگیا تھا تم بھی سیریس ہی لے لیتی ہو۔ ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

"آپ کی بھابھی کہہ رہی ہیں، مکان میں جو پیسے

انہوں نے ڈالے تھے‘ وہ ان کا حصہ ہوگیا لہٰذا جس حساب سے مکان کی قیمت بڑھی ہے۔ اسی حساب سے انہیں پیسے واپس کیے جائیں۔" عرشیہ نے میاں کو رپورٹ کی۔

"کہہ تو وہ صحیح رہی ہیں۔" عمر صاحب اب بھی کینڈی کرش میں لگے ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ کا پارہ چڑھ گیا۔

"ارے اس کم بخت کو تو آگ لگادیں۔ بھلا بتاؤ‘ پانچ سال پہلے جب ہم نے یہ گھر لیا تھا تب تو ایسی کوئی بات نہ تھی بلکہ بھابھی صاحبہ نے ایک بار کہا بھی تھا کہ سمجھو یہ ہماری طرف سے قرض ہے۔ اب جب مکان کی قیمت اتنی بڑھ گئی تو بھائی صاحب نے نیا دعوا داخل کردیا۔"

عمر صاحب نے موبائل سائیڈ پر رکھا اور خاموش ہوگئے۔



اسمٰعیل اور عمر دو ہی بھائی تھے‘ ساتھ ہی رہتے تھے۔ پانچ سال پہلے جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا تو دونوں نے ورثے میں ملنے والی رقم میں اور پیسے ملا کر یہ جدید اسٹائل کا فلیٹ خرید لیا۔ عمر صاحب بڑے تھے اور حیثیت میں مضبوط بھی تھے۔ دونوں کی بیویوں کی آپس میں بنتی تھی اسی لیے دس سال گزارا ہوگیا اور ظاہر ہے معاشی طور پر ایک دوسرے کی سپورٹ بھی تھی۔ ان کی ایک بہن تھیں‘ وہ اپنے گھر میں خوش تھیں۔ پانچ سال میں دونوں ہی بھائی اپنی اپنی فیلڈ میں ترقی کرتے چلے گئے۔ اب جب وقت آیا کہ مکان علیحدہ کرلیں تو دل بھی الگ ہورہے تھے۔ شاید پیسہ ہے ہی بری چیز‘ خیر جھگڑے تو غریبوں میں بھی بہت ہوتے ہیں۔

اگلے دن ناشتے کی ٹیبل پر عرشیہ کا منہ پھولا پھولا تھا۔ منیزہ نوٹ کرچکی تھی‘ مگر بولی نہیں۔ دونوں کے بڑے بچے اسکول روانہ ہوچکے تھے۔ منیزہ چھوٹے والے کو ابلے ہوئے آلوؤں پر مکھن ڈال کر کھلا رہی تھی۔ ننھا مزمل اپنی تائی کی جان تھا اور گھر بھر کا چھوٹا بچہ بھی‘ مگر اس وقت تو عرشیہ کا موڈ بہت ہی خراب تھا۔ میاں کو ناشتا کرا کے آفس روانہ کیا۔ عمر صاحب کے باہر نکلتے ہی منیزہ نے سکھ کا سانس لیا‘ اپنی بڑی سی چادر اتار کر کرسی پر رکھی اور کہنے لگی۔

"اف! کتنی گرمی ہے‘ یاد ہے عرشی بھابھی‘ ہم ہمیشہ سوچتے تھے جب بھی الگ ہوں گے‘ آزادی سے اپنے گھروں میں دوپٹے اتار کر گھوم سکیں گے۔" عرشیہ کے چہرے کے تاثرات میں نرمی آئی۔

"ہاں اور تم کھانے پکا پکا کر مرجاؤگی اپنے شوقین میاں کے لیے‘ ہمارے صاحب تو سیدھے سادے ہیں۔" عرشیہ نے بے ساختہ یاد کیا۔

"اور اب دیکھو‘ میرے تو تینوں بچے اپنے چچا پر چلے گئے‘ مجال ہے جو کھانے پر کمپرومائز کرلیں۔"

"اور میرے والے اپنے تایا پر گئے ہیں‘ جو سامنے رکھ دیا۔ صبر شکر سے کھالیا۔" منیزہ نے ہنستے ہوئے برتن سمیٹ کر کہا اور جب بھاوج کا موڈ اچھا دیکھا تو کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ایک بات کہوں عرشی بھابھی!" وہ عرشی بھابھی اسی وقت کہتی جب بہت سنجیدہ ہوتی۔ "ہم اور آپ تقریباً" دس سال سے ساتھ ہیں۔ الحمدللہ ہماری اچھی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ دین کا علم بھی ساتھ ہی حاصل کیا۔ جب کوئی اچھی بات سنی ایک دوسرے سے شیئر کی‘ اسی لیے ہمارے ذہن ہی نہیں دل بھی ملتے ہیں۔"

اس نے رک کر عرشیہ کو دیکھا جو خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی۔ مزمل زمین پر غوں غاں کر کے تائی کی توجہ کھینچنے کی کوشش کررہا تھا جو فی الحال ناکام ہورہی تھی۔

"ہمارا مال تو وہ ہے جو ہم نے کھالیا‘ پہن لیا یا آگے بھیج دیا‘ باقی تو وارثوں کا مال ہے۔ کل کو میں مرگئی یا آپ‘ تو ہمارے شوہروں کا پیسہ ہمارے کس کام کا؟ یاد ہے آپ ہمیشہ کہتی تھیں ہم عورتیں شوہر کو اپنی جیب میں رکھا ہوا بلینک چیک سمجھتی ہیں‘ جب چاہیں گے

کھلوالیں گے، لیکن میاں اور بیوی دو الگ الگ انسان ہوتے ہیں۔ دونوں کی وراثت الگ تقسیم ہوتی ہے، دونوں اپنے اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جب بندہ اپنی اوقات کو اور اپنے رب کی بڑائی کو پہچان لیتا ہے تو پھر وہ صحیح معنوں میں بندے دا پتر بن جاتا ہے۔ ہم سے غلطی ہوئی، ہمیں ان بھائیوں کو آپس میں فیصلہ کرنے کا اختیار دینا چاہیے تھا۔ ایک دن میں نے اپنی طرف سے ایک تجویز دی اور آپ نے بھی ہامی بھرلی، لیکن دراصل یہ کام تو دونوں بھائیوں کا تھا۔ وہ اپنے پیسوں کے معاملات کا خود حساب کتاب رکھتے تو آج ہمارے دل خراب نہ ہوتے۔"

عرشیہ نے یہ سب سن کر ٹھنڈی آہ بھری۔

"تمہارا مطلب ہے، اسمٰعیل سے مشورہ کیے بغیر تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔" منیزہ نے بے بسی سے کہا۔

"ہم نئے نئے اس گھر میں شفٹ ہوئے تھے اور کھانے کے دوران سب ہی موجود تھے۔ میں نے ایک تجویز دی تھی، مگر کسی نے بھی کچھ کنفرم نہ کیا تھا۔ اب اتنے سال بعد اسمٰعیل کہتے ہیں معروف کے مطابق فیصلہ کرلیں، سچی بات یہ ہے بھابھی کہ قیمت میں اتنا فرق آگیا ہے کہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا۔" عرشیہ نے پھر ٹھنڈی آہ بھری۔

"اصل بات یہی ہے۔ معاملہ تھوڑے پیسوں کا نہیں رہا۔"

"ہم ہمیشہ پڑھتے تھے کہ معاملات کو کلیئر رکھو، لیکن انسان کو اس وقت تک سمجھ نہیں آتا جب تک خود اس پر نہ پڑے۔" منیزہ نے میز پر سے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

عرشیہ نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کچھ ہمارے ہاں کا کلچر ہے، معاملات کو غیر واضح رکھنا، بڑا بھائی، باپ کے ساتھ کاروبار میں لگتا ہے، باپ کے پیسے کو واقعی باپ کے مال کی طرح بے دردی سے خرچ کرتا ہے۔ باقی بہن بھائیوں کا ذکر ہی نہیں ہوتا۔" عرشیہ کو بھائیوں نے ترکہ دینے میں رلا دیا تھا۔ وہ اپنے پھپھولے پھوڑنے لگی، لیکن ایک بات تو طے ہوگئی کہ منیزہ کی بر سبیل تذکرہ کہی گئی بات کا اب کوئی حوالہ نہ رہا۔ عرشیہ نے دل پہ ہاتھ رکھ کر یہی بات رات کو شوہر کو بتائی۔

"آپ کی بھابھی۔" جب اس کا دل جلا ہوا ہوتا تو شوہر کے سامنے وہ منیزہ کا ذکر ایسے ہی کرتی گو اس کی نوبت کم ہی آتی، مگر آج کل اس کا دل ذرا زیادہ ہی دکھی ہو رہا تھا۔ ان کے حصے کے حساب سے چار گنا بڑھا کر پیسے دینے پڑ رہے تھے، دل کو تو دکھنا ہی تھا۔

اس نے صبح کی گفتگو کا حوالہ دیا، شوہر نامدار فون پر کسی کو میسج کرنے میں مصروف تھے، چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ عرشیہ نے ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر سوچا۔

"جس کو پیسے دینے ہیں اس کو غم نہیں تو میں کیوں گھلی جارہی ہوں؟"

عمر صاحب نے فون سائیڈ پر رکھ دیا اور محبت سے اپنی غمگسار بیوی کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"کیوں اتنی فکر کررہی ہو۔ اللہ تعالیٰ دے رہا ہے، اسی میں سے دے رہے ہیں۔ کون سا اپنی جیب سے دے رہے ہیں۔" یہ ان کی خاص منطق تھی۔ جب زیادہ خرچا ہونے لگتا فرماتے۔ "ہم تو خالی ہاتھ آئے تھے۔ کفن میں کوئی جیب تو ہے نہیں جو ساتھ لے جائیں، یہاں کا مال ہے، یہیں خرچ کرلیں۔"

عرشیہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "پیسے تو ہمارے پاس دو سال پہلے ہی آگئے تھے۔ اسی وقت ان کا حصہ انہیں دے کر فارغ کردیتے۔ ان کا وہ ایک حصہ اب چار گنا ہوگیا۔" اس پر عمر صاحب نے ایک ایسی بات کہی کہ وہ لاجواب رہ گئی۔

"یہ کیوں دیکھتی ہو ان کا ایک حصہ کتنا بڑھ گیا، یہ دیکھو ہمارے تین حصے بھی تو بڑھے۔ اپنے تین حصوں کا منافع دیکھو گی تو ان کا ایک حصہ اتنا بڑا نہیں لگے گا۔"

بعض لمحے آگہی کے لمحے ہوتے ہیں، اس کے دل پہ ایک دم پھوار پڑگئی۔ بندہ رب کی تقسیم پر راضی ہوجائے تو اس کی زندگی آسان ہوجاتی ہے۔

سائرہ رضا

پھر کبھی دل دھڑکتا ہے



اس نے پیڈسٹرین برج کی ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر شہر کو تاحد نگاہ دیکھا۔ سڑک کے دونوں اطراف اسٹریٹ لائٹ کے کھمبوں کی روشنی کا عکس... سیاہی اور زردی کا امتزاج' اور اس پر آدھی رات' اس کے سیدھی جانب فردوس شاپنگ مال تھا اور الٹے ہاتھ پر لیاقت آباد سپر مارکیٹ... سارا دن اس سڑک پر ٹریفک کا اژدھام رہتا تھا۔ اندر بازار گرم ہوتا تھا تو باہر پتھارے والوں کی پکار گہما گہمی رونق' تجارت کی برکت...

لیکن اب رات تھی۔ دکانوں کے شٹر گر چکے تھے۔ پتھارے والے اپنا مال اللہ کے سپرد کرکے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔

یوں لگتا تھا جیسے کسی نے شہر کو سمیٹ دیا تھا۔ لپیٹ کر رکھ دیا تھا' سڑک کتنی لمبی اور چوڑی تھی۔ مگر دن کو یہ ایسی لگتی تھی جیسے تنگ نالی ایک مشکل گزر گاہ...

تو رات یہ جادوگری بھی رکھتی ہے کہ پھیل جاتی ہے اور دن سمٹ جاتا ہے۔ تنگ ہوتا ہے تنگ کرتا بھی ہے۔

کیسا سکون اور آرام طاری تھا شہر پر' شہر والوں پر... مگر ایک وہی... وہ ٹھنڈا سانس بھر کے چل پڑا تب ہی چونکا۔

اس کے پیر سے کچھ ٹکرایا تھا' وہ... میلی چادر سے سر تانے ٹیڑھا میڑھا سویا چرسی' برج کے اوپر' برج کے نیچے فٹ پاتھوں پر بے سدھ سوئے انسان...

اس نے سر جھٹکا اور پیروں میں آتے انسانوں سے بچتا سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

کچھ لوگ مشکلوں کا سامنا کرتے ہیں۔
اور کچھ دامن بچا لیتے ہیں یوں چادر تان کر.....
مگر کچھ بھی کریں زندگی کو جینا تو پڑتا ہی ہے۔
اس نے اپنی شرٹ کی جیب تھپتھپا کر دادا ابا کی دوا کی موجودگی کو محسوس کیا۔ انہیں شوگر کا مرض لاحق تھا' دیگر بہت سے امراض کے ساتھ ساتھ۔ صبح اٹھتے ہی نہار منہ شوگر کی گولی کھانی ہوتی تھی۔ اور باقی دن اور بہت ساری گولیاں مگر سب سے ضروری یہی والی تھی۔

دادا کا بس چلتا تو اپنی بیماری' تکلیفوں اور دواؤں کا قطعاً ذکر نہ کرتے۔ مگر یہ ذمہ داری حورے کی تھی۔ (مگر بھی ایک کیوں اس نے اور بھی بہت سی ذمہ داریاں اٹھا رکھی تھیں۔)
وہ حورے کے بارے میں سوچنے لگا۔
وہ جاگ رہی ہوگی۔ اس سے کھانا پانی پوچھے گی اور اس کے منع کرنے کے باوجود چنگیر میں روٹی اور سالن کی پلیٹ لے آئے گی۔ اس نے کتنی دیر لگا دی تھی گھر پہ جانے میں..... اس معاملے میں دادا پوتی ایک تھے۔

"رات دیر تک گھر سے باہر رہنا شرفاء کا طریقہ نہیں سبکتگین....." دادا کا آغاز یہاں سے ہی ہوتا تھا۔
"تمہیں شہر کے حالات کا پتا ہے نا؟" حورے وہ سوال کرتی جس کا جواب بچے بچے کے پاس سے مل جاتا۔ (خراب' بے حال و برباد شہر..... آہ روشنیوں کا شہر ..... روشنی کو ترستا شہر)
"جگہ جگہ رینجرز اور پولیس موبائلز گھومتی ہیں۔ سبکتگین! ایسوں کے ساتھ تم بھی پستا ہے میں بوڑھا انسان تمہیں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ نہ پھرا کرو رات گئے تک سڑکوں پر۔"

مکمل ناول



وہ مسکرا دیتا۔ سر اثبات میں ہلاتا ان کے پیر داب نے لگتا۔ ایسے سڑکیں ناپنا اچھا لگتا تھا۔ اسے اس شہر سے محبت تھی۔ اپنی گلیوں سے، چوراہوں سے، راستوں کونوں کھدروں سے...

شہر سبق تھا اور اسے یاد تھا۔

شہر کتاب تھا اور اس نے اسے سینے سے لگایا ہوا تھا۔

شہر خواب تھا اور وہ تعبیر کے لیے کسی قائد کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔

اور کسی کیوں... وہ خود قائد ہونا چاہتا تھا۔

مگر یہاں انسان ہونا مشکل ہو رہا تھا وہ رہنما کیسے بنتا۔

اوہ... یہ حورے بھی ناں۔" اس کے ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔

وہ یقیناً" اسے اوپر گیلری سے دیکھ چکی تھی۔ اس نے چٹخنی گرا دی تھی مبادا دستک کی آواز پر دادا کی نیند خراب ہو۔

"شہر کے حالات معلوم ہیں۔ پھر بھی دروازہ کھول دیتی ہو۔"

"تم مجھے دکھائی دے گئے تھے اس لیے۔"

"ہاں مگر مجھ سے پہلے کوئی چور ڈاکو بھی اندر آسکتا تھا۔"

"یہاں سے کیا لے کر جائے گا؟" اس کا لہجہ سادہ تھا۔

"دروازہ تو جھونپڑی کا بھی ہوتا ہے حورے..."

سالن نکالتے اس کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ اس نے ترچھی نگاہ سے دیکھا۔ جوتے اتارنے کے بعد وہ جیب سے دادا کی دوا نکال رہا تھا۔

پھر اس نے پیسے اور کچھ کارڈز نکالے۔ پیسے گنے۔ پچاس، سو، دس، بیس اور کچھ سکے بھی... ٹوٹل ایک سو پچاسی تا ستاسی... اس نے ٹھنڈی سانس بھر کے میز پر کارڈ اور رقم رکھ دی، پھر جیب سے موبائل نکالا۔ اس نے آج بھی اس کی اسکرین نہیں بدلوائی تھی۔

سبکتگین کا اٹھا نیس سو ننانوے روپے والا موبائل... جو اکثر بیلنس سے محروم رہتا تھا۔ میسج پیکج اور ایک مس کال کی گنجائش۔

وہ کچن کے سنک پر ہی ہاتھ منہ دھونے لگا تھا۔

اس نے چھوٹی میز گھسیٹ کر تخت کے سامنے رکھی اور اس پر کھانا چن دیا۔

"اتنے سارے برتن۔" وہ تولیے سے ہاتھ پونچھتا آیا۔ "کیا پکا لیا ہے۔ یہ تو دعوت لگ رہی ہے خیریت...؟"

"کوئی دعوت نہیں ہے۔ روٹیاں ہیں رائتہ ہے۔ دہی بڑے بنائے تھے شام کو دادا کی فرمائش پر... اور یہ زردہ... ساتھ والوں کے ہاں سے آیا ہے۔"

"اور یہ..." اس نے سالن کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"قیمہ مٹر..." وہ تیزی سے بولی۔ کتنا مہنگا ہو چکا تھا گوشت اور اس پہ بغیر ہڈی کا قیمہ۔ اف توبہ... سو حیرت بنتی تھی۔

حورے کھانا واقعی بہت اچھا بناتی تھی۔ اور دیگ کا ست رنگا زردہ... واہ! وہ سر ہلا ہلا کر کھانے لگا۔



"زمانہ بدل گیا ہے دادا... نئی سوچ نئی مثالیں اور حکایتیں... اب بڑھاپا اولاد کے سہارے نہیں دواؤں کے سہارے گزرتا ہے۔" وہ انہیں مٹھی بھر گولیاں کھانے پر مجبور کر رہی تھی۔

"اتنی ساری گولیاں میں نہیں کھا سکتا۔"

"لاؤ آدھی میں کھا لیتا ہوں۔ ڈوز تو پوری کرنی ہے نا۔" سبکتگین نے صرف کہا نہیں بلکہ اس کا ہاتھ تھام کر گولیاں اٹھا بھی لیں۔ اب وہ پانی کا گلاس ڈھونڈ رہا تھا۔

"پاگل ہوئے ہو۔" دادا سٹپٹائے "کوئی کسی کی دوا میں بھی حصہ بانٹتا ہے۔"

وہ مسکرا دیا۔ "بالکل صحیح... جیسے کسی کا درد نہیں

بانٹ سکتے ویسے ہی دوا بھی بانٹی نہیں جا سکتی خود ہی کو کھانا پڑتی ہے۔" اس نے گولیاں دادا کے منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"اوہ...!" دوا نگل کر وہ یوں ہانپے جیسے معرکہ سر کیا ہے۔

"درد تو بانٹا جا سکتا ہے بیٹے...!"

"اوں ہوں!" وہ کرسی پر بیٹھ کر کف بند کرنے لگا۔

"نرا محاورہ ہے۔ یہ کیا بات ہوئی۔

کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ کتنی بیماریاں لیے بیٹھے ہیں۔ آپ کی تکلیفیں میں سن تو سکتا ہوں۔ خود پر لے نہیں سکتا۔"

"محسوس تو کر سکتے ہو نا۔" دادا کا دل چھوٹا ہوا۔

"ہاں مگر اتنا ہی جتنی مجھے آپ سے محبت ہو گی۔"

"محبت زیادہ ہو گی تو احساس بھی زیادہ۔" "محبت کم... احساس زیرو... ہو رہا ہے تو ہو تا رہے درد کوئی کیا کر سکتا ہے؟" وہ کچھ تلخ ہو گیا تھا۔ کپوں میں چائے نکالتی حورے کے ہاتھ اک گئے۔ اس نے کچن کی کھڑکی سے اسے دیکھا۔

بلیک ڈریس پینٹ پر اسکائی بلو لائنوں والی شرٹ... وہ یقیناً "کسی انٹرویو کے سلسلے میں جا رہا تھا۔ اور ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا۔

وہ خاموش ہو جاتا تھا۔ یا پھر بہت تلخ...

"تمہیں میرے درد کا احساس ہے؟" دادا کا سوال امید بھری ٹوہ لیتا مگر انداز بچکانہ تھا۔

"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" وہ مسکرایا۔

"یہ بس ایک سوال ہے اور اس کا ایک جواب بھی ہونا چاہیے۔" دادا نے نروٹھے پن سے کہا۔

"اوہ...!" وہ ہنس دیا۔ چائے لاتی حورے ٹھٹک کر رک گئی۔ کتنا کم ہنسنے لگا تھا وہ... کہیں غلطی سے بڑی مشکل سے۔

"تو سیدھا جواب یہ ہے دادا کہ مجھے اس درد کا بہت احساس ہے۔ ہر وقت ہر گھڑی... اس لیے کہ مجھے آپ سے بہت محبت ہے۔"

"ہاں!" دادا کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔

آج کے اس خود غرض دور میں جب اولاد والدین سے نگاہ چُراتی ہے۔ وہ پوتا ہو کر ان سے اظہار محبت کر رہا تھا۔ بڑی بات تھی بہت بڑی بات۔

"اللہ تمہیں کامیاب کرے بیٹا!" دادا نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

"تین سال ہونے کو آرہے ہیں دادا...

"اوں ہوں۔ مایوس نہیں ہوتے۔"

"نہیں ہوا... اسی لیے تو ہر بار تیار ہو کر نئے عزم سے درخواست دینے انٹرویو دینے پہنچ جاتا ہوں... اور یہی نہیں' ہر بار پوسٹ ماسٹر سے پوچھتا بھی ہوں۔ میرا کوئی لیٹر آیا۔ ایسے تو گاؤں کی گوری بھی ڈاک بابو کا انتظار نہیں کرتی ہو گی۔" وہ ہنس دیا۔ (ایک دن میں دوبار... اف... حورے نے نگاہ چُرائی پہلے والی ہنسی اور اب یہ دوسری والی ہنسی (جب ہم خود پر ہنسیں۔ کتنے برے لگتے ہیں۔ بد دعا کی طرح' جلے سڑے کالے بھوت)

"ناشتہ کرو۔" دادا نے نصیحت کا ارادہ ترک کر دیا۔

اس نے سر ہلا دیا۔ سلائس دو لقموں میں کھالیا اور چائے کا کپ ایک سانس میں ختم... فائل ہاتھ میں پکڑے وہ دادا سے پیار لے کر اسے مسکرا کر دیکھتا' دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتر گیا۔ حورے خاموشی سے گیلری میں آگئی۔

فرنیچر گلی صبح کے نو بجے سوئی پڑی تھی۔ سب کارخانوں کے دروازے بند تھے۔ نیچے کارخانے اوپر گھر... خاموشی تھی ورنہ تو سارا دن وہ شور ہوتا کہ الاماں...

وہ آج پھر خواب لے کر گھر سے نکلا تھا۔

کیا وہ کامیاب ہو گا۔ یا پھر ہمیشہ کی طرح' آہ' حورے کی آنکھ بھر آئی۔



"چلا گیا۔۔۔؟"

"ظاہر ہے۔ تمہیں کمرہ خالی نظر نہیں آرہا۔ تخت کے نیچے چھپ کر تو نہیں بیٹھے گا۔" دادا کا موڈ واقعی خراب تھا۔ وہ ہنس پڑی۔ دادا نے گھورا۔

"ایک کپ چائے بنا کر دینے سے کیا فرق پڑتا۔"

"دادا۔۔۔!" وہ ہنس دی۔ "وہ کون سا دور سے آتا ہے۔ یہ نیچے سے چار سیڑھیاں چڑھیں اور کارخانے کا کرایہ دے دیا۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں اوپر آنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ کسی بچے کو بھیج دیا کرے۔"

"بچے کو کیوں۔۔۔ گیلری سے ڈول نیچے لٹکا دوں گا وہ اسی میں ڈال دے۔"

"اوہ دادا۔۔۔" اسے ہنسی آگئی۔ "کمال ہے یہ آئیڈیا مجھے کیوں نہیں سوجھا۔"

"حورے!" دادا نے سختی سے کہا۔

"کیا حورے۔۔۔" وہ تخت پر ان کے سامنے چوکڑی مار کے بیٹھ گئی۔ "وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"ایسے نہیں کرتے بیٹا۔"

"تو پھر بھی ویسے بھی نہیں کرنا چاہیے جو اس نے کیا۔"

"اس نے کہا کیا؟"

"جیسے آپ جانتے نہیں۔" اس نے ناک چڑھائی۔

"اوہ۔۔۔!" دادا سمجھ گئے۔

"خالد چچا جانتے تھے کہ میرا رشتہ بچپن سے سبکتگین سے طے ہے تو پھر ان کی بیوی میرے لیے رشتہ کیوں لے کر آئیں۔"

"بیٹے کی فرمائش پر آگئی ہوگی۔ مائیں مجبور ہو جایا کرتی ہیں۔" دادا کے پاس درگزر کے لیے بہت گنجائش تھی۔

"اگر یہ بات سبکتگین کو پتا چلے کہ ایاز کی ماں رشتہ لائی تھی تو۔۔۔"

دادا بھی چونکے۔ "ہاں وہ اس سارے قصے سے ناواقف ہے۔"

"تو اگر جان لے تو کیا ردعمل ہوگا۔"

"ظاہر ہے برا لگے گا۔"

ایاز سے دن میں دس بار کا سامنا تھا۔ ان کا گھر اوپر تھا اور نیچے کے سارے حصے پر فرنیچر بنانے کا کارخانہ۔۔۔ جو ایاز کے ابو نے کرائے پر لے رکھا تھا اور ایاز اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ دو تین برسوں سے باقاعدگی سے کارخانہ سنبھالنے لگا تھا۔ وہ خود بھی کام کرتا تھا اور کاریگر بھی رکھے ہوئے تھے۔ کاریگر کام کر رہے ہوتے تو وہ کرسی ڈال کر تھڑے پر بیٹھ جاتا۔ سبکتگین سیڑھیاں چڑھتے اترتے بات چیت کیا کرتا ویسے تو وہ زیادہ گفتگو کرنے کا شوقین نہیں تھا۔ لیکن سلام دعا۔۔۔ حال احوال سے حالات حاضرہ تک بالخصوص جب لائٹ جانے پر وہ گھر سے نکل کر سیڑھیوں پر بیٹھ جایا کرتا تھا۔

وہ سبکتگین سے بہت عزت سے پیش آتا تھا۔ وہ تعلیم میں زیادہ تھا اس لیے یا وہ مالک مکان تھا اس لیے۔۔۔ یا پھر یہ سبکتگین کا کیا لیا دیا مخصوص انداز تھا جو مقابل کو اس کا احترام کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

اس کی شخصیت میں ایک رعب تھا۔ آنے جانے والوں کو شہزادہ لگتا مگر بے روزگاری کی فکر اور جدوجہد نے آنکھوں میں جو حزن بھر دیا تھا۔ وہ جلاوطن شہزادہ لگتا ہلکی بڑھی شیو کے ساتھ اسی کی دہائی کے ڈراموں کا اینگری ینگ مین۔۔۔

گلی کے تمام چھوٹے بڑے اس سے واقف تھے وہ مظفر معراج کا پوتا تھا مظفر معراج ایک زبردست بڑھئی۔۔۔

ان کے ہاتھوں میں لکڑی کو تراشنے اور شکلوں میں ڈھالنے کا ہنر تھا۔

وہ لکڑی سے صورتیں بھی گھڑ سکتے تھے۔ مگر ہاتھوں میں رعشہ اتر آیا تو سہارے کے لیے لکڑی تھامنا بھی مشکل ہوگئی۔

یہ ایک گھر کل پونجی تھا۔ اوپر خود رہتے تھے سر چھپانے کا آسرا اور نچلا کارخانہ پیٹ بھر دیتا تھا۔

اللہ نے چار بچوں سے نوازا۔ دو بیٹیاں دو بیٹے۔
بڑی بیٹی اچھے امیر کبیر گھرانے کی بہو بنی۔ اس کے میاں کا اپنا کاروبار تھا۔ کاروبار پھیلا تو وہ سرگودھا شفٹ ہو گیا۔ کینو کی سپلائی کا کوئی کام تھا اور خوب چلتا تھا۔
چھوٹی بیٹی یہیں خود سے قریب گارڈن میں بیاہی۔ عزت کے ساتھ گزارا ہو رہا تھا۔ مگر اسے بیوگی کا روگ لگ گیا۔ سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ انہیں سب سے زیادہ صدمہ اسی کا لگا تھا۔ اس سے پہلے سبکتگین کے باپ ظفر کی اچانک موت نے بھی توڑ دیا تھا مگر بیٹی کی بیوگی نے کرچی کرچی کر دیا۔ ہاتھوں میں رعشہ اتر آیا تھا۔ ورنہ وہ خود بیٹی کا آسرا بن جاتے۔ اب یہ کرنے لگے کہ کارخانے کا کرایہ اسے دینے لگے۔ اپنے گھر کے اخراجات کی فکر نہیں تھی۔
سبکتگین کی ماں گورنمنٹ اسکول کی ٹیچر تھی اور گھر میں کل افراد ہی کتنے تھے۔ وہ سبکتگین اور اس کی ماں اور حورے۔
حورے ان کے دوسرے بیٹے قمر کی بیٹی تھی۔ قمر سعودیہ میں بوجہ ملازمت رہائش پذیر تھا۔ اور انہیں ان کا اور بیٹی کا خرچا بھیجا کرتا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ رقم بہت کم ہوتی تھی۔ مگر یہاں دادا پوتی کا خرچا بھی کیا تھا۔ قناعت اور سادگی یوں بھی زندگی کو آسان کر دیتی ہے۔
لیکن زندگی اتنی آسانیوں کا نام بھی نہیں۔
سبکتگین کی ماں معمولی بخار میں مبتلا ہو کر ایک صبح چٹ پٹ ہو گئیں۔
وہ جانتے تو تھے بہو نے سب کچھ سنبھال رکھا ہے۔ مگر کتنا۔۔۔ کچھ یہ اندازہ نہیں تھا۔
کارخانے کا کرایہ دادا پوتا پوتی کے لیے بہت کافی تھا۔ مگر وہ تو وہ بیٹی کو دیتے تھے۔ تو اب کیا ہو گا۔
ادھر قمر سعودیہ سے پیسے کبھی بھیجتا تھا کبھی نہیں۔۔۔ آمدنی کم اور پھر فیملی کا ساتھ۔۔۔ وہ اپنی گرہستی ہی سنبھال پاتا تھا۔
دراصل حورے کی ماں اور قمر میں کبھی نہیں بنی۔
شوہر کے دل پر بیوی چڑھی ہی نہیں۔۔۔ تو بیوی نے بھی کوشش نہیں کی نہیں تو نہ سہی۔ حورے کی پیدائش بھی اس خلیج کو پاٹنے میں ناکام رہی۔
وہ اپنی ماں کے گھر جا کر بیٹھ گئی۔ بچی کو دادا دیکھے یا باپ دیکھے یا پھر تائی یعنی سبکتگین کی امی۔۔۔ جو بیٹھک خاندان کے بڑوں نے صلح صفائی کے لیے جمائی اس کا انجام طلاق نکلا۔ کہانی ختم۔
قمر سعودیہ جا کر بیٹھ گیا۔ ماں نے سال بعد شادی رچالی اور اب اللہ جانے وہ کہاں تھی یا نہیں تھی۔ کچھ خبر نہیں۔
ادھر تھوڑا وقت اور گزرا تو مظفر معراج نے بیٹے کا دوبارہ گھر بسانے کی کوشش کی۔ جلد رشتہ طے ہو گیا اور وہ بیوی کو ہمراہ لے گیا۔ وہاں بچے بھی ہو گئے۔ حورے تائی اور دادا کے نزدیک تھی۔ وہ یہیں رہنا چاہتی تھی۔ کہنے کو قمر سعودیہ کے ریال کما رہا تھا مگر وہ اس کے اپنے خاندان کی ضروریات کے لیے کافی تھے۔ ماہوار ایک مخصوص رقم باقاعدگی سے دینا مشکل تھا۔ مگر اب حالات بدل گئے تھے۔ ہاں سبکتگین جو پڑھ رہا تھا۔ تعلیم مکمل کرتا اور اسے اچھی سی ملازمت مل جاتی تو سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک ہو جاتا۔ مگر ابھی تو وہ زیر تعلیم تھا اور تعلیم خرچا مانگتی تھی۔ بیوہ بیٹی کا واحد آسرا ان ہی کی دی رقم ہوتی تھی۔ اور اس میں کٹوتی کرنا پڑی۔ یہ بہت مشکل فیصلہ تھا۔ مگر ناگزیر تھا۔ مظفر معراج نے بیٹی کو اس کا سرا تھمایا۔
"بس کچھ وقت کی تنگی ہے۔ جیسے ہی سبکتگین کو ملازمت ملتی ہے۔ سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائے گا۔"
بیٹی نے دل کی گہرائی سے آمین کہا۔
مگر سبکتگین کی ملازمت۔۔۔ اوہ۔۔۔ یہ تو جوئے شیر لانے جیسا کام ہو گیا۔
وہ عام آدمی تھا عام انسان ایک عام سی مرحوم گورنمنٹ ٹیچر کا بیٹا۔۔۔ اسے کس نے پوچھنا تھا سفارش بھی نہیں تھی۔ رشوت دینے کو بھی مناسب

بندہ نہیں ملتا تھا۔
اس نے ڈگری کو چار چاند لگانے کے لیے دو تین اور امتحان بھی پاس کر ڈالے۔ سی وی جگمگانے لگی۔ مگر یہ جگمگاہٹ میز کے دوسری طرف بیٹھے افسران کی آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی تھی۔
میز کے دوسری طرف بیٹھے بااختیار کسی فون کال پہ پہلے ہی اپنا اختیار کھو چکے ہوتے تھے۔ محض فارمیلٹیز نباہنے کے لیے اتنا تردد...
اب تو انٹرویو دیتے وقت اس کے انداز میں جھلاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔
وہ کمرے میں داخل ہو کر سیٹ سنبھالنے تک چہرے بھی پڑھ لیتا۔ نوکری پہلے ہی دی جا چکی ہے اور مذکورہ افسران اے سی کمرے میں بیٹھ کر بس ایسے ہی فارمیلٹی کے مزے اڑا رہے ہیں۔

☼ ☼ ☼

چھوٹی پھپھو کے پاس کوئی ہنر نہیں تھا۔ انہیں باپ سے پیسے لیتے ہوئے اب لاج آنے لگی تھی۔ وہ سبکتگین کی تنگ دو سے بھی انجان نہیں تھیں۔
انہوں نے اپنے پڑوس والی کی مدد سے کسی گارمنٹ فیکٹری سے بیڈ شیٹ کے ساتھ کے تکیے لا کر سلائی کرنے شروع کر دیے۔ فی تکیہ سلائی کرنے کی مزدوری دس روپے۔ سبکتگین کی آنکھوں سے لہو برسنے لگا۔
پھپھو تکیے سلائی کر دیتیں اور ان کا چودہ برس کا بیٹا اسے سائیکل پر لاد کر واپس پہنچا آتا۔ سبکتگین نے دیکھ لیا۔ وہ دادا کے بھیجے گئے پھل سبزیاں اور دودھ کے ڈبے دینے آیا تھا۔ گلی سے علی کو گزرتے دیکھا۔ اس نے ساری تفصیل بتا دی وہ بھاری قدموں سے دروازہ پر پڑا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔
سامنے برآمدے میں پھپھو دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں مونڈے بیٹھی تھیں۔
سامنے مشین پڑی تھی... ادھ کھلی قینچی اور زمین پر پڑی چند کترنیں اس کا دل بوجھل ہو گیا۔ اتنا وزنی کہ اٹھایا نہ جائے۔
سامان کے تھیلے بے آواز دروازے کے پاس ہی رکھ کر وہ دبے قدموں باہر نکل آیا۔
"پھپھو سے کہیں وہ یہ نہ کریں۔" وہ دادا کے سامنے اپنا ضبط کھو بیٹھا۔
"تو پھر اور کیا کرے؟" دادا نے جوابی سوال کیا تھا اور وہ لاجواب ہو گیا تھا۔
اور پھر اس نے سنا پھپھو نے علی کو کسی دکان پر رکھوا دیا ہے۔ بارہ بجے سے رات دس بجے تک... اور ماں بیٹا کتابوں کی جلدیں کرنا بھی سیکھ رہے ہیں کہ سیزن میں خوب آمدنی ہوتی ہے۔
"لیکن علی تو ابھی نائنتھ کلاس میں ہے اور بارہ بجے تو خود وہ اسکول سے اٹھے گا تو شاپ پر کب جائے گا؟"
"اسکول کے ساتھ ہی شاپ ہے۔ چھٹی ہوتے ہی بیگ سمیت بھاگ کر شاپ میں گھس جاتا ہوں بھائی جان... اسکول شرٹ اتار دیتا ہوں۔ اندر ٹی شرٹ ہوتی ہی ہے۔ بس دو منٹ میں..."
"اور لنچ..." اس کے منہ سے نکل گیا۔
"لنچ کا کوئی مسئلہ نہیں... شاپ اونر نے ایک رول کھانے کی پرمیشن دے دی ہے۔ ڈیپ فریزر میں ٹھنڈا پانی ہوتا ہے اور سارے رول سموسے بک جاتے ہیں تب سموسوں کی ٹوٹی پارٹی اور چورا اتنا سارا ہوتا ہے کہ رات تک بھوک نہیں لگتی۔ شام کی چائے بھی شاپ اونر کی طرف سے ہوتی ہے۔"
علی مطمئن تھا۔ سبکتگین کے حال سے بے خبر بولتا ہی جا رہا تھا۔
"اور پڑھتے کب ہو؟"
"پڑھائی کا کوئی مسئلہ نہیں... بارہ سے ڈھائی بجے تک رش آورز ہوتے ہیں۔ پھر آفٹر نون کی چھٹی کے وقت پانچ سے چھ بھی درمیان میں پڑھتا ہوں رات کو کبھی رش ہوتا ہے کبھی نہیں۔"
اس نے علی کو دیکھا وہ خوش تھا اور پرجوش بھی...

اور یہ بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ ییسے وہ اپنی ماں کا سہارا بن گیا تھا۔ اس عمر میں اتنی محنت اس نے سر جھٹکا اور علی کے پر عزم چہرے کو دیکھا۔

"پڑھائی مت چھوڑنا علی۔"

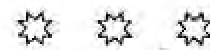
"ارے!" علی ہنس دیا "پڑھائی کیوں چھوڑوں گا۔"

سبکتگین کا دل مضبوط ہوا۔ اگر جو علی کہہ دیتا کہ آپ کو پڑھ لکھ کر کیا ملا تو۔۔۔؟ سبکتگین نے اپنی ترجیحات بدل لیں۔

وہ افسر نہیں بنے گا۔ نہ بڑا افسر نہ چھوٹا افسر۔۔۔ وہ بس کام کرے گا۔ کوئی بھی کام کوئی سا بھی کام۔۔۔ بس کوئی بھی باعزت ملازمت جو اس کی تعلیم سے مناسبت نہ رکھتی ہو مگر۔۔۔ گھر کے حالات کو مناسب کردے۔

لیکن یہاں بھی یہ مصیبت کہ وہ کسی ہنر سے واقف نہیں تھا۔ ڈھائی برس کی عمر میں استانی امی نے پنسل پکڑائی تھی۔ اسے تو چھری پکڑ کے آم کی قاش بنانے تک کا سلیقہ نہیں تھا۔

اپنے مزاج کے برخلاف وہ کئی جگہ پر کام کرنے بیٹھ بھی گیا۔ مگر ان دنوں وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہو جاتا۔ کچھ دن کام کرلیتا۔ ملنے والی ساری تنخواہ دادا کے ہاتھوں میں دیتا اور راتوں کو اخباروں سے تراشے کاٹ کاٹ کر صبح سی وی پوسٹ کر دیتا۔ بازار حرص و نا انصافی میں قابلیت کی دکان پر سناٹا پڑا تھا۔ اور اس کا کوئی خریدار نہیں تھا۔



"کیوں بھیج رہی ہے مہو اپنی بیٹی کو؟" دادا کے ہاتھ میں کھلا خط تھا۔ جسے تین چار بار پڑھنے کے بعد بھی الجھن ختم نہ ہوئی اب حورے کو خط لہرا کر دکھایا۔

"دادا۔۔۔!" حورے نے ہاتھ روک لیے۔ وہ چھوٹے ٹب میں دادا کی نماز کی ٹوپیاں اور رومال مل رہی تھی۔

"بچے چھٹیوں میں اپنے نانا۔۔۔ دادا کے گھر جایا ہی کرتے ہیں۔"

"مگر پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"آپ کو اعتراض پہلے نہ ہونے پر ہے یا اب ہونے پر ہے؟"

"دونوں پر۔۔۔" دادا کا لہجہ جارحانہ تھا۔

"آپ کو خوشی نہیں ہو رہی۔ آپ کی سب سے بڑی نواسی ہے زینیا۔"

"گھر کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔" دادا نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

"اوہ۔۔۔! حورے کی نگاہیں جھاگ پر ٹک گئیں۔ "ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں دادا کہ ایک مہمان کو دو وقت روٹی نہ کھلا سکیں۔"

"امیر باپ کی بیٹی ہے وہ۔۔۔ ہم تو گوشت بھی سوچ سمجھ کر پکاتے ہیں۔"

"مرغی آج کل سستی ہے دادا جان!" اس نے انہیں بچوں کی طرح بہلایا۔

"ہاں۔۔۔ خریداروں کے لیے۔۔۔"

دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ دادا ایک بار پھر خط کے مندرجات پڑھ رہے تھے۔ حورے نے ان کا چہرہ بغور دیکھا تفکر سے کچھ بڑھ کر ناراضی محسوس ہوتی تھی۔ ماتھے پہ تیوری، آنکھوں میں خفگی۔

"آپ اصل بات بتا دیں دادا!" وہ ٹب اٹھا کر لے جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو کہہ دیا دادا چونکے مگر نفی میں سر ہلا نہیں سکے۔ حورے ٹوپیاں وغیرہ ٹانک کر واپس آئی تو تفکر موجود تھا مگر ایک فیصلہ کن تاثر بھی عیاں تھا۔

چند لمحوں بعد وہ کرسی گھسیٹ کر ہاتھ پونچھتے ہوئے ان کے تخت کے نزدیک براجمان ہو گئی۔

"میں ناراض ہوں مہو سے۔۔۔"

"ناراض؟ کیوں؟"

اگر وہ چاہتی تو کیا کیا نہ کر سکتی تھی زیبی کے لیے۔"

"اوہ۔۔۔!" اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "آپ کو اب تک وہ بات بھولی نہیں دادا۔"

"نہیں۔" دادا کا سر نفی میں ہلا۔ "جب تک زیب النساء کے حالات درست نہیں ہوتے، مجھے یہ بات یاد رہے گی۔ میں نے تو اس سے یہ بھی کہا کہ جو کچھ اللہ کے نام پر نکالتی ہے اپنے شوہر سے کہے کہ وہ سب زیبی کو دے دیا کرے تو بولی۔

"میں اپنے شوہر کے سامنے میکے کو نیچے کیسے کر دوں؟ کہ میری بہن صدقہ زکواۃ لے لے گی۔ جس چیز کو اللہ نے حلال کر دیا وہ اس کے لیے ہیٹی ہو گئی۔ وہ اپنی سگی چھوٹی بہن جو چھوٹے چھوٹے بچوں کی بیوہ ماں ہے۔ اس کے لیے اتنا نہیں کر سکتی کہ چلو کم از کم بے چاری راشن کی فکر سے ہی آزاد ہو جائے۔ مگر نہیں اُسے تو اپنی ناک کی فکر ہے۔ سسرال کے سامنے کہیں کٹ نہ جائے۔ بہن کی گردن بھلے سے کٹتی رہے۔ تو کٹتی رہے۔"

دادا کی آواز بلند ہوتے ہوتے پھٹنے پر آ گئی۔ اس نے تیزی سے اٹھ کر پانی کا گلاس ان کے لبوں سے لگا دیا۔ پانی پی کر وہ قدرے پرسکون ہوئے مگر ابھی انہیں اور بھی بہت کچھ کہنا تھا۔

"دیتی تو ہیں دادا۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں اونٹ کے منہ میں زیرہ۔" دادا نے اسے گھورا۔

حورے کو چپ لگ گئی۔

بڑی پھپھو پیسے والی عورت تھیں۔ اپنے خیالات و نظریات دوسروں پر ٹھونسنے کی عادی جو انہوں نے کہہ دیا... جو کر دیا وہ ہی سب سے بہتر، حرف آخر۔

"اوہ...!" دادا پوتی ایک ساتھ چونکے چھت کا چلتا پنکھا بند ہو گیا تھا۔ لائٹ چلی گئی تھی چند لمحوں میں سارے میں جنریٹرز کی گھوں گھوں کا شور ہونے لگا۔ اس پر لکڑیوں پر کیل ٹھونکنے کی آوازیں... فرنیچر پالش کی مخصوص بو لکڑیوں کے اٹھانے پٹخنے کی آوازیں...

"اچھا آپ اداس مت ہوں۔ سبکتگین کو جاب مل جائے گی، تب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کارخانے کا سارا کرایہ ہم زیبی پھپھو کو دیا کریں گے اور سبکتگین کی ساری سیلری سے ہم تینوں عیش کریں گے۔" اس نے دادا کی دل گرفتی برداشت نہ ہوئی تو امید کے کچھ جگنو تھمانے چاہے۔

"سبکتگین!" دادا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "اس کے لیے بھی تو مختار سے کہا تھا نا (مختار... پھپھو مہرالنساء کے شوہر نامدار) کہ قابل لڑکا ہے۔ اسے اپنے ساتھ ہی کہیں کھپا لے مگر نہیں۔ بجائے اس کے کہتا جی سسر صاحب میں کچھ کرتا ہوں بولا' آپ کا پوتا پڑھا لکھا بندہ ہے۔ میں ٹھہرا کنوؤں کا بیوپاری... میں کہاں بناؤں اس کی جگہ... ارے کام کرنے کی نیت ہونی چاہیے اور کوئی کام نہ دیتا کنوؤں کی گنتی پر ہی لگا دیتا مگر نہیں۔"

"کنوؤں کی گنتی۔" حورے کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مگر دادا کے چہرے کا اضمحلال دیکھ کر ہونٹ بھینچ لیے۔

"جب یوں نہیں مانا تب میں نے ساری انا پیچھے ڈال کر کہا چلو کچھ رقم قرض حسنہ کے طور پر دے دو۔ میں سبکتگین کو کوئی موبائل شاپ یا کوئی اور کام شروع کروا دوں۔ تب بولا کنوؤں کی فصل اچھی نہیں ہوئی۔ کاروبار خسارے میں جا رہا ہے۔ اس سے کہیں نوکری ڈھونڈے اونہہ بڑا آیا مشورہ بیگ۔"

دادا اس وقت اذیت پسند ہو رہے تھے۔ بولتے ہی جاتے تھے جبکہ وہ ششدر تھی۔ دادا کی نظر اس پر پڑی۔

"تمہیں کیا ہوا؟"

"آپ نے سبکتگین کے لیے یہ بات کہی... قرض والی۔"

"ہاں تو کیا غلط کیا؟"

"اور اگر اسے پتا چل جائے تو...؟"

"تو...؟" اسے کون بتا رہا ہے میں یا تم...؟"

"قرض اتارنا تو سبکتگین کو پڑتا نا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تو نہ اتارتا۔ کہہ دیتا۔ بڈھا مر کھپ گیا۔ وہ جانے اس کا کام جانے' پہلے ہی زندگی گناہوں کی پٹاری ہے

اک گناہ اور سہی۔" دادا کی آواز بھرا گئی۔
"دادا۔۔۔!" وہ بے چین ہو کر ان سے لپٹ گئی۔
"ہٹ جاؤ۔۔۔" دادا کسمسائے۔" مجھے جذباتی کرنے کی ضرورت نہیں۔"
"چھوڑیں دادا! اس وقت صرف یہ بتائیں' زینیا آ رہی ہے۔ کیا تیاری کروں؟"
"فریج خالی کر دو۔۔۔ اکیلی تو آئے گی نہیں۔ وہی حسب معمول کنوؤں کے بورے۔" دادا کا دل واقعی جلا ہوا تھا۔
"فریج کیوں۔۔۔ کسی سے ریڑھی مانگ لاتے ہیں۔ دس نمبر کے اسٹاپ پر سبکتگین کو کنوؤں کے ساتھ بھیج دیں گے۔" شام تک قیمت وصول۔۔۔" وہ شرارت پر آمادہ تھی۔ پردادا اچھل پڑے۔
"سبکتگین اب ریڑھی لگائے گا۔ میرا اتنا قابل پوتا۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے حورے؟" وہ واقعی غصہ ہو گئے۔
"مذاق کر رہی تھی۔" وہ منمنائی۔
"مذاق میں بھی ایسی بات نہیں کرتے۔"
"آپ بھی تو زکوٰۃ لینے والی بات کرتے تھے۔ بڑی پھپھو سے چھوٹی پھپھو کے لیے۔" اسے وہ بات واقعی بہت معیوب لگی تھی۔ (دل کو چھری کی طرح کاٹتی ہوئی)
"وہ تو بس یونہی۔" دادا بھی جلا کٹا بول بول کر تھک گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

دادا کے کسی جاننے والے نے سائٹ کی کسی گارمنٹ کمپنی میں کوالٹی چیکر کی جاب بتائی تھی۔ تنخواہ مناسب تھی۔ بہت زیادہ امید بھی تھی۔
وہ منیجر سے ملا۔۔۔ کالا' موٹا' بھدا اور کچھ کچھ کرپٹ دکھائی دیتا شخص۔۔۔ سبکتگین اندر داخل ہوا تو وہ سر جھکائے کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ سلام پر اس نے نظریں بے ساختہ اٹھائیں تو خود بھی کھڑا ہو گیا۔ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔
"جی میں سبکتگین معراج۔۔۔ زیدی صاحب نے آپ سے ملنے کا کہا تھا۔"
"اوہ۔۔۔ منیجر بری طرح چونکا' اس نے اپنا ہاتھ جیب میں چھپا لیا۔ وہ خفت کا شکار ہوا تھا۔ کوالٹی چیکر کی جاب کے لیے آنے والے نوجوان کو وہ ایکسپورٹ والوں کا افسر سمجھا تھا۔
یا کسٹم آفیسر۔۔۔ یا ڈاکٹر صاحب یا اوہو۔۔۔
اب سبکتگین کا کیا قصور۔۔۔ اللہ نے اسے صورت ہی افسروں والی دی تھی۔ حالانکہ اس نے دسیوں دفعہ کی دھلی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ لیکن دھلی نہ بھی ہوتی تو۔۔۔ ہیرا کوئلہ میں بھی دمکتا ہے۔
"بیٹھو۔۔۔" اس کی آواز بھی بدل گئی تھی۔ پہلی نظر کے متاثر کن اور فدویانہ انداز کی جگہ اب ایک رعب ودھونس اور بے نیازی نمایاں تھی۔
"جی سر۔۔۔"
"پڑھے لکھے لگتے ہو۔"
"جی۔۔۔!" اس نے اختصار سے کام لیا۔
کتنا؟
"گزارے لائق سر۔۔۔"
"ہُم۔۔۔!" منیجر نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں جوڑ کر بننے والے دائرے کو بغور دیکھنا شروع کر دیا۔
"اس فیلڈ کا کچھ تجربہ۔۔۔؟"
کام کروں گا تو تجربہ بھی ہو جائے گا۔"
"یہ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ٹیکسٹائل ڈیزائننگ یا گارمنٹ ڈیزائننگ سکھانے والا اسکول نہیں ہے برخوردار۔۔۔
"میں جانتا ہوں سر۔۔۔!" سبکتین نے گہری نظر سے اسے دیکھا۔ منیجر نے انٹرویو اسٹارٹ کر دیا اور سبکتگین جس نے پڑھائی والے سوال کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے جان لیا' یہ نوکری ملنے والی نہیں ہے۔ اس نے اپنی تعلیمی قابلیت اور ڈگریوں کی فہرست رٹو

طوطے کی طرح سنادی
منیجر کے چہرے پر حسد کے بعد استہزا اور آیا۔
"چھوڑو یار... یہ نوکری شوکری۔ اچھے خاصے گڈ لکنگ ہو۔ کسی ڈرامے شرامے میں کام کیوں نہیں کرتے۔"
سبکتگین نے چونک کر منیجر کو دیکھا اور غیر محسوس طریقے سے سی وی والی فائل پر ہاتھ رکھ دیے۔
"کرلوں گا سر... اگر کوئی کام دے تو۔"
"تمہیں ٹرائی کرنا چاہیے۔"
"جی" اس نے فائل زانو پر رکھ لی۔
"سر! آپ کا کوئی جاننے والا ہے میرا مطلب ہے کسی چینل پر یا پروڈکشن ہاؤس میں..."
"ارے نہیں یار!" منیجر نے قہقہہ لگایا۔ وہ جھینپ گیا تھا اور اسے حد سے زیادہ برا لگا تھا۔
"تو پھر کیسے سر... بنا جان پہچان کے تو کوئی چینل والی سڑک پر سے گزرنے بھی نہیں دیتا۔"
"او یار... تمہیں جان پہچان یا سفارش کی کیا ضرورت ہے۔ تمہاری تو شکل ہی تمہاری سفارش ہے۔"
"نہیں سر!" وہ کھڑا ہو گیا۔ "شکل سفارش نہیں ہو سکتی۔ جب میری فائل' میری یہ سی وی میری ملازمت کے لیے سفارش نہیں بن سکی تو میری شکل بھی میرے کسی کام کی نہیں۔"
سبکتگین خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اس کی صورت پیاری تھی۔ بچپن میں اماں نے بتایا تھا۔ پھر کلاس میں ٹیچرز بھی بہت پیار کرتی تھیں۔ دادا زبردستی اس کے ماتھے پر یہ بڑا کالا ٹیکہ لگوایا کرتے تھے۔ پھر جوانی کے دنوں میں ایک ایسا دور بھی آیا جب آئینہ چیخ چیخ کر بتانے لگا۔ سوہنیو... اوہو... ہو۔
یونی ورسٹی میں اسے پرنس کہتے تھے اور لڑکیاں اسے کن اکھیوں سے دیکھتی تھیں اور پھر گھر میں حورے جو ان گنت بار ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی' رنگے ہاتھوں پکڑے گئی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ رعب سے پوچھتا۔
"کچھ نہیں..." وہ صاف مکر جاتی۔
وہ حالات کا ستایا گردو پیش سے' اپنے آپ سے بے خبر ضرور تھا۔ مگر اتنا اندھا اور کم عقل بھی نہیں تھا کہ منیجر کی خود پر پڑی حاسدانہ نگاہوں کا مطلب نہ سمجھتا۔ منیجر کے بے ساختہ کھڑے ہونے اور پھر سٹپٹا کر بیٹھتے وقت ہی وہ جان گیا تھا۔ یہاں سے کچھ نہیں ملنے کا۔
اور اب بس کے انتظار میں کھڑا اس کا گورا رنگ سرخی میں بدل رہا تھا۔ بس آگئی مگر یہ کیا۔
اس نے کھچا کھچ بھری بلکہ ابلتی بس کو دیکھا۔ کیا پیدل چل پڑے۔ مگر کہاں تک سائٹ ایریا کے جی سی ٹی کالج سے لالو کھیت دس نمبر... خالی پیٹ "نہیں بابا' نہیں ہو سکتا۔"
"ٹائم خراب مت کرو' اوپر آجاؤ' پیچھے گاڑی نہیں ہے۔" کنڈیکٹر نے اسے چونکایا۔
"اوہ...!" اس کی نظریں اوپر اٹھیں' چھت پر بیٹھے مسافر... کسی ایک نے ہاتھ بڑھا دیا کہ وہ اپنی فائل دے دے اور اس نے دے دی' ایک پیر پائیدان پر جمایا' دوسرا سیڑھی پر' تیسرا سیڑھی پر اور یہ چھت کے اوپر... اور وہ پہلی بار چھت پر بیٹھ کر سفر نہیں کر رہا تھا' مگر اس طرح پینٹ شرٹ ہمراہ فائل... اب وہ شہر کو ذرا بلندی سے دیکھ رہا تھا۔
بس اب ناظم آباد کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ دونوں طرف پانچ چھ منزلہ عمارتیں' پھر لالو کھیت کی فرنیچر مارکیٹ اور یہی اس کا اسٹاپ تھا۔
اور گھر میں دادا... اور حورے... وہ سوال پوچھتے تو مشکل... اور نہ پوچھتے تو اور زیادہ مشکل...
تو ایسا نہ کرے' ایک اور ٹکٹ کٹائے' جہاں تک بس جائے' وہ بھی ساتھ جائے' مگر جہاں تک بھی چلا جائے گھر تو لوٹنا ہی ہوتا ہے۔
اور کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے یہ احساس کہ اپنے ہی گھر لوٹتے وقت قدم لڑکھڑائیں' اپنے ہی گھر جانے کا

دل نہ کرے' اپنی ہی گلی بری لگے' اپنے ہی لوگوں سے نظریں نہ ملائی جاسکیں۔

☼ ☼ ☼

لائٹ چلی گئی تھی۔ اس نے کمرے کی بالکنی میں کھلنے والی کھڑکیاں کھول دیں۔ وہ بالکنی میں کرسی پر بیٹھ کر وال چننے لگی۔

نیچے گلی میں وہی لکڑیوں کی اٹھا پٹخ۔۔۔ شور۔۔۔ زندگی رواں دواں تھی۔ جمود بس اسے اپنے گھر میں لگتا تھا۔ ہاں اب یہ جو زینب کی آمد نے ہلچل پیدا کی تھی۔ وہ خوش تھی۔

زینیا سے کہیں بچپن میں ملاقات ہوئی تھی۔ جب وہ چھوٹی تھی اور پھپھو کے ساتھ لگ کر آئی تھی۔ دادا کا اعتراض اپنی جگہ مسلم تھا۔ "یہاں وہ کس چیز کا مزہ لے گی۔ بوڑھے نانا کے پاس تو وہ عیش و آرام نہیں' جو اپنے گھر میں باپ نے دے رکھا ہے۔ غریب بھی ہوں اور بیمار بھی۔۔۔ وہ باغ باغیچوں کی مالک اور ہماری گیلری کے چار گملے ہیں' وہ بھی صحیح سے نہیں پنپتے۔"

"اللہ دادا۔۔۔ آپ کیا کیا سوچتے ہیں۔"

"بالکل صحیح سوچتا ہوں۔ وہ رہے گی کہاں؟"

"میرے ساتھ میرے کمرے میں۔۔۔" سبکتگین سے کہہ کر اس نے ایک چارپائی ڈلوا کر پیازی پھولوں والی بیڈ شیٹ بھی ڈال دی تھی۔

اور دیگر گھر کی تفصیلی صفائی بھی کروائی تھی۔

"وہ ملنے آرہی ہے یا انسپکشن کرنے۔۔۔" اس کی تیزی کو دیکھتے ہوئے سبکتگین نے پوچھا تھا۔

"اللہ۔۔۔ مہمان کے استقبال کی تیاری تو کرتے ہیں نا۔۔۔"

"تیاری اور ایمرجنسی کے نفاذ میں فرق ہوتا ہے۔" اس نے تصحیح ضرور سمجھی۔

"ایمرجنسی کی بات نہیں ہے سبکتگین۔۔۔ روٹین سے کچھ ہٹ کر مہمان کی عزت افزائی ہوتی ہے۔ اسے بھی یہ احساس ہو کہ جو اتنی دور سے چل کر آرہا ہے۔ اس کے لیے ہم بھی منتظر ہیں۔ دیدہ و دل وا کیے منتظر ہیں۔"

"عید کارڈ لکھ رہی ہو۔۔۔ دیدہ و دل۔۔۔ منتظر۔۔۔" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"ارے نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔۔۔ "لیکن اس سے ہمارا کیا جاتا ہے کہ ہم اسے کچھ خاص ہونے کا احساس دلائیں' دل خوش ہوتا ہے۔"

"اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہیں چھت پر لگا فانوس اتار دوں' تاکہ تم اسے بھی چمکا دو۔"

"ہاں اور اس میں نئے بلب بھی لگا دو۔۔۔ زمانے گزرے' بلب فیوز ہوگئے دوبارہ لگائے ہی نہیں۔۔۔"

"جو حکم۔۔۔" وہ اسٹول لے آیا۔ پیتل' لکڑی اور شیشوں کے چھوٹے ٹکڑوں سے بنا یہ فانوس دادا کے ہاتھوں کا بنا ہوا تھا۔

اس نے دادا کے سامنے بیٹھ کر ان کے ہنر کی بے حد تعریفیں کرتے ہوئے فانوس کی جھاڑ پونچھ کا کام کیا۔

سبکتگین نے نئے چھوٹے بلب بھی لگا دیے۔ کمرے کا پینٹ بہت سال پہلے کا تھا' مگر ان کے گھر میں کون سے بچے تھے جو دیواریں خراب کرتے۔ اس نے صرف گیلے کپڑے سے دیواریں دھوئیں۔ دھلے پردے لگائے' بالکنی کی چق کو مرمت کی ضرورت تھی۔ اس نے پرانی سندھی اجرک کے چوکور ٹکڑے کاٹ کاٹ کر اس طرح سے جوڑے کہ وہ ڈیزائن سا بن گئے۔

ساری کارروائی سے فارغ ہو کر اس نے فانوس کے بلب جلائے تو کمرہ جگمگ کرنے لگا۔

"واہ۔۔۔!" اس نے خوشی کے عالم میں تالی پیٹی۔ سبکتگین نے مسکرا کر اسے داد دی۔ واقعی اس کی محنت رنگ لے آئی تھی۔

"کیسا لگ رہا ہے دادا! آپ بھی تو بولیں۔"

"کیسا لگنا ہے۔" دادا کا لہجہ بے زار تھا۔ "غریب اپنی غربت کو چھپانے کے لیے ہمیشہ سلیقے کا سہارا لیتا ہے۔"

"دادا!" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ چہرہ اتر گیا۔

"کیا دادا! غلط تو نہیں کہہ رہا میں۔" وہ واقعی بہت افسردہ تھے۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو دادا..." سبکتگین کی نظریں اس کے اترے چہرے پر ٹکیں۔

"کچھ نہیں۔ سونے لگا ہوں... نہ سوؤں...؟" انہوں نے تخت پر لیٹ کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

سبکتگین نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں کون ہوتا ہے آپ کو منع کرنے والا... سوئیے ضرور سوئیے... بس حیران ہوں، مغرب کے وقت آپ کبھی سوتے تو نہیں..."

"جو کام کبھی نہ کیا ہو، وہ بھی کبھی کرنا پڑ جاتا ہے۔" دادا کی آنکھوں پر ہنوز بازو رکھا ہوا تھا، مگر بات بڑھائے جاتے تھے۔

"آپ ایسے کیوں ہو رہے ہیں دادا...؟" سبکتگین اپنی جگہ سے کھڑا ہوا وہ ان کے تخت پر جا کر بیٹھنا چاہ رہا تھا، مگر شٹ...

"اوہ...!" حورے کے منہ سے بھی تاسف زدہ پکار نکلی۔ لائٹ چلی گئی تھی۔ شیڈول سے ہٹ کر...

دادا نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دھیمے ہوتے پنکھے کے پر دیکھے۔ پھر ان دونوں کو "سجا لو گھر... جلا لو فانوس..."

سبکتگین خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا پھیلاوا سمیٹنے لگی، مگر اب انداز میں وہ جوش نہیں تھا۔ زینیا کی آمد کا سن کر اس نے دل سے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا اور دادا، وہ خط کے مندرجات پڑھتے جاتے تھے اور ماتھے پر تیوری گہری ہوتی جاتی تھی۔ بعد میں پھپھو کا فون بھی آ گیا۔ دادا کو کچھ سالوں سے کسی قدر کم سنائی دینے لگا تھا اور فون کا استعمال تو یوں بھی مشکل لگتا تھا۔ پہلے تو بہت لمبا سا کھینچ کر "ہیں... ہیں..." اور "کیا کیا" کرتے رہے۔ پھر فون اسے تھما دیا۔

پھپھو کہہ رہی تھیں۔ "میں وہی سب کہہ رہی تھی جو خط میں لکھ کر بھیج چکی ہوں، اکلوتی لاڈلی بیٹی ہے، اس کی فرمائش پوری کیے بغیر رہ نہیں سکتی۔ اسے کراچی دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔"

اس نے فون رکھ کر ساری باتیں دہرائیں۔ دادا کے منہ سنتے رہے۔ آخری جملے پر بھڑک اٹھے۔

"کراچی دیکھنے کا شوق ہے... کیوں..."

"لوگ نئے شہر دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں دادا!" اس نے آسان وجہ بتائی۔

"کوئی نیا شہر نہیں ہے۔ بالکل پرانا، بابے آدم کے زمانے کا ہے یہ شہر... اور دیکھنے کو کیا بچا ہے۔ کچرے کے ڈھیر... بند نالیاں اور گٹر... اور رکشے اور ٹریفک جام اور..."

"ہم زینیا کی آمد کی بات کر رہے تھے دادا...!" اسے احساس ہوا، موضوع سے ہٹ گئے تھے دادا...

"ہاں تو کیوں آ رہی ہے وہ..."

اور پھر دادا منہ سر لپیٹ کر پڑ گئے تھے۔ وہ زینیا کے ماں، باپ سے خفا تھے۔ پتا نہیں ناراضی درست تھی یا غلط... مگر عتاب کا نشانہ زینیا بننے والی تھی۔

"دوسری طرف سبکتگین نے زینیا کی آمد کی خبر اور دادا کا مذکورہ ردعمل اسی سے سنا۔ وہ اپنے جوش، دادا کے رویے پر حیرت۔ سب کا اظہار کر رہی تھی، وہ مسکرا دیا۔

"ہزار بار آئے بھئی... اس کے نانا کا گھر ہے آخر..."

"اور نانا ہی ماننے کو تیار نہیں ہیں۔" وہ بولی۔

"چھوڑو تم، وہ بس ایسے ہی غصہ ہیں۔ تم اپنی تیاری کرو۔"

اور اس کی تیاری صفائی، دھلائی اور جھاڑ پونچھ تک ہی محدود تھی۔ دادا تو ایسے اجنبی بن گئے تھے جیسے گھر کا حصہ ہی نہ ہوں۔ جبکہ سبکتگین نے اس کے ہاتھ میں تین ہزار روپے رکھے۔ "کچن کا سامان وغیرہ پورا رکھو۔"

"وہ تو پورا ہی ہے۔" دادا اکٹھا راشن ڈلوا دیتے ہیں۔" وہ نوٹوں کو ناسمجھی سے دیکھ رہی تھی۔

"او بابا... میرا مطلب ہے، وہ جو تم کباب وغیرہ بناتی ہو اور ——— رول وغیرہ... اور ہاں جیم بھی...." وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا جو حیرت زدہ تھی، تو سبکتگین کو سب یاد ہوتا تھا... کہ وہ کیا کیا کرتی ہے یا کرنا چاہتی ہے۔

یہ ہی تو وہ چاہ رہی تھی۔ کباب اور کوفتے فریزر ہو جاتے۔ چنے بھگو کر فریز کر لیتی اور کچھ خاص چٹنیاں... لیکن اگر وہ یہ فرمائشیں دادا سے کرتی تو وہ اسے لیکچر تو دیتے ہی، خفا بھی ہو جاتے۔

"تم یہ سب سامان بھی لا دینا۔" اسے بروقت سوجھا۔

"نہیں... تم دادا سے منگوانا نا... انہیں ہی گوشت کی پہچان ہے۔"

"وہ لا کر دیں گے؟ اور خفا ہوں گے۔"

"ہاں... چلو میں لادوں گا، بلکہ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں، لسٹ بنا کر ایاز کو بھجوا دو، وہ کارخانے کے کسی لڑکے سے منگوا دے گا۔ دراصل میں دو ایک دن مصروف ہوں تو...."

"نا... نہیں..." اس نے تیزی سے سر ہلایا۔ "ایاز سے نہیں... اس سے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں منگوالوں گی، تم پریشان مت ہو۔"

"تو ایاز لا دے گا نا... دادا بھی اسی کو اکثر کہہ دیتے ہیں۔" وہ حیرت سے اس کے بدکنے کو دیکھنے لگا۔

"ہاں... ٹھیک ہے، ایاز سے کہہ دوں گی منگوالوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔" اس نے بحث کے بجائے ہامی بھری... ارادہ قطعی نہیں تھا۔

"اور سنو... کھیر بھی بنا لینا، جو تم باداموں والی بناتی ہو۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"تمہیں پسند ہے، تم نے بتایا نہیں کبھی...."

"میرا خیال تھا، تمہیں پتا ہوگا۔"

"مجھے اندازہ تھا... پر تم کون سا دل کی بات پتا لگنے دیتے ہو۔" اس کے لبوں سے پھسلا۔

"اچھا...!" اس نے بے ساختہ نگاہ اٹھائی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے میں کھلی کتاب کی طرح ہوں۔ میرا اندر باہر سب عیاں ہے۔"

"کوئی نہیں...." وہ جھینپ مٹانے کو پیسے سنبھالنے کے بہانے مڑ گئی۔

سبکتگین کی نظریں اس کی پشت پر ٹک گئیں۔ اس کی کچھ الجھی چوٹی، سادہ سے پرنٹ کا سیاہ و سفید جوڑا... اس کے پیر اور شفاف ایڑیاں۔ پیاری تھی، تو سر سے پیر تک پیاری تھی۔ نازک اور شفاف....

"کوئی اور فرمائش....؟" وہ خود پر قابو پا کر مڑی۔

"نہیں، کوئی نہیں...." اس نے چہرے سے سارے تاثرات مٹا لیے۔ کرم کیا کہ ظلم، خبر نہیں.... "بلکہ تم بتاؤ۔ یہ پیسے کافی ہوں گے یا...."

"ارے نہیں، بہت ہیں... میں مینج کر لوں گی۔"

"مشکل میں پڑنے کی ضرورت نہیں... تم مجھ سے کہہ دینا...." وہ اسے ہمت دے رہا تھا۔

"کہہ دوں گی...." اس نے فرماں برداری سے سر ہلایا۔

خوش تھا سبکتگین... ورنہ زمانے گزرے وہ ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہیں دیتا، یا پھر یہ ہی میرا اندازہ کہ جس روز وہ دادا کو یا مجھے بھی خرچے کے حوالے سے یا کسی بھی کام کے لیے رقم دے تو خوش ہوتا ہے۔

اپنی جیبیں جھاڑ بھی دے، پھر بھی مطمئن ہوتا ہے۔

وہ کباب چڑھانے کے لیے دال چن رہی تھی اور اب یہ تھا کہ ذہن پر زور دے دے کر یاد کر رہی تھی، پچھلے چھ مہینوں میں... بلکہ پورے ایک سال میں وہ کب کب دل سے خوش ہوا تھا اور ہنسا تھا، دل سے... اور کوئی دیکھتا تو پوچھتا۔ "بی بی تم یہ بتاؤ" تمہیں یہ سب کیسے یاد ہے دن، تاریخ، وقت و موقع کے حساب سے...

اور پتا نہیں وہ جواب دے پاتی یا نہیں....

اور بھلے نہ دیتی چپ رہتی، مسکرا دیتی، نظر انداز کرتی، تب بھی آنکھ رکھنے والے جان جاتے، دماغ

والے سر ہلاتے اور دل والے... وہ کہتے۔ "ہمیں سب خبر ہے۔ ہمیں نہ بتاؤ... یوں ہی تو نہیں 'سب یاد رہتا' بلکہ... بلا سبب تو نہیں کہ کچھ بھولتا ہی نہیں... ہر انسان کی زندگی میں ایک شخص ایسا ضرور ہوتا ہے۔ جو سونے سے پہلے بھی یاد رہتا ہے اور سونے کے بعد بھی...

جاگنے سے پہلے بھی ساتھ ساتھ... اور جاگ جانے کے بعد بھی... ہمزاد بن جاتا ہے۔"

"ارے کب آئے گی لائٹ... کوئی جاکر کے الیکٹرک والوں سے پوچھے۔" دادا کی آواز پر وہ چونکی' مسکراہٹ سمٹ گئی' نہ جانے کہاں پہنچ کر واپس آئی تھی۔

"بیڑہ غرق کے الیکٹرک کا... لے کر دادا کی نیند توڑ دی۔ ابھی خاصی گہری نیند میں چلے گئے تھے' کوئی خواب ہی دیکھ رہے تھے جو ٹوٹا تو چہرے پر افسردگی نظر آنے لگی۔"

اور خواب تو وہ بھی دیکھ رہی تھی' جاگتی آنکھوں سے...



سبکتگین باہر سے لوٹا تھا۔ چہرے سے تھکان نمایاں تھی۔ اس نے پانی کی پوری بوتل خالی کردی' بال پریشان اور لباس شکنوں سے پُر ہونے کے باوجود وہ کچھ پُرسکون دکھائی دے رہا تھا اور تیز ہاتھوں سے آٹا مسلتی حورے کو وجیہ کچن کے اندر تک سنائی دے رہی تھی۔

"پکی نوکری کہاں ملتی ہے دادا... وہی تین مہینے کے لیے کچوں میں رکھا ہے' نوے دن یا سو دن..."

اسے کسی دوائی کمپنی میں نوکری ملی تھی۔ ایسی نوکریاں وہ کئی بار کرچکا تھا۔ تین مہینے پورے' نوکری پوری...

"وہی روٹین دادا... صبح آٹھ بجے نکلوں گا اور شام پانچ بجے چھٹی..." وہ ہاتھ منہ دھونے کھڑا ہو گیا تھا۔

"روٹی جلدی لے آؤ حورے... بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔"

"ہاں... بس تم فریش ہو کر آؤ..." اس نے چولہے کی آنچ بڑھائی۔

تازہ گندھا آٹا تھا۔ روٹی بنانی کچھ مشکل تھی۔ سارے گھر میں روٹی جھلانے کی تھپ تھپ آواز گونجنے لگی۔

دادا کے چہرے پر سکون تھا۔ دس بارہ ہزار مہینہ بعد ہاتھ آتے ہی... مگر... اس کے ٹیوشن والے چند لڑکے... دادا چونکے... وہ بال جھٹکتا آرہا تھا... دادا نے فوراً" پوچھ لیا۔

"میں منیج کرلوں گا دادا... آپ پریشان مت ہوں..."

"تم تھک جاؤ گے سبکتگین..." حورے سلاد کی پلیٹ لارہی تھی۔

وہ مسکرادیا' کچھ کہنے کے لیے لب کھولے' مگر دادا کی خفا آواز۔ چپ ہو گیا۔

"مرد نہیں تھکتا بھی... بے وقوف لڑکی! کام کرنا مردوں کی شان ہوتا ہے۔ سر پر دوپٹا لپیٹ کر تو عورتیں بیٹھتی ہیں' یہ بھی کوئی..."

دادا شروع ہو گئے تھے۔ حورے دادا کو گھورنے لگی۔ سبکتگین نے سر جھکا کر منہ میں کھیرا لیا۔

"روٹی جل گئی ہے' نالائق لڑکی... تم مجھے گھورو..." دادا دھاڑے' حورے اندر بھاگی۔



تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔

شاہکار ہی تو تھی زینیا مختار... اس نے اسے بہت بچپن میں دیکھا تھا۔ وہ بہت دبلی پتلی اور پتلے نقوش کی حامل سانولی بچی تھی۔ پر اب جو یہ سامنے تھی۔

یہ بچی نہیں' ایک جوان لڑکی تھی اور سانولی تو کہیں سے نہیں تھی۔ گوری بھی نہیں تھی' مگر چمک خوب رہی تھی۔ دبلا پتلا وجود اب اسمارٹ کہلایا جاتا اور پتلے نقوش بہت دل فریب تھے۔ نازک ناک اور پتلے ہونٹوں پر گھنی پلکوں والی بڑی کچھ زیادہ ہی بڑی

آنکھیں۔
سبکتگین اسے اس کی پھپھو کے گھر سے لایا تھا۔ وہ سامان کے ہمراہ پیچھے تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اندر آئی۔ دادا بے تاثر' سنجیدہ چہرہ لیے بیٹھے تھے۔ قدموں کی چاپ پر کھڑے ہوگئے۔ وہ نظر آئی۔ اس نے دونوں کو دیکھا۔ ہاتھ میں لٹکتا بڑا ہینڈ بیگ زمین پر چھوڑ کر دونوں ہاتھ پھیلا کر خالص فلمی انداز میں بھاگ کر دادا سے لپٹ گئی۔
"نانا... میرے نانا..."
"اللہ خیر..." اس نے حلق تر کیا۔ دادا سے کیا بعید... اتنے دنوں سے انہوں نے جو طوفان اٹھا رکھا تھا۔ پر یہ کیا... نواسی کے فلمی جملے کا جواب اتنا زیادہ فلمی...
"میری بچی...!" وہ لپٹے جاتی تھی' دادا لپٹائے جاتے تھے۔
"میری گڑیا...!" دادا نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما' پھر ماتھا بھی چوم لیا۔
ہائے اللہ جی... وہ سچ تھا یا یہ جھوٹ ہے۔
"وہ سب جھوٹ تھا اور یہ سچ ہے..." اس کی بڑبڑاہٹ سبکتگین تک پہنچ گئی تھی۔ کان میں پھونک کی طرح جواب آیا... اتنی قربت۔ وہ کچھ گڑبڑا کر سرک گئی۔
"ہو سکتا ہے یہاں نانا' نواسی کا ایک ڈوئٹ بھی ہو جائے۔"
"ڈوئٹ نانا نواسی کا..." اسے سبکتگین کی ذہنی حالت پہ شک ہوا۔
"ہاں لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں' ایسا کوئی گانا ہندوپاک دونوں جگہ نہیں ہے۔" وہ بہت سنجیدگی سے اس سے جواب چاہ رہا تھا اور اس کی سوئی بھی سنجیدگی سے اٹک گئی تھی۔

"تیرے میرے پیار کا ایسا ناتا ہے۔ دیکھ کے تیری صورت دل کو چین آتا ہے۔"
وہ زیر لب گنگنائی۔

ادھر دادا' زینیا کو بازو کے گھیرے میں لیے لیے تخت پر جلوہ افروز ہوگئے۔
"بیٹا حورے... بہن کے لیے پانی وانی لاؤ۔"
"بہن... کل تک تو وہ لڑکی تھی اور آج بہن ہوگئی۔"
"اور اس سے تو تم واقف ہی ہوگی۔" اس نے لال سرخ روح افزا کا گلاس بڑھایا' تب دادا کو تعارف یاد آیا۔
"ہاں یہ عرشیہ..."
"اوں ہوں... عرشیہ نہیں... یہ حورے ہے... حور عرش... عرشیہ تو اس کی ماں میری ضد میں پکارتی تھی۔"
"ہاں میں یہ ہی سوچ رہی تھی۔ اس کا پورا نام کچھ عجیب مشکل ہے۔"
وہ الجھے' مگر دوستانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔ وہ مسکرا دی' اسے یہ جملہ سننے کو ملتا ہی تھا اپنے نام کے حوالے سے...
"کوئی مشکل نہیں ہے۔ تم حورے کہنا میری طرح..."
"حورے... اوکے... تو حورے تم کیسی ہو..."
"میں ٹھیک ہوں..." وہ کچھ جھینپ گئی۔
"اور یہ سبکتگین ہے... تعارف تو ہو گیا ہوگا نا..."
(دادا کے پیش نظر دونوں کا ساتھ آنا تھا۔)
"ہو گیا تھا نانا... مگر اب اس کا بھی نک نیم بتا دیں۔ بڑا مشکل نام ہے۔" وہ بے چارگی سے بولی۔ دادا سمیت سب کی ہنسی نکل گئی۔
"رحم دل بادشاہ کہہ لوں..." اس نے آپشن دیا۔
"رحم دل بادشاہ' وہ کیوں بھئی...؟" دادا نہ سمجھے' جبکہ وہ دونوں مسکرانے لگے تھے۔
"بچپن میں نیک دل بادشاہ کی کہانی پڑھی تھی۔ وہ جو ہرن کا بچہ شکار کر کے قید کر لیتا ہے' مگر ماں کی آنکھوں کا دکھ' آنسو اور تڑپ دیکھ کر بچہ چھوڑ دیتا ہے۔ وہ بادشاہ سبکتگین ہی تھا نا..."

"اوہ ہو۔۔۔" دادا نے سمجھ کر سر ہلایا۔

"بس میں تو رحم دل بادشاہ ہی کہوں گی۔۔۔" میں نے فیصلہ سنا دیا۔

"جو دل چاہے کہنا۔۔۔" دادا نے فری ہینڈ دے دیا۔

سبکتگین نے شانے اچکا کر حور عرش کو دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ ابھی تو اسے آئے چند منٹ ہی گزرے تھے۔ مگر پتا لگ گیا تھا۔ وہ اندازوں' قیافوں سے بالکل الگ تھی۔

مہو پھپھو اسی شہر میں پیدا ہو کر پل بڑھ کر بھی کنوؤں کے باغ کی چوہدرائن لگنے لگی تھیں۔ ان کے خالص اردو لب ولہجے پر پنجابی تلفظ کا رنگ چڑھ گیا تھا۔ سوتینوں کا خیال تھا۔

وہ سرگودھا کی جٹی ہو گی' مگر وہ سرگودھن تو تھی' مگر جٹی ہرگز نہیں' بعد میں یہ خیال درست بھی ثابت ہوا۔



"تم بہت اچھا کھانا بناتی ہو حور عرش۔۔۔" زینیا کے ہاتھ میں بھری ہوئی پلیٹ پکوڑوں کی تھی۔

"شکریہ۔۔۔" وہ بہت احتیاط سے پکوڑے کڑاہی سے نکال رہی تھی۔

"کس سے سیکھا؟"

"کسی سے بھی نہیں۔۔۔ خود ہی آگیا۔" اس نے آنچ دھیمی کی اور پوری طرح سے متوجہ ہوئی۔

"امی کہتی ہیں' کھانا بنانا سیکھ لوں' ورنہ اگلے گھر جا کر ماں کی ناک کٹواؤں گی۔ میں نے کہا۔ کسی کی اتنی ہمت کہ میری ماں کی ناک کاٹے۔۔۔ کاٹنی ہے تو میری کاٹے فالٹ تو مجھ میں ہے نا۔"

"توبہ۔۔۔" اس کی تشریح پر حورے ہنستی چلی گئی۔

"سارا دن گھر میں رہ کر بس یہ ہی سب کام کرتی ہو' تم بور نہیں ہوتیں؟"

"بور کیوں ہونا ہے۔ کام ہی ختم نہیں ہوتے۔"

اس نے شانے اچکائے تھے۔

"ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔" اسے کچھ دھیان آیا۔ "تم ایف بی پر ہو۔"

"ایف بی۔۔۔؟ اوہ اچھا فیس بک۔۔۔ نہیں میرے پاس تو موبائل بھی نہیں ہے۔"

"واٹ۔۔۔ رئیلی۔۔۔ اسٹرینج۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ یقیناً" اس میں اتنی حیرت کی بات کی ہے۔" اس نے اسی کے انداز میں پوچھا۔

"یار آج کے زمانے میں کون ایسے رہتا ہے۔" وہ شاید ٹھیک کہہ رہی تھی۔

"کون مطلب۔۔۔ میں رہ رہی ہوں نا۔۔۔" وہ دوبارہ کڑاہی سے پکوڑے نکالنے لگی۔

"تو۔۔۔ تو تم فارغ وقت میں کرتی کیا ہو؟"

"فارغ وقت تو ملتا ہی نہیں۔۔۔ اور اگر کبھی ملے تو میں بالکنی میں بیٹھ کر نیچے لوگوں کو دیکھتی ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے ایسے۔۔۔ اخبار پڑھتی ہوں اور اگر لائٹ ہو تو دادا کے ساتھ بیٹھ کر نیوز دیکھ لیتی ہوں۔"

"ٹی وی بھی دیکھا تو نیوز۔۔۔ او خدا۔۔۔" زینیا نے سر پر ہاتھ مارا۔۔۔

"نیوز سے بڑی انٹرٹینمنٹ اور کون سی ہوتی ہے آج کل۔۔۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" زینیا دروازے سے ہٹ گئی۔ پکوڑے بن چکے تھے۔

دادا نماز کے لیے گئے تھے۔ حورے نے ان کا حصہ ڈھک دیا اور ایک ڈھیر زینیا کی پلیٹ میں اور ڈال دیا۔ زینیا خوش خوراک تھی اور ساتھ ہی خوش قسمت بھی' جو بھی تھا سب ہضم۔۔۔ اسے موٹاپے کے خطرات نہیں تھے۔

دونوں بالکنی میں آگئیں۔

"تم تو بالکل بھی اپ ڈیٹ نہیں ہو۔ یہ بتاؤ اب شلوار قمیص کون پہنتا ہے۔" وہ اسے تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

"شلوار قمیص۔۔۔" اس نے بری طرح چونک کر خود کو دیکھا۔ "سب ہی پہنتے ہیں۔"

"کوئی نہیں پہنتا۔" زینیا کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"اب تو لڑکیاں ٹائٹس ٹراؤزر سگریٹ پینٹس اور پلازو پہنتی ہیں۔ شلوار آؤٹ آف فیشن ہے۔"

حورے کی نگاہیں اس پر اٹھ گئیں۔ وہ ٹائٹس پر گول دامن کی قمیص اور چنے ہوئے دوپٹے میں تھی۔ اس کے نازک اور لمبے سراپے پر یہ لباس بہت جچ رہا تھا۔ نازک سی اسٹائلش فلیٹ جوتی۔ جس نے ایک دو انچ چوڑی پٹی کی صورت صرف پیروں کی انگلیوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔

کلائی پر چوڑے اسٹیپ والی بڑی سی گھڑی۔۔۔ شفاف لمبی گردن میں سونے کی دمکتی چین۔۔۔ کانوں میں سکے کی شکل جیسے ٹاپس تھے۔ جن پر لگی لکیریں اس کی شرٹ سے میچ ہوتی تھیں۔

اور جس دن وہ آئی تھی' تب وہ جینز کے اوپر لمبی اے لائن لینن کی قمیص اور دوپٹے میں تھی۔ پیروں میں سیاہ ویلوٹ کے جالی والے بند جوتے۔ سیاہ رسٹ واچ۔۔۔

منہ دھونے کے لیے مہنگا فیس واش۔۔۔ اور پھر وہ برانڈڈ نائٹ کریمز۔۔۔ اور سب سے زیادہ متوجہ کرنے والے پرفیومز۔۔۔ ایسی دلفریب مہک کہ حورے کو اپنا کمرہ عطر کی دکان لگنے لگا تھا۔ اجنبی سا مسحور کن احساس۔۔۔

وہ حور عرش سے عمر میں کم تھی۔ دبلے سراپے اور شوخی و بانکپن میں اور بھی چھوٹی دکھائی دیتی۔ حورے چھبیسویں برس میں تھی۔ جبکہ وہ اکیس برس کی تھی۔

لیکن وہ تو اکیس چھوڑ سترہ برس میں بھی' ایسی شوخ و شنگ تتلی نہیں رہی تھی۔ بلکہ وہ تو کبھی بھی تتلی نہیں تھی۔ بس ایک عام سی لڑکی۔۔۔

بہت بچپن میں ماں باپ کے درمیان کی بیچ خلش۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی' مگر نظر آتی تھی۔ پھر ماں کا اسے چھوڑ کر چلے جانا۔۔۔ بہت بڑا صدمہ تھا اور پھر یہ کہ ماں نے کبھی پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔ بہت بڑا روگ بن گیا تھا زندگی کا اور باپ۔۔۔ ہاں وہ الحمدللہ حیات تھا' مگر وہ اپنی خود کی ایک دنیا بسا چکا تھا۔

جس میں بیوی بچے سب تھے۔

وہ بچپن سے تنہائی کاٹتی بے بس و بے اختیار لڑکی تھی۔

قانع و شاکر۔۔۔

جوانی کے دن تو اس پر بھی آئے تھے' مگر جس طرح چپکے سے آئے' چپکے سے چلے بھی گئے اور ٹھہر کر کرتے بھی کیا؟

وہ اپنے خول میں سمٹی لڑکی تھی۔ ماں نہیں تھی۔ باپ بھی نہیں تھا۔ بہت سی ایسی باتیں تھیں جو ماں' باپ ہی سے کی جاتی ہیں۔ وہ انہیں اندر دبالیتی تھیں' پھر جب اتنی ضروری باتیں وہ نہ کرسکی تو غیر ضروری کرنی بھی چھوڑ دیں اور پھر عادت ہی نہ رہی۔ دادا اور سبکتگین سے کیا کیا کہتی؟

اور زینیا نے فقط دو دن اس کے ساتھ گزار کر تیسرے دن کہہ دیا۔ اسے فیشن کا نہیں پتا اور وہ اچھے رنگ نہیں پہنتی۔

حورے قناعت پسند تھی۔ اس کے پاس یہ جواب موجود تھا کہ اچھے رنگ اچھے پیسوں سے ملتے ہیں۔ غریب کے گھر کا تو گلاب بھی پورے رنگ سے نہیں مہکتا۔ گیندا بھی پھیکا ہوتا ہے جیسے۔ کسی نے رنگ نچوڑ دیا ہو۔ مگر یہ بہت تلخ جواب ہوتا اور اسے کیا ضرورت کہ گھڑی بھر کی مہمان کے آگے حقیقت پسندی کی تلخی بیان کرتی۔۔۔ ہاں مگر اکیلے میں جب سوچنے بیٹھی۔۔۔ تب دل اتنا دکھا کہ بند ہونے کی کسر رہی۔

رنگ پیسوں سے تو آتے ہی ہیں۔ مگر رنگ تو مائیں خریدتی ہیں۔ اپنی بیٹیوں کے لیے لاڈ سے پیار سے۔۔۔

گلابی۔۔۔ دھانی' سرخ۔ اللہ صرف بیٹی بنا کر زمین پر بھیجتا ہے' وہ مائیں ہوتی ہیں جو سجا سنوار کر انہیں پریاں کردیتی ہیں۔

اور اس کی ماں۔۔۔

تائی اس کے لباس و خوراک کا خیال رکھتی تھیں اس سے محبت بھی کرتی تھیں۔ مگر ایک بیوہ عورت کی زندگی سے بھی رنگ اڑ جاتے ہیں۔ پھیکے' بے رنگ'

بد مزہ رنگ وہ جس ہلکے رنگ کے تھان سے اپنے لیے ٹو پیس کٹواتیں اسی سے اس کے لیے بھی اور اپنا سینے بیٹھتی تو اس کی قمیص پر بھی برابر کی کٹنگ کرتی جاتیں ڈھیلے ڈھالے ... اور اب وہ عادی ہو چکی تھی ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص کی' سو یہ ایک نیا جرم بھی آپ کے بہت سے جرائم میں شامل ہوا امی۔

وہ آنکھوں پر ہاتھ پھیر کے اٹھ گئی۔

باہر زینیا دادا کو اپنے تختی برابر موبائل پر نجانے کیا دکھا اور سنا رہی تھی۔ دادا کی ہنسی اور دلچسپی عروج پر تھی۔

تو پتا چلا زندگی کو تبدیلی درکار تھی۔

زندگی چاہتی ہے کہ ذرا رک کر باہر بھی جھانک لیا جائے' یہ ضروری ہوتا ہے ارتقا کے لیے... جینے کی وجوہات ملتی ہیں۔

وہ بھی اپنے دائرے میں خوش تھی۔ مگر ایک زندگی دائرے سے باہر بھی تو تھی اور زینیا مختار کی آمد نے وہ دروازہ کھول دیا تھا۔



"ہم شاپنگ پر جا رہے ہیں نانا... آپ کے لیے کیا لائیں؟"

"میرے لیے..." نانا حیران ہوئے۔

"ہاں آپ کے لیے اور تم اب کیوں دیر کر رہی ہو۔" وہ حورے کی طرف مڑی۔

"نا۔ نہیں کوئی دیر نہیں... بس دادا کے لیے چائے بنا کر فلاسک میں ڈال رہی تھی۔"

"ہاں وہ تو نظر آ رہا ہے مگر ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔"

"میں تیار ہوں زینیا مختار!"

"اور میں حیران ہوں حور عرش..." وہ اسے سرتاپا دیکھ رہی تھی ٹھوڑی پہ ہاتھ جما لیا تھا۔

"میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" وہ اعتماد سے بولی۔

"اور ویسے بھی میں نے عبایا لینا ہے' اندر جو بھی ہو چلے گا۔"

"عبایا....!" وہ حیران رہ گئی۔ "پر میں نے تو صرف دوپٹا لیا ہے۔" وہ کچھ فکر مند ہوئی۔
حورے مسکرائی۔ "تم ایسے ہی ٹھیک ہو بس سر پہ اچھی طرح سے اوڑھ لو۔"
"ویسے میں نے نوٹ کیا ہے کراچی میں عبایا کا استعمال بہت زیادہ ہے۔" وہ کمرے میں آکر عبایا پہننے لگی تھی اور زینیا پیچھے پیچھے تھی۔
"ہاں ہے تو۔"
"اور یہاں بسوں میں عورتوں اور مردوں کے لیے الگ پورشن ہوتے ہیں۔"
"ہاں.... ہوتے ہیں۔"
"پنجاب میں نہیں ہوتے' آپ کے ساتھ کوئی بھی ساجھا گاما جڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔"
"ارے نہیں.... "حورے کے ہاتھ رکے۔
"کراچی میں اگر کبھی غلطی سے بھی ایسا ہو جائے بلکہ غلطی چھوڑو لیڈیز پورشن میں جگہ ہو بھی تب بھی مرد اس طرف نہیں آسکتے۔ ڈنڈا پکڑ کے بس گرتے پھریں گے مگر جنگلے کے پار نہیں آسکتے۔"
"چلیں...."
"ہاں ہاں میں تو کب سے ریڈی ہوں۔" وہ پنجوں کے بل اونچی ہوئی۔ "اچھی لگ رہی ہوں ناں۔"
"ہاں...." تعریفی جملے حورے کے حلق میں اٹک گئے۔ قمیص کے پیچھے کمر سے نیچے دامن تک 'ایک بڑا ہٹا کٹا مرغا بنا.... نہیں مرغا نہیں یہ مور تھا۔
یہ کیسی قمیص ہے؟" اس کی آواز پھٹی پھٹی سی تھی۔
"اچھی قمیص ہے۔ میں مورنی ہوں۔" اس نے گردن اٹھائی۔ وہ بات کرتے کرتے کامن میں آگئی تھیں۔
"ہاں اس میں کیا شک...." دادا اپنے کسی معجون کی ڈبی کے اندر پوری آنکھ گھسائے ہوئے تھے۔ آوازوں پر سر اٹھایا' مورنی کی بات کی تائید فوراً" فرمائی "اتارو اسے فوراً"...."
"ارے واہ.... کیوں؟ اتنے شوق سے پہنی ہے۔"
وہ دور ہو کر کھڑی ہو گئی۔
"لڑکے آوازیں کسیں گے۔ مورنی کہیں گے زینیا۔

"کہنے دو.... میں انہیں کوا کہہ دوں گی.... یہ کراچی کے لڑکے اتنے کالے کیوں ہوتے ہیں۔"
"ہائیں!" حورے کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "کالے تو نہیں ہوتے سبکتگین کتنا گورا ہے۔"
"ہاں.... وہ تو واقعی گورا ہے۔"
"میں خود بہت گورا تھا یہ تو بڑھاپے اور شوگر اور بلڈ پریشر اور دل نے اس حال پر پہنچا دیا ورنہ...." دادا کو بھی الزام چبھا تھا اپنے دونوں ہاتھ ناخن چیک کرانے کے انداز میں آگے کر دیے۔
زینیا نے بغور دیکھا پھر صورت دیکھی اور کسی حد تک مانتے ہوئے اقرار میں گردن ہلا دی۔
"نیچے ایاز بھی گورا ہے۔" دادا کو دوسرا ثبوت بھی فوراً" یاد آگیا۔ حورے کا چہرہ تن گیا۔ یہ دادا بھی ناں اچھا خاصا وہ بھولے ہوئے تھی یاد کروا دیا اور ابھی سیڑھیاں اترتے ہوئے بھی وہ ساتھ ہی کرسی ڈال کر بیٹھا ہو گا۔ کھٹکے پر چونک کر اٹھے گا اور دیکھنا شروع کر دے گا۔
دیکھتا تو وہ یقیناً" پہلے بھی ہو گا۔ مگر رشتے والی بات کے بعد سے حورے کو زیادہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اللہ کرے کہیں گیا ہوا ہو.... اس کے دل سے دعا نکلی۔ مگر پوری کیسے ہوتی.... دوسری طرف کتنے دنوں سے ایاز سوچ رہا تھا وہ نظر نہیں آئی۔ بس ایک جھلک اللہ میاں۔

یا اس کی طلب سچی تھی۔ یا وہ اللہ کو زیادہ پیارا تھا۔
وہ نیچے کرسی پر سینے پہ ہاتھ باندھے بیٹھا تھا۔ دیکھنے والوں کو لگتا تار پر بیٹھی چڑیوں کو تک رہا ہے۔ چوں چیں مارتی چہچہاتی چڑیاں۔ پر کدھر جی.... وہ تو سیڑھیوں کے اختتام پہ لگے۔ سیاہ جالی کے دروازے کو دیکھتا تھا۔ کچھ آوازیں نیچے آرہی تھیں۔ دادا' پوتی کے علاوہ ایک تیسری آواز مظفر معراج کی نواسی آئی ہوئی تھی۔ اس کی مصروفیت رہی ہو گی۔

جو حورعرش نے بالکنی میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ ورنہ وہ بالکنی میں آتی تھی‘ تین چار گملے اسٹینڈ میں لگے تھے ان میں پانی ڈالتی۔ چڑیوں کے لیے آب خورے لٹکائے ہوئے تھے۔ پانی بدلتی باجرہ ڈالتی۔ وہ بالکل صاف دکھائی دیتی تھی۔

اور وہ نظر آجانے کی آس میں بالکنی کے نیچے کرسی ڈال کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ سر اٹھا کر دیکھتا تو چوری بھی پکڑی جاتی اور دنیا کی نظروں میں بھی آجاتا اور اسے یہ مشکل یا تہمت اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

کارخانے کے عین سامنے روڈ کے دوسری طرف بیڈ روم سیٹ کا شوروم تھا۔

پیچھے میچنگ کے پردے... آگے بیڈ... دائیں جانب الماری اور بائیں جانب سنگھار میز۔

ایاز کو اسی سنگھار میز کے آئینے میں اس کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

"یہ اندر مارکیٹ تک ہی تو جانا ہے۔ پیدل بھی جاسکتے ہیں‘ مگر ہم رکشہ کرلیں گے۔" یہ حورعرش کی آواز تھی ایاز چونک کر کھڑا ہوا۔ وہ اپنے پیچھے کسی سے مخاطب تھی یقیناً "دادا کی نواسی ہوگی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" پُرشوق انداز سے گردوپیش کو دیکھتی ایک لڑکی۔

ایاز الرٹ ہوگیا۔ اس نے سامنے سے گزرتے رکشے کو ہاتھ دے کر روکا اور دوسرے ہاتھ سے حیران و خفگی والے تاثر سے بھرپور آنکھوں والی حورعرش کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی‘ مگر نواسی اچک کر سوار ہوگئی تھی۔ ایاز نے کرایہ بھی ادا کردیا۔

حور نے ہونٹ بھینچ لیے۔ یہ پیسے تو میں لوٹا کر رہوں گی ایاز محمود! رکشے میں بیٹھی تب بھی خفا تھی۔



"مجھے نہیں اچھا لگا یہ بازار۔" زینیا کا منہ بنا ہوا تھا وہ دونوں ہاتھوں سے پیروں کی انگلیاں داب رہی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے حورے...؟" دادا نے اس سے پوچھا۔

"اس سے پوچھیں۔ رش ہونے کا شور کرتی رہی۔ کوئی چیز اسے پسند نہیں آئی۔"

دونوں لالوکھیت مارکیٹ گئی تھیں۔ زینیا کو بھی شاپنگ کا شوق چڑھا تھا۔ حورے کہاں بازار جاتی تھی پہلے اس کے لیے چیزیں تائی امی لاتی تھیں۔ پھر دادا زیبی پھپھو کے ساتھ بھیجنے لگے تب بھی کمانڈ پھپھو ہی کرتی تھیں۔ اسے نہیں پتا تھا بازاروں کا... نہ شاپنگ کا خاص تجربہ... مگر زینیا نے کہا وہ سب جانتی ہے۔

مگر بازار جا کر ناک بھوں چڑھاتی رہی۔

"تو اور کیسے ہوتے ہیں بازار...؟" حورے مسلسل تنقید پر بازار میں بیچ و بیچ کھڑی ہوگئی۔

"تم مجھے مال لے کر جاتیں حورعرش... پارک ٹاور یا پھر ڈولمین مال۔" "مگر میں تو کبھی مال نہیں گئی۔" اس کا لہجہ مجرمانہ ہوگیا۔

"کیا...؟ تو پھر شاپنگ کہاں سے کرتی ہو؟"

"کہیں سے بھی... وہیں سے مینا بازار چلے جاتے ہیں کبھی کبھار۔"

"ہاں مینا بازار... مجھے وہاں سے مہندی لگوا کر جانا ہے لازمی..."

"لگوا لینا..." حورے کے ہاتھ میں کچھ سبزیوں کے شاپر تھے۔ مارکیٹ تک آگئی تھی تو لگے ہاتھوں یہ بھی سہی‘ مگر یہ زینیا مختار... ایسے منہ اٹھا کر ہر چیز کو دیکھ رہی تھی جیسے عجوبہ ہو کوئی اور مجال ہے جو ایک بار بھی شاپر اٹھانے کے لیے اپنی خدمات پیش کی ہوں۔ ہر چیز کو ناگواری سے دیکھ رہی تھی۔

"بازار تو بازار ہوتا ہے زینیا!" وہ ہی کہہ سکی۔

"نہیں..." وہ زور دے کر بولی۔ "بازار اسٹینڈرڈ ہوتا ہے حورعرش۔"

"اسٹینڈرڈ تو جیب کا ہوتا ہے۔ آپ کی جیب ہلکی ہے آپ ہلکی چیز پر ہاتھ رکھیں گے جیب بھاری چوائس بھاری... یہاں بھی سب ملتا ہے۔ تم دیکھتیں تو..." اس نے افسردگی سے کہا۔

"نہیں... مجھے نہیں دیکھنا تھا۔ اچھا تم مجھے طارق

روڈ لے چلو۔" اسے ایک اور نام یاد آیا۔
"میں کبھی طارق روڈ نہیں گئی زینیا!"
"کیا۔۔۔؟" زینیا چیخی۔ "کیا بہت دور ہے؟"
"پتا نہیں۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔" اس نے پیروں کا وزن بدلا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔ جسمانی تھکن، دل کی دکھن۔ اس نے کب سنی تھیں ایسی باتیں۔ یہ نئے خیال و نظریے۔
"آؤ، تمہیں چاٹ کھلاؤں۔"
"رہنے دو۔"
"تم آؤ تو۔۔۔" وہ سبزی گلی سے الٹے ہاتھ مڑ گئی۔ ایک ہاتھ میں تھیلے سنبھالے دوسرے سے زینیا کا ہاتھ پکڑے وہ کس مشاقی و تیزی سے رش میں راستہ بناتی بڑھتی ہی جاتی تھی۔
دونوں پیڈسٹرین برج کے نیچے چاٹ والے کے اسٹول پر بیٹھ گئیں۔ حورے نے نقاب کھول دیا۔ وہ پسینے پسینے ہونے لگی تھی۔ مارچ کے مہینے میں گرمی کا یہ حال تھا۔ آگے خدا جانے کیا ہوتا۔ اور انداز کی بے زاری عیاں تھی۔ ہر چیز کو تنقید سے دیکھتی وہ بدمزہ لگتی تھی۔ حورے کی نگاہیں سامنے برتنوں کی دکان پر ٹک گئیں۔
سفید اور سیاہ امتزاج کا چینی کا ڈنر سیٹ جس کے کنارے سرخ تھے۔ اور کبھی اس کے پاس اتنے پیسے ہوں گے تو وہ اس دکان سے ایک سیٹ تو ضرور ہی لے گی اور زینیا کہتی ہے بازار اچھا نہیں۔
تنگ دلی اور سطحیت کی بھی تو کوئی حد ہوگی ہی۔۔۔۔ زمین کو بھی ایک حد تک کھود سکتے ہیں۔ وہ نجانے کیوں دل گرفتہ ہوتی جارہی تھی۔
چاٹ والا کچی مٹی والی سفید پلیٹوں میں چاٹ دے گیا تھا۔
زینیا نے پلیٹ پکڑی تھی، مگر اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔
حورے نے نظریں پھیر لیں۔ اپنی پلیٹ میں چاٹ مسالہ چھڑکا اور سر جھکا کر کھانے لگی۔ چاٹ حسب معمول مزے دار تھی۔ یہی ایک عیاشی، یہی ایک شوق جو سید ھی سادی حور عرش فرمایا کرتی تھی۔
زینیا نے حورے کی بے نیازی یا ناراضی کو محسوس کیا اور پھر جس طرح مزے سے وہ چاٹ کے چمچ بھر رہی تھی، زینیا نے بھی چمچہ منہ میں رکھ لیا۔
اور اسے چاٹ پسند آگئی۔ یہی نہیں اس نے بعد میں وہی بڑے بھی ٹرائی کیے۔ اس کا موڈ بہتر ہو گیا تھا۔ حورے بھی سارا املال بھول کر خوش ہو گئی۔ واپسی کے سفر میں خوش گوار یت اور باتیں تھیں۔
مگر گھر آکر زینیا نے اپنی ساری شکایتیں دہرانا شروع کردی تھیں۔ حورے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چائے بنانے چل دی۔
جبکہ دادا کا چہرہ کچھ اتر گیا تھا۔ پھر وہ آرام کرنے کا کہہ لیٹ گئے۔

✲ ✲ ✲

"غربت شرمندگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔۔۔" دادا خود سے ہم کلام تھے گویا، حالانکہ وہ ہمہ تن گوش تھی۔ "اسی لیے تو میں اس کے آنے سے خوش نہیں تھا۔ میرے پاس تو اتنی گنجائش بھی نہیں کہ اسے جاتے ہوئے ایک اچھا جوڑا تحفتاً دے سکوں۔"
"چھوڑیں دادا! اسے کیا جوڑوں کی کمی ہے۔" اس نے بات اڑانا چاہی۔
"بات کمی کی نہیں ہے، وہ اتنے سالوں بعد اپنے نانا کے گھر آئی ہے۔ کیا دکھائے گی جاکر، نانا کوئی ڈھنگ کی چیز بھی نہ لے کر دے سکا۔ مہرو کو میرے سارے حالات معلوم تھے، اسے اس کو بھیجنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"
"وہ اپنے کزنز کے ساتھ اپنے ددھیال کی شادی میں شرکت کرنے آئی تھی۔ آپ کو زیادہ دکھ ہوتا اگر وہ ملے بغیر چلی جاتی تو۔۔۔"
"ہاں ہوتا دکھ۔۔۔ مگر اس شرمندگی سے کم جواب ہو رہی ہے۔"
"سبکتگین کام پر لگا ہوا ہے۔ اسے سیلری ملے گی۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ ہم اسے اس کی پسند

کے بازار سے پسند کی چیز دلوادیں گے دادا۔۔۔" وہ بھرپور طریقے سے تشفی کرنا چاہتی تھی۔

"زینیا بتارہی تھی اس نے جو وہ موتیوں والا جوتا پہنا تھا۔وہ تین ہزار کا ہے؟"

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔وہ سوال پوچھ رہے تھے اور جواب میں فقط انکار سننا چاہتے تھے۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں دادا۔۔۔ بھلا جوتا بھی تین ہزار کا ہوتا ہے۔ آپ کو سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔"

اس نے کسی بچے کو جھٹلانے کے سے انداز میں ہنس کر دکھایا تھا۔ ہنسی کھوکھلی تھی پر دادا کو اس وقت ایسے ہی یقین کی ضرورت تھی۔

دادا خاموش رہے۔ہاں کم سننے والی بات وزن رکھتی تھی۔وہ بھی چپ ہوگئی۔



زینیا' پھپھو یعنی اپنی اکلوتی خالہ سے ملنے کو بے قرار تھی' مگر دادا اسے وہاں بھیجنے میں متامل تھے۔ بیٹی کی باتیں عیاں ہوتیں وہ مشکل میں پڑجاتی لہٰذا سبکتگین کو روانہ کیا کہ وہ اپنی پھپھو کو لے آئے۔

پھر خود سے اٹھ کر کپکپاتے ہاتھوں میں لاٹھی سنبھالتے نیچے اترے۔ مارکیٹ تک گئے۔ گوشت' پھل اور سلاد وغیرہ۔ اور ایک تھیلا مارکیٹ میں موجود ساری سبزیوں کا بھی تھا اور کچھ مزید پھل جو جاتے وقت بیٹی کے ساتھ کرنے تھے' بچوں کے کھانے کے لیے پاپڑ' بسکٹ اور ٹافیاں۔۔۔

"گاڑھے مسالے کا آلو گوشت اور مٹر پلاؤ بنالو۔ زیبو کو پسند ہے۔" دادا کی ہدایات جاری تھیں' وہ نہ بھی کہتے تو حورے کو سب دھیان رہتا تھا۔

"کیا زیبو خالہ کی دعوت ہورہی ہے۔" زینیا صبح سے مچی ہلچل پر پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"دعوت ہی سمجھ لو۔۔۔ وہ دادا کی لاڈلی بیٹی ہیں اور جب سے پھوپھا جان کا انتقال ہوا ہے' دادا ان کے حوالے سے بہت حساس اور دکھی ہوگئے ہیں۔"

اس کے لہجے میں غم گھل گیا۔ زینیا نے سر ہلایا۔

حورے کام لگ گئی اور وہ اپنے موبائل پر۔۔۔

بچوں کے لیے کسٹرڈ بنا کر فریج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیا تب دادا کی آمد ہوئی۔ تھیلوں کے وزن کے گمان میں وہ تیزی سے آگے آئی' دادا میں اب کہاں وزن اٹھانے کی سکت تھی' خود ہی کو بمشکل اٹھائے پھرتے تھے۔

"اللہ دادا! آپ کسی کو ساتھ لے جاتے اگر کہیں راستے میں گر گرا جاتے تو۔۔۔"

"اوہ۔۔۔!" اس کے باقی جملے منہ میں رہ گئے۔ دادا کے ساتھ کوئی تھا۔

تھیلے اسی کے ہاتھ میں تھے دادا تو صرف بلند آواز سے بولتے آرہے تھے۔

دادا آگے اور پیچھے۔۔۔ پیچھے ایاز۔

اس نے تیزی سے پلو سر پر ڈالا۔۔۔ چہرے پر سختی آگئی جو اگلے ہی پل ناراضی میں بدل گئی۔ وہ نگاہوں میں شوق کا جہان آباد کیے اسے دیکھ رہا تھا۔

اور دادا۔۔۔ اس نے سخت ناراضی اور غصے سے انہیں دیکھا۔ وہ جانتے ہیں نا کہ وہ اس ایاز کے بچے کا سامنا نہیں چاہتی پھر بھی اسے اوپر تک لے آئے اور اب ہانپتے ہوئے اسے بیٹھنے اور اسے جلدی سے پانی لانے کا کہہ رہے تھے۔

وہ سارے تھیلے وہیں چھوڑ کر پیر پٹختی اندر بڑھ گئی۔ فریج کھولنے' بند کرنے۔۔۔ بوتل اٹھانے' گلاس پکڑنے سے لے کر ٹیبل پہ لاکر رکھنے تک کی آوازوں سے غصے کے درجہ حرارت کا پتا چلتا تھا۔ وہ سب سمجھتے ہوئے بھی انجان بنا مؤدب مسکرا رہا تھا۔

"شربت گھول لاتیں حورے۔۔۔" دادا کو اس پر افسوس ہوا۔

"آپ کو شوگر ہے دادا۔۔۔" اس نے دانت پیس کر کہا' ڈھیٹ۔۔۔ ایاز کا سر جھکا ہوا تھا' مگر وہ مسکراہٹ اور خوشی۔۔۔

اسے لگ رہا تھا لاٹری نکلی ہے۔ واہ اللہ تیری رحمت۔۔۔

"بیٹا! میں ایاز کے لیے کہہ رہا تھا۔" دادا نے گلاس

تھامتے ہوئے کہا۔

"وہ... لاؤں... گھول کر... شربت..." اتنا بھونڈا انداز...

"نہیں یہ کافی ہے۔" وہ قناعت پسندی کے سارے مدارج طے کر گیا۔

اور نجانے یہ کتنی دیر بیٹھے گا؟

اور یہ ایاز... پہلے بھی بارہا دادا کے ساتھ اسی قسم کے کسی کام کے حساب سے اوپر آیا کرتا تھا۔ پھر دادا کے ساتھ نشست لگتی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلتا۔

حورے دادا کے کہے بنا ہی چائے کا کپ رکھ آیا کرتی۔

اچھا تھا دادا کا دل بھی بہل جایا کرتا۔ دونوں خبروں پر تبصرہ کرتے اگر کوئی میچ ہوتا تو بات مزید بڑھ جاتی... ورنہ دادا کے اپنے قصے کیا کم تھے۔

بڑھاپے میں انسان کی ضروریات یقیناً محدود ہو جاتی ہیں مگر ایک سامع کی طلب، سامع کی کمی... بڑے دکھوں کو جنم دیتی ہے۔ حورے دل ہی دل میں شکر گزار ہوتی ایاز دل جوئی کے فن سے واقف ہے۔ دادا کتنے مسرور دکھائی دیتے تھے اس سے باتیں کرتے ہوئے۔

وہ بہت دلچسپی سے کرید کرید کے اچھا۔ اچھا... پھر... نہیں نہیں... واقعی... یقین نہیں آتا جیسے جملے کہہ کر بات بڑھاتا جاتا اور دادا کا جوشِ خطابت آسمان کو چھونے لگتا۔

لیکن یہ تو اس کی ماں کے آنے کے بعد معلوم ہوا۔

وہ جتنی دلچسپی سے دادا کو سن رہا ہوتا تھا اس سے دگنی چوگنی دلچسپی اسے حورے کی موجودگی سے محسوس ہوتی تھی۔ وہ سامنے نہیں آتی تھی۔ بہت غیر محسوس انداز سے چائے کی ٹرے رکھ جاتی۔ دادا کی پکار پر پانی لے آتی۔ بس لیکن پردے کے اس پار اس کی موجودگی۔ قدموں کی چاپ۔ کسی برتن کے گرنے تک کی آواز ایاز کی سماعتوں پر مدھر تار بن کر چھڑتی۔

اف یہ کیسی کشش تھی۔

اسے محبت کی کشش کے سارے فارمولے ازبر ہو گئے تھے، مگر کیسی بدقسمتی... کوئی ایک فارمولا بھی من پسند جواب نہیں لایا۔ وہ کسی اور کی امانت تھی۔

سبکتگین معراج... اوہ...

ایاز کو حسد سے زیادہ رشک آیا۔ ہاں وہ سبکتگین تھا۔ حور عرش کے عین جوڑ کا... اور کاش اسے جوڑ توڑ آتا تو وہ اسے خود سے جوڑ لیتا اور سب سے توڑ کر... مگر محبت حشر اٹھانے کا نام تو نہیں۔

"یہ شاپرز اندر لے جاؤ بیٹا..." دادا نے دیکھا سب سامان وہیں کا وہیں پڑا ہے۔

"لے جاتی ہوں دادا... ذرا مہمان سے فارغ ہو لیں آپ..." اس نے جملے کا پہلا حصہ بلند اور دوسرا دانت بھینچ کر کہا۔

دادا تو نہیں چونکے پر ایاز سمجھ گیا۔

"میں چلتا ہوں دادا...!"

"کوئی آیا ہے حور عرش...؟" یہ زینیا تھی کانوں سے ہینڈ فری نکالتی وہ آ رہی تھی۔ ایاز جالی کے دروازے کے پار جوتے پہن رہا تھا۔

"نہیں، یہ تو دادا کا کوئی جاننے والا تھا۔ دادا کی ہیلپ کے لیے شاپرز وغیرہ اٹھا کر اوپر تک آ گیا تھا۔" حور شاپرز اٹھانے آ گئی تھی۔ نیچے اترتے ایاز کے قدم من من کے ہو گئے۔ شکستہ لڑکھڑاتے ہوئے۔

"کوئی جاننے والا..." حقیقتیں ہمیشہ افسردہ کرتی ہیں، کڑوی کریلے سی چبھتی کانٹے کی طرح۔ "کوئی جاننے والا آہ۔"



زیبو پھپھو کے خوب صورت نقوش پر ایک اداسی اور درد... تکان اور اضمحلال کا ڈیرہ، مگر اس وقت خوش تھیں۔ زندگی اب مشقت کے علاوہ کچھ نہیں تھی تو آج کا یہ آرام... عیش لگ رہا تھا۔

"آپ کو ڈاکٹر سے ایک تفصیلی معائنہ کروا لینا چاہیے پھپھو...!" حورے گرین ٹی کی پیالیاں لے کر آئی۔ "ایسے بار بار بخار اچھی بات نہیں۔" وہ واقعی فکر مند تھی۔

پھپھو کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔

"بالکل نہیں۔۔۔ آرام سے بیٹھنے دو اسے۔۔۔ کتنے عرصے بعد اسے یوں ہنستا مسکراتا دیکھ رہی ہوں۔"
پھپھو کی نگاہیں کچھ فاصلے پہ زمین پر نشست لگائے سبکتگین' زینیا اور اپنے چاروں بچوں پر تھیں۔ لڈو کی بازی چل رہی تھی۔
پھپھو کے چاروں بچوں کو اپنی یہ کزن بہت پسند آئی تھی۔
پیار تو حورے باجی بھی کرتی تھیں۔ ان کے لیے ان کی پسند کے کھانے بناتی تھیں۔ باتیں بھی کرتی تھیں اور کہانیاں تو لازما" سناتی تھیں۔
مگر یہ زینیا باجی۔۔۔ جیسے کھیل رہی تھیں' سکس آنے پہ بیٹھے بیٹھے اچھل پڑتیں گوٹ مار لینے پر اپنے فرضی کالر جھاڑتیں۔ کانا آنے پر گھٹنوں میں منہ دے کر ہل ہل کر رونے لگتیں۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ عینا' مینا سے دل گرفتی دیکھی نہ گئی۔ عمیر سات برس کا تھا۔ وہ تو کندھے سے کندھے جوڑ کر رونے بھی لگا دونوں بہنوں نے باہمی مشاورت سے ایک اور دام لینے کا کہا تب آنسو اور ہچکیاں تھمیں۔ علی اور سبکتگین یہ ساری ہوشیاریاں دیکھ رہے تھے۔
زینیا نے ہار اور جیت دونوں صورتوں میں گفٹ دینے کی بات کی تھی۔
ہار گئی تو ہرجانہ۔
جیت گئی تو خوشی۔۔۔ منہ مانگا انعام دینے کا اعلان۔۔۔
بچے بے فکری سے کھیل رہے تھے۔
"حیثیت ہو نہ ہو' کچھ تو دینا پڑے گا حورے۔۔۔ اکلوتی بھانجی ہے وہ میری اور پہلی بار ملنے آئی ہے۔"
پھپھو کی نگاہیں زینیا پر ہی جمی تھیں۔
"رہنے دیں۔ وہ سب حالات سے واقف ہی ہے۔ دادا نے سارے دکھڑے روئے ہوئے ہیں۔" اس نے انہیں ان کے ابا کی عادت یاد کروائی۔
"ہاں۔۔۔ مگر پھر بھی۔۔۔ ابھی تو تم مشورہ دو۔ اگلے اتوار کو میں اسے دعوت پر بلانے کا سوچ رہی ہوں۔ کیا شوق سے کھاتی ہے یہ۔۔۔؟"
"دعوت۔۔۔!" اس نے تیزی سے گھونٹ بھرا۔
"اس کی آپ فکر نہ کریں' دادا اسے آپ کے گھر بھیجنے والے ہی نہیں۔۔۔"
"ابا نہ بھیجیں۔۔۔" پھپھو نے اپنی پیالی خالی کر دی تھی۔ "میں خود بلاؤں گی۔"
"سبکتگین نے ہزار کا نوٹ دیا تھا۔ ابھی جب مجھے لینے آیا۔ اسی سے بندوبست کروں گی۔" پھپھو نے سنجیدگی سے بتایا۔
"اچھا۔۔۔!" حورے نے سانس بھری۔ "جیسے آپ کی مرضی۔۔۔ آپ کا دل ہے تو۔۔۔ ورنہ میرا تو خیال تھا' آپ کو خود پیسے کی ضرورت ہے تو۔۔۔"
"پیسے کی ضرورت تو مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی۔۔۔" پھپھو نے سختی سے کہا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔
"کوئی تحفہ بھی تو بتا دو نا۔" پھپھو کو تھوڑی دیر بعد یاد آگیا۔ "ویسے مزاج کی تو سیدھی سادی لگی ہے مجھے یہ۔۔۔ کہیں سے بھی بڑے باپ کی بیٹی نہیں لگتی۔ کوئی نخرہ ہے ہی نہیں۔۔۔"
"ہاں یہ تو ہے۔" حورے نے تائید کی۔ "آپ کیا تحفہ دینا چاہتی ہیں اور کتنی رقم تک۔۔۔؟"
"وہی تو تم سے پوچھ رہی ہوں۔ کیا دوں۔۔۔ اور میری جیب کا بھی تمہیں اندازہ ہے۔ خالہ کے نام پر ماں کو کیا دکھائے گی۔ آپا کتنا کرتی ہیں میرے لیے۔۔۔ موقع مناسبت سے کپڑے بنا کر بھیجتی ہیں۔ سو اور بھی طریقے نکالتی ہیں۔ ابا یونہی ان سے خفا رہتے ہیں۔ وہ کون سا خود کماتی ہیں۔ شوہر ہی کی دست نگر ہیں' جو بھی کر دیں' بہت ہے۔" پھپھو شروع تھیں۔ حورے کی نگاہیں ان سب پر تھیں۔ پر وہ سر اثبات میں ہلا ہلا کر پھپھو سے متفق ہونے کا اشارہ دے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ تحفہ پھر بھی غور جاری تھا۔
"کشتی۔۔۔!" وہ یک دم اچھلی "آپ اسے کشتی لے دیں۔"
"کون سی کشتی۔۔۔؟" زینی پھپھو چونک گئیں۔
"وہ جو سیپیوں سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ سی ویو پر بکتی ہے۔ سیپیوں کی کشتی اور فوٹو فریم۔۔۔ اس دن ہم گئے تھے نا سی ویو تو یہ تو وہ سب چیزیں دیکھتے ہی بے قابو

ہوگئی' مگر رش بہت تھا تو سبکتگین نے کسی روز ذرا روشنی میں جاکر خریدنے کا کہہ کر روکا۔ آپ وہی لے دیں پھپھو!" اس نے خوشی سے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔" پھپھو بھی مطمئن ہوگئیں۔

☆ ☆ ☆

وہ سر اٹھا کر "پاری مال" کے اندر کی روشنیاں اور جگمگاہٹیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی تھی' مگر یہ ڈر جا ہی نہیں رہا تھا کہ وہ اس چکنے چمکتے فرش پر پھسل جائے گی۔ جبکہ دوسری طرف زینیا آج ——— لمبی ہیل کے ساتھ بے فکری و بے نیازی سے چل رہی تھی' سبکتگین ساتھ تھا۔ حورے نے کئی بار اس کا چہرہ دیکھا۔

وہ زینیا کی طرح ایک پُرغرور تاثر کے ساتھ تو نہیں چلتا تھا' مگر وہ بااعتماد اور بے نیاز ضرور تھا۔

زینیا کے ہاتھ میں دیدہ زیب شاپنگ بیگز کا ڈھیر بڑھتا جا رہا تھا۔

"تم اپنے لیے بھی کچھ لے لو حورے...!" سبکتگین نے اس کے کان میں دھیرے سے کہا۔

"نہیں... مجھے کچھ نہیں لینا۔"

"کیوں... دیکھو زینیا کو جس حساب سے وہ چیزیں خرید رہی ہے' تھوڑی دیر میں اسے اپنے لیے ایک ایکسٹرا ہاتھ بھی خریدنا پڑ جائے گا۔" وہ مزے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیوں... ہم اٹھائیں گے نا؟" وہ بولی۔

"اچھا' تم اپنے لیے یہ سوٹ لے لو..." اس نے ہینگر پر لگا ایک پیازی و سفید سوٹ سفید نگینے اور ابھری ابھری سی کڑھائی بہت خوب صورت تھی' مگر وہ بدک کر پیچھے ہوئی۔

"نہ بابا... مجھے نہیں لینا۔"

"کیوں...؟" اس نے گھورا۔

"اس کی قیمت دیکھی ہے تم نے؟"

"اس کی خوب صورتی دیکھی ہے میں نے... تم پر بہت سجے گا۔" اس کا جملہ سادہ تھا' مگر لہجے اور آنکھوں سے خواہش عیاں تھی۔

وہ خاموش ہوگئی۔

"جو میں نے پہنا ہے' وہ نہیں سج رہا؟" وہ نجانے کیا جاننا چاہ رہی تھی اور کیوں؟

سبکتگین کی نگاہیں اس کے سراپے پر ٹک گئیں۔ پرنٹڈ چوڑی دار رنگین پاجامہ پر وہ کالے کرتے دوپٹے میں ملبوس تھی۔ پیروں میں چھ سو والی سیاہ دوپٹی اور اس کے خوب صورت پیر... گلابی ایڑیاں...

دھلا دھلایا چہرہ تھا۔ وہ کچھ نہ بھی لگاتی تو پیاری لگا کرتی تھی۔ آج تو گلابی مدھم سا لپ گلوس بھی لگا رکھا تھا۔ سبکتگین بھول گیا۔ وہ مال میں کھڑا ہے چاروں طرف لوگ ہیں اور آوازیں ہیں۔

اور پلکیں جھپکنا بھی کیوں... خود حورے نے تو پوچھا تھا کہ کیا میں سج نہیں رہی۔

اب صحیح جواب کے لیے جائزہ ضروری تھا۔ جبکہ دوسری طرف حورے نے پہلو بدلا پھر پیر کا وزن بھی...

"بری لگ رہی ہوں..." اسے یہی خدشہ تھا۔ وہ اس سارے ماحول میں خود کو ویسے بھی مس فٹ اور ان ایزی فیل کر رہی تھی۔

"تم بری لگ سکتی ہو؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تو بولتے کیوں نہیں..."

"کیا...؟"

"کہ اچھی لگ رہی ہو..."

"بول دوں..." سبکتگین کے اندر نجانے کیا چل رہا تھا۔ ورنہ دو لفظ بولنے میں اتنی دقت... حورے نے منہ بنا کر رخ موڑتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ہینگر جھپٹ لیا تھا' وہ اسے واپس لگا رہی تھی۔

سبکتگین مسکراتے ہوئے اسٹینڈ کے دوسری طرف حورے کے مقابل آگیا۔

"اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ اس پورے مال میں تم جیسی ایک بھی نہیں..." اس کے ناراض ہاتھ رک گئے۔ نظریں اٹھائیں۔ خفگی ہنوز برقرار تھی۔

"صرف مال میں...؟"

"نہیں نہیں۔ مال سے باہر روڈ تک بھی۔۔۔" وہ شرارت پر آمادہ تھا۔
"صرف باہر والا روڈ۔۔۔؟" وہ بھی شریر ہوئی۔
"یار! پورے کراچی میں۔۔۔" اس نے حد کردی۔
"اب یہ نہ کہنا صرف کراچی۔۔۔" ساتھ ہی تنبیہہ بھی کی۔
"میں یہی کہوں گی صرف کراچی۔۔۔"
"سارا جہان کہہ دوں۔۔۔؟" وہ اسے تول رہا تھا۔
"کہنا تو چاہیے۔۔۔" اس نے انتہا کردی اور آگے بڑھ گئی۔ وہ پیچھے تھا۔
"پورا جہان کہنے کے لیے نہ جگہ مناسب ہے اور نہ وقت۔۔۔"
"اچھا بہانا ہے۔" وہ سیدھی چل رہی تھی۔
"تم مجھے اکسارہی ہو۔"
"نہیں۔۔۔ مجھے ضرورت نہیں۔۔۔ مگر تم اتنی حجت کی جگہ ایک جملہ کہہ دیتے کہ تم پر سوٹ بج رہا ہے۔" وہ شکوہ کناں ہوئی۔
"اور تم یہ کیوں نہیں سمجھ لیتیں کہ تمہیں پیارا بتانے کے لیے بیچ میں سوٹ کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔"
صبح شام کا ساتھ تھا۔۔۔ ہمیشہ سے۔۔۔ مگر اتنی وضاحت سے یوں اچانک۔۔۔ حجت تمام ہوئی۔ حورعرش کے لب کپکپا گئے اور پلکیں لرز کر جھک گئیں۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔
"یہ زینیا کہاں رہ گئی؟" وہ لڑکی تھی اسے ہی سنبھلنا تھا۔ لڑکے تو بے قابو و بے خود ہوتے ہی ہیں۔ نرے بے قوف، نہ موقع دیکھتے ہیں نہ محل، اب بھلا یہ کوئی وقت اور جگہ تھی جہاں وہ شروع ہوا تھا۔ گھر میں تو زمانہ ہوا اس نے ضرورتاً بات کرنا بھی چھوڑدی تھی یا پھر یہ کہ وہاں وہ غم روزگار و غم دنیا سے نبرد آزما رہتا تھا اور یہاں۔۔۔ اس کی جیب میں پیسے تھے یقیناً۔
اور یہ ماحول۔
اے سی کی ٹھنڈک اور خوشبو اور میوزک۔۔۔
تو کیا آج کے زمانے میں محبت اور اظہار کو بھی لگژریز درکار ہیں وہ خائف ہونے لگی۔
"تو پھر پیک کروالوں یہ سوٹ۔۔۔" سبکتگین نے سوال دہرایا۔
"یہ بہت مہنگا ہے سبکتگین۔۔۔"
"میرے پاس پیسے ہیں حورے۔۔۔"
"پھر بھی نہیں۔۔۔"
"میں ناراض ہوجاؤں گا۔" اس کے لہجے میں مان تھا۔
"میں بھی ناراض ہوجاؤں گی۔"
"بے وقوف۔۔۔ تمہیں کہنا تھا۔ میں تمہیں منالوں گی۔"
"لو خوامخواہ۔۔۔" اسے زور سے ہنسی آئی۔ سبکتگین اسے پیار سے دیکھتا ہی رہتا، مگر زینیا شاپرز بھرے دونوں ہاتھ لہرا لہرا کر انہیں بلا رہی تھی۔
دونوں آگے بڑھے۔



شاپنگ کے بعد سبکتگین نے انہیں کھانا بھی کھلایا۔ تکہ اور پراٹھے۔۔۔ زینیا بریانی کی فرمائش کرتی رہی بقول اس کے بریانی کا جو ذائقہ کراچی میں ہے۔ وہ پورے پاکستان میں کہیں نہیں۔۔۔
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو زینیا! مگر آج تکہ پراٹھا ہی چلے گا۔ بریانی کسی اور دن۔۔۔ وعدہ پکا والا۔" زینیا کا منہ بنتا دیکھ کر اس نے زور دے کر کہا۔ حورے نے سر جھکا لیا۔ اس نے فقط یہی خود کلامی کی تھی کہ
"باربی کیو کی کتنی مزے دار خوشبو آرہی ہے۔"
اور سبکتگین انہیں اوپن ایئر فوڈ کورٹ میں لے آیا تھا۔
گھر لوٹنے پر زینیا بی بی تو تھکاوٹ کا اظہار کرتے ہوئے بستر نشین ہوگئیں جبکہ حورے دادا کے کھانے کا انتظام کرنے لگی۔
مسور کی پتلی دال کے ساتھ پھلکا۔۔۔ اور دوائیوں کا سارا پروگرام۔ اسے ابھی تک کپڑے بدلنے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ زینیا کو چائے کا بڑا کپ بھی وہ اہتمام

سے دے آئی تھی۔ باتیں کرنے کا ارادہ تھا مگر وہ فون پر اپنی امی سے بات کر رہی تھی۔ حورے اپنا کپ لے کر بالکنی میں آگئی۔

بحیرہ عرب میں طوفان کا سنا تھا۔ ٹھنڈی ٹھار بوجھل ہوائیں تصدیق کا پیغام لائی تھیں۔ لائٹ چلے جانے پر بھی موسم کی خوشگواریت کم نہ ہوئی پھر بہت ہلکی سی بوندیں پڑنے لگیں۔ تب دادا کی فرمائش پر سکینہ انہیں چھت پر لے گیا۔ حورے بھی چھت پر جانا چاہتی تھی، مگر زینیا ابھی مصروف تھی۔

فرنیچر گلی میں سناٹا تھا۔ پھر کچھ منچلے لڑکے شرٹ اتار کر گردن سے باندھے گلی میں بھاگتے نظر آئے۔ حورے نے اپنا ہاتھ لمبا کر کے باہر نکال دیا۔ بوندوں کی گنتی... ایک، دو، تین...

اندر زینیا اپنی ماں سے بات کر رہی تھی۔ وہ پنجابی بول رہی تھی۔ حورے کے لیے زبان سے زیادہ ناآشنائی زینیا کے لہجے سے تھی۔ زیادہ مشکل زیادہ تکلیف دہ...

بازار میں زینیا کو اپنے وہ کزنز مل گئے۔ جن کے ساتھ وہ شادی میں آئی تھی۔ وہ سب وہاں انجوائے کر رہے تھے اور یہ ادھر... وجہ... وجہ وہی نانا سے ملنے کا شوق و محبت...

مگر ابھی جو وہ فون پر ماں سے کہہ رہی تھی۔

"سوئی نوں تے اگ لگ گئی مینوں ویکھ کے... میں دی لفٹ نہیں کرائی۔ مال دے وچ ایس طراح کمدی سی جی وے پیو نے لے کر دیتا ہووے۔ یا فیر جمی ای ملاں وے اندر سی۔"

(سوئی کو تو مجھے دیکھ کر آگ ہی لگ گئی، میں نے بھی لفٹ نہیں کرائی مال میں ایسے گھوم رہی تھی جیسے باپ نے خرید کر رہا ہو دیا پھر پیدا ابھی کسی مال کے اندر ہوئی ہو)

ایسے سمجھتی ہے جیسے لوگ بھول جاتے ہیں۔ پہلے اس کی دادی اپنی بیٹیوں کے بیاہ کے لیے ابو جی سے قرضہ مانگ کر لے جاتی تھی۔ اب اس کی ماں نے بھی ہمارا گھر دیکھ لیا۔ یہ تو اب اس کے بھائیوں کا باہر کام سیٹ ہوا تو... دو سے تیسرے سوٹ کی اوقات ہو گئی۔ جیسے مجھے یاد نہیں...

ایسے خیالات... ہتک آمیز تحقیر بھرا لہجہ... غرور کی آنچ۔ اپنے پیسے کا غرور۔

یہ کون سی زینیا تھی وہ جو اتنے دنوں سے ان کے گھر تھی۔ وہ تو بہت پیاری سی تھی بے ضرر سی... جہاں بٹھا رہے تھے بیٹھ گئی۔ جو کھلا رہے تھے ہنسی خوشی کھا رہی تھی، اس نے کسی چیز پہ سوال نہیں کیا تھا، کوئی تنقید نہیں کی جبکہ ابھی وہ اپنی ماں کو بتا رہی تھی کہ فلاں نے وہی سوٹ چڑھا رکھا تھا جو دس اور جگہ پہن چکی تھی۔ سوچا ہو گا کراچی میں کس نے دیکھا ہے، یہ نہیں پتا پچھلے سال کے لان پرنٹ دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں لوگ کوئی اندھے تھوڑی ہیں۔ تو پھر حورے کے کپڑے... اور زینیا ماں سے کہہ رہی تھی کہ پوسٹر پرنٹ ملے تو فائدہ کیا چھ ہزار کا جوڑا لینے کا۔ تو وہ کس کو دھوکا دے رہی تھی۔ حورے کو، اس گھر کے سب مکینوں کو یا پھر اس نے حورے کو کسی بھی کیٹگری میں نہیں رکھا تھا۔ وہ اتنی نااہل تھی کہ مقابلے کی اس دوڑ میں میدان سے باہر کھڑے ہونے کی بھی حق دار نہیں تھی۔ کسی گنتی میں ہی نہیں تھی۔

حورے کا دل بالکل بجھ گیا۔ اندر زینیا کی آواز میں ہنوز جوش برقرار تھا اور صرف جوش ہی کیوں... طنز... تحقیر... سب۔

اس کے آنے کا سن کر حورے کے ذہن کے گوشے میں ایک سیدھی سادی دیہاتی لڑکی کا خیال آیا تھا۔ وہ سرگودھا کے کسی گاؤں سے آرہی تھی۔ جگمگ روشنیاں دیکھنے مگر پہنچی تو پتا چلا، وہ تو خود کسی مشعل کی طرح ہے۔ روشنی روشنی... تو یہ طے ہوا کہ پیسہ اہم ہے۔ حورے کا دل بھر آیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے اصل دکھ کس بات کا ہے۔

"تم سوئیں نہیں حور عرش..." زینیا فون سے فراغت پا کر بالکنی میں چلی آئی تھی۔

"ہاں بس... بارش دیکھ رہی تھی۔"

"بارش...!" زینیا ہنس دی۔ "اسے تم بارش کہتی

ہو۔ بارش تو ہمارے ہاں ہوتی ہے۔ یہ چھاجوں چھاج۔۔۔ پہروں۔۔۔ دنوں تک۔"

حورے نے اسے بغور دیکھا جو ریلنگ سے دونوں ہاتھ باہر نکالے قطرے گننے لگی تھی۔۔۔ اس کا لہجہ سادہ تھا ریا اور استہزاء سے عاری۔۔۔ صاف — شستہ لہجہ۔۔۔ سادہ مسکراہٹ، تو پھر ابھی اندر کون تھا۔ حورے گڑبڑائی۔

پتا نہیں وہ زیادہ معصوم تھی
یا
زینیا مختار زیادہ چالاک تھی۔

☼ ☼ ☼

وجہ واضح نہیں تھی۔ مگر حورے زینیا کے سامنے اپنے خول میں سمٹ سی گئی۔

شاید اس دن کی شاپنگ اور یک طرفہ گفتگو کو سن لینے کے بعد حورے نے اپنا اس کا جائزہ لیا تھا۔ وہ خود سے الگ تو بہت پہلے ہی نظر آتی تھی۔ مگر جب خود سے برتر لگی تو وہ خود ہی کچھ پیچھے ہٹ گئی۔

اس وقت وہ دادا کے تخت پر براجمان کوئی بحث چھیڑے ہوئے تھی۔ سبکتگین سی وی تیار کر رہا تھا۔

کچی نوکری کوئی پکی تھوڑی تھی کہ بے فکر رہتا۔۔۔ درخواستیں جاتی رہتی تھیں۔ اتوار کے دن اخبار چھانٹ چھانٹ کر تراشے نکالنا سب سے اہم کام تھا۔ حورے دادا کی فرمائش پر بیسن کے پراٹھے ہمراہ لہسن اور سرخ مرچ کی چٹنی تیار کر رہی تھی۔

"اتنا مشکل نام سبکتگین معراج۔۔۔ اف۔۔۔"

"اس کی ماں نے رکھا تھا۔ گورنمنٹ اسکول ٹیچر تھی آخر وہ۔۔۔" دادا نے تعریف کی تھی کہ تنقید۔

"آپ کو نک نیم رکھنا چاہیے تھا۔"

"ہمیں ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔" دادا نے کہا۔

"تم رکھ لو بابا۔۔۔" سبکتگین کے ایک ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور دوسرے سے وہ کاغذ ترتیب سے لگا رہا تھا۔

"میں کیسے رکھ لوں۔۔۔ پیار کا نام تو امی، ابو رکھتے ہیں۔"

"غلط۔۔۔ پیار کا نام۔۔۔ جو بھی پیار کرے، وہ رکھ سکتا ہے۔" سبکتگین نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "تم بھائی جان کہہ لیا کرو۔" اس نے آرام سے کہا۔

"بھا۔۔۔ئی۔۔۔ جان۔۔۔!" زینیا کو اچھولگا۔ بمشکل سنبھلی۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے بھائی جان کہنے کی۔۔۔ پہلے ہی میرے تین بھائی ہیں، مجھے کوئی نیا بھائی نہیں بنانا۔" وہ تو سخت عاجز تھی۔

"اونہوں! ماشاء اللہ کہتے ہیں۔" دادا نے تلقین فرمائی۔

"ہاں ہاں۔۔۔ ماشاء اللہ ہی کہتے ہیں دادا۔۔۔ وہ آپ نے دیکھا ہے انہیں۔۔۔ تینوں کو دیکھ کر اللہ کی شان ہی یاد آتی ہے۔ اتنی جگہ گھیرتے ہیں۔" اس نے چائے کا کپ رکھ کر ہاتھ پہلوؤں میں اکڑائے اور گال پُھلا لیے۔

کچن سے دیکھتی حورے کو بھی ہنسی آگئی۔

کتنا بے ساختہ، معصوم انداز تھا۔ تو پھر اس دن فون پر۔۔۔

وہ پھر اٹک گئی۔ زینیا کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ جگمگاتی آنکھیں، پُرکشش چہرہ یا وہ اتنی معصوم ہے کہ جو دل میں ہوتا ہے کہہ دیتی ہے۔

اور دل کی باتیں تو انسان ماں ہی سے کرتا ہے۔

اور میری کون سی امی نے میرے ساتھ رشتہ بنایا تھا جو میں یہ سب سمجھوں۔۔۔ بلکہ میری امی تو میرے ساتھ کبھی تھیں ہی نہیں۔

وہ بیسن کے پراٹھے تلتے ہوئے خود کو سمجھا رہی تھی۔ اب زینیا سے تو کہہ نہیں سکتی تھی۔ تمہاری اس دن کی گفتگو سمجھ میں نہیں آئی کیا تم مجھے خود کو سمجھاؤ گی۔ ہاں۔۔۔

اندر کمرے میں زینیا نک نیم پر دادا اور سبکتگین سے بحث کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نہیں جاؤں گی کہیں بھی دادا....." حورے کے انداز میں ناراضی تھی۔
"بیٹا! اتنے پیار سے وہ بلانے آئی ہیں۔"
"بھلے.... مجھے پھر بھی نہیں جانا۔" اس کا انکار پتھر پر لکیر تھا جیسے۔
"شادی کے نو سال بعد صاحب اولاد ہوئی ہے ایاز کی بہن.... اس کی ماں نے اسی خوشی اور شکر میں قرآن خوانی اور عقیقہ کی دعوت رکھی ہے۔ اور ہم نہ جائیں۔"
"تو آپ چلے جائیں ناں!"
"تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" دادا کی جان جل گئی تھی۔
"جیسے آپ جانتے نہیں۔" اس کی آواز مدھم ہو گئی۔
"اوہ۔!" دادا کی تیوری پر بل ابھرے۔ "بیٹا جہاں بیری ہو' وہاں پتھر آتے ہی ہیں.... انہیں تم اچھی لگیں رشتہ دے دیا۔ ہم نے سلیقے سے معذرت کر لی۔ بات ختم...."
"اور اگر یہ بات سبکتگین کو پتا لگ جائے تو...... دو منٹ کے اندر کارخانہ خالی کروالے گا اور جو طوفان اٹھائے گا وہ الگ....."
"کیوں کرے گا وہ ایسا۔؟" دادا انکاری تھے۔
"آپ پوچھ رہے ہیں۔ بھول گئے جب زیبی پھپھو کی نند نے اپنے دیور کا رشتہ دیا تھا۔"
"وہ تو پرانی بات ہے بیٹا۔ تب سبکتگین کو بھی اتنی عقل نہیں تھی۔" دادا نے بات ختم کر دی اپنے تئیں۔
"بات عقل کی نہیں دادا عزت کی ہے۔ اس وقت بھی اس نے یہی کہا تھا۔ 'ورا سے تو بالکل نہیں چھوڑے گا کہ۔' (جانتے بوجھتے کسی کی منگیتر کو اس خیال سے دیکھا ہی کیوں اور رشتہ بھی بھیج دیا۔ اس نے ایسا سوچا بھی کیسے....)
کتنا حساس تھا وہ اس کے بارے میں....
اور یہاں دادا کا تجاہل.....



زیبی پھوپھو کی نند کے دیور والی کہانی اتنی خاص بھی نہیں تھی۔ مگر سبکتگین کے طوفان اٹھا دینے سے تماشا ہی بن گئی... یہ کوئی پانچ برس پرانی بات تھی۔ علی کے ختم قرآن کی خوشی میں پھوپھو نے اپنے گھر قرآن خوانی کا اہتمام کیا تھا۔
یہاں پھوپھو کی نند کے دیور نے حور عرش کو دیکھا۔ وہ ساری زندگی دبئی میں رہا تھا۔ عمر چالیس کے پیٹے میں تھی مگر ہنوز کنوارا تھا۔ وہی روایتی کہانی۔ وہاں مزدوریاں کر کے پاکستان میں سب کچھ سیٹ کرتے کرتے عمر آگے نکل گئی۔ اچھا گھر بنا دیا۔ بہن بھائیوں کو بھگتا لیا۔ بینک بیلنس....
اس کی اماں جس قدر سونا چڑھا سکتی تھیں۔ چڑھا کر آجاتی تھیں۔ اور پھر علی کے ختم قرآن کی تقریب میں تو سارا خاندان اکٹھا تھا۔ اس سے بڑھ کر نمود و نمائش کا مقصد اور کہاں ملتا۔ شومئی قسمت چھٹی پر آیا دبئی والا بیٹا بھی ہمراہ تھا اور کامن کے صوفے پر براجمان مسلسل شو مار تا تھا۔ اس کی گھڑی' اس کی چین.... اس کے جوتے..... اس کی جیکٹ اور اس کا دبئی.... سبکتگین کو وہ ایک آنکھ نہ بھایا۔
اور قرآن خوانی کے اگلے ہی روز.... وہ اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ بنا کسی پیشگی اطلاع کے حورے کا رشتہ لے کر بہ نفس نفیس موجود تھا۔
دادا مسکرائے تھے۔ تائی نے بھی متانت سے سب سنا تھا۔
"مگر حورے تو بچپن ہی سے میرے سبکتگین کی منگیتر ہے۔"
"منگیتر۔" شیخ نے حیرت سے دہرایا۔ "وہ جو آپ کا بیٹا ہے عجیب سا نام ہے جس کا۔"
"جی عجیب سا ہی ہے سبکتگین....." جواب سبکتگین کی طرف سے آیا۔ اور دادا اور اس کی خود کی امی بری طرح گھبرا گئیں۔ وہ ابھی ہی آیا تھا۔
"تم جاؤ بیٹا.... بڑے بات کر رہے ہیں۔ تمہارا یہاں کیا کام....."
"بات میرے متعلق ہو رہی ہے امی.... میری

موجودگی ضروری ہے۔"

"ہم حور کی بات کررہے ہیں۔" دبئی کے شیخی خورے شیخو نے منہ میں رس گلا بھر کے حور کہا۔

"حور عرش نام ہے اس کا...." سبکتگین کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔

"واقعی جس کسی نے نام رکھا ہے' خوب رکھا ہے۔"

"بچپن کی منگنی وغیرہ اب آج کے زمانے میں کہاں چلتی ہیں۔ پھر سبکتگین کو تو سیٹ ہونے میں ابھی عرصہ درکار ہے۔ جبکہ میرا سکندر مقدر کا سکندر ہے۔ کتنے سالوں سے میں اسے شادی کا کہہ رہی ہوں۔ مانتا ہی نہیں تھا۔ ایک سے ایک لڑکیاں دکھادیں.... پر حور کا نام اب اس نے خود لیا ہے۔ کہتا ہے شادی کرے گا تو حور ہی سے.... میں بڑی مجبور ہو کر بڑی امید لے کر آئی ہوں۔" ان کے جملے اتنے تکلیف دہ نہیں تھے جتنا انداز....

"یہ بچپن کی منگنی یا بڑوں کے فیصلے والی بات نہیں ہے بی بی...." دادا متحمل تھے۔ "دونوں بچے بھی اس رشتے سے خوش ہیں ماشاء اللہ.... میں معذرت چاہوں گا۔" مقدر کے سکندر نے جلبلا کر ماں کو دیکھا۔ ماں نے اک نظر سبکتگین کے سرخ چہرے پر ڈالی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہوں گے مگر آپ ایک بار بچی سے پوچھیں۔ شادی کے بعد سکندر اپنے ساتھ لے کر جائے گا اسے.... اور وہاں دبئی کی زندگی.... اوہو.... عیش ہوتے عیش' مالز میں گھومنا' ہوٹلنگ' شاپنگ گھومنا گھمانا.... نہ فکر نہ فاقہ.... اور لڑکیوں کا کیا ہے جس کا نام مرضی ساتھ لیا جائے۔ محبت وہ شوہر ہی سے کرتی ہیں۔" ان کے انداز میں جتنی بے پروائی بھرتی جارہی تھی۔ دوسری طرف صورت حال الٹ تھی۔ طیش وضبط کی آخری حدیں۔

دادا نے پوتے کو دیکھا۔ "تم جاؤ سبکتگین۔"

"چلا جاؤں گا' دیکھ تو لوں بے غیرتی' بے شرمی کی کتنی سرحدیں پھلانگ سکتے ہیں یہ ماں بیٹا...." وہ دانت پیس کر بولا تھا۔ شیخ مسکرایا۔

وہ کچھ طنزیہ۔ جتاتا جملہ کہنے والا تھا۔ جب مسکراتے چہرے کے ساتھ ٹرالی گھسیٹ کر حورے اندر داخل ہوئی۔ شیخو نے سبکتگین کو حقیر انداز سے دیکھ کر جواب دینے کا ارادہ ترک کردیا' وہ عجیب بے خودی کے عالم میں کھڑا ہوگیا تھا اور مسکراتی مگر بہت عجیب سی نگاہ سے حورے کو دیکھتا ہی چلا گیا۔ ماں نے فخر سے بیٹے کو دیکھا۔ اور پھر دادا کو اور دونوں کو.... کہ دیکھو میرے بیٹے کی دیوانگی۔ اور شیخو کی نظریں ایسی تھیں' جو لڑکیوں کو کبھی بھی اچھی نہیں لگتیں۔ اور لڑکیوں کے گھروالوں کو....

سبکتگین جگہ سے کھڑا ہوا تھا۔ اور اگلے پل اس کی دھاڑ نے گیلری میں لگے آب خوروں سے پانی پیتی چڑیوں تک کا دم نکال لیا۔ گڑبڑا کر نیچے گریں۔ اف۔

"اندر جاؤ۔" وہ سب کو بھلا کر حورے سے مخاطب تھا۔ اور اس کے چہرے کے تاثرات....

حورے نے ایک نظر سب کو دیکھا' خاک سمجھ میں نہ آیا۔ مگر وہ بھیانک تاثرات وقطعیت.... وہ صوفے سے ٹکرائی مگر بھاگ لی۔

اور پھر باقی کی ساری صورت حال اس نے کھڑکی کے پردے کو دبوچ کر دیکھی اور دھڑکتے بے یقین دل سے سمجھی۔ اوہ خدا....

سبکتگین نے بس دھکے نہیں دیے تھے۔ اور گالی نہیں دی تھی۔ اور مارا نہیں تھا۔ حالانکہ اس کا چہرہ دیکھ کر صاف پتا لگتا تھا۔ وہ یہ سب کرنے کو بے تاب ہے۔ اس پر نہ ماں کی منت کا اثر ہو نہ دادا کے حکم کا۔

ماں بیٹا بھی ڈھیٹ ابن ڈھیٹ تھے۔ شیخو نے جالی کا دروازہ جو سبکتگین نے اس کے منہ پر دھاڑ سے بند کیا تھا۔ کے پار سے بھی اپنی خوبیاں' دولت' عیش و آرام اور اس محبت کا پتا دیا۔ جو اسے پہلی نظر میں ہوگئی تھی اور سبکتگین کسی اتھرے بیل کی طرف دروازے کی طرف لپکا تھا۔ مگر تائی نے اسے پیچھے سے جکڑ لیا۔ دادا بھی مددگار بنے اور دوسرے ہاتھ سے شیخو کو دفعان ہوجانے کا کہا۔

برا انہیں بھی لگا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے زیبی

پھوپھو کے کان میں بات ڈالی تھی تو انہوں نے بتادیا تھا کہ۔

تب ماں بیٹا نے تاریخی جملہ کہا۔

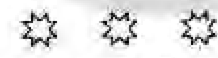
"منگنی تو ہوتی ہی ٹوٹنے کے لیے ہے اور سکندر مقدر کا سکندر ہے۔۔۔ اللہ اللہ۔"

ادھر سبکتگین ان دونوں کو تو بہت کچھ کہنے کے بعد بھی کچھ نہ کہہ سکنے کی حسرت سے زخمی شیر بن گیا۔ حورے اس کے عتاب کا نشانہ بنی۔ اس نے اسے اتنی سنائیں، اتنی سنائیں کہ حورے کے آنسو بھی خشک ہوگئے۔ کب تک روتی اور کیا کیا صفائیاں دیتی۔۔۔

"تمہیں اس کے سامنے جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

اور دوسری طرف شیخو اور اس کی آدھی **شیخیاں** اماں نے ہار نہیں مانی کئی طرح سے زور ڈالو یا جس نے سبکتگین کے طیش میں اضافہ کردیا۔ اور دادا کہتے ہیں کہ "ایاز کی اماں۔

اور یہ دادا بھی ناں سب بھول جاتے ہیں' اس نے جھرجھری لی تھی۔



"تمہیں تو میں نے کبھی کپڑوں کے لیے اتنا پریشان ہوتے نہیں دیکھا حورے۔۔۔ پھر اب کیا ہے۔"

اسے پتا نہیں تھا کہ وہ کب سے اس کے الجھن زدہ متفکر چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ جو کچھ جوڑے اپنے سامنے رکھے بیٹھی تھی اور کبھی ایک کو اٹھاتی تھی اور کبھی دوسرے کو۔۔۔ پھر اسے بھی رکھ دیتی تھی۔

"نہیں تو۔۔۔ بس ایسے ہی۔۔۔" اس نے فوراً" اپنے تاثرات مٹائے۔

"دراصل وہاں اتنے لوگ ہوں گے تو سمجھ میں نہیں آرہا۔ قرآن خوانی بھی ہے اور بعد میں دعوت تو۔" اس نے بات بنا ہی ڈالی۔

یہ نہ کہہ سکی کہ پیڈسٹل فین پر استری شدہ زینیا کے لباس کے آگے اسے اب ہر کپڑا ہیچ لگ رہا تھا۔

بہت نفیس ملائم لان کا بیس کلیوں والا فراک۔۔۔ ہر کلی کی سلائی میں سلور باریک پائپن لگی تھی۔ بین کالر اور کرتا پٹی پر سلور نفیس کڑھائی۔ سلور تار والا نفیس شیفون دوپٹا۔ جس کے اندر کی جانب سلور جامہ وار کی دو انگل چوڑی پٹی لگی تھی۔ چوڑی دار پاجامہ اور رنگ والی جوتی جوڑے کی خوب صورتی نگاہ سے ہٹتی ہی نہ تھی۔

اور اس کے پاس کب ہوتے تھے اتنے کپڑے۔۔۔ اور پھر اتنے نفیس اور فیشن کے عین مطابق۔۔۔ دل بجھ گیا تو چہرے کی روشنیاں بھی ماند پڑ گئیں۔

"اسی لیے کہہ رہا تھا اس دن وہ پیازی سوٹ خرید لیتیں تم۔۔۔" اس نے مسکرا کر جتایا۔ وہ کچھ نہ بولی' بس دیکھ کر رہ گئی۔

"لگتا ہے۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

وہ اپنے غم میں پڑی تھی۔ ان سنی کردی۔ چونکی تب جب گود میں ایک شاپر گرا۔

"یہ کیا ہے؟"

"کھول کر دیکھو۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ نہ سمجھی مگر ہدایت کے مطابق کھولنے لگی۔ "اوہ۔۔۔" اس کے ہونٹ سکڑے۔ نظریں اٹھا کر دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"یہ تو وہی سوٹ ہے ناں' جو اس دن۔"

"ہاں وہی ہے۔" وہ تسلی سے بیٹھ گیا۔ "تمہاری سالگرہ کے لیے لیا تھا۔" پر تمہیں ابھی ضرورت ہے تو یہی صحیح وقت ہے۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"میری سالگرہ۔۔۔؟ پر اس میں تو ابھی بہت دن ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے سوچا' خرید لوں۔ اپنی جیب کا تو تمہیں پتا ہے ناں؟ عین ٹائم پر کیا منہ لے کر گھر آتا۔"

"میں نے تو کبھی ایسی ڈیمانڈ نہیں کی سبکتگین!" اس کی آواز تاسف زدہ تھی۔

"ہوں۔۔۔" وہ کرسی پر کچھ آگے جھکا۔ "ایسے لوگوں کا تو پھر زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔" اس کے لہجے میں آنچ سی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر پیچھے کو ہوئی۔

"اب تیار ہو جاؤ' صرف دعوت ہی نہیں کھانی

سپارے بھی پڑھنے ہوں گے۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔" وہ ہنس پڑی، مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور سبکتگین کی جانب سے تحفہ ملنے کی خوشی سب پر بھاری۔۔۔ زینیا کے سفید چاندی ملے سوٹ سے آنکھوں میں جو ٹھنڈک اتر رہی تھی، اسے بھول کر وہ دل سے تیار ہوئی۔

دادا نے ماشاء اللہ کہا۔۔۔ زینیا نے بھی سراہا۔ سبکتگین نے زبان کو تکلیف دینے کے بجائے یہ کام آنکھوں سے کرلیا۔ اور وہ شرما بھی گئی۔

پیازی اور سفید سوٹ۔۔۔ اس نے کچھ چوڑیاں بھی ہاتھ میں ڈال لیں۔

عام طور پر چوٹی بناتی تھی۔ آج بس ایک کیچو میں جکڑ کر بال کھلے چھوڑ دیے۔

ایاز کے گھر پہنچے تو اس کی امی نے گلے لگایا۔ ماتھا چوما اور دونوں ۔۔۔ ہاتھوں میں موتیے کے خوب بھاری گجرے پہنا دیے۔

مانو بہار چھا گئی۔ خوشبو، رنگ۔۔۔ وہ کھل اٹھی۔

سبکتگین نے لمبا سانس لیا۔ سارے میں موتیا کی خوشبو چکرا رہی تھی وہی جو حور عرش کے وجود سے بھی اٹھ رہی تھی۔ سب سے الگ ایا۔۔۔ وہ بھی بہت خوش تھا۔

"تھی تو چوری۔۔۔ اور غلط حرکت مگر دل کو تاویلیں گھڑنا بھی خوب آتا ہے۔"

وہ اس کھڑکی کے پاس سے ہزار بار گزرا جہاں سے وہ صاف دکھتی تھی۔



"کیسی بے بس زندگی ہے، بندہ واشنگ مشین تک اپنی مرضی سے نہیں لگا سکتا۔" اس نے جلے کٹے لہجے میں با آواز بلند کہا۔

"گھر کے کام کرنے تک کا شیڈول کے الیکٹرک والے طے کرتے ہیں۔ دو گھنٹے کا کام نہیں تھا یہ۔۔۔ اور اب شام ہونے کو آرہی ہے۔ ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔" وہ نچوڑتے ہوئے کپڑوں کی بالٹی اب چھت پر لے جا رہی تھی۔

چھت پر سبکتگین اور زینیا پہلے سے موجود تھے۔

زینیا اپنے کنوؤں کے باغ کے بارے میں تفصیلات بتا رہی تھی۔ اور باتوں میں سے ایسی ایسی نئی باتیں نکل رہی تھیں کہ کیا قصہ چہار درویش میں سے نکلتی ہوں گی۔

باغ سے روڈ۔۔۔ روڈ سے نہر۔۔۔ نہر سے دنگل۔۔۔ دنگل سے جنگل اور جنگل میں منگل پیدا کرنے والے اس کے تین بھائی۔۔۔

ابھی اس بھائی کا قصہ تھا جو بہت موٹا تو تھا مگر ماہر تیراک تھا۔ نہر میں ادھر سے ڈبکی لگاتا تو دوسرے شہر سے ابھرتا۔

"شکر زینیا تم یہ نہیں کہہ رہی ہو کہ وہ نہر میں ڈوب کر سمندر سے نکلتا ہے۔" سبکتگین نے شگفتگی سے کہا۔

اس نے حورے کے کہے بغیر کپڑے لے کر تار پر ڈالنے شروع کردیے تھے۔

حورے کی ہنسی چھوٹ گئی۔ "بھائی تھا کہ جن۔"

"میری جینز وغیرہ مت نچوڑنا، وزنی ہوتی ہیں۔ میں خود نچوڑلوں گا۔"

وہ اپنی شرٹس لائن سے تار پر ڈال رہا تھا۔ حورے اپنے کپڑے نیچے شلوار قمیص اوپر دوپٹا پھیلا کر کلپ لگا دیتی۔

اسے پسند نہیں تھا کہ عورت کے کپڑے یوں کھلے عام ہوا سے ڈولتے پھریں اور نظروں میں آئیں۔

"آپ دونوں شاید مذاق سمجھ رہے ہو۔" زینیا نے دونوں کی تقلید کرتے ہوئے بالٹی میں سے کپڑے نکال کر نچوڑتے ہوئے تار پر ڈالنے شروع کردیے۔

"نہیں، ہم بالکل مذاق نہیں سمجھ رہے ہیں۔" ان دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا پھر ہنسی بھی آگئی۔

"بلکہ ہم تو اتنے ٹیلنٹڈ بھائی سے ملنا چاہیں گے۔" سبکتگین نے کہا۔

"ہاں تو اس میں کیا مشکل ہے۔ سرگودھا آجاؤ۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

پھر زور دینے کے انداز میں دوبارہ منہ کھولا۔ کچھ یاد آگیا تھا۔

"دتم یقین کرو سبک... میرا یہ والا بھائی..."

شڑنگ گ گ گ... حورے کے ہاتھ میں تولیہ... تھا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب پورے جسم کی طاقت اسے نچوڑنے میں لگ گئی۔ فرش پر بوچھاڑ سی گری۔

"س... ب... ک۔ یعنی کہ سبک... زینیا سبکتگین کو سبک کہہ رہی تھی۔"

وہ نام جو حورے نے بہت پیار سے اسے دل ہی دل میں دے رکھا تھا۔

بہت لجا کر اسے ایک دن یوں ہی خیال آیا تھا' وہ اسے شادی کے بعد سبک پکارے گی۔ جیسے وہ اسے کبھی حور کہہ دیتا تھا۔ حورے تو دادا کا دیا نام تھا۔ لیکن جب وہ دل سے پکارتا تھا تو حور...

اور اب یہاں... اس نے سبکتگین کو دیکھا۔ وہ بیڈ شیٹ تار پر ڈال چکا تھا۔ زینیا دونوں سروں پر کلپ لگاتے ہوئے مسکرا کر کچھ کہہ رہی تھی' نجانے کیا...

اسے تو سبک کے بعد کچھ سنائی نہ دیا۔

☆ ☆ ☆

اس کے اعصاب شل ہو گئے۔ کتنا مشکل کام تھا کسی کی ٹوہ لگانا۔ یہ تو دن کا چین اور رات کی نیند اڑانے والا کام تھا۔ مگر شکر کی بات یہ تھی کہ اسے سب ٹھیک ملا۔

زینیا کے سبکتگین کو سبک کہنے کے پیچھے کچھ نہیں تھا۔

وہی اس کا بے خیالی اور بے ساختگی میں گفتگو کرنا... وہ دادا کو بہت لاڈ سے نانا جانی بھی پکار لیتی تھی۔ اور حورے کو اس نے پورے نام سے پکارا' حور عرش اور سبکتگین کو سبک... تو اس میں کچھ نہیں تھا۔ اس سے واقعی سبکتگین بولا نہیں جاتا تھا۔ جس دن سے آئی تھی کوئی دس بار تو نام مشکل ہے کا رونا پیٹ چکی تھی۔

اور تو کچھ نیا نہیں تھا... قابل غور یا قابل تشویش۔

ہاں وہ سبکتگین کی مردانہ وجاہت و خوب صورتی کو بہت بے باکی سے سراہ چکی تھی۔ پر ایسا تو اس نے حور عرش کے لیے بھی کہا تھا۔

اس نے علی کی پسلی میں ٹہوکا دے کر یہ بھی کہا تھا۔

اسے اگر پتا ہوتا کہ اس کی خالہ کا اتنا حسین پتر ہے تو وہ پہلے ہی کراچی آجاتی۔ بلکہ دنیا میں کچھ لیٹ آتی یا پھر وہ جلدی آجاتا۔

اور علی اس اس طرح شرمایا تھا کہ کیا کوئی شرمیلی حسینہ شرماتی ہو۔ وہ بعد میں بغلیں جھانکتا پھرا' زینیا قہقہے لگاتی پائی گئی۔

عمیر تو تھا ہی پیارا بچہ... وہ اپنی تعریف پر ماں کی گود میں گھس گیا۔

تو کچھ نہیں تھا زینیا کے انداز و بیان میں ایسا جو وہ وہم پالتی۔

مگر۔

مگر اس کا کیا کرتی اسے زینیا کے منہ سے سبکتگین کا سبک کہنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"خیر زینیا مختار تو اب جانے والی تھی۔"

اتنے دنوں کی خوشگوار ہلچل اختتام پذیر ہونے کو تھی۔ پھر وہی گھر ہوتا' دادا' حورے اور بالکنی سے نیچے سڑک... رواں دواں زندگی اور سبکتگین...

وہ کام سے لگا ہوا تھا۔ اس پر شاید گھر کے سناٹے کا اثر نہ ہوتا۔ اور شکر تھا کام لگا ہوا تھا۔ ورنہ فارغ ہوتا تو اس کے اندر کی کشمکش' الجھن اور تکلیف و اضطراب... ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ ہر طرف اداسی' ناامیدی' نہ ہنسنے کو دل کرتا اور رویا بھی نہ جاتا۔ دادا خاموش ہو جاتے۔ تو وہ بھی دم سادھ لیتی۔

نیچے سے اٹھتا شور اعصاب شکن ہو جاتا۔ اپنا وجود لکڑی لگتا۔ جس پر ہر دم ہتھوڑی کی ضربیں لگتیں۔ مصائب اور ناامیدی کی کیلیں... اندر کہیں جا کر گڑ جاتیں۔

☆ ☆ ☆

یہ کسی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے نوے دن نہیں

تھے کہ گیارہ سال تک کھینچ جاتے' یہ تو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے نوے دن تھے جو گھڑی کی سوئیوں سے جوڑ دیے گئے تھے' نوے دن پورے ہوئے اور شام پانچ بجے سبکتگین معراج ایک بار پھر بے روزگار تھا' جانتا تھا کہ یہی طے ہے اور یہی ہوتا ہے' ہو کر رہے گا۔

آج اس کا بس میں بیٹھنے کا بھی دل نہیں کیا' وہ سائٹ کے علاقے سے لالوکھیت تک جانے کے لیے پیدل ہی چل پڑا۔

اچھے گزرے تھے یہ تین مہینے۔۔۔ مہمان داری بھی سنبھالی گئی۔ زینیا بہت خوش خوش اپنے گھر لوٹی تھی۔ حورے اسے تن زیب محل لے گئی تھی اور اس نے اس کی پسند سے لان کا خوب صورت سوٹ دلوایا پھر ناظم آباد کی چورنگی پر بیٹھ کر گول گپے بھی کھائے۔ وہاں سے دونوں رکشے میں بیٹھ کر مینا بازار پہنچیں اور زینیا نے کہنی سے اوپر تک دونوں ہاتھ مہندی سے بھر والیے' پیروں پر بھی پھول بنوائے اور درجن بھر کون مہندی خرید بھی لی۔ سرگودھا جا کر گفٹ کرنی تھی سب کو۔۔۔

وہ بہت مطمئن تھا۔ دادا بہت خوش تھے' حورے بھی مسکرا رہی تھی۔ زینیا کا جوش و خروش بھی دیدنی تھا۔ وہ جتنا زینیا کے آنے پر خفا تھے خود سے اور سب سے' اب اتنا ہی اداس ہو رہے تھے۔

"دوبارہ کب آؤ گی زینیا!"

"اب آپ آئیں گے نانا جانی۔۔۔!" وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ حورے نے سر ہلایا پر سبکتگین کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔ رات حورے اور زینیا کے شاپنگ سے آنے تک وہ مسرور تھا۔ دادا جو خوش تھے۔ حورے اور زینیا بھی۔۔۔ اپنے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل بھرتا ہی نہ تھا۔

اتنی پیاری مہندی۔۔۔ ایسی مہندی تو پورے سرگودھا میں کسی کو نہ لگانی آتی ہو گی اور یہاں چیزیں سستی ہوتی ہیں اور ورائٹی بھی بہت ہے۔ "اتنا برا بھی نہیں ہے کراچی۔۔۔" وہ شرارت سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کراچی برا ہے ہی نہیں۔۔۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔

صبح دس بجے زینیا کو نکلنا تھا۔ سب ٹھیک ہو گیا تھا' لیکن سبکتگین نے اس کی گفتگو سن لی جو وہ اپنی امی سے کر رہی تھی ایسے میں اس کا لہجہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ الفاظ کا چناؤ بھی۔۔۔

"نہیں کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ سارے گاڑی بھر کے ادھر آ کر مجھے لیں۔ میں سبک کے ساتھ ہی نکلوں گی۔ وہ مجھے اسٹیشن لے آئے گا۔ وہ سارے بھی ادھر ہی ہوں گے۔"

"حرج یہ ہے امی جی۔۔۔ کہ نانا کا گھر اور محلّہ تو آپ نے دیکھ رکھا ہے نا' سارے شریکوں کو باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ نیچے لکڑیوں کا ڈھیر۔۔۔ برادے کا غبار جس میں سانس گھٹتی ہے اور اوپر چوبارہ۔۔۔ تین کمرے ان ساروں کے بیٹھنے کے لیے تو کرسیاں بھی پوری نہیں ہوں گی۔۔۔ اور پھر زندگی بھر کی ہنسی میں اپنی ہتک برداشت نہیں کر سکتی' میں خود پہنچ جاؤں گی اسٹیشن بس۔۔۔"

اور سب کچھ کہہ دیتی پر لہجہ اچھا رکھتی یا پھر یہی کہہ دیتی کہ میں اپنے نانا کی ہتک برداشت نہیں کر سکتی۔ کچھ محبت بھرے لہجے سے۔۔۔ دل گیری سے بجائے کہ اپنی ہتک۔۔۔

تو سبکتگین کا دل بھی ٹوٹ گیا۔

اس نے جھک کر جوتا اتار کر جھاڑا۔۔۔ ہاں ننھا سا کنکر۔۔۔ چنے کی دال برابر۔۔۔ مگر کتنی بری طرح کاٹ رہا تھا اور کاٹ تو یہ بات بھی رہی تھی کہ جب وہ گھر میں قدم رکھے گا تو دادا کا سوالیہ۔۔۔ امید و بیم والا چہرہ۔۔۔ اور حورے کا بھی۔ لاکھ وہ خود کو نارمل ظاہر کرے گی۔

سبکتگین کے قدم من بھر کے ہو گئے اور دل درد سے بھر گیا۔ کتنی تکلیف ہوتی ہے نا جب اپنے ہی گھر جانے کو دل نہ کرے' یہ دل بھی نا۔۔۔



ایاز کی نگاہیں ہی نہیں سماعتیں بھی سیڑھیوں کی

نگہبانی کرتی تھیں۔ جالی کے دروازے کے کھلنے اور بہت تیز دھڑ دھڑ قدموں کی آواز پر اس کی گردن تیزی سے گھومی تھی اور اگلے ہی منٹ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور وہی ایک کیوں' جس جس نے دیکھا تھا' سب متوجہ ہو گئے تھے۔ یہ حور عرش تھی ننگے پیر۔۔۔ حواس باختہ' دوپٹا سر پر ٹکا ضرور تھا' مگر وہ حجاب کے تقاضے پورے نہیں کر پا رہا تھا۔

"دہ۔۔۔ دادا۔۔۔" اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔ آگے کچھ بول نہ سکی بس پیچھے دروازے کی سمت اشارہ کیا اور واپس بھاگ گئی۔ دروازے کے بجنے کی آواز بہت زور دار تھی۔ ایاز چونکا۔ اس نے مجمع کے لوگوں کو دیکھا سامنے والے انکل تیزی سے اوپر جا رہے تھے۔ ایاز نے تین جستوں میں سیڑھیاں پار کیں پیچھے اور لوگ بھی تھے۔

دادا چھت پر جاتی سیڑھی کے پاس آڑے ترچھے پڑے تھے' پورا جسم پسینے سے تر بتر تھا بلکہ نچڑ رہے تھے چہرہ سفید' ہونٹ سفید اور سینہ پر ہاتھ دھرا تھا' کراہنا تک مشکل تھا۔

ایاز نے ان کے دبلے ہلکے وجود کو بازوؤں میں اٹھا لیا اور سیڑھیاں اتر کر بھاگا۔ سب نیچے اتر گئے حورے عرش بمشکل تالا لگانے کا ہوش رکھ سکی۔ پڑوسی کی ہائی روف تیار کھڑی تھی' وہ دادا کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ ایاز سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر دادا کے تلوے سہلانے لگا۔

اور پھر وہ تین گھنٹے۔۔۔ دادا مردوں کے وارڈ میں تھے وہ اپنے دوپٹے کا نقاب بنائے ان کے سرہانے کھڑی رہی۔ تاوقتیکہ مانیٹر پر دل کی دھڑکن رواں ہونے لگی۔

"باہر جاؤ۔ اب دادا ٹھیک ہیں۔" ایاز نے آہستگی سے کہا۔

"نہیں' میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اس کی نگاہیں دادا کے وجود پر جمی تھیں۔

"یہاں سب مرد ہیں حور عرش۔۔۔ اور پھر ادھر میں ہوں اور ساتھ والے نظامی انکل بھی بیٹھے ہیں۔ تم باہر بینچ پر بیٹھ جاؤ۔ اچھا نہیں لگتا۔"

"ایاز ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹی!" انکل بھی ہم خیال تھے۔

"آجاؤ حور عرش۔۔۔!" ایاز نے دوبارہ پکارا۔ حورے چونکی تو وہ اس کے نام سے بھی واقف ہے۔ اسے عجیب سا لگا۔ سب اسے حورے پکارتے تھے۔ اصل نام سے تو کم ہی لوگ واقف تھے۔ اس نے نظریں اٹھائیں وہ اس کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہ ملنے پر باہر نکلنے کا اشارہ دیا۔ حورے آگے بڑھ گئی۔

اور ساری غلطی اسی کی ہے۔ وہ علی سے اتنی بے احتیاطی سے کیوں گفتگو کرنے لگی۔ جبکہ علم تھا' دادا گھر پر ہی ہیں' لیکن بے احتیاطی تو نہیں کی تھی۔ وہ فون لے کر چھت پر چلی آئی تھی۔ آخری سیڑھی پر تسلی سے بیٹھ کر اسے علی کی باتیں سننا تھیں۔ اسے تسلی دینی تھی' ہمت دلانی تھی۔ چودہ برس کا چھوٹا سا لڑکا۔۔۔ جو یتیم تھا اور پڑھائی کے ساتھ ماں کی مدد کے خیال سے محنت کرتا تھا۔ ماں بیٹا نے طے کر رکھا تھا۔ وہ دونوں مل جل کر اس وقت کو گزار لیں گے' مگر۔۔۔ زینی پھپھو کو بریسٹ کینسر تشخیص ہوا تھا' علاج فوری ضرورت تھا۔

دادا تو صرف بخار کو لے کر فکر مند تھے۔ اور نتیجہ کیا سامنے آیا تھا۔

"ابتدائی اسٹیج ہے' مگر قابل علاج' لیکن علاج کے لیے درکار رقم سن کر حورے کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔۔۔ اتنے سارے پیسے۔۔۔

سبکتگین تک گھبرا کر رہ گیا۔ بہت دیر تک تو وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔

"چلو اللہ مالک ہے۔ کرتے ہیں کچھ نہ کچھ۔۔۔"

اس نے اسے بھرپور تسلی دی تھی۔ وہ ہے ناں۔۔۔ وہ کچھ بھی کرے گا۔ مگر دادا کو نہ ہی پتا چلے تو۔۔۔ اور دادا کو پتا چل گیا۔ سن لیں انہوں نے حورے کی ساری باتیں۔۔۔

"ابتدائی اسٹیج ہے علی۔۔۔ اور بریسٹ کینسر قابل علاج مرض ہے زینی پھپھو ٹھیک ہو جائیں گی تم فکر نہ کرو اپنی پڑھائی پر توجہ دو اپنے کام پر۔۔۔ تم بہادر ہو

میرے پیارے بھائی... سب ٹھیک ہوگا ان شاء اللہ۔"

سب کچھ تو واضح ہوگیا تھا۔ دادا کو اور سننے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو بس یونہی حورے کو پکارتے سیڑھیوں تک چلے آئے تھے کہ دل گھبرا رہا ہے نیچے جاکر بیٹھ رہا ہوں، دروازہ بند کرلو... اس کی باتوں نے دل بند کردیا۔ اوہ خدا... اس نے جھرجھری لی۔

"چائے..." وہ چونکی... ایاز تھا، ہاتھ میں دو کپ چائے... وہ متامل ہوئی۔

"پی لو... سر کا درد ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے اس کی سوجے پپوٹوں والی سرخ دھلی آنکھوں میں جھانکا۔ سرخ ناک، کچھ سوجے گیلے ہونٹ... ایاز نے نظر پھیرلی۔

بہت بچپن میں ماں نے سمجھایا تھا۔ "بیٹا ایاز! کبھی کسی دوسرے کی چیز پر نگاہ نہیں جماتے۔"

اور وہ بڑا تابع دار بچہ تھا... مگر اس دل کا کیا کرتا جو...

وہ چونکا۔ حورعرش اسی سے مخاطب تھی۔

"میں سبکتگین کے بارے میں پوچھ رہی تھی، آپ نے اسے کال کی..."

"جی۔ میں مسلسل اسے ٹرائی کررہا ہوں، مگر وہ فون اٹھا نہیں رہا، میں نے میسج بھی کیے ہیں۔"

"ہاں... ڈپارٹمنٹ کے اندر فون الاؤ نہیں ہے تو اس لیے..."

"مجھے بھی یہی لگ رہا تھا۔" ایاز نے سرہلایا، جس بنچ پر حورعرش بیٹھی تھی۔ وہاں جگہ تھی ایاز کے بیٹھنے کے لیے، مگر وہ قصداً "دوسری پر بیٹھا۔

سبکتگین کو شام پانچ بجے ہارٹ اٹیک کا پتا چلا، وہ کسی سے بائیک مانگ کر اندھا دھند کارڈیو پہنچا کچھ سجھائی نہ دیا کہ کدھر جائے پھر تب ہی حورے اور ایاز کو دیکھ لیا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ایاز دواؤں کی تھیلی دیتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ سبکتگین بھاگا آیا۔ اس نے تھیلی جھپٹ لی۔

"کیا ہوا، دادا کو کیا ہوا...؟" وہ بے قراری کی انتہا پر تھا۔ دونوں کے بیچ میں حائل ہوگیا۔ اس کی آواز سنتے ہی حورعرش نے رونا شروع کردیا جبکہ ایاز کو سبکتگین کا بیچ میں آجانا بری طرح محسوس ہوا تھا۔

"اب وہ ٹھیک ہیں یار...!" ایاز نے بتایا۔

"ہاں... مجھے انہیں دیکھنا ہے۔" وہ ایاز کی ہمراہی میں اندر چلا۔

"میں بھی آتی ہوں۔" حورے نے تیزی سے کہا۔

دونوں نے سرہلایا۔

دادا آنکھیں موندے پڑے تھے۔ سبکتگین نے ان کے دونوں پیر پکڑلیے۔ دادا چونکے۔

"اب کیسی طبیعت ہے دادا...؟" وہ ان کے سرہانے چلا آیا۔

"زیبی کیسی ہے؟" دادا نے ان سنی کرکے پوچھا۔ سبکتگین نے بری طرح چونک کر حورے کو دیکھا۔ حورے نے نظریں چرائیں۔ اوہ... یعنی...

"وہ ٹھیک ہیں دادا... وہ ٹھیک ہوجائیں گی۔ بس آپ جلدی سے اچھے ہوجائیں۔"

"میں بھی تب اچھا ہوں گا جب زیبی..." دادا کی آواز گھٹ گئی۔

"باتیں نہیں کریں ادھر۔" میل نرس کی آواز گونجی۔ "اور باہر جائیں مریض کو آرام کرنے دیں... ابھی اوپر شفٹ کریں گے۔"

"اوہ...!" تینوں نے شکر ادا کیا اور باہر نکلے۔

"میں تمہارے لیے چائے لاتا ہوں۔ ساتھ میں کچھ لوگے پیٹیز وغیرہ۔" ایاز نے پوچھا۔ سبکتگین چونکا تو ایاز لایا دادا کو اسپتال... ؟

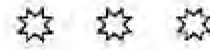
"یا پھر کینٹین چلتے ہیں۔ نظامی انکل اور جوجی ادھر ہی ہیں، دوپہر سے کھانا نہیں کھایا تھا۔" ایاز بتا رہا تھا۔ سبکتگین پرسکون ہوا تو حورے اکیلی نہیں تھی۔

"کینٹین ہی چلتے ہیں۔" ایاز نے دانستہ نگاہیں تیزی سے آتی ایمبولینس پر جمائیں۔ سبکتگین چونکا پھر سرہلادیا۔

ایاز آگے تھا، یہ دونوں ہم قدم۔ "دوپٹا اچھے سے اوڑھو حور...! اور یہ آستین بھی نیچے کرو۔"

بہت نرم دھیما لہجہ... مگر کچھ تھا، وہ چونکی۔ ہوش

ہی کب تھا۔ وضو کرنے میں آستینیں چڑھائی تھیں۔ اس نے دوپٹا اچھی طرح لپیٹ لیا۔



چڑچڑے، چپچپے، خارش زدہ مئی کے گرم دن۔۔۔ شہر زہر بن چکا تھا۔ آلودگی۔۔۔ ہوائیں چلتیں تو اور مصیبت ساتھ لاتیں۔ گرم ہوا میں کچرے کی بساند گلتا سڑتا ڈھیروں ڈھیر کچرا۔۔۔ سارا شہر مچھر کالونی بن چکا تھا۔

چاند سے دیوار چین کے ساتھ اگر اب کچھ نظر آتا۔۔۔ تو پھر یہی نظر آتا کچرا۔ بجلی کے کھمبے اور ان پر ڈلے کنڈے۔۔۔ رسیاں، تاریں اور کٹی پتنگیں۔۔۔ جھولتی پھڑپھڑاتی تھیلیاں۔۔۔ ثمر کے جنگلات ختم ہوگئے تھے اور اب ان پر مہمان پرندے نہیں آتے تھے۔ اسے تو آسمان پر چیلیں اور کوے بھی کم لگتے۔

کتنے دن ہوگئے اس نے بالکنی میں لٹکتے آب خوروں میں پانی نہیں ڈالا تھا۔ چڑیاں یا جرے کی آس میں خالی برتن میں چونچیں مارتیں پھر چلاتیں، شاید اسے پکارتی تھیں۔ "کہاں ہو حور عرش۔۔۔ حورے۔۔۔؟"

اور حورے کہیں نہیں تھی۔ ہوتا ہے ایسے بھی کبھی کبھی ہم ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتے۔ اپنے آپ میں گم ہو جاتے ہیں۔

حقیقت ہوتے ہیں، مگر گمان لگتے ہیں۔

وجود رکھتے ہیں، مگر بلبلے سا۔۔۔

آواز ہوتی ہے، مگر آہ جیسی۔۔۔ تو ایسے ہونے کو پھر کیا کہتے ہیں۔

زندگی کا اور کوئی نام ہوتا تو۔۔۔ حیرت ہوتا اور اس میں ایسی حیرت کیا؟ دکھ، صدمہ جیسی مثالیں پرانی ہو گئیں۔

زندگی کے اسکول کا آخری دن موت تک ہوتا ہے۔ انسان گود سے گور تک سیکھتا ہے اور اس نے اب تک کچھ نہ سیکھا۔ اسے پرکھ ہی نہیں تھی، اسے چہرے پڑھنے ہی نہیں آتے تھے نہ وہ دل کا حال معلوم کر سکتی تھی یا پھر لوگ اتنے چالاک ہیں کہ اپنا اندر کبھی ظاہر نہیں کرتے۔

"زیبی کی زندگی کا سوال ہے مہرالنسا! وہ مر جائے گی۔" دادا کی آواز میں منت تھی۔

"اور زینیا نے سبکتگین کو زندگی، موت کا مسئلہ بنا لیا ہے ابا۔۔۔" پھپھو کتنی برجستہ تھیں۔

اس کا دل رویا۔ دادا کی سماعت کمزور تھی۔ انہیں فون لاؤڈ اسپیکر آن کر کے دیا جاتا تھا۔ عام گفتگو میں یہ کمزوری اتنی پتا نہیں چلتی تھی، مگر فون پر بات کرتے ہوئے وہ بہت اونچا بولتے تھے اور اس وقت تو بات زیبی پھپھو کی ہو رہی تھی ان کی آواز رندھی ہوئی اور پھٹی ہوئی تھی۔

"تم زیبی کی بات کو اس بات سے کیوں جوڑتی ہو مہرو۔"

"جوڑ نہیں رہی ابا۔۔۔ مگر آپ بھی بیٹی کو رو رہے ہیں اور میں بھی۔۔۔"

"اللہ نہ کرے جو ہم دونوں کو اپنی بیٹیوں کو رونا پڑے۔" دادا ابل اٹھے۔

"تو پھر آپ مان کیوں نہیں جاتے؟"

"کیسے مان لوں۔۔۔ دوسری طرف بھی تو میری بیٹی ہی ہے۔" دادا کی نگاہیں بالکنی تک گئیں۔ انہیں حورے نظر نہیں آئی، مگر وہ وہیں تھی۔

"آپ سبکتگین سے بات تو کریں۔"

"وہ کبھی نہیں مانے گا۔" دادا پوتے سے خوب واقف تھے۔

"آپ منائیں گے تو مان جائے گا ابا۔" پھپھو کا لہجہ اکساتا ہوا تھا۔

"نہیں۔۔۔" دادا کا سر نفی میں ہلا۔

"اچھا آپ اسے کم از کم بتا ہی دیں۔۔۔ یا پھر میں فون کروں؟"

کیا مہرالنساء دھمکا رہی تھیں، لیکن سبکتگین ایسا نہیں ہے۔ وہ پوری بات بھی نہیں سنے گا۔" اس کا دل سکڑا سمٹا، مگر پھر ایک یقین کے سہارے چھیل کر روانی سے دھڑکنے لگا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔" دادا کا لہجہ مضبوط تھا۔

"نہیں نہیں کروں گی آپ کی بات مان لیتی ہوں ابا۔۔۔ لیکن مختار۔۔۔"

"کیا مختار۔۔۔؟" دادا نے اکڑ کر پوچھا۔

"اکلوتی بیٹی ہے زینیا۔۔۔ مختار کی جان بند ہے اس میں' باپ نے اس کے لیے یونہی کسی رشتے کا بتایا تھا اور اس نے بغیر کسی جھجک کے باپ کے سامنے سبکتگین کا نام لے دیا۔ اور زینیا کو مختار کے آگے بس نام ہی لینا ہوتا ہے' چیز حاضر۔۔۔"

"تمہاری بھتیجی ہے حورے۔۔۔ تمہیں اس پر رحم نہیں آئے گا۔ بچپن سے دونوں اس رشتے میں بندھے ہیں' میں تو یہ سوچ بیٹھا تھا کہ سبکتگین کی کہیں نوکری لگے تو نکاح کردوں اور تم۔۔۔"

"زینیا سے شادی کی صورت میں اس کے سارے دلدر دور ہوجائیں گے ابا۔۔۔ بھاڑ میں گئی نوکری۔۔۔"

"وہ بھی حورے کو پسند کرتا ہے۔ جانتی نہیں زیبی کے سسرال والے رشتے پر اس کا اٹھایا گیا طوفان۔۔۔" دادا کو بروقت یاد آیا۔

"پانچ چھ برس پرانی بات ہے ابا۔۔۔ کم عمر تھا سبکتگین۔۔۔ اور لڑکے اس عمر میں جذباتی ہوتے ہی ہیں۔ آپ اب بات کریں تو۔۔۔ اب اور تب کی صورت حال میں فرق ہے۔"

"لوگ تو کہتے ہیں' پھپھی بھتیجی ایک ذات۔۔۔" دادا کی بے یقینی جاتی ہی نہ تھی مہرالنسا کو بس بیٹی کی پڑی تھی۔

"لوگ غلط نہیں کہتے ابا۔۔۔ واقعی پھپھی بھتیجی ایک ذات ہوتی ہیں' مگر ماں بیٹی تو ایک عضو کی طرح ہوتی ہیں۔ آنکھ' ہاتھ' دل' دماغ کی طرح۔۔۔ مجھ سے اس کے آنسو دیکھے نہیں جاتے۔" پھپھو آبدیدہ ہوگئیں۔

"اور زیبی۔۔۔!" دادا چونکے تھے۔ "وہ تو روتی نہیں۔۔۔ پھر بھی دیکھی نہیں جاتی۔"

دادا نے فون کاٹے بغیر تخت پر یونہی اچھال دیا۔ پھپھو کی اچنبھا بھری آواز سارے میں کچھ دیر گونجتی رہی۔

"ہیلو ابا۔۔۔ ابا سن رہے ہیں مجھے۔۔۔ فون کان سے صحیح طرح لگائیں۔ وہ ابا۔۔۔ ہیلو ہیلو۔۔۔ یہ ابا بھی نا۔۔۔ اف۔۔۔"

"مجھے پانی پلادو حورے!" دادا کی زبان سوکھ کر لکڑی ہوگئی۔ ٹینشن' شوگر' بلڈ پریشر اور وہ موا دل بھی۔۔۔ جو دھڑکنے کو بہانے مانگے اور بند ہونے کے بھی' حق ہا۔

حورے اسٹیل کے نقشین پیالے میں پانی بھر لائی۔ دادا نے پیالہ خالی کرکے مزید کی طلب میں ہاتھ بڑھایا۔ حورے دوبارہ بھرلائی اور پھر ایک بار اور۔۔۔ دادا کی شوگر ہائی ہوگئی تھی۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا دادا!" وہ ان کے سر کے نیچے تکیہ درست کرنے لگی۔

پھر انہیں لٹا دیا۔ وہ کچھ دیر سو جاتے تو اچھا رہتا مگر۔۔۔ یااللہ اس نے تڑپ کر اوپر دیکھا۔ پنکھا بند ہوگیا تھا۔ لائٹ چلی گئی تھی۔ یارب۔۔۔ اس نے سر ہاتھ پر گرالیا۔ دادا کی کھلی آنکھیں بھی چھت پر تھیں۔

"کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔" وہ کہنی کے بل اونچے ہوئے۔۔۔ "کے بچے۔۔۔ الو کے۔۔۔ نمک حرام۔ کیا کریں گے اتنی بجلی بچاکر' اپنی قبروں میں لگائیں گے۔ پنکھے' بلب۔۔۔ جینا حرام کردیا' نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔"

وہ سر جھکائے ہونٹ بھینچے سنتی رہی۔ دادا نے پیر تخت سے اتارے۔ جوتا ڈھونڈ رہے تھے۔ پھر آدھا پہنا جوتا بھی ہوا میں اچھال دیا۔

"باہر کہاں جاؤں' کچرا کنڈی پر جاکر بیٹھوں یہ شہر رہنے کے قابل نہیں رہا اوپر سے دھوپ۔۔۔ اعمال کا نتیجہ ہے سارا۔۔۔ گناہوں نے گرمی بڑھادی۔ اور گناہ بھی کس کے 'میرے ہی ہوں گے' میں کون سا نیک۔۔۔ اب تو نماز کے لیے بھی نہیں جایا جاتا اسی لیے مجھ پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔ ہوں ہوں ہاہ۔"

"ہائے اللہ۔۔۔" حورے کا جھکا سر کرنٹ کھائے انداز سے اٹھا۔ دادا رو رہے تھے۔

وہ دونوں ہاتھوں کی پشت سے کسی ننھے بچے کی طرح آنسو صاف کرتے تھے پر رونا آتا ہی جاتا تھا۔

"دادا۔۔۔" وہ بے قراری سے پکارتی ان سے لپٹ

گئی۔ "مت روئیں اللہ کا واسطہ۔"

"نہیں میں روؤں گا سالے۔ سونے بھی نہیں دیتے۔ جینے بھی نہیں دیتے۔ مار دو مجھے مار ہی دو۔" وہ پنکھے سے مخاطب تھے۔ "نہ میں ہوں گا نہ یہ سب ہوگا۔" "دادا۔" اس نے خود بھی رونا شروع کر دیا۔



"میں نے فیصلہ کرلیا ہے، میں یہ گھر بیچ دوں گا۔" حورے نے چونک کر سر اٹھایا۔ دادا کا انداز فیصلہ کن تھا۔ اس نے سبکتگین کو دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور سر اثبات میں ہل گئے۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے ابھی کینسر ابتدائی مرحلے پر ہے۔ بارہ پندرہ لاکھ میں علاج ہو جائے گا۔"

"جی دادا۔۔۔!" دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ انہوں نے ہی تو یہ بات بتائی تھی۔

"گھر میری بیٹی کی جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں۔۔۔" یہ انہوں نے خود کو باور کرایا۔

"جی دادا!" حورے نے ان کا جھریوں بھرا اکڑا بوڑھا ہاتھ تھام دیا۔

دادا نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی الفاظ کی تائید کرتا تھا جبکہ سبکتگین کچھ سوچ رہا تھا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم اس گھر کو بیچنے کے بجائے زیبی پھپھو کا گھر بیچ دیتے ہیں۔" حورے تو فقط چونکی تھی۔ دادا تو چھت تک اچھل گئے۔ آنکھوں میں حیرت ابھری پھر غصہ پارہ چڑھ گیا۔

"تاکہ یتیم بچوں سے چھت کا آسرا بھی چھن جائے۔ ابھی تو میں زندہ ہوں تو کیسے اس گھر۔۔۔ اور اس گھر میں فرق کر دیا، میں مر گیا تو میری زیبی تو لاوارث ہو جائے گی۔۔۔ تجھ سے یہ امید نہیں تھی، سبکتگین۔۔۔"

"میرا وہ مطلب نہیں تھا دادا!" سبکتگین اپنی کرسی چھوڑ کر ان کے تخت پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا۔ اس گھر کی مالیت زیادہ ہے۔ بزنس پوائنٹ آف ویو سے لوکیشن زبردست ہے، پھپھو کا گھر بیچ کر آدھے پیسوں سے علاج کرواتے ہیں اور باقی آدھے سے اوپر چھت پر ان کے لیے پورشن بنوا دیں گے۔" اس نے بہت اچھا حل پیش کیا۔

"اوہ۔۔۔ ہو۔۔۔!" دادا چوکنے ہو گئے۔ "بہت خوب شہزادے! اس کا گھر بھی بک جائے اور تمہارے لیے بلڈنگ تیار ہو جائے جہاں سے تم اسے کل کو نکال باہر کرو۔ بہت اچھے میاں کیا منصوبہ بندی کی ہے۔"

"ایسا نہیں ہے دادا! آپ ایک بار سوچیے تو۔۔۔ ہم سب کا کھانا پینا ایک ہو جائے گا، کم خرچا ہو گا۔ یہاں آ کر رہنے سے پھپھو کو سہولت ہو گی۔ کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔ آپ جو ہوں گے یہاں۔۔۔ بچوں کے نانا۔۔۔ نواسیوں کو اسکول چھوڑنے لینے جایئے گا۔ ابھی پھپھو کو یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ سب مل جل کر رہیں گے۔ پھپھو اور ان کے بچے اوپر۔۔۔ اور یہاں آپ۔۔۔ میں اور حور سب۔ پھر مجھے ملازمت مل جائے گی۔ ہم اپنا خرچہ اٹھالیں گے اور کارخانے کے پیسے پھپھو کو دیں گے۔"

وہ حقیقت سے بہت قریب کی باتیں کر رہا تھا۔ بھلے وہ خواب جیسی حسین لگ رہی تھیں، مگر خواب ہی تو حقیقت بنتے ہیں۔

اور اس نے کہا میں اور حور۔۔۔ کتنا خوب صورت لگا تھا، میں اور تم، تم اور میں۔۔۔ یہی مطلب نکلتا تھا نا اس جملے کا۔۔۔ اس کے اندر تک سکون اترنے لگا۔ خدشات دم توڑ گئے۔

ہاں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس کی نگاہیں دادا پر اٹھیں، وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ پھر نظریں سبکتگین کے چہرے پر گاڑ دیں وہ اسے جانچ رہے تھے۔ کتنا سچ، کتنا جھوٹ۔۔۔ کتنا کھوٹ اور کھوٹ کتنا بھی ملا دو سونا۔۔۔ سونا ہی رہتا ہے۔ پوتا تو وہ ان ہی کا تھا نا۔ ان کا خون۔۔۔ ان کے ہاتھوں کا پالا۔۔۔ یقین آ گیا تھا۔ مگر۔۔۔ یونہی۔۔۔

"ٹھیک ہے، مگر میری ایک شرط ہے۔ پھر میں یہ گھر زیبی کے نام کر دوں گا۔" اپنے تئیں انہوں نے دھماکہ

گیا۔

"آپ ابھی کردیں دادا۔۔۔!" سبکتگین کرسی پر ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا۔ "آپ کی چیز ہے جسے جی چاہے دے دیں۔"

"حورے کو بھی نہیں دوں گا۔ سارا زیبی کو دوں گا۔ قمر کو بھی نہیں اس کا اپنی گھر نہیں ہے ادھر یا ہے۔۔۔"

"حورے کو چاہیے بھی نہیں۔۔۔ کیوں حورے۔۔۔؟"

"ہاں دادا! ہمیں نہیں چاہیے۔۔۔ میرا مطلب ہے مجھے۔۔۔ مجھے بھی نہیں چاہیے۔" روانی کا "ہم" حیا سے ٹکرایا تو "میں" میں بدل گیا۔ سبکتگین کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

بچ پر اتنی بے ساختگی تو بجتی ہے۔ بچ اتنا ہی خوب صورت ہوتا ہے تھوڑا مشکل تو ہوتا ہے 'مگر۔۔۔ اور حیا سے بڑا زیور اور کوئی نہیں۔۔۔ عورت 'عورت لگتی ہی تب ہے جب حیا دار ہو' تمیزدار ہو اور سونے پر سہاگا دل دار ہو۔ واللہ۔۔۔ اللہ اللہ۔

دادا کا چہرہ ہشاش بشاش ہو گیا۔ ہاں سبکتگین کا بتایا حل بہت قابل قبول تھا۔ شام تک دادا سرشار رہے۔

منا ڈے کے گانے بھی سن لیے۔ سر بھی دُھنا۔ بوڑھی آواز میں تان بھی لگائی 'مگر پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

"اے میری زہرہ جبین تجھے معلوم نہیں۔۔۔"

حورے کمر سہلانے پیچھے آکر بیٹھ گئی۔ "حورے!"

"جی دادا۔۔۔" اس کی نرم ہتھیلیاں دادا کی جھریوں بھری پیٹھ پر سرکنے لگیں۔

"چیک کر رہا تھا اس کو۔۔۔ میں نا انصاف نہیں ہوں۔ تم تینوں کے نام لگاؤں گا۔ کارخانے کا کرایہ جب تک علی پیروں پر کھڑا نہیں ہوتا زیبی لے گی۔ پھر بعد میں تین حصے کر لینا۔ ٹھیک ہے نا۔"

"جی دادا۔۔۔!" وہ کیا کہتی۔ سبکتگین تو لاٹھی سے بچ گیا تھا۔ وہ تو ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی 'مگر یک دم کچھ دھیان آیا تو منہ نکل گیا۔

"اور مہرو پھپھو۔۔۔ ان کا حصہ۔۔۔ ان کو بھی تو دینا ہوگا نا۔

"کیا۔۔۔؟" وہی ہوا 'دادا بھڑک کر سیدھے ہوئے وہ پیچھے کو کھسکی۔

"کچھ نہیں دوں گا اسے۔۔۔ باپ سے سودے بازی کرتی ہے نا ہنجار۔ میرا گھر ہے 'میری جائیداد۔۔۔ میں اسے گھر میں گھسنے نہیں دوں گا۔ سارے لا کو کھیت والوں کو اس کے پیچھے لگوا دوں گا۔ کنوؤں کے باغ تک چھوڑ کر آئیں گے سب اس کو۔۔۔"

"وراثت سے محروم کرنے سے گناہ ہوتا ہے دادا۔۔۔" اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

"اور سودے بازی کرنے سے اور کسی کو مرتا دیکھتے رہنے سے گناہ نہیں ہوتا۔ ابھی میں زندہ ہوں 'یہ میری جائیداد ہے۔ میں اسے اپنی بیٹی کے علاج پر لگانا چاہتا ہوں۔ کسی کو کیا اعتراض ہے۔

ہے تو میری بیٹی۔۔۔ مگر مجھ پر پڑنے کے بجائے اپنے شوہر پر پڑ گئی ہے۔ اس کا فون آئے تو کہنا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ سے میرا نام کٹوا دے اسی مالک و مختار کا نام لکھوائے نہیں ہے وہ میری بیٹی۔۔۔ اخبار میں لکھواؤں گا 'پتا کرو 'ایک سطر کتنے کی ہے۔۔۔

اور وہ اس کی بیٹی زینیا۔۔۔ مجھے وہ بھی اچھی نہیں لگی۔ میں نانا تھا اور مجھے ماموں بنا گئی۔ سبکتگین اچھا لگا ہے۔ اسی سے شادی کرے گی۔ کرواتا ہوں میں شادی۔۔۔"

دادا دانت پیس پیس کر یاد کر رہے تھے۔ ارادے باندھ رہے تھے۔ حورے سر جھکائے سنتی رہی۔ اچھا تھا بولتے بولتے بھڑاس نکلتی یا پھر یہ تھا کہ مسئلے کا حل نظر آیا تو خوشی کا ایک انداز یہ بھی۔۔۔



مسئلے کا حل ڈھونڈ لینے سے دادا اتنے خوش اور مطمئن ہوئے کہ اگلی صبح ہی رکشہ منگوایا اور حورے کے ساتھ زیبی پھپھو کے گھر پہنچ گئے۔

پھپھو اپنے سلائی والے تخت پر پاؤں لٹکائے خاموش بیٹھی تھیں 'نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی

تھیں۔ دادا اور حورے سر پر پہنچ گئے تب پکارنے پر بری طرح چونکیں۔

"دروازہ کیوں کھلا چھوڑا ہوا تھا' حالات دیکھے ہیں آج کل کے۔۔۔" دادا نے سرزنش کی۔

"نہیں تو۔۔۔ وہ بس بچیاں مدرسے گئی تھیں تو۔۔۔ دھیان نہیں رہا ابا۔"

"دھیان رکھنا چاہیے۔" دادا بیٹھ گئے۔ حورے خود ہی فریج سے پانی کی بوتل نکال لائی۔ پھپھو کی غائب دماغی اور بے دلی اسے بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے ابا جو بیٹی کے گھر خوشی' غمی پر ہی جانے کے قائل ہوں یوں اچانک تشریف لے آئیں اور وہ چونکیں نہیں۔۔۔ خوشی کا اظہار بھی نہیں کیا۔

دادا کی نگاہیں بیٹی کے گھر کا طائرانہ جائزہ لے رہی تھیں۔ کتنے پیسے مل سکتے تھے۔ کیا اتنے کہ علاج بھی ہو جاتا اور کچھ رقم بچا کر بچوں کے لیے محفوظ کرلی جاتی۔ رات بنائے گئے منصوبے نے انہیں پرسکون کر دیا تھا۔

مگر جب پھپھو نے سنا۔۔۔ تب وہ مسکرادیں۔ پھر سر نفی میں ہلا۔

"سوچا تو آپ نے کمال تھا ابا! مگر یہ ہو نہیں سکتا۔"

"کیوں۔۔۔ کیوں نہیں ہو سکتا؟" دادا نے تیزی سے پوچھا۔

"یہ گھر کوئی سارا کا سارا علی کے ابو کی ملکیت تو نہیں تھا نا۔"

"تو پھر اور کون مالک پیدا ہو گیا؟" دادا کا انداز جارحانہ تھا۔

"علی کے تایا اور چاچا بھی اس کے مالک ہیں اور شریعت پر چلیں گے تو پھپھو وغیرہ بھی۔۔۔"

"ہائیں۔۔۔!" دادا بھونچکے رہ گئے۔ حورے کی بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

زیبی پھپھو مسکرادیں۔ زخمی' بے بس مسکراہٹ۔۔۔

علی کے دادا کے دو گھر تھے۔ ایک جس میں وہ رہتے تھے۔ دوسرا یہ جس میں اب زیبی پھپھو رہتی تھیں۔

زیبی بیاہ کر گئیں تو سسر کے گھر۔۔۔ وہاں ایک جٹھانی ہی تھیں۔ پھر دیور کی شادی ہوئی تو گھر چھوٹا پڑ گیا۔ یہ گھر کرائے پر چڑھا ہوا تھا۔ علی کے دادا نے گھر خالی کروایا اور زیبی پھپھو کو ادھر منتقل ہو جانے کا کہہ دیا۔ جٹھانی بہن کو دیورانی بنا کر لائی تھیں۔

دونوں بہنیں ساس سسر کے ساتھ اکٹھی ہو گئیں۔ نندیں بیاہی ہوئی تھیں' مگر سسر صاحب نے ببانگ دہل کہہ رکھا تھا۔ ان کے مرنے کے بعد دونوں گھر اولادوں کی ملکیت ہوں گے۔ شرعی تقسیم کر دی جائے گی۔ (دونوں گھروں کو بیچ کر رقم کی منصفانہ تقسیم) اور اگر کوئی گھر بیچنا نہیں چاہتا تو پھر اپنے حصے سے رقم ادا کرے اور رہے۔

گھر بیچ کر زیبی پھپھو کو حصہ دیا جاتا تو وہ رقم تو اونٹ کے منہ میں زیرہ ہوتی۔

علاج کی رقم بھی نہ نکلتی۔ پس انداز کرنے کا تو خیال ہی کیا؟

واپسی کے سفر میں۔۔۔ حورے رکشے کے کونے میں دبکی ہوئی تھی۔ دادا بیچ میں بیٹھے تھے ذرا سا آگے ہو کر رکشے کے ڈنڈے پکڑ رکھے تھے اور گرفت کی سختی ہاتھوں کی ابھری رگوں سے ظاہر ہوتی۔ ان کے جبڑے بھی بھنچے ہوئے تھے اور صاف نظر آتا تھا آنسو روکے ہوئے تھے۔ وہی گیلی' بے رنگ آنکھیں۔۔۔ ہونٹ نیم وا اور خشک تھے۔ شوگر ہائی ہو گئی تھی۔ حورے ان کے لیے پانی کی بوتل ساتھ رکھتی تھی۔

"دادا پانی۔۔۔!" دادا ناک کی سیدھ میں دیکھ رہے تھے۔ نفی میں سر ہلایا حورے نے نگاہیں چرالیں اگر وہ دوبارہ پکارتی تو دادا کے آنسو بہہ جاتے۔

گھر پہنچ کر بھی وہ اسی طرح گم صم رہے تھے۔ وہ بھی خاموش تھی۔

"حورے!" دادا نے پکارا۔

"جی دادا!"

"ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھیں دادا۔۔۔!"

"تمہیں اندازہ ہوا ایک بار بھی کہ وہ سبکتگین کے

بارے میں کچھ اور طرح سے سوچنے لگی ہے۔" حورے ٹھٹکی۔
"نہیں دادا۔۔۔"
"پھر اس نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی؟"
"پتا نہیں۔۔۔۔۔۔" وہ سر جھکائے فرش کو تکتی رہی۔

پتا نہیں زینیا کی فرمائش سے حیرت زیادہ ہوئی تھی کہ صدمہ۔۔۔ اس نے نجانے کتنی بار اس بات کو سوچا۔ ہاں اسے حیرت زیادہ ہوئی تھی۔ زینیا نے سبکتگین کی پرسنالٹی کو بے باکی سے سراہا تھا، مگر اس نے ایسی ہی تعریف حورے کی بھی کی تھی۔ سبکتگین کو سبک پکارنے پر وہ بری طرح چونکی تھی اور اسے برا بھی لگا تھا، مگر زینیا کے بے ساختہ انداز و روانی۔۔۔ دل کے حال پر پردہ ڈال گئی یا پھر اسے لوگوں کے چہرے پڑھنے نہیں آتے تھے۔ جب ہی تو۔۔۔

وقت رخصت وہ حورے سے بہت گرم جوشی سے گلے ملی تھی۔ بہت دیر تک حورے کے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں کی گرفت میں رہے۔ اس نے مہمان داری پر دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کیا اور شاپنگ کروانے پر شہر گھمانے پر گول گپے اور چاٹ کا شکریہ اور یہ بھی کہ حورے کھانا بہت اچھا بناتی ہے اور وہ ہے بھی بہت اچھی۔

"نانا کے نمبر پر فون کیا کروں گی۔ تمہارے پاس تو اپنا سیل ہے ہی نہیں۔۔۔ یا پھر سبک کے نمبر پر۔۔۔"

لیکن اس نے ایک بار بھی فون نہیں کیا۔۔۔ ہاں سبکتگین نے دو چار بار بتایا کہ آج زینیا کی کال آئی تھی مگر وہ اٹینڈ نہیں کر پایا کہ کام پر تھا۔

دادا کے نمبر پر چند ایک لطائف آئے تھے۔ جنہیں اس نے شوق سے دادا کو سنایا اور دادا بہت خوش ہوئے۔ انہیں پہلی بار زندگی میں میسیجز آئے تھے۔

"مجھے فون میں سے میسیج نکال کر پڑھنا سکھا دو حورے۔۔۔ آخر کو میری نواسی کرتی ہے۔"

"جی دادا! سکھا دوں گی۔" وہ بھی خوشی سے بولی تھی۔

"تم نے مجھے کبھی لطیفہ نہیں سنایا۔" دادا نے اسے گھورا۔

"مجھے لطیفے آتے ہی نہیں دادا۔۔۔" وہ سادگی سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔" دادا نے معاف کر دیا۔

پھر ایسے ہی ایک دن زینیا کے نمبر سے کال آگئی، دوسری طرف میر النسا پھوپھو تھیں۔ دادا نے بیٹی کے آگے نواسی کی تعریف کی۔ وہ ہنس رہے تھے، خوش تھے۔ حورے ہتھیلی پر ٹھوڑی جما کر پیار سے انہیں دیکھنے لگی۔۔۔ پھر یک دم اس نے دادا کے چہرے پر حیرت نمودار ہوتے دیکھی اور رنگت بدل گئی۔۔۔ حیرت۔۔۔ اور غصہ۔۔۔

مہرو پھوپھو نے اپنی بیٹی کی فرمائش بیان کر دی تھی۔ وہ سبکتگین کے لیے زینیا کا رشتہ دے رہی تھیں۔۔۔ حورے کے سر پر دھماکا ہوا۔

"تم ہوش میں ہو۔۔۔" دادا دھاڑے تھے اور پھوپھو ہوش ہی میں تھیں، وہی والا ہوش۔۔۔ جیسے بقائمی ہوش و حواس کہا جاتا ہے۔

"وہ آپ کی نواسی ہے ابا۔۔۔"

"نواسی کو تو بعد میں پوچھوں گا، پہلے بیٹی کی تو سن

لوں۔ تمہیں کیا خبر نہیں ہے کہ سبکتگین اور حور عرش۔۔۔"

"وہ پوتی یہ نواسی۔۔۔ آپ فرق کریں گے ابا؟" پھوپھو نے بات کاٹ کر اپنی کہی۔

"فالتو بکواس مت کرو۔۔۔ حورے کی جگہ کوئی باہر کی لڑکی بھی ہوتی تو میرا جواب انکار ہوتا۔"

"آپ ٹھنڈے دل سے سوچیے تو۔۔۔ مختار تو خود بہت خوش ہوئے' یہاں میرے سسرال میں زینیا کے جوڑ کے لڑکے ہیں ہی نہیں' جو ہیں' وہ اسے پسند نہیں۔ باپ کی لاڈلی ہے وہ۔۔۔ میں تو ڈر رہی تھی' مگر مختار نے کہا۔ ان کے لیے بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔۔۔"

"مہر النسا۔۔۔!" دادا نے دھاڑنے کی کوشش کی تھی۔

"اتنا زور مت لگائیں ابا۔۔۔ پھر آپ کو کھانسی آجائے گی۔ میری بات تحمل سے سنیں' مختار صرف بیٹی کا رشتہ تھوڑی دے رہے ہیں۔ ہر چیز کا مختار بھی بنائیں گے۔ ہمارے بیٹے تو ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ سبکتگین سگا بھتیجا ہے میرا۔۔۔ میرا داماد بن کر تو ہمارا اسہارا بن جائے گا۔ شادی کے کتنے سال بعد زینیا کی شکل میں اولاد دیکھی۔۔۔ پھر مزید طویل انتظار سے بیٹے ہوئے۔ مختار اب خود کو بوڑھا اور کمزور محسوس کرتے ہیں۔ زندگی سنور جائے گی سبکتگین کی۔۔۔ سارے شہر کی مٹی اڑادی نوکری کے لیے جوتیاں گھسیٹ کر۔۔۔ اور نتیجہ زیرو بٹا سناٹا ہونہہ۔۔۔ آپ بھی ہمارے پاس آجائیے گا۔۔۔ بس مختار کی ایک شرط ہے کہ سبکتگین کو یہاں ہمارے ساتھ آکر رہنا پڑے گا۔"

"شرط کی بچی۔۔۔" طیش کی شدید لہر نے دادا کے پورے وجود کو لرزہ براندام کردیا۔ آواز کپکپائی۔

"مجھے ایسی کوئی موت نہیں آرہی کہ اپنا گھربار چھوڑ کر بیٹی کے دروازے پر بیٹھ جاؤں۔ تم نے۔۔۔"

"یہ پرانی باتیں ہیں ابا۔۔۔ بیٹی کے گھر کا پانی۔۔۔ نہیں پینا بیٹی کے گھر۔۔۔"

"چپ۔۔۔" مہرو نے بات کاٹی تھی۔ دادا نے بھی بولتی بند کروادی۔

"ہم سبکتگین کے سنہرے مستقبل کی بات کررہے ہیں ابا۔"

"نہیں شکریہ۔۔۔ ہمیں سبکتگین کا سیاہ مستقبل ہی مبارک ہے۔ بڑی آئی سنیارن۔۔۔ بند کر فون۔۔۔" دادا نے فون اچھال دیا۔

اور پھر ایک بار تو نہیں بار بار۔۔۔ پھوپھو کی آفر پُرکشش ہوئی جاتی تھی

"اپنی بیٹی کی بات آئی تو سب کرنے کو تیار ہے' بھول گیا جب میں نے کچھ رقم قرض حسنہ کے طور پر مانگی تھی کہ سبکتگین کو کوئی کاروبار ہی شروع کروادوں تو کیسے صفا انکار کیا تھا۔ تمہارے اس بنیے شوہر نے۔۔۔ لالچی' خود غرض' فسادی۔۔۔"

"ایک منٹ ابا۔۔۔" دادا کے پاس ایسے القابات کی پوری سیریل تھی۔۔۔ مگر پھوپھو نے بہت سنجیدہ خفگی آمیز انداز سے ٹوکا۔

"میں نے نہیں بنایا اسے بنیا۔ وہ شروع دن سے ہی ایسا تھا اور اس کی اسی خوبی کی بنا پر تو آپ نے اسے اپنا داماد چنا تھا۔ میں نے تو صرف اچھی بیٹی کی طرح "قبول ہے" کہا تھا۔"

دادا واقعی چپ کر گئے۔

مختار دادا کے کسی دوست کا بھانجا تھا۔ مؤدب اور چرب زبان۔۔۔ اسے لوگوں کو شیشے میں اتارنا آتا تھا۔ اس کے ماں باپ سرگودھا میں کنوؤں کے باغ کے مالک تھے۔ زمین داری بھی تھی۔ جوانی کے دن تھے' وہ ان سب کاموں سے جان چھڑا کر کراچی آگیا۔ ماموں ادھر لکڑی کا بیوپاری تھا۔ دادا کے اچھے دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ مختار نے خوش شکل' نازک سی مہر النسا کو سیڑھیاں اترتے چڑھتے دیکھا تھا۔ وہ بہت شستہ نرم لہجے میں بات کرتی تھی۔

ابا ہیں۔۔۔ ابا نہیں ہیں۔ ادھر سرگودھا میں مختار کی ماں' بہنوں کا مخصوص پنجابی ڈھنگ لہجہ تھا۔ اسے مہرو کے لہجے کی نرمی اور مٹھاس اچھی لگی۔ ساتھ ہی شکل بھی پیاری تھی۔ ماموں نے رشتہ ڈالا اور ہر طرح کی گارنٹی لی۔

دادا نے بھی دیکھا' لڑکا ہوشیار تھا۔ کاروباری سمجھ بوجھ بھی اور ترقی کرتا۔ شریف بھی تھا۔ رشتہ دے دیا۔ تمام قیافے درست نکلے۔ وہ مٹی کو بھی ہاتھ لگاتا تو سونا کر دیتا۔ کاروباری اصولوں میں پورا قصائی تھا۔ دوٹوک۔۔۔

(یہ ہی خوبی اب دادا کو سب سے بڑی خامی لگ رہی تھی۔ بنیا پکارتے تھے۔)

مختار پیسہ کماتا تھا' مگر خرچ کرنے سے پہلے سوچنے کا عادی تھا۔ مختار ان لوگوں میں سے تھا جو بیوی کو کھڑے کھڑے ہزاروں کی خریداری تو کروا دیتے ہیں مگر ہاتھ میں پیسہ نہیں رکھتے۔

اور دادا کوئی بے غیرت آدمی نہیں تھے۔ مگر سبکتگین کے لیے ان کا دل دکھتا تھا۔

اور پھر زیبی کی بیوگی اور کسمپرسی۔۔۔ وہ چھوٹی تھی۔ لاڈلی تھی اور اب مصیبت میں تھی۔ دادا سے یہ بدحالی دیکھی نہ جاتی۔ اول خویش بعد درویش دادا کی سوچ قطعاً" غلط نہیں تھی۔ مہرالنساکو اپنی بہن کے لیے کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔ مہرو موقع کی مناسبت سے لباس و جوتے بھیج دیتی تھی' مگر نقد رقم۔۔۔ بہت مشکل سے۔۔۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ماہوار راشن کے لیے رقم مقرر کر دیتی یا بچوں کی فیس کی ذمہ اٹھالیتی۔

اور اس پر بیماری۔۔۔ اتنی خطرناک بیماری۔۔۔ کچھ لوگوں کو اللہ آزمائش کے لیے چن لیتا ہے اور اللہ کی پسند ہونا آسان نہیں۔ زیبی پھوپھو تو شکر صبر اور توکل سے بیٹھ گئی تھیں۔

"شکر میرے مالک تو جس حال میں رکھے' جو تیری رضا۔ جو تیرا حکم۔۔۔" مگر دادا کیا کرتے۔

"مجھ موئے کا تو کوئی گردہ بھی نہ خریدے' ورنہ وہی بیچ آتا' مگر اس سے بھی کینسر کا علاج کہاں ہوتا تھا۔"

"ایک بار مہرو سے بات کرتا ہوں' آخر کو بہن ہے۔ لاکھ شوہر کے زیر نگین ہو۔ مگر بہن کی زندگی کا سوال ہے۔ چاہے تو اپنا زیور بیچ کر علاج کروالے۔۔۔ کتنا سونا پہن کر گھومتی ہے۔"

مگر مہرو پھوپھو نے صاف انکار کر دیا۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ابا۔۔۔ میں اپنا زیور کیسے بیچ دوں اور لاکھ دو لاکھ کی بات ہو تو۔۔۔ یہ تو دس پندرہ لاکھ کی کہانی ہے اور کینسر کا لاکھ علاج کروالو' وہ اپنی جڑیں اندر ہی اندر بنا کر رکھتا ہے۔ لاکھ دو لاکھ میں کر دیتی ہوں' کچھ آپ قمر سے کہیں۔۔۔ مگر اس سے زیادہ کیا؟؟"

"ہاں اس سے زیادہ کیا۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔" دادا کی نگاہیں حورے پر ٹک گئیں۔ وہ مچھلی صاف کر رہی تھی۔

"کاش مچھلی کے پیٹ سے ایک موتی نکلے۔۔۔ اور۔۔۔"

"وہ تمہاری سگی بہن ہے مہرو۔۔۔ بچپن میں تم اسے کمر پر اٹھائے گلی میں گھومتی تھیں؟" دادا ہار گئے۔

"تمہیں اس کا ذرا درد نہیں۔"

"فی الحال تو مجھے اپنی بیٹی نے درد میں مبتلا کر دیا ہے۔ رو' رو کر زندگی اجیرن کر دی ہے اس نے۔۔۔ اسے سمجھالوں' بہلالوں' پھر دیکھتی ہوں۔"

بیٹی نے جان ہی چھڑائی تھی۔ دادا نے خود مختار سے بات کرنے کا سوچا اور اس نے اچھی امید دلائی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ کرتے ہیں' کچھ سوچتے ہیں۔ دنیا میں ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔"

اور حل آگیا۔ مہرو پھوپھو نے تو بیٹی کی خواہش کو درخواست بنا کر پیش کیا تھا۔ غور کرنے پر زور ڈالا تھا۔ نفع نقصان کی شرح بتائی تھی' مگر مختار پھوپھا نے۔۔۔ وہی سب الفاظ استعمال کیے' مگر آخر میں شرط کا لفظ کہہ کر گیند ان کے کورٹ میں ڈال دی۔ (وہ زیبی کا علاج کروادے گا' مگر سبکتگین۔۔۔)

دادا کی روح فنا ہوگئی' تو اولاد کیسی چیز ہے؟
اور انسان کتنا مجبور ہے اور انسان ہی کتنا بااختیار ہے۔

لیکن وہ نہیں مانیں گے۔

"مجھ سے سودے بازی کر رہا تھا۔" آگے دادا کی مخصوص گالیاں تھیں' جو وہ زیر لب اٹھتے بیٹھتے دیتے رہے۔

☆ ☆ ☆

دادا کے کان سے فون لگا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر حسب معمول کھلا تھا۔ حورے سب سن رہی تھی۔ دوسری طرف اس کے ابو تھے سعودیہ عرب سے' وہ دادا کو بتا رہے تھے کہ وہ ایک لاکھ کی رقم بھیج رہے ہیں پھپھو کے علاج کے لیے۔۔۔

دادا پر شادی مرگ سی طاری ہو گئی۔ کچھ بہت اہم ٹیسٹ کروانے تھے۔ رقم کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ اس پر یہ کال۔۔۔

حورے چوکی پر اکڑوں بیٹھی تھی' منہ گھٹنوں میں دیے وہ سامنے رکھی ٹرے سے دال چن رہی تھی۔

دھیان مہو پھپھو کی آخری کال پر چلا گیا۔ وہ حسب معمول دادا کو نئی پٹیاں پڑھا رہی تھیں۔ حورے کو حیرت ہوئی۔ دادا چلائے جاتے۔ پھپھو پر اثر نہیں ہوتا تھا۔

یہ پھپھو کے مزاج کا ٹھہراؤ تھا۔ لائحہ عمل تھا صبر تھا یا وہ چکنا گھڑا تھیں۔ دادا کے جیسے واشگاف انکار کے بعد تو لوگ جائز بات سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ پھپھو ناجائز پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

زینیا کا مزاج۔۔۔ اکلوتی لاڈو رانی بہت معصوم ہے مگر تھوڑی ضدی بھی ہے۔ محبت کرتی ہے تو ٹوٹ کر۔۔۔ اور نفرت۔۔۔ اوہ نفرت تو وہ کسی سے کر ہی نہیں سکتی (اور اگر وہ نفرت کرنے پر آجائی) حورے نے جھرجھری لی۔ جو لوگ اپنے دل کی سنتے ہیں۔ وہ صرف اپنے دل ہی سے محبت کرتے ہیں۔

"آپ جذباتی ہو رہے ہیں ابا۔!" دادا نے ایک ہی سانس میں پھپھو کو بہت کچھ سنا ڈالا تھا۔ وہ ہانپنے لگے تھے۔ پھپھو نے باپ کی حالت کو محسوس کیا اور گہرا ٹھنڈا سانس بھرا اور پھر جب وہ بولیں۔ حورے ششدر رہ گئی۔

"جتنا کچھ مجھے آپ سے کہنا تھا' آپ کو سمجھانا تھا سب کر لیا۔ بس اب میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

پھپھو کا لہجہ مضبوط تھا۔ ادھر دادا چونکے اور حورے بھی۔۔۔ دادا پرسکون ہوئے کہ مہو خود ہی پیچھے ہٹ گئی۔ حورے کو بھی اطمینان ہوا۔

"میں اب سبکتگین سے براہ راست بات کروں گی۔ ایسے ہی اتنے دن غلط نمبر گھماتی رہی۔ وہ آج کا لڑکا ہے۔ زمانے کی اونچ نیچ کو سمجھتا ہو گا آپ سے زیادہ۔ وہ سمجھے گا میری بات۔۔۔"

حورے یک دم تخت پر بیٹھی تھی۔ دادا نے چونک کر گردن موڑی۔ خود ان کے چہرے کی بے یقینی حد سے سوا تھی۔ دوسری طرف پھپھو کی تقریر دل پذیر جاری تھی۔ دادا بری طرح بھڑکے تھے۔

"دادا۔۔۔ دادا۔۔۔ دادا۔۔۔!" حورے اچھل کر ان کے سامنے آگئی۔ ان کے کان سے لگا فون جھپٹ کر دور صوفے پر اچھال دیا۔

"اوہ دادا۔۔۔!" حورے نے دادا کا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ان کے منہ سے کف جاری ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کیا بولتے جاتے تھے۔ حورے پانی کا گلاس بھر لائی۔

دادا کی جسمانی حالت اس کے دل کی تباہ حالت سے زیادہ اہم تھی۔ دل۔۔۔ ہائے خدشات سے بھرا۔۔۔ کانپتا لرزتا۔ یہ کیا کہہ دیا تھا پھپھو نے۔۔۔ ان کے ارادے اور اگر اگر سبکتگین نے۔ اوہ میرے خدا۔۔۔

اسے فون کی شکل سے ڈر لگنے لگا۔ اب بجا کہ تب۔۔۔ اور دادا نے بھی فرمان جاری کر دیا۔ "آج کے بعد اس کا فون نہیں اٹھانا۔"

"کیا فائدہ۔۔۔ وہ اب یہاں فون کریں گی بھی نہیں۔۔۔ وہ تو اب سبکتگین سے بات کریں گی۔۔۔ اور پھر سبکتگین کیا جواب دے گا۔ اگر اس نے ہاں کہہ دی؟؟"

پھپھو کے دلائل بھی تو کتنے وزن دار تھے۔

اور مستقبل کے سہانے خوابوں کی وہ لڑی جسے دادا نے نہیں تھاما تھا اگر سبکتگین نے گلے میں ڈال لی۔۔۔ اوہ خدا نہیں۔۔۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

ہر پل سبکتگین کا چہرہ کھوجتی، سبکتگین کے فون کی بیل ہوتی تو دل اچھل کر حلق میں آجاتا۔ اس نے پہلی بار زندگی میں چوری بھی کرڈالی۔ چپکے سے اس کا فون اٹھاتی اور مسڈ کالز اور ریسیو کالز کے آپشنز میں جاکر نمبر جانچتی۔

مگر کب تک... کاش وہ کہہ سکتی "پھپھو کا فون نہ سنا سبکتگین۔"

پر اگر وہ پوچھ لیتا کیوں...؟ اوہ آگے کنواں پیچھے کھائی۔

"حورے...!"

"اوہ...!" دادا کی آواز پر چونکی۔ دادا کا دھیان نہیں تھا وہ بہت خوشی و جوش سے بیٹے سے باتیں کررہے تھے۔

"قمر کہہ رہا ہے۔ حورے نے مجھ سے بات نہیں کرنی۔" دادا نے فون والا ہاتھ اس کی سمت بڑھایا۔ ابو اس سے حال احوال پوچھ رہے تھے۔ اسے کچھ چاہیے تو نہیں۔

وہ اپنے ابو کو "ہوں ہاں" میں جواب دیتے ہوئے پیروں کے پاس گری دال کے دانے چن رہی تھی۔ باپ سے تعلق نام کا اور فون کے رسمی جملوں تک محدود تھا مگر اس نے کبھی اسے کسی محرومی کی طرح پالا نہیں تھا۔

اس کی زندگی میں باپ اور ماں دونوں کا کردار بنانے والے دادا تھے ناں۔ اور بیٹے سے بات کرنے کے بعد دادا کا چہرہ بڑے دنوں بعد پرسکون تھا۔ اسے تقویت محسوس ہوئی۔ فون دوبارہ دادا کے حوالے کرکے وہ دال چڑھانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆ ☆ ☆

زیبی پھپھو کے ٹیسٹ بھی ہوگئے۔ تجویز کردہ دوائیں خرید لی گئیں۔ کچھ نقد رقم پھپھو کے ہاتھ میں رکھی۔ کچھ دادا نے بچالی۔

"تو بیسہ سکون ہے۔" تپائی پر ناشتہ سجاتے ہوئے اس کے اندر سے آواز ابھری۔ "تمام مسائل کا حل۔"

کتنے دنوں بعد اتوار منانے کے لیے اس نے اچھا سا ناشتہ بنایا تھا۔ حلوہ پوریاں، آلو کی کلونجی زیرے والی بھجیا۔ اچار

دادا کے لیے بہت کم میٹھا ڈال کر حلوہ بنایا تھا۔

لائٹ چلی گئی تو سبکتگین بدمزہ ہوکر گیلری میں چلا گیا۔ حورے کے چائے کے اشارے پر "ادھر ہی دے جاؤ" کہہ دیا۔ دادا نے آج کے الیکٹرک والوں کو نظر انداز کردیا۔ وہ اخبار دیکھ رہے تھے۔

اس نے سبکتگین کو چائے کا کپ تھمایا اور ناشتے سے لطف اندوز ہونے لگی۔ دادا ہر خبر پر تبصرہ کرتے اور حورے کی رائے جانتے۔ یک دم سبکتگین کی دھاڑ نے آواز گونجی ۔۔۔ وہ خشم ناک تیور لیے فون کو دادا کی جانب بڑھائے حورے کے سر پر کھڑا تھا۔ دادا پوتی بری طرح چونکے۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" دادا کی آواز رعب دار تھی۔

"پھوپھو کا دماغ خراب ہے۔"

حورے کچھ نہ سمجھی۔

"اور ان کی بیٹی کا بھی۔"

"اوہ۔" حورے کے بدترین خدشات مجسم ہوکر سامنے آگئے۔ پتا نہیں سبکتگین کیا کہہ رہا تھا۔ اس کے تو کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہ رہی کہ پلکیں اٹھا کر سبکتگین کا چہرہ دیکھ لے جو بولتا جارہا تھا۔ ہاں وہ بتا رہا تھا۔ پھوپھو مہو نے کیا کہا ہے۔

"پر اس نے کیا جواب دیا یہ بھی تو بتائے۔" اس کے دل کو پنکھے لگ گئے۔

اسے جواب جاننے کی ایسی بے چینی تھی کہ جیسے کوئی جلتے توے پر ہاتھ لگ جائے تو بے چینی سے جھٹکا جاتا ہے۔ اس نے ڈری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی وہ صوفے پر براجمان ہوچکا تھا۔ چہرہ لال بھبھو کا تھا۔ آنکھوں سے ناگواری اور سرد مہری عیاں تھی۔ وہ اندر سے امڈتے غیض پر قابو پانے کی کوششوں میں تھا

اور ناکامی صاف پتا لگ رہی تھی۔
"اوہ...!" حورے کی سانسیں بحال ہو گئیں۔
اسے منہ سے جواب دینے کی کیا ضرورت تھی' یہ جو اس کی حالت تھی۔ جواب ہی تو تھی۔
دادا نے اخبار دوبارہ اپنے سامنے پھیلا لیا۔ جیسے انہیں کچھ جاننے میں دلچسپی نہ رہی ہو۔ دادا کی بے نیازی نے بتایا تو ان کا کوئی معاملہ ہی نہیں ہے۔
اس نے دوبارہ بجتے فون کو گھورا تھا۔ اور حقارت سے خود سے دور کر دیا تھا۔ اسے دوبارہ غصہ آنے لگا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھولنا چاہتا تھا تب ہی اس کی نگاہ سہمی حورے پر پڑی۔
"اوہ...!" اس کی نگاہوں میں نرمی آگئی۔ ایسے جیسے بادل یک دم سورج کے آگے آجائیں۔
اس کے چہرے سے ساری ناراضی اڑن چھو ہو گئی۔ وہ ویسا ہی پیارا' بے ضرر مہربان ہو گیا جیسا کہ وہ ہمیشہ سے حور عرش کے لیے تھا۔ اس نے مسکرا کر چہرہ اچکا کر اس سے اشارے سے پوچھا کہ
"وہ کیوں سرسوں کا پھول بن رہی ہے کیا وہ سبکتگین کو پاگل کا بچہ سمجھتی ہے۔ یا لالچی بے وقوف...؟"
اور یہ یقین کافی تھا۔ آج کی صبح واقعی اچھی تھی اور بڑے دنوں بعد آئی تھی۔ اس کے سارے خدشات ختم ہو گئے۔ وہ مسکرا دی۔



"بے وقوف سی لڑکی ہے زینیا... اور پھوپھو... بچوں کی ہر فرمائش پوری کرنے والے والدین گھاٹے میں رہتے ہیں"
حورے رات کے لیے روٹیاں بنا رہی تھی۔ جب وہ کچن کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ سینے پر ہاتھ لپیٹ رکھے تھے۔ حورے کے پیڑے بناتے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ اس نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔
"اور تم اس سے بڑی بے وقوف لڑکی ہو۔" اس کا لہجہ مسکراتا اور جتاتا ہوا تھا۔ حورے چونکی۔
"ہے ناں؟" وہ تصدیق بھی چاہتا تھا کہ وہ ہاں ہی کہے۔ وہ بے وقوف ہے۔
"میں نے کیا کیا ہے؟" اس کا لہجہ خفا تھا۔
"میں کیوں بتاؤں' تم اپنے دل سے پوچھو۔"
"مجھے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا۔" اس نے روٹی توے پر ڈالی اور نکل جانے والے کونے کو انگلیوں سے سیدھا کیا۔
"اوئی!" توا فل گرم تھا۔ اس نے تیزی سے انگلی اپنے ہونٹوں میں داب لی۔
"دھیان سے..." سبکتگین بے تابی سے اس کے نزدیک آیا۔
"کچھ نہیں ہوا مجھے۔" اس نے روٹی کا رخ بدلا۔
"ہاتھ جلا ہے یار!" وہ انگلی دیکھنا چاہتا تھا۔
"نہیں جلا... اور اگر جلا بھی ہے تو اتنا چھوٹا موٹا جلنا کٹنا تو باورچی خانے کی زندگی کا حصہ ہے' ہر عورت کے ساتھ دن میں ایک بار تو ایسا کچھ نہ کچھ ہوتا ہی ہے۔" اس نے بہت نرمی مگر صاف گوئی سے کہا۔
"تم نے کبھی بتایا نہیں۔"
"تم نے کبھی پوچھا نہیں۔"
"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔" وہ خفا ہوا۔ حورے کچھ نہ بولی۔ وہ دوسرا پیڑا بنا رہی تھی۔
"اچھا۔ آج برتن میں دھودوں گا۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔
"صرف آج..." حورے شریر ہوئی۔
"تو کیا ہمیشہ...؟" اسے جھٹکا لگا۔
"میں نے تو نہ آج کے لیے کہا نہ ہمیشہ کے لیے... صرف پوچھا ہے۔" اسے ہنسی آرہی تھی۔
سبکتگین نے اسے گھورا۔ پھر گویا ہوا۔ "ہم ہمیشہ مل جل کر کام کیا کریں گے۔"
"بالکل..." حورے نے سر ہلایا۔ "آپ کام بڑھائیں گے میں کام کیا کروں گی۔"
"جو بھی کریں گے' دونوں ہی کریں گے۔" سبکتگین نے معصومیت کی حد کر دی۔
"ٹھیک ہے۔" اس نے ہنسی روک کر تابع داری کا مظاہرہ کیا۔

"تمہیں اتنی ہنسی کیوں آرہی ہے؟"
"تو کیا رونے لگوں؟"
"نہیں... رونا مت مگر ہنسی کو روکا نہیں کرو۔"
"کیوں۔؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔
"ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو۔" سبکتگین کا لہجہ جذب سے لبریز ہو گیا۔ حورے کے ہاتھ رک گئے۔ اور پلکیں لرزا ٹھیں۔
اس نے ایسے تو کبھی تعریف نہیں کی تھی۔ بہت برد بار، بہت لحاظی، بہت حیا والا تھا۔ مگر شاید آج کے دن کا تقاضا تھا کہ وہ کچھ ایسا کہے جو مقوی قلب ہو۔ ڈھارس دے... بھروسا بنے۔
ایک... ایک نظر... ایک مسکراہٹ۔
مضمون لکھ کر دینے کو کون کہتا ہے محبت میں۔
محبت تو بس چار حرفی ہوتی ہے۔
اور محبت تو...
"اکیلی کھڑے ہو کر روٹی بناتی تھیں تو جلدی مل جاتی تھی۔ مجھ بڈھے کو... آج دونوں سے مل کر بھی نہیں بنی۔ بوڑھا آدمی ہوں۔ بھوک بھی جلدی لگتی ہے۔"
حورے کے توتے چڑیاں اڑے دادا کی صدا پر... سبکتگین کے بھی دیوتا کوچ کر گئے۔ وہ جب کچن میں حورے کی دل جوئی کے خیال سے آیا تھا۔ دادا منہ کھول کر خراٹے لے رہے تھے۔
"کمال ہے بھئی۔" وہ کچن سے باہر نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

دادا نے ایاز سے رکشہ لانے کا کہا۔ وہ زیبی پھپھو کے گھر جانا چاہ رہے تھے۔ فون پر انہیں بیٹی کی آواز نقاہت سے پر لگی تھی حالانکہ بیٹی نے سب اچھا ہے کا یقین دلانے کے لیے ہنس ہنس کر باتیں کی تھیں۔ مگر باپ کا دل۔
"رکشے میں کہاں تکلیف کریں گے دادا... اتنی تو گرمی ہے۔ تو میں اپنی گاڑی لے آتا ہوں۔ اس میں چلے جائیں گے۔" ایاز نے نئی گاڑی خریدی تھی۔ دادا مسکرائے۔
"ویسے تو سبکتگین لے جاتا مگر وہ نئے کوچنگ سینٹر میں جاب کر رہا ہے۔ اور میرا دل کچھ بے چین سا ہے۔ بس آدھے گھنٹے کو زیبی کو دیکھ آؤں۔" دادا کے لہجے میں بھی بے چینی اور بے چارگی گھل گئی۔
ایاز نے سر ہلا دیا۔
دونوں روانہ ہوئے۔ دادا نے ایاز کو اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔ اسے نزدیکی چائے کے کھوکھے پر ہی روک کر آدھے گھنٹے بعد آنے کا بتا دیا۔ ایاز نے پھر سر ہلا دیا۔
اور بیٹی کے گھر میں قدم رکھتے ہی دادا کو اپنے دل کی بے چینی کا سبب معلوم ہو گیا۔ بیٹی حال سے بے حال اپنے سلائی والے تخت کے اوپر بیٹ پر ہاتھ دھرے آنکھیں موندے پڑی تھی۔ تینوں چھوٹے بچے ماں کے گرد بیٹھے تھے۔ یونی فارم بدلا نہیں تھا۔
سنک میں پڑے گندے برتن، چائے کی پتیلی میں پڑی صبح کی چائے مٹیالی ہو چکی تھی۔ اور ایسا ہی بے رنگ چہرہ زیبی کا تھا۔
"تم لوگوں نے کھانا کھایا؟" بچے منہ سے کچھ نہ بولے۔ ایک دوسرے کو دیکھا اور نفی میں سر کو ہلا دیا۔
"کھا لیا ہے نانا...؟" بڑی والی کا جھوٹ صاف نظر آرہا تھا۔
"ہاں کھا لیا ہے۔" چھوٹوں نے بہن کی تائید ضروری سمجھی۔
نیم جان پڑی زیبی نے بمشکل آنکھیں کھول کر بچوں کو دیکھا پھر باپ کو۔ مسکرا دی۔ اور دادا نے سوچا وہ کیوں مسکرائی۔ ایسے مسکرانے سے تو بہتر تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔ دھاڑیں مارتی۔ بین کر ڈالتی۔ کم دکھ ہوتا، تھوڑی تکلیف ہوتی۔
"تم تو کہہ رہی تھیں اب بہتر ہو۔" دادا نے شکوہ کیا۔
"ٹھیک کہا تھا... رات سے تو بہتر ہوں بہت زیادہ..."
"امی کو بہت درد ہے نانا!" چھوٹی والی نے بتایا۔

"تم لوگوں کو بھوک نہیں لگ رہی۔؟"
"لگ رہی ہے۔" بیٹے نے بے بسی آمیز فکر سے کہا۔
"چلو سامان باندھو... ہم گھر جائیں گے' راستے میں برگر کھلاؤں گا۔"
"برگر...!" بچوں کی آنکھیں چمکیں۔ "کیچ اپ کے ساتھ؟"
"ہاں۔!" دادا لاٹھی پر زور ڈال کر کھڑے ہوئے۔
"بچوں کا اسکول ابا...!" زیب النساء سب سن رہی تھیں۔
دادا نے جواب نہ دیا۔
بچے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ دادا اپنے ناتواں کندھوں سے بیٹی کو لگائے کپکپائے ہاتھوں سے تالا بند کرنے لگے۔



دادا نے سنا تھا کہ ان کی زیبی کو کینسر ہو گیا ہے۔ کینسر ایک لفظ اس کو کہہ دینے کے بعد مزید کچھ بتانے کی گنجائش نہیں رہتی۔ سب سے مہنگا علاج اور انتہائی تکلیف دہ مرض اور زیبی پھپھو کو گھر لانے کے بعد وہ اس تکلیف کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔
وہ درد سے تڑپتیں تو دادا باؤلے ہو کر چکراتے۔ حورے کو دو دو مریض بھگتانے پڑ جاتے۔ بی پی بڑھ جاتا۔ دل میں درد ہونے لگتا' زبان کے نیچے گولی رکھ کر جبڑے بھینچ کر بھیگی آنکھوں کے ساتھ بیٹی کو دیکھے جاتے' یہاں تک کہ اس کی صورت دھندلا جاتی۔
دھند کے اس پار بیٹیوں کے چہرے ڈگمگاتے۔ زیبی مہو' حورے اور زینیا۔
مہو نے کہا تھا "ابا! پوتی بھی آپ کا خون اور نواسی بھی۔ یہ تو اب طے ہے فیصلہ کچھ بھی ہو' ایک اولاد کو تو رونا پڑے گا۔ تو ٹھیک ہے۔ میں اور میری بیٹی خود ہی رو دھو کر چپ کر جائیں گے۔"
وہ خوامخواہ انہیں جذباتی کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر دادا کے دل پر اس بات کا اثر ضرور ہوا تھا۔
"میں نے آپ سے زندگی میں پہلی بار کوئی چیز مانگی نانا! اور وہ بھی آپ نے منع کر دی۔" زینیا کا لہجہ بھیگا اور مایوس تھا۔
سبکتگین "چیز" تو نہیں تھا۔
ایاز اوپر کے حوالے سے کان کھلے رکھتا تھا۔ اسے بھی زیبی پھپھو کی بیماری کا پتا لگا۔
"آپ مجھ سے پیسے لے سکتے ہیں دادا... میں علاج کروا دوں گا زیبی پھوپھو کا۔" اس نے کہا۔
اور اگر یہ کوئی اور وقت ہوتا وہ حورے کے لیے ایاز کے حال دل سے ناواقف ہوتے تو فوراً" ہامی بھر لیتے مگر انہیں بہت گھٹیا سا احساس ہوا۔ وہ ایاز سے پیسے نہیں لے سکتے... کبھی بھی۔
"یہ قرض حسنہ ہو گا دادا... آپ واپس کر دیجیے گا' جب آپ کو سہولت ہو۔" دادا خاموش رہے۔
"دیگر حل تو نکالنا پڑے گا۔" انہیں مہو کی باتیں یاد آنے لگیں۔
"آپ کیوں سبکتگین کے روشن مستقبل کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں ابا... کیا مل رہا ہے۔ جوتیاں چٹخاتا ہے۔ مختار کا دل بہت بڑا ہے' وہ کچھ بھی کر کے دے دیں گے۔ جو بھی سبکتگین چاہے۔ شہزادوں جیسی آن رکھنے والا میرا بھتیجا کیا حق نہیں رکھتا کہ اسے سکھ کے پل نصیب ہوں۔" مہو پھپھو کا لہجہ دل گیر ہو گیا۔ (حقیقت یا مصنوعی؟)
"اوہو...!" دادا اپنی سوچوں سے ابھرے۔ یہ زیبی کی کراہوں کی آوازیں تھیں اب تو درد کی شدت ایسی تھی کہ کوئی بھی پین کلر اثر نہ کرتی۔



"میں مان گیا ہوں سبکتگین!" کمرے میں تین نفوس تھے اور اعصاب شکن خاموشی تھی۔ حورے اپنی قمیص پر بٹن ٹانک رہی تھی۔ دادا بالکل خاموشی سے گیلری میں آتی جاتی چڑیوں کو تک رہے تھے مگر سوچیں نظر آتی تھیں۔ سبکتگین دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے جکڑے بیٹھا تھا۔ دادا کے جملے پہ چونکا۔ حورے

کے ہاتھ بھی رک گئے۔ دونوں کی نگاہیں ملیں پھر دادا کو دیکھا۔ مگر وہ ان دونوں کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہی آب خوروں پر آتی چڑیاں۔۔۔

"تم بھی مان جاؤ۔۔۔" ان کی آواز اور لہجہ بہت صاف تھا۔

"آپ کیا مان گئے ہیں اور۔۔۔ میں کیا مان جاؤں؟" سبکتگین کی سوالیہ نگاہیں حورے پہ گئیں جس نے لاعلمی سے کندھے اچکائے تھے۔

"زینیا سے شادی۔۔۔ میں نے مہو کو ہاں کا فیصلہ کر لیا ہے تم بھی ہاں کہہ دو۔"

"دادا۔۔۔!" سبکتگین کی آواز شدید ترین حیرانی کے ساتھ بلند ترین تھی۔

"دادا۔۔۔!" حورے کی آواز جیسے کنویں سے برآمد ہوئی۔ ساتھ ہی اس کی کراہ نے دادا پوتے کو متوجہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں سوئی کھب گئی تھی اور دوسری مٹھی میں بند سرخ بٹن تڑ تڑ کر کے زمین پر یہاں وہاں گر گئے تھے۔

مگر نہ وہ بٹنوں کو دیکھ رہی تھی نہ پور پر نمودار ہونے والے سرخ قطرے کو۔۔۔ وہ تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے دادا کو دیکھ رہی تھی۔ جن کا چہرہ جذبات سے عاری مگر فیصلہ کن تھا۔

"دادا! آپ نے کیا کہا؟" سبکتگین کو سارا قصور اپنی کم فہمی کا لگا دادا بھلا ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں' سوال تو سادہ سا تھا۔

"آپ نے کیا کہا؟" مگر دادا نے جواب میں کیوں کہا سے لے کر وجوہات اور سدباب تک کا معاملہ نبٹا دیا۔

حورے تو لڑکی تھی اور لڑکیوں کے دل تو پتے کی طرح لرزنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔

مگر سبکتگین تو مرد تھا' اس نے زندگی میں پہلی بار جانا دل کا دھڑکنا اور بات ہے۔ دل کا لرز جانا اور۔۔۔

☆ ☆ ☆

حورے میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ ایک شکوہ کناں نگاہ دادا پر ڈال لیتی دکھ اور صدمہ کوئی بتانے کی چیز ہے۔ دادا کو فیصلہ کرتے ہوئے جب اس کی یاد نہ آئی تو فیصلہ سنانے کے بعد وہ اسے کیا دیکھتے جو بیٹھے ہوئے کو نہ دیکھ سکے۔ وہ کھڑے ہوئے کو بھی نہیں دیکھ پاتا۔

اس نے دادا کی طرف سے منہ پھیر لیا۔۔۔ اور انہیں معاف بھی کر دیا جو ان کے حالات تھے' ایسی بات سے کیا بعید۔۔۔ یا شاید اس لیے کہ اس نے سبکتگین کا انکار سن لیا تھا' دیکھ لیا تھا۔

"وہ اور زینیا۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔" حورے کا دل مضبوط ہوا۔

اور زیبی پھوپھو۔۔۔ سبکتگین کون سا ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھا تھا۔ اچھا پرائیویٹ اسپتال نہ سہی۔ بہت سے اور راستے بھی تھے۔ ذرا تحمل مگر دادا کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھے۔ زیبی پھوپھو کی کراہیں۔۔۔ تکلیف سماعت پر ہتھوڑے برساتی تھی۔

مگر یہ حل تو نہیں۔۔۔ کہ۔۔۔

اور دوسری طرف دادا وہ اپنی بات منوانے پر کمربستہ تھے انہوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔

"یہ کیا بچپن ہے دادا!" سبکتگین کو دانتوں پسینہ آ گیا۔ منت سماجت جبر تک کر لیا مگر وہ منہ کھولنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ شوگر لیول گر گیا۔ ایمرجنسی میں اسپتال گئے۔

"آپ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔" سبکتگین نے تنبیہی انگلی اٹھائی۔ حورے خاموش تھی۔ بے چارہ سا' بے بس رندھا ہوا چہرہ۔۔۔ اس کے الفاظ گم ہو گئے تھے۔ کیا ہو گا۔ اب کیا ہو گا۔

"ہاں۔۔۔ نہیں کروں گا ایسی حرکت دوبارہ۔۔۔" دادا کے جملے امید افزا تھے مگر یہ تو جواب کا ابتدائیہ تھا جبکہ اصل جواب۔

"تو اس سے کہو' مان جائے۔" دادا وہیں کھڑے تھے۔ حورے کے بازو گر گئے۔ یہ نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ کیسے کہہ دیتی۔۔۔ دم نکل جاتا۔

دادا کے چہرے پر استہزا بکھر گیا۔

"بس صرف باتیں لگاوٹ کے مظاہرے۔"

"آپ مجھے بیچنا چاہتے ہیں دادا.....!" سبکتگین کے لہجے میں کانچ تھا۔

"ہاں... دادا کا لہجہ بے جھجک تھا۔ سبکتگین گنگ رہ گیا۔

"مصیبت کے وقت گھر کی قیمتی چیزیں نیلام کردی جاتی ہیں۔ زیور' کپڑا' زمین' مکان...." دادا کی آواز صاف تھی اور میرے گھر کی واحد قیمتی چیز تم ہو...." صاف آواز میں سلوٹیں پڑ گئیں۔ مضبوط لہجے میں دراڑیں... پتھر آنکھ بھی موم ہوئی تھی اور دادا نے موم کو بہنے سے روکا نہیں' ہاں پر منہ ضرور پھیر لیا۔ سبکتگین جہاں کا تہاں رہ گیا تھا۔



سبکتگین کا انکار و قطعیت ڈھارس تھا تو دادا کا فیصلہ قیامت...

دادا' پوتا مدمقابل آگئے تھے۔ "زینیا سے نہیں کرے گا تو میں حورے کا ہاتھ بھی نہیں دوں گا۔ میری پوتی ہے۔ میں نہیں دیتا۔ رشتہ گھر سے نکال دوں گا بلکہ نکل جاتا ہوں خود ہی۔"

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔" سبکتگین نے کہا۔

"میں سب کچھ کروں گا پوتے! کون مائی کا لال مجھے روکے گا۔" دادا نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ کھانسی کا پھندا لگ گیا۔ سبکتگین کمر سہلانے کو آگے آیا تو دونوں ہاتھ آگے کر کے اسے روک دیا "دور... بالکل دور تم اپنی زندگی جیو۔" دادا دونوں ہاتھوں سے اسے دفع دور کے اشارے کر رہے تھے۔

"آپ مجھے کتا بنا رہے ہیں دادا.... وہ بھی پٹے والا جس کی زنجیر اس زینیا کے ہاتھ میں ہوگی۔" وہ بے بسی سے بیٹھ گیا۔ "مجھے تو مہو پھوپو پر حیرت ہے' وہ اپنی سگی چھوٹی بہن کے علاج اور زندگی کے لیے فکر مند نہیں۔ سودے بازی پر تلی ہیں۔"

"مہو نہیں کہہ رہی' مختار کہہ رہا ہے۔" دادا نے تصحیح ضروری سمجھی۔ سبکتگین نے استہزاء سے سر جھٹکا۔

"آپ مہو پھوپھو کو اس طرح باعزت بری نہیں کر سکتے دادا....! اکلوتی چھوٹی بہن زندگی و موت کے درمیان کھڑی ہے اور وہ... میری خود کی سگی بہن اس حال میں ہوتی تو میں اپنا گردہ بیچ دیتا... اپنی جان بیچ دیتا اور مہو پھوپھو۔"

تیز تیز لہجے میں بولتے ہوئے اس کی سانس پھول گئی۔ چہرہ بھی انار ہو گیا تھا۔ پر یہ کیا...؟ دادا عجیب سی مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ سبکتگین کا چہرہ سوالیہ ہو گیا۔

"تو میں اور کیا کہہ رہا ہوں۔ میں بھی تو تمہیں جان بیچ دینے کا کہہ رہا ہوں ناں۔ سگی بہن کے لیے گردہ بیچتے' جان بیچتے تو سگی پھپھی کے لیے کیوں نہیں... یا پھر بہن اور پھپھی کے درجوں یا محبت میں فرق ہے؟"

سبکتگین بھونچکا رہ گیا۔ دادا نے کہاں سے پکڑا تھا۔ کیسا نشتر لگایا تھا۔ کیسا تیر چلایا تھا۔ وہ اپنے ہی جملے کی پکڑ میں آگیا۔ ہاں تو دادا اسے وہی کرنے کا تو کہہ رہے تھے جس کا اس نے جوش سے دعوا کیا تھا کہ۔

"ہم کیوں جئیں سبکتگین! محرومیوں کے ساتھ...."

دادا کی آواز مدھم اور لہجہ دوستانہ مگر ٹوٹا ہوا تھا۔ "کیا دے رہی ہے ہمیں یہ زندگی۔ مایوسی' بھوک' افلاس' بیماری۔"

"میں مایوس نہیں ہوا دادا.... میں کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے میرا اچھا وقت بھی آئے گا۔" سبکتگین کا لہجہ پرعزم و پریقین تھا۔

"زیبی زندہ ہوگی تب تک....؟" دادا کی آواز اور آنکھ بھر آئی۔

"ہم سب امید و بیم میں جی رہے ہیں سبکتگین.... بے کار زندگی.... ٹھیک ہے تم نہ مانو.... زیبی... کی تکلیف اللہ کم کرے' وہ اتنی زندگی ہی جیے گی جتنی اللہ نے لکھی ہے۔

مگر ہمارا ساتھ ایک دوسرے کو کیا دے رہا ہے ہم نے مجھ سے پوچھا۔ مجھے حورے پر ایک بار رحم نہیں آیا... اس پر رحم آیا تب ہی تو اس فیصلے پر پہنچا ہوں۔"

سبکتگین نے چونک کر دادا کو دیکھا۔ کچن میں سلیب کے سہارے مجسّمے کی طرح کھڑی سب سنتی حورے بھی بری طرح چونکی۔

"کیا مل رہا ہے اسے اس گھر میں اور اس زندگی سے۔ تمہارے اور میرے ساتھ سے؟ پیدا ہوئی تو ماں کی عدم دلچسپی بلکہ نفرت... بے زبان، معصوم بچی ماں کی حقارت کو جھیل کر بڑی ہوئی پھر ماں کا چلے جانا پھر اسے بھول کر کبھی پلٹ کر پوچھا تک نہیں... باپ کی عدم دلچسپی اور پھر جب وہ ملک سے ہی چلا گیا۔ اور نئی دنیا بسالی۔

جو کھلاؤ، کھالیتی ہے جو پہناؤ، پہن لیتی ہے۔ کبھی کچھ مانگتی نہیں جبکہ اس کی عمر کی لڑکیاں... تمہاری نوکری کے خواب دیکھتی ہے۔

کیا ملے گا اسے تم سے شادی کر کے... کسمپرسی، تنگ ہاتھ جو بعد میں زندگی کو بھی تنگ کر دے گا۔ یہی بے کار سا غریبانہ گھر... ایک کمرے سے دوسرے کمرے کا سفر، کیا نیا پن ہوگا۔ لڑکیاں تو بڑے خواب دیکھتی ہیں۔"

"یہ سب آپ سے حورے نے کہا؟" سبکتگین کی آواز میں بے یقینی والا سہما پن نمایاں تھا۔

دادا کا سر نفی میں ہلا "یہی تو رونا ہے، وہ منہ سے کچھ نہیں کہتی۔"

سبکتگین کے سرخ پڑتے چہرے سے بے نیاز دادا نے آج حقیقت بیان کرنے کی قسم کھالی تھی۔ دوسری طرف حورے مجسّمے کی طرح ساکت بس سن رہی تھی۔

"میں تو سب کا بھلا سوچ رہا ہوں ہم سب خوش رہتے... میں... زہی، اس کے بچے... زینیا اور تم حورے بھی اور..." دادا نے حلق تر کیا۔ بہت سوچا تھا انہوں نے اس پہلو پر... اور پھر جتنا سوچتے رہے صورت حال واضح اور قابل قبول ہوتی چلی گئی۔ ہاں ایسا ہو سکتا ہے اور کیا برائی تھی۔ اس میں کوئی نہیں۔ دراصل انسان کا خود قائل ہونا ضروری ہے۔ باقی تو پھر غیر ضروری باتیں ہوتی ہیں۔

"اور دادا... ؟ اور کون دادا؟" سبکتگین کا لہجہ سنگین ہو گیا۔

"اور... اور ایان..."

بالآخر انہوں نے کہہ ہی دیا۔

سبکتگین بھونچکا رہ گیا تھا۔ "ایان... اس کا کیا ذکر...؟"

"رشتہ دیا ہوا ہے اس کی ماں نے حورے کے لیے... دس بار منت کر چکی ہے۔"

"رشتہ... منت... وہ جانتی نہیں کہ... اور آپ نے منع نہیں کیا کہ..."

"جانتی بھی ہے اور منع بھی کر چکا ہوں، مگر ماں ہے نا۔ مائیں بڑی مجبور مخلوق ہوتی ہیں۔ بیٹے کے زور دینے پر آجاتی ہے بے چاری..."

سبکتگین کے سر پر جیسے گارڈر گرا... اور حورے کے پیروں سے زمین سرکی۔ وہ سلیب سے سرکتی یوں زمین پر بیٹھی۔ جیسے حلق میں اٹکی آخری سانس نکلی ہو۔

(یہ آپ نے کیا کر دیا دادا... جتنا کہ وہ سبکتگین کے مزاج سے واقف تھی، جتنا وہ اس کے حوالے سے پوزیسو تھا۔ وہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی محتاط ہو گئی تھی، تو یہاں تو دادا خود سے کہانی کہہ رہے تھے۔)

"وہ کہتی ہے، ایاز کہتا ہے، حورے سے شادی نہ ہوئی تو وہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔"

دادا نے ایاز کی ماں کا جملہ دہرایا۔ مگر یہ تو وہ بات تھی جو مرتے دم تک سبکتگین کو پتا نہیں لگنی چاہیے تھی۔

"اور حورے، وہ کیا کہتی ہے؟ اور آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" سبکتگین کی آواز اجنبی ہونے لگی تھی۔

"لڑکیاں کب منہ سے بولتی ہیں سبکتگین..."

ایک جملے میں دادا نے دونوں کی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا۔ (کاش وہ اٹھ کر جا سکتی اور دادا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی، مگر...)

"لیکن یہ تو ہم بڑوں کا کام ہے نا، بیٹیوں کے دل کا حال چہروں سے جان لیں۔ قرآن خوانی پر گئی تھی وہ اس

کے گھر۔۔۔ اب تک پھولوں، پودوں والے ہرے بھرے گھر کی تعریف کرتی ہے۔ اس کے گھر کا رنگ، دروازے۔۔۔ لکڑی کا جھولا اور بڑے بڑے ہوا دار کمرے۔۔۔

ہمارے ساتھ رہ کر اسے کب ملیں گی یہ سب چیزیں۔۔۔ (چاہئیں بھی نہیں۔۔۔)

ہمارا ساتھ صرف خسارہ ہے جبر ہے، اور کچھ نہیں۔۔۔ (نہیں دادا۔۔۔ نہیں۔)

"یہ سب حورے نے کہا؟" سبکتگین اسی جگہ پر اٹکا ہوا تھا۔

"لڑکیاں کب منہ سے کہتی ہیں۔" دادا اور کتنا جھوٹ بولتے۔ کیسے کہانی گھڑتے۔ کہانی بنانا کوئی آسان کام ہے، وہ بھی جھوٹی۔۔۔ (چپ کر جاییے دادا۔۔۔)

حورے نے دیکھا، سبکتگین کھڑا ہوا تھا۔ اس کے نقوش بگڑ گئے تھے۔ وہ دادا کو دیکھے جاتا تھا۔ پھر وہ بیٹھا۔ منہ پر ہاتھ پھیرا، پھر بالوں میں۔ بے قراری و وحشت اس کے ہر مو سے عیاں تھی۔ یک دم وہ اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا اور جتنا حور عرش اسے جانتی تھی۔

وہ اس کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ چلا گیا تھا ہمیشہ کے لیے۔۔۔

☆ ☆ ☆

کتنی دیر گزر گئی۔ دادا تخت پر اکیلے بیٹھے تھے۔ حورے اب تک باہر کیوں نہیں آئی ان سے جواب طلب کرنے، گلہ کرنے، لڑنے یا رونے ہی کے لیے۔۔۔ صرف سبکتگین کو سنانا تو مقصود نہیں تھا۔ حورے کو بتانا بھی ضروری تھا۔ وہ کیا کرنے والے ہیں اور انہوں نے کیا کر دیا۔

"کہاں گیا ہوگا سبکتگین۔۔۔؟" انہیں گمان ہوا، کہیں وہ ایاز کا گریبان نہ پکڑ لے اور اسے مار دے یا مر جائے۔۔۔ لیکن نہیں، وہ جس طرح نکلا تھا، اس کے قدموں کی شکستگی ان کی زیرک نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہی تھی۔

"اور یہ حورے۔۔۔" دادا کا دل یک دم لرزا۔۔۔ "وہ ٹھیک تو ہے نا۔۔۔!" انہیں عجیب سا وہم ہوا تو سرعت سے پیروں میں جوتا پھنسا کر کچن کی سمت بڑھے، پر دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔

وہ پھسکڑا مار کے فرش پر بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے۔ وہ ناک کی سیدھ میں دیکھ رہی تھی۔ دادا کی آہٹ پر بھی جنبش نہ ہوئی۔ اس کے سرخ پپوٹے اور گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں خشک ہو چکی تھیں، مگر داغ اب بھی باقی تھے، ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی۔

"حورے۔۔۔!" دادا نے پکارا۔

جواب ندارد۔۔۔

"حور عرش!" دادا نے دوبارہ پکارا اور پھر شکستہ قدموں سے اس کے نزدیک اکڑوں بیٹھ کر کندھا ہلا کر متوجہ کرنا چاہا، مگر اس کا ارتکاز نہ ٹوٹا۔

"حورے۔۔۔!" دادا کی آواز بھرا گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اس کی پوری ہستی ہل جاتی، پر ابھی پلک بھی نہ جھپکی۔

دادا بیٹھے بیٹھے آگے ہوئے۔ اس کا چہرہ دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ حورے میں تب بھی حرکت نہ ہوئی۔ ہاں بس پتھر ہوئی آنکھوں میں نمی چمکی۔ نمی سے چشمہ اور جھیل کے کنارے لبریز ہو گئے۔ حرکت اب بھی نہ ہوئی۔

"اور کوئی حل نہیں تھا میرے پاس۔۔۔"

(تو الزام لگا دیا دادا۔۔۔ بدگمانی پیدا کر دی۔)

دادا وہی سب باتیں کہہ رہے تھے جو سبکتگین سے کہی تھیں۔

"سبکتگین شہزادہ ہے تو فقیروں کی طرح کیوں رہے؟"

(نہ رہے فقیر۔ بادشاہ بن جائے پر بادشاہ کنیزوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ دادا اسے بھی رہنے دیتے۔)

"میں لالچی نہیں ہوا حورے، خود غرض بھی نہیں کہنا، مگر بات زندگی موت کی تھی، تمہارے سامنے تو ڈاکٹر نے کہا کہ مرض بڑھ رہا ہے۔ یعنی لاعلاج ہوتا

جارہا ہے۔ تم خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو' تم کیا کرتیں؟" دادا کی آنکھیں بہنے لگیں۔ پہلی بار حورے کی پلکیں لرزیں اور نظر اٹھی۔

ہاں' موت کے بازار سے زندگی خریدنے کے لیے وہ سب کچھ داؤ پر لگا دیتی مگر اس الزام کو کیسے جھیلے جو اس پر لگ گیا تھا۔ بہت اچھا تھا' سبکتگین... مگر عورت کے معاملے میں اس کا ظرف بہت چھوٹا تھا۔ ہوا اندر کر ہوتی تو وہ سارے دریچے بند کر دیتا۔ حورے کو کیوں چھوا؟

پھر وہ کیسے ایاز کا نام حورے کے نام کے ساتھ سن لیتا' جبکہ ساتھ بہت مہارت سے بنی کہانی بھی تھی اور کہانی کھینے والا کون... ؟ دادا... جن پر اسے آنکھ بند کر کے یقین تھا۔

"تم میری بات سن رہی ہو نا حورے؟" دادا نے اس کا کندھا ہلایا اور وہ چھوئے جانے کی تو منتظر تھی۔ اس کا ضبط ختم ہو گیا' وہ ڈھے گئی۔ دونوں بازو دادا کی جانب بڑھا کر ان سے لپٹ گئی۔

دادا نے اسے خود میں سمو لیا۔ بھینچ بھینچ کر رو پڑے۔

"بہت اچھا ہے ایاز..."

(پر وہ سبکتگین تو نہیں...)

"تم خوش رہو گی؟"

(زندہ رہوں گی دادا! سانس چلنے کا نام زندگی ہی تو ہے۔)

"وہ مجھے معاف کر دیتا۔"

(سزا کیسے دوں' معاف کرنا پڑے گا دادا...)

حورے کے پاس سارے جواب تھے' مگر اس کے لب سل گئے تھے یا پھر زبان رہن ہو گئی تھی۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم سمجھ دار ہو' زینیا نادان ہے' ضدی ہے' بچی ہے۔"

(کاش وہ بھی ہوتی' اس کے سارے عیبوں پر باپ کے پیسے نے پردہ ڈال دیا۔)

"کیا سبکتگین کا حق نہیں کہ وہ اچھی زندگی جیے۔" دادا' پھوپھو مہرو کے الفاظ دہرانے لگے۔

"ہاں حق ہے اسے..." حورے' دادا کی آغوش سے نکلی' اس نے خود ہی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"زینی کے بچے رُل جاتے' وہ مر جاتی۔" دادا روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

حورے نے سر اثبات میں ہلایا۔ "ہاں بالکل..."

"ایاز اچھا لڑکا ہے نا؟" دادا بتا رہے تھے کہ پوچھ رہے تھے' اس نے پھر بھی ہاں میں سر ہلایا۔

(نہ ہوا اچھا ایاز... برا ہو یا کوئی بھی ہو... محمود تو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔)

"میں نے ٹھیک کیا نا؟" دادا کو نہ جانے کون سی تسلی درکار تھی۔ حورے کی نگاہیں بے ساختہ اٹھیں۔

"تم مجھے معاف کر دو گی نا؟" دادا کو قرار نہیں تھا۔ مگر اس بار حورے کا سر اثبات میں نہیں ہلا۔ وہ نفی میں گردن ہلا رہی تھی۔ وہ دادا کو کبھی بھی معاف نہیں کرے گی۔ انہوں نے کچھ ٹھیک نہیں کیا۔

دادا کا رنگ بدل گیا' ہر سوال پر "ہاں" کیسے سوچ لی انہوں نے... کند چھری سے ذبح کیا اور پوچھتے ہیں۔ درد تو نہیں ہو رہا۔

حورے کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا' پھر وہ ان ہی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔



"ستر' اسی کا تو ہو گا... حورے کا سوٹ؟"

"بالکل نہیں... یہ ایک لاکھ سے اوپر کا ہے لکھوا لو مجھ سے..." اگلی آواز پر یقین تھی۔

"اور اس نے میک اپ بھی صیب بیوٹی پارلر سے کروایا ہے۔"

"حورے ہے ہی پیاری..."

سبکتگین نے ٹھنڈا سانس بھرا... وہ سب سے دور کسی کونے میں بیٹھا پڑوسی کی دونوں بیٹیوں کی گفتگو سن رہا تھا' جو دلہن بنی حورے کو سراہ رہی تھیں۔ حورے کو یا اس کے وجود پر سجے لباس و زیور اور سنگھار کو...

سبز غرارہ سوٹ پر سلور کام اور نگینے تھے۔ سلور زیور اور پوتوں کا سادہ میک اپ' سرخ لپ اسٹک۔۔۔ اسے دیکھنا اور پھر نظر کترانا' جان جوکھم کا کام تھا۔
اور پھر حورے کی اٹھی نظر کی خاموش استدعا۔۔۔ وہ اس کے سامنے سے چلا جائے۔ اسے نہ دیکھے اور وہ دور ہٹ گیا تھا۔ مگر ارادہ نہ ہونے کے باوجود نظر پلٹ پلٹ کر اسی طرف جاتی تھی۔
صرف پڑوسی کی بیٹیاں ہی کیوں زینیا بھی حورے کے لباس و زیور اور مہندی کو چھو چھو کر رشک بھرے انداز سے سراہ رہی تھی۔
"کتنا ڈفرنٹ سبز رنگ ہے یہ۔۔۔" اس نے کہا تھا۔
(ہاں نیم رنگ۔۔۔ کڑوا زہر رنگ۔۔۔ جس کی کڑواہٹ اس کے جسم کے ساتھ ساتھ روح پر بھی چڑھ گئی تھی۔)
حورے کسمسائی۔۔۔ اسے سبز رنگ پسند تھا۔ جوگیوں کا رنگ۔۔۔ گنبدوں' میناروں کا رنگ۔۔۔ سبزے اور تراوٹ کا رنگ۔۔۔ مگر اب وہ بس نیم کا رنگ تھا۔
"اور واقعی حورے تم مستحق تھیں کہ تمہیں سب کچھ ملے اور یہ شان و شوکت' یہ آسائش اور خواہش۔۔۔"
"میں تمہارے ساتھ چٹنی روٹی کھا کر شکر گزاری کی زندگی گزار لیتی سبکتگین۔۔۔ مگر۔۔۔" اس سے آگے وہ بول ہی نہ پائی۔
"مجھے معلوم ہے' تم گزار لیتیں وہ زندگی۔۔۔ مگر حورے کیوں؟ تمہارا حق تھا کہ تمہارے لیے آسمان سے تارے چنے جائیں اور میرا ہاتھ اتنا اونچا ہو نہیں سکا۔"
"تم دادا کی بات مان لو سبکتگین۔۔۔ زینیا اچھی لڑکی ہے۔" وہ صاف آواز' مضبوط لہجے کے ساتھ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔
"اور تم۔۔۔؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تم بری لڑکی ہو؟"
"میرا کوئی ذکر نہیں سبکتگین۔۔۔ میں اس سارے قصے میں کہیں نہیں ہوں اور اس کے ساتھ میرا یقین بھی کر لو کہ۔۔۔"
"واقعی۔۔۔؟"
"ہاں یقین۔۔۔ میں ایاز کو بالکل نہیں جانتی کہ وہ کون ہے اور کیا سوچتا ہے۔"
سبکتگین پوری جان سے ہل گیا۔ وہ اس کے مزاج کے تمام رنگوں کی بھیدی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کے نام کے ساتھ وہ کسی کا نام غلطی سے بھی نہیں سن سکتا تب ہی تو صفائی دے رہی تھی۔ ہاں وہ راہ ضرور بدل لے' مگر بدگمانی مت پالے' بات کردار کی تھی' وہ محبت وار کر دینے کا حوصلہ رکھتی تھی' مگر اس نے اس کے ساتھ بے ایمانی نہیں کی تھی۔
سبکتگین نے بس نظر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ دادا نے تو بہت پکا نشانہ لگایا تھا۔ پل بھر کو اس کا وجود ہل گیا تھا مگر حورے۔۔۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی بھی۔۔۔
"میں جانتا ہوں۔ تم کسی ایاز کو بالکل نہیں جانتیں اور یہ کہ۔۔۔"
"بس۔۔۔" حورے نے ہاتھ اٹھا دیا۔ "اتنا کافی ہے اور کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔" وہ کمرے سے نکل گئی۔
اور محبت پانے کا نام تو نہیں۔۔۔ محبت ہی میں تو کھویا جاتا ہے۔ محبت ہی کا تو غم منانے کی روایت ہے۔ محبت قربانی مانگتی ہے۔ دادا نے مانگی اور محبت ہی تو مجبور کرتی ہے۔ وہ محبت جو اسے دادا سے تھی۔ ان کے آنسوؤں سے تھی اور زیبی پھپھو سے تھی اور حورے سے تھی۔۔۔
وہ اسے اپنے ساتھ سسکتی' قطرہ قطرہ نچڑتی زندگی کا حصہ کیوں بنائے' جبکہ اس کے لیے راہیں روشن اور کشادہ ہیں۔
دادا نے ایاز کو ہاں کر دی اور آج نکاح کی یہ تقریب۔۔۔
ایاز' حور عرش کو اپنا بنانے آیا تھا' اس نے زمین کے مقدور بھر وسائل لگا دیے تھے۔ یہ شان و شوکت' یہ رنگ و نور۔۔۔ اور وہ حورے کے ساتھ بیٹھا جچ رہا تھا۔

اور مہو پھپھو نے یہ کہا تھا کہ "سبکتگین اور زینیا ساتھ کھڑے کتنا جچ رہے ہیں۔"

پتا نہیں... وہ زینیا کی طرف دیکھ ہی نہیں پاتا تھا۔ (ہاں زینیا کی نظریں نہیں تھکتی تھیں اسے دیکھ دیکھ کر...) دادا کی ہر بات پر لاجواب ہو کر اس نے نہ جانے کس امید پر آخری پتا کھیلا تھا۔

"میں مان گیا ہوں دادا! مگر ایک بار زینیا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ضرور بات کرو اس میں کیا حرج ہے۔" دادا کے لیے یہ ہی کافی تھا کہ وہ مان گیا تھا۔

اسے یقین تھا اس سے بات کرنے کے بعد زینیا خود انکار کر دے گی۔

مگر زینیا نے اسے حیران کر دیا۔

"زینیا! میری کچھ شرطیں ہیں۔ اگر تمہیں منظور نہ ہوں تو تم اپنے فیصلے پر نظرثانی کر سکتی ہو۔"

"تمہید مت باندھو مجھے سب منظور ہے۔" اس نے اس کی پوری بات بھی نہیں سنی تھی۔

وہ خوشی سے بے حال تھی۔

"میں گھر داماد نہیں بنوں گا۔ تمہیں یہیں رہنا ہوگا اسی شہر اور ان ہی گلیوں میں۔ مجھے اپنے شہر سے محبت ہے۔"

ایک محبت (حورے) چھوڑ دی ہے۔ اب اور کچھ نہیں چھوڑے گا۔ اپنی انا خودداری اپنے لوگ اپنا شہر شہر خرابی شہر دلدار شہر محبت... شہر بے درد...

"تمہیں گزارہ کرنا ہوگا ہر حال میں ساتھ نبھانا ہوگا اور... اور..."

شقیں بڑھتی ہی جاتی تھیں اور وہ مسکرائے جاتی تھی وہ جیسے اس پر وزن بڑھا بڑھا کر ڈگمگانے کا منظر دیکھنا چاہتا تھا۔ (شاید کوئی موہوم سی امید کہ...)

"چپ کر جاؤ سبک..." اس نے ہوا میں ہاتھ ہلایا۔

وہ ہلکی پھلکی تھی۔

"لعنت اس محبت کے دعوے پر جو ساتھ بھی نہ نبھا سکے۔ تم میرے ساتھ رہو یہ ہی کافی ہے میرے لیے اور وہ محبت ہی کیا جو محبوب کے رنگ میں نہ رنگ سکے۔"

اس کے حیران تاثرات پر اس نے گہرا جملہ کہا۔

"میں کسی بلیک میلنگ میں نہیں آؤں گا۔ نہ کبھی سنوں کہ تم پچھتا رہی ہو۔"

"بلیک میلنگ... کون سی بلیک میلنگ...؟"

زینیا چونکی اور وہ بھی چونکا۔ تو پھر پھوپھو یا پھپھا مختار ڈوریاں ہلا رہے تھے۔

اور پتا نہیں زینیا نے سچ کہا کہ جھوٹ... ابھی تو وہ پالینے کے خمار میں سراپا تسلیم تھی۔

سبکتگین کی نسبت دادا اسٹیج کے عین سامنے والی کرسی پر براجمان گیلی آنکھوں سے حورے کو تکتے ہی جاتے تھے۔ مہو پھپھو ساتھ آکر نہ جانے کب بیٹھ گئیں۔

"میں شرمندہ ہوں ابا... مگر مختار... وہ ایسا ہی ہے۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں اسے... لیکن ایک بات بتاؤں... میں فیصلہ کر چکی تھی۔ میں اپنا زیور بیچ کر بہن

کا علاج کرواؤں گی تو اس نے دھمکا دیا۔ تمہارے ابا کے لیے اپنی بیٹی کی زندگی اور خوشی اہم ہے تو میرے لیے میری بیٹی کی میں بے بس ہو گئی ابا۔۔۔ کاش میں آپ کو سمجھا سکتی یا یقین دلا سکتی۔"

وہ ہاتھ مل رہی تھیں۔

"میں زینیا کو بھی نہیں سمجھا سکی۔" دادا کچھ نہ بولے۔

یقین سے اب کیا حاصل تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

مگر شاید یہ سب ٹھیک ہوا۔ وہ ایاز کو دیکھ رہے تھے جو اپنی کزنز کے جلو میں قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کی خوشی بتانے کے لیے کوئی مثال ملنی مشکل تھی۔

(بالکل ایسے جیسے سبکتگین کا غم بتانے کے لیے اور حورے کا غازے کی تہ اور آنکھوں کے گہرے سیاہ میک اپ نے سب چھپا دیا تھا۔ وہ غم جو آنکھ میں ٹھہر گیا تھا۔ وہ زردی جو چہرے پر کھنڈی تھی۔ لرزتے سرخ لب حیا کے خانے میں ڈال کر سب ٹھیک ہو گیا۔ آہ۔۔۔)

"تمہارے نام کا مطلب جاننے کے لیے میں لغت خرید لایا تھا۔" ایاز کی سرگوشی پر وہ کیا کہتی۔

"عرش کی حور تو مرنے پر ملے گی۔ میرے لیے تو تم حور ارض ہو۔" وہ بے حد خوشی سے کہہ رہا تھا۔ اپنی اختراع پر نازاں۔۔۔ جبکہ حورے۔۔۔ اس کا دل رو دیا۔

حور ارض۔۔۔ جب ہی مٹی ہو گئی۔

کھانا کھلنے کی صدا پر سبکتگین دادا کو سہارا دے کر لے آیا۔ اب حورے تو نہیں تھی جو ان کا دھیان رکھتی، اسے ہی سب کرنا تھا۔



آزردہ اور محروم زندگی سے بہتر زندگی۔

دادا اور حورے نے اسے "محبت" ہی کا واسطہ دیا تھا۔ دادا سب کہہ دیتے، سارے دلائل دیتے، سچے اور جھوٹے۔ بس یہ نہ کہتے

"اگر مجھ سے محبت ہے تو؟"

اور اسے محبت تھی۔ اسے خود سے وابستہ ہر چیز سے محبت

تھی۔ ان محبتوں کے لیے وہ جان قربان کر سکتا تھا۔ یہ تو فقط دل کی قربانی تھی اور محبت خراج مانگتی ہے۔

ایثار صرف اس کے حصے میں تو نہیں آیا تھا۔ حورے بھی اس کی ہم قدم تھی۔ وہ بھی محبتوں سے گندھی تھی۔ اتنی محبتوں سے بچھڑ کر وہ بھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ دونوں کے ایثار نے کتنی محبتوں کو بچا لیا تھا۔ کتنا ظالم لگتا کہ حورے کا ہاتھ پکڑتا اور چل پڑتا۔ تب وہ سبکتگین تو نہ ہوتا جس کی رحم دلی مشہور ہے۔

اور یہ تو اسے پتا تھا کہ زینیا کے ساتھ زندگی کا سفر مشکل نہیں ہو گا۔ وہ اپنی محبت سے اس کے دل کے زخم بھر دے گی اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک ہلکی سی کسک رہ جائے گی۔

اس نے زینیا کی آنکھوں میں سچائی کو دیکھا تھا۔ وہ صاف گو لڑکی تھی۔ اور مضبوط بھی۔۔۔

اور محبت بچھڑ جائے تو انسان مر نہیں جاتا۔ دل دھڑکتا ہے۔ ایک میٹھے درد کے ساتھ۔

پھر بھی دل دھڑکتا ہے
پھر بھی سانس چلتی ہے
زندگی ہے تھکی سی
اک نظر بھٹکی سی
ساتھ چھوٹ جانے سے
راستہ بدلنے سے
دل نہیں بدلتا ہے
عشق بے زبان سہی
پھر بھی بات کرتا ہے
وہ نظر سے دور ہو
پھر بھی پیاس لگتا ہے
بے بسوں کی دنیا میں عشق بار لگتا ہے
بار بار لگتا ہے
ہاتھ چھوٹ جاتا ہے، یا دروگ لگتی ہے
پھر بھی دل دھڑکتا ہے، پھر بھی سانس چلتی ہے

حاجرہ ریحان



نظر ہو جاتا۔۔۔ رات کو اپنے ایر کنڈیشنڈ کمرے میں سکون کی نیند۔۔۔ ایسے میں کوئی وجہ بھی تو نہیں تھی کہ ہم باپ بیٹی ایک دوسرے سے گھتم گتھا ہوتے۔

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ اب کھڑکی میں لگی گرل کو پکڑے ہمارے وسیع و عریض لان میں ایک سے ایک خوب صورت اور نایاب پودوں میں کھلتے پھولوں کی بہار دیکھ رہا تھا یا پھر مجھ سے جان چھڑانے کی ترکیب



میں نے سانس لینے کے لیے رک کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے گلاب کو ٹہنی سے پکڑے لاتعلقی سے اپنی انگلیوں میں گھما رہا تھا۔ اس کی اس قدر بے حسی پر مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے پھر سے کہنا شروع کیا۔

"یاد ہے وہ دن جب میں نے اسی طرح تم کو اپنے چھوٹے سے کچے آنگن کا گلاب آپا کو دینے کے لیے دیا تھا اور تم دھڑلے سے یہ کہہ کر چلتے بنے تھے کہ یہ پھول تو تم ہی اپنی کسی کتاب میں محفوظ کرو گے۔۔۔؟"

وہ دھیرے سے مسکرا اٹھا۔۔۔ اور مجھے اور بھی تاؤ آگیا۔

"اور وہ دن جب تم نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ کچھ پھول تو صرف مٹی میں رلنے کے لیے ہی ہوتے ہیں تو کیوں نہ سیج پر چڑھا دیے جائیں؟"

وہ گڑبڑا کر مجھ سے نظریں چرانے لگا اور اس کے چہرے پر ندامت نظر آنے پر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔۔۔ شکر ہے کہ اس نے کچھ تو محسوس کیا۔ خوشی نہیں غم ہی سہی۔۔۔ فخر نہیں تو ندامت ہی سہی۔۔۔ مرے ہوئے کو کیا مارا جائے۔۔۔ کسی بے عزت اور بے توقیر شخص کی بے عزتی کر بھی دی جائے تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، عادی مجرم۔۔۔ میں نے مایوسی سے سوچا۔

"تمہاری بدنامی تو پہلی خبر تھی جو تمہارے محلے کی زینت بنتے کے ساتھ ہی مجھ تک پہنچی تھی۔۔۔ گو کہ میں اور بابا خود کو لیے دیے رکھتے تھے، مگر کیا کرتے کہ ہمارے گھر کی دیواریں کچھ یوں ملی ہوئی تھیں کہ آپا کا تم پر اکثر رات گئے چیخنا چلانا۔۔۔ ننھے ٹیپو کا رونا پیٹنا۔۔۔ تمہارے بوڑھے والد کا تم دونوں بھائی، بہن کو بہلانا پھسلانا۔۔۔ ایک مچھلی بازار کا سا سماں باندھ دیتا تھا۔۔۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سب سنتی تھی۔۔۔ حیران الگ ہوتی۔۔۔ میں نے تو زندگی میں ایک ہی لفظ سیکھا اور برتا تھا۔۔۔ پرائیویسی۔۔۔ ویسے بھی بابا کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا تھا کہ کسی بات پر غصہ کرتے، نہ ہی میں ان کو تنگ کرتی تھی۔۔۔ دن بھر تو پڑھنے لکھنے۔۔۔ گھومنے پھرنے۔۔۔ مہمان نوازی۔۔۔ دوستی یاری اور شاپنگ کی

سوچ رہا ہوگا۔ اس وقت وہ کسی جیل کے قیدی جیسا لگ رہا تھا جو اپنی کوٹھری کی سلاخیں پکڑے باہر چلتے پھرتے پولیس والوں کو حسرت سے دیکھے۔ وہ آج کچھ ایسا ہی میری مضبوط گرفت میں تھا۔ جبکہ میں کم گو۔۔۔ کم حوصلہ اور بزدل ہو کر بھی دلیری سے سب کچھ کہہ دینے پر تلی ہوئی تھی۔ آج ہی تو تمام حساب چکائے جائیں گے۔ آج ہی لازمی ہم دیکھیں گے۔



آپا سے مل کر مجھے کیسی طمانیت سی محسوس ہوئی تھی۔۔۔ وہ ہماری شفٹنگ کے دن ہی ٹرے میں چائے اور کچھ کھانے پینے کا سامان سجائے بغیر دستک دیے چلی آئی تھیں۔۔۔ میں جو اپنے حالات کو کئی بار کوس کر تھک ہار کر مزدوروں کو فارغ کردینے کے بعد کچے چھوٹے سے آنگن میں ڈھیر کردیے سامان کے ساتھ خود بھی کسی کرسی پر ڈھیر تھی۔

تمہاری آپا کو یوں خوش دلی سے آتا دیکھ کر دو چار لمحوں کے لیے حیران رہ گئی تھی۔ شاید اسی وقت آپا نے میرے چہرے پر وہ سب پڑھ لیا تھا جو ایک اچھے اور امیر خاندان کے فرد پر اپنا سب کچھ لٹ جانے پر آجاتا ہے۔ انہوں نے مجھے دلاسا دیا نہ ہی مجھ سے کرید کرید کر میرے ماضی کے بارے میں پوچھا۔ بس کچھ ایسی محبت سے پیش آئیں، جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔۔۔ اتنی انسیت؟ ایک اجنبی سے۔۔۔!! میں نے سوچا یہ کیسے لوگ ہیں۔۔۔ یہ کون سا محلّہ ہے۔۔۔ چھوٹے گھر دل بڑے۔۔۔ علم کے کچے عقل کے پکے۔۔۔

"آہ۔۔۔ وہ بھی کیا دن تھے۔۔۔ قبضہ کیے ہوئے بے قاعدہ سے گھیرے ہوئے چھوٹے بڑے بوسیدہ مکانات۔۔۔ اور ان میں ہمارا وہ دو کمروں کا چھوٹا سا کوارٹر۔ جس کی دیواریں ایسی کمزور تھیں کہ ڈر لگتا تھا کہ کسی دن چھت کیسے ہم پر ہی نہ گر جائیں۔۔۔ دیواریں کمزور ضرور تھیں مگر وفادار تھیں۔۔۔ مکینوں کا غربت میں ساتھ دینا جانتی تھیں۔۔۔ ہاں بس محبت اور انسیت میں پڑوسیوں کے گھر میں ہونے والی ایک ایک بات کو برابری سے بانٹ بھی دیا کرتی تھیں۔

یوں چند ہی دنوں میں تمہارے گھر کے ہر فرد کو میں اچھی طرح سے جان گئی تھی۔۔۔ آپا جو صبح سے شام تک ایک گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتیں۔۔۔ تمہارا ننھا بھانجا ٹیپو جس کو کھیلنے کودنے اور کارٹون دیکھنے سے فرصت نہیں تھی۔۔۔ تمہارے بوڑھے والد۔۔۔ جو بڑھاپے میں بھی اپنا چھوٹا سا پرچون کا ڈھابہ چلا رہے تھے۔۔۔ اور پھر مجھے بھی کتنی سہولت سے آپا نے تمہارے والد کا باقاعدہ قرض دار بنا دیا تھا۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر تمہارے والد اس زمانے ہمیں ادھار راشن نہ دیتے تو ہم بھوکے ہی مرجاتے۔۔۔ اور پھر آپا نے ٹیپو کو جس کو کھیلنے کودنے اور کارٹون دیکھنے سے فرصت نہیں تھی۔۔۔ زبردستی ٹیوشن پڑھنے کے لیے میرے پاس بھیجنا شروع کردیا گو کہ میں ان کو ایک دو دن میں ہی بتا چکی تھی کہ ٹیپو اتنا ذہین ہے کہ اسے میری ٹیوشن کی قطعی ضرورت نہیں۔

وہ ٹیپو کا سنتے کے ساتھ ہی مسکرانے لگا تھا۔۔۔ میرے ذہن میں بھی گول مٹول ٹیپو کا خاکہ ابھرا۔۔۔ میں بھی مسکرائی۔۔۔ مگر فوراً" ہی سنجیدہ ہوگئی۔

"اور ان سب کے درمیان تم۔۔۔ شیطان۔۔۔ ابلیس۔۔۔ کسی ولن کی مانند موجود تھے۔۔۔ گھر بھر ہی نہیں پورا محلہ تم سے نالاں تھا۔۔۔ خودغرض۔۔۔ خودسر۔۔۔ خودپسند تو بہت چھوٹے اعزازات ہیں۔۔۔ مجھے پہلی بار محلے والوں کی باتوں پر اس وقت یقین آیا تھا جب۔۔۔"

میں نے ذہن پر زور دے کر دن اور تاریخ یاد کرنے کی کوشش کی۔۔۔ حیرت ہے کہ اب تک جو دن اور تاریخ مجھے ازبر تھی۔ اچانک میرے ذہن سے محو ہوچکی تھی۔

"آپا نے ہی مجھے دو چار پودے لا کر دیے تھے کہ اپنے کچے آنگن میں اگاؤں اور پھر پودوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا کروں۔۔۔ پودوں کی نرمی اور خاموشی کیسی

سہانی رفاقت ہے' اس کا اندازہ مجھے اپنے پودوں میں کھلتے چند پھولوں کو دیکھتے کے ساتھ ہی ہونے لگا تھا۔۔۔ میں نے سنا کہ ٹیپو ٹیوشن کے لیے آنے سے انکاری ہے اور تم اس کی منت سماجت میں لگے ہو۔۔۔ ویسے تمہارے اور ٹیپو کے تعلقات بھی بڑے عجیب تھے۔۔۔ پوری دنیا کا بددماغ۔۔۔ بدتمیز۔۔۔ بدمعاش ٹیپو کے آگے بھیگی بلی بن جاتا تھا۔۔۔

تم اس کے حکم پر مجھے اطلاع دینے چلے آئے۔

''آپا تو شام تک آتی ہیں' اس وقت تک تو پودے آرام کرنے لگتے ہیں۔ میں نے یہ سوچ کر تم کو دروازے پر ہی اپنے نئے نویلے پودوں سے ایک کھلتا ہوا گلاب توڑ کر دیا کہ آپا کو دے دیں اور پھر تمہاری اکڑفوں دیکھ کر سہم گئی۔

تم نے کمال ڈھٹائی سے کہا کہ یہ گلاب تو تم ہی اپنی کسی کتاب میں محفوظ کرو گے' اگر آپا کو دینا ہے تو دوسرا دے دوں اور اس گلاب کو بھول جاؤں۔

گوکہ میں ایسے معاشرے اور ماحول سے نکل کر آئی تھی جہاں لڑکیوں کو پھول دینا۔۔۔ ان کے حسن کی تعریف کرنا۔۔۔ ہنسی مذاق میں ان کے ہاتھوں کو پکڑنا عام سی بات تھی' مگر پتا نہیں تمہاری اس حرکت پر نہ تو مجھے غصہ آیا تھا' نہ ہی کسی قسم کا کوئی دکھ ہوا تھا۔ بس کچھ اندر ہی اندر ٹوٹ گیا تھا۔

میں لاجواب سی ہو کر دروازہ بند کر کے خود میں گم ہو گئی تھی۔۔۔ میں نے اسی وقت دل میں گڑگڑا کر اپنے اللہ کو پکارا تھا۔ ''اے مالک! کیا ابھی بھی۔۔۔''



ملازمہ ٹرالی میں چائے اور ناشتے کے لوازمات سجائے آچکی تھی۔۔۔ میں اس کو لیے صوفوں کی طرف بڑھ گئی۔۔۔ جب تک ملازمہ ہمیں چائے اور دیگر چیزیں پکڑاتی رہی' میں خاموش رہی۔۔۔ وہ گھبرایا ہوا سا تھا۔ کہاں وہ دو کمروں کا چھوٹا سا کوارٹر اور کہاں دو ہزار گز کے بنگلے کا بڑا سا نئے ڈیزائن کے فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم۔۔۔ میں نے فخریہ سوچا۔۔۔ یقیناً مرعوب ہو چکا ہے۔ اس کی اکڑفوں۔۔۔ اکھڑپنا۔۔۔ لاتعلقی سب کہیں ہوا ہو چکی تھی۔۔۔ وہ نظریں چرا کر کبھی کبھار چیزوں کو دیکھ لیتا۔

''آرام سے دیکھیے۔'' میں اتنی جلدی ویسے بھی اسے کہاں رہائی دوں گی۔۔۔ آپا نے اسے بھیجا ہے۔۔۔ اور میں اسے ٹھیک ٹھاک سنا کر ہی دم لوں گی۔

وہ چائے کے دو تین گھونٹ بھر کر بولا۔ ''دراصل میں تو تمہارے آنے سے ہم سب دوستوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔۔۔ محلے میں ہر کوئی مطلب کہ کیا مرد کیا عورت سب ہی تم پر فریفتہ تھے۔۔۔ اور تمہاری توجہ کے طالب بھی۔۔۔''

وہ کن اکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ذرا دیر کو رک کر پھر گویا ہوا۔

''ہم نے آج تک کسی بڑے گھر کی خوب صورت پڑھی لکھی لڑکی دیکھی ہی کہاں تھی۔۔۔ محلے میں ایک دو شادیوں میں جو تم جلوہ گر ہوئیں تو سب کو ہی تم سے بات کرنے کا شوق ہو گیا تھا۔۔۔ آپا سے تمہاری دوستی اور تمہارے پڑوسی ہونے کے ناتے میں خود کو کچھ زیادہ معتبر سمجھتا تھا۔۔۔ بس اسی زعم میں شاید۔۔۔ سونو کی شادی میں دوستوں میں گھر کر وہ پھول والی بات کہہ گیا تھا جو تم نے بھی سن لی اور پھر جب میں نے تم کو افسردہ ہوتے دیکھا تو سچ پوچھو' مجھے اس بات کا بعد میں بہت دکھ ہوا تھا۔۔۔''

وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔۔۔

میں نے نخوت سے کہا۔ ''ہاں بوڑھے شیر پر لکڑ بھگے اور بے یارو مددگار مرنے پر گدھ ہی منہ مارا کرتے ہیں۔'' وہ پھر بے چین سا ہو گیا۔

''خدا کی قسم ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ مجھے آپا نے بتایا تھا کہ تمہارے بابا کو دھوکے سے جائیداد پر قبضہ کر کے تم لوگوں کو دربدر کر دیا گیا ہے۔۔۔ اور تم خود اپنے مقدمے کی پیروی کر رہی ہو۔۔۔ میری نظر میں تمہاری بڑی عزت تھی۔۔۔ آپا جانتی تھیں کہ ایک دن تم یہ سب دوبارہ حاصل کر لو گی' اسی لیے شاید۔۔۔''

میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "اسی لیے تم نے سوچا، کہیں چڑیا اُڑ نہ جائے اور تم دیکھتے ہی رہ جاؤ۔"

میں اس کو بات کرنے کا موقع دینا ہی نہیں چاہتی تھی... میں کتنی بے ہودہ ہوں... اس نے تو مجھ پر وہ مہربانی کی، جس کی شاید میں اس سے کبھی بھی توقع نہیں کرتی تھی... اس کی وجہ سے تو میرا انسانوں پر اعتبار بحال ہوا... میں خود ہی خود میں شرمندہ ہو گئی... توبہ ہے۔

آپا نے تو اس کو بابا کے پاس ہمارے رشتے کے سلسلے میں انٹرویو کے لیے بھیجا تھا اور میں... میں اسے بابا کے پاس بھیجنے کے بجائے سبق سکھانے پر تلی ہوئی تھی... ذرا ان صاحب کی اکڑفوں بھی تو نکالنی تھی... وہ منہ پھلائے روٹھ سا گیا... اور اسی وقت بابا کے سیکرٹری اسے بابا کے پاس حاضر ہونے کا پیغام دینے چلے آئے... اس کو تو جیسے موقع مل گیا... وہ بھاگم بھاگ میری طرف دیکھے یا مجھ سے اجازت لیے بغیر ہی سیکرٹری کے ساتھ ہولیا تھا... میں زیر لب مسکرانے لگی... پر مارنے سے جال اور بھی تنگ ہو جاتا ہے... ہاتھ پاؤں چلانے سے دلدل جلد ہی نگل لیتی ہے۔

ویسے بھی میں جس حد تک اس کو زچ کرنا چاہتی تھی، کر چکی تھی... اس کی کچھ بدتمیزیوں کا بدلہ شادی سے پہلے لے کر حساب برابر کرنا چاہتی تھی... وہ کر چکی تھی اور دل بہت ہلکا پھلکا ہو چکا تھا... اب بابا بھی اس کو بغیر کچھ جتائے قبول کرلیں... ویسے تو میں بابا کو سب بتا چکی ہوں۔



"اس رات... جب میں پیسوں کے لیے پریشان تھی تو اس نے ہی ساتھ دیا تھا... وہ کتنی کٹھن رات تھی اور میں کس قدر اکیلی تھی... بابا کو اچانک ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور اسپتال والے اینجیو گرافی اور اینجیو پلاسٹی کرنے پر بضد تھے اور مجھے جلد از جلد پیسے جمع کرانے کا کہہ چکے تھے۔ صاف بات تھی۔ پیسے جمع کرواؤں گی تو بابا کا علاج ہوگا... آدھی رات میں کہاں جاؤں... کس سے مانگوں... پورے راستے میں یہ ہی سوچتی رہی اور غیرارادی طور پر رکشے میں بیٹھ واپس گھر آگئی... گو گھر پر ایسا کون سا خزانہ رکھا تھا۔

آپا سے بات کرنے کا سوچا تو یاد آیا کہ آج کل تو ان کی رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ اب کیا کروں... دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے دروازے پر ٹہل رہا تھا... مجھ سے کبھی کبھار ہی بات کی ہوگی۔ مگر ان سب تکلفات کا وقت کہاں تھا۔ میں نے جھٹ اس کو بابا کا بتادیا اور پیسوں کا ذکر کرتے کرتے رونے لگی۔

"تم فکر نہ کرو... رونے کا کوئی فائدہ نہیں، ہمت سے کام لو... میں دیکھتا ہوں... تم کچھ کھالو جب تک... کس قدر پیلی ہو رہی ہو۔"

وہ بہت سی ہدایات ایک ساتھ دے کر چلتا بنا... ابھی میں گھر سے بابا کے اور اپنے کچھ کپڑے باندھ کر نکلی ہی تھی کہ وہ دروازے پر ہی آٹکرایا۔

اور کسی روبوٹ کی مانند میں اس کے پیچھے پیچھے ہولی تھی۔ وہ مجھے کئی گلیوں اور تنگ راستوں سے گزار کر ایک عجیب گھٹن زدہ مقام پر ایک بے ڈھنگے سے مکان کے سامنے لے آیا تھا... کچھ لفنگے ٹائپ مرد ادھر ادھر لڑھکے پڑے تھے اور گھر کے اندر سے بے ہودہ گانوں کی آوازیں آرہی تھیں... اتنے میں ایک آدمی جو شکل سے ہی دو نمبر کام کرنے والا نظر آرہا تھا، گھر سے نکل آیا اور میں ڈر گئی... مجھے اپنی حماقت کا احساس بہت دیر سے ہوا تھا۔ یہ میں نے کیا کردیا...؟ اتنی رات گئے اس کے ساتھ ایسے کیوں چلی آئی؟

اس کے کرتوت ایک ایک کرکے مجھے یاد آنے لگے اور پاؤں کانپنے لگے... میرے ہاتھ سے کپڑوں کا تھیلا گر پڑا۔ اس نے بڑے اطمینان سے جھک کر میرا تھیلا اٹھالیا... دونوں میں کیا بات ہوئی، یہ تو مجھ حواس باختہ تک پہنچ ہی نہیں سکی، بس اتنا یاد ہے کہ اس نے اپنی جیب سے ایک سونے کا کڑا نکال کر آدمی کو تھمایا اور آدمی نے بدلے میں مجھے گندے سندے نوٹوں کا بنڈل پکڑا دیا۔

میرے بازو سے پکڑ کر ہی نہیں باقاعدہ سہارا دے کر وہ مجھے اسپتال تک لایا۔ بابا کے لیے پیسے جمع کروائے گئے تو ان کو فوراً" آپریشن تھیٹر میں شفٹ کردیا گیا۔۔۔ جب تک بابا کو واپس کمرے تک نہیں پہنچایا گیا' وہ میرے اردگرد منڈلاتا رہا۔ چائے پانی پوچھتا رہا۔۔۔ پہلی بار مجھے کسی کا خود پر اس قدر احسان محسوس ہوا تھا۔۔۔ جیسے کسی نے مجھے کھڑے کھڑے خرید لیا ہو۔۔۔

سچ ہے انسان کو پیسے سے نہیں خریدا جاسکتا۔

صبح ہونے تک بابا کی حالت خطرے سے باہر ہوچکی تھی اور جب اس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ وہ شکرانے کے نفل پڑھنے مسجد جارہا ہے تو میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

مجھے چائے کا کپ تھما کر وہ چلا گیا۔۔۔ دوپہر تک آپا بھی آگئیں۔۔۔ اور پھر جب تک بابا اسپتال میں رہے' وہ ایک دن بھی نہیں آیا۔ جب ہم واپس گھر آئے تو ایک دو دن کے بعد مجھے اصل صورت حال معلوم ہوئی۔

آپا نے مجھے رازداری سے بتایا کہ وہ آپا کے مرحوم شوہر کی نشانی جوئے میں ہار گیا۔ جس کے باعث آپا نے اس کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے۔

آپا مجھے یہ سب بتاتے ہوئے روہانسی ہوئی جارہی تھیں جبکہ۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔۔۔ آپا کو کس طرح بتاؤں کہ میں نے ہی کڑا بکوا دیا۔۔۔ آپا کیا سوچیں گی۔۔۔ پورے محلے میں بات مشہور ہوگی تو لوگ کیا کہیں گے۔ ہمارے تعلقات پر طرح طرح کی باتیں بنیں گی۔ اس نے مجھے ان سب خرافات سے بچ کر نکلنے کا پورا پورا راستہ دے دیا تھا۔۔۔ جوئے میں کڑا ہار جانے کا بہانہ بنا کر وہ خود ہی ساری سزا بھگت رہا تھا۔

چند مہینوں بعد ہی ہمارے مقدمے کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگیا' مگر میری خوشی ادھوری تھی۔۔۔ وہ کہیں نہیں تھا جس کو میں سب سے پہلے خوش خبری دینا چاہتی تھی۔۔۔ میں نے سب سے پہلے آپا کے کڑے کو دوبارہ حاصل کرنے کی تگ و دو کی۔۔۔ بابا کے پرانے سیکرٹری نے بڑی مہارت دکھا کر کڑا اس آدمی سے دگنی قیمت پر حاصل کرلیا تھا۔ جب میں اپنی بڑی سی نئی گاڑی میں اس کے محلے میں پہنچی تو ہر طرف سے لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔۔۔ سب نے ہی مبارک باد دی۔۔۔ اور آپا تو وارے صدقے جاتی رہیں۔ بڑی دیر کے بعد ان کے ساتھ تنہائی نصیب ہوئی تو میں نے کڑا ان کے حوالے کیا اور حقیقت بھی بتائی اور ان سے معافی مانگی کہ میں اس وقت اپنے اکیلے پن سے ڈر گئی تھی کہ اگر بات پھیل گئی تو لوگ کیا کہیں گے۔۔۔ اس لیے چاہ کر بھی اقرار جرم نہیں کرسکی۔۔۔ آپا میری ہر بات پر مسکراتی چلی جارہی تھیں' جیسے انہوں نے آج میری ساری غلطیوں کو معاف کردینے کا عہد کر رکھا ہو۔۔۔ پھر خوش دلی سے مجھے بتایا کہ تھوڑے دنوں کے بعد ہی اس کو آپا نے خود ہی واپس بلوالیا تھا' مگر ناراضی ابھی بھی تھی۔۔۔ مگر اب یہ سب جان کر ان کو اپنے بھائی پر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ زیر لب مسکراتا ہوا کچھ شاداں سا نظر آیا۔۔۔ میں لان میں گلابوں کی باڑھ کے پاس کھڑی تھی۔ وہ پہلے تو ناک کی سیدھ میں دروازے تک چلا گیا' مگر پھر تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ کر واپس پورچ سے گزر کر لان میں میرے پاس آگیا۔

میں نے ایک گلاب توڑ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میری طرف سے آپا کو دے دیجیے گا۔"

وہ بڑی ترنگ میں چہکا۔

"ناممکن۔۔۔ یہ گلاب تو بس میں ہی اپنی کسی کتاب میں محفوظ کروں گا۔"

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ "ایسا لگتا ہے کہ بابا نے اوکے کردیا ہے۔"

"الحمدللہ!" میں ذرا سنجیدہ ہو کر بولی۔ "جی بہت بہتر۔۔۔ اب فرمائیے کہ آپ کون سی کتاب پڑھتے ہیں؟" وہ ہنس پڑا۔۔۔ اور گلاب سونگھتے ہوئے بولا۔

"مسجد میں جا کر شکرانے کے نفل پڑھنا نہیں بھولوں گا۔"

مصباح نوشین

محبت کی انوکھی کہانی

میں نے زندگی میں بہت سی کہانیاں لکھی ہیں لیکن سچی کہانیوں کی بھوک ایک لکھاری کے اندر سے کبھی بھی نہیں مٹتی۔ چاہے وہ کتنے ہی بڑے شاہکار تخلیق کر چکا ہو... اور میں تو رہتا ہی سچی کہانیوں کی تلاش میں ہوں۔ میں عام سوچ کا ایک عام سا لکھاری ہوں جو اپنے لکھے سے کبھی بھی مطمئن نہیں ہوا۔ میری ایک عجیب سی عادت تھی۔ میں روز پارک میں جاتا' مختلف جگہوں پہ جاتا' عام لوگوں سے ملتا ان کی کہانیاں سنتا' فٹ پاتھ پہ بیٹھے لوگوں کے چہرے پڑھنا' میرے روزمرہ کے معاملات میں شامل تھا... مجھے تو چہرے پڑھنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ بوڑھے دل گرفتہ چہرے' جن پہ زمانے بھر کے تجربے اور تھکن کی کہانیاں ثبت ہوتی تھیں۔ دکھ درد' زمانے کے چال چلن کے علاوہ بہت کچھ تھا' جو مجھے ان لوگوں سے ملتا تھا۔ میں ایک عام سا لکھاری ہوں لیکن اللہ کی عنایت کہ لوگ پیار بہت کرتے ہیں۔ ویسے بھی تخلیقی لوگوں کو ہمیشہ یہ خوش فہمی رہتی ہے کہ لوگ بہت عزت اور پیار دیتے ہیں' لمحے بھر میں ہی ان کو اتنا خاص بنا دیتے ہیں کہ بعض دفعہ تو شرمندگی ہونے لگتی ہے۔ آج کا دن بہت خاص ہے کیونکہ مجھے آج وہ کہانی سننے کو ملنے والی ہے جو بہت انوکھی ہے۔ ایسا میں نہیں کہہ رہا' یہ ان کا دعویٰ ہے اب آپ لوگ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسا تو ہر انسان کہتا ہو گا لیکن میں اس کہانی کو اس لیے خاص کہہ رہا ہوں کیونکہ سنانے والے نے اسے ایک بے حد عام سی کہانی کا کہہ کے مجھے ٹال دیا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں آج مجھے بہت خاص سننے کو ملنے والا ہے۔ پارک کے گیٹ سے ایک معمر صاحب داخل ہوتے دکھائی دے رہے ہیں... مجھے اب ان سے ملنا ہے' ان کی کہانی سننے کو میں بے چین ہو رہا ہوں۔



"میں جانتی ہوں وہ آپ کی زندگی بن چکی ہے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ میرا اللہ مجھے اتنی ہمت دے کہ میں اسے آپ کی خوشی بنا سکوں..."

ضبط کی کوشش میں وہ ناکام رہی۔ عاطف نے اسے محبت کی اس نظر سے دیکھا' جس میں صرف بے بسی تھی۔ افسوس' دکھ' التجا اور زندگی چھن جانے کا المیہ بسا تھا... یہ ان کی شریک حیات ہے جو جانے کس مٹی سے بنی ہے کہ اپنے ہاتھ سے سوتن لانے کی بات کر رہی ہے... مگر وہ اسے سراہ نہیں سکے' شکریہ کا لفظ بھی نہیں۔ ایک جملہ تک نہیں کہہ سکے وہ عشق کی آگ میں جلتے کندن سے راکھ ہو رہے تھے' ایسے میں وہ کیسے جان سکتے تھے کہ خود اپنی زندگی اپنے ہاتھوں کسی کو سونپ کر جینا کتنا مشکل امر ہوتا ہے... دل کتنے ٹکڑوں میں بٹتا ہے۔ ہر ہر ٹکڑے سے کتنا خون رستا ہے اور ہر قطرے میں دل کا درد کیسے عیاں ہوتا ہے یہ بات وہ انہیں نہیں سمجھا سکی اور خاموشی سے پلٹ گئی۔

عاطف اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔ بہت اداس' ویران اور خالی۔ اس وقت ان کے چہرے پر اتنی ویرانی تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے ان کا سب کچھ ان سے چھین لیا ہو کسی نے... دنیا میں ان سے زیادہ تہی داماں' آزردہ' غمگین اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسا دعوا ہر دیکھنے والا انہیں دیکھ کر بہ آسانی کر سکتا تھا... اور یہ سچ بھی تھا وہ جب سے علیزے سے ملے تھے' وہ اس کی محبت میں کھو سے گئے تھے... حالانکہ وہ عمر کے اس حصے کو کسی کورے کاغذ کی مانند گزار چکے تھے... کہ جب کسی کے حسن کا خمار آنکھوں کے رستے دل میں اترتا ہے... اور پھر دو جہاں کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر سدھ بدھ کھو دی جاتی ہے' اپنا آپ فراموش کر دیا جاتا ہے... مگر اتنی تپسیا کے بعد بھی ایسا لگتا ہے کہ محبوب کے حسن کو خراج پیش کرنا باقی ہے' ابھی تو کچھ کیا ہی نہیں۔

عاطف کا شمار ایسے مردوں میں ہوتا تھا جن کے نزدیک عورت صرف گھر اور مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ محبت کے معنی ان کے نزدیک بس یہی تھے... ویسے بھی ردا نے ساری زندگی عاطف کی پرستش کی تھی۔ عاطف اس کی زندگی کی اولین خواہش تھے۔ وہ ان کی محبت کے سحر میں اس وقت سے مبتلا تھی جب وہ اس کے معنی سے بھی واقف نہیں تھی۔ ان کی شخصیت کا

سحر، بہترین انداز بیاں، اچھی عادتیں اسے ان کا دیوانہ بنا گئی تھیں... جب بھی وہ حیدر آباد سے کراچی ان کے گھر آتے، ردا ان سے بات کرنے کی ہمت تو نہیں کرپاتی البتہ چلمن کی اوٹ سے چھپ چھپ کر انہیں دیکھتی ضرور رہتی اور جب وہ چلے جاتے تو دنوں ان کے لیے اداس رہتی اور ان کے ایک ایک انداز کو دہراتی۔ عاطف ایسے بیٹھتے تھے۔ ایسے کھاتے تھے۔ لاشعوری طور پر وہ ان جیسی بننے کی کوشش کرتی۔ ان کے ہر ہر انداز کو نقل کرنا اسے خوشی دیتا... اور ان سب باتوں سے انجان عاطف اپنی زندگی میں مگن بہت خوش تھے۔ ہاں وہ محبت جیسے خوب صورت جذبے سے ہمیشہ کی طرح بے خبر ہے۔

ابا کو اپنے سسرال سے خدا واسطے کا بیر تھا... نہ خود آتے نہ عاطف اور ان کے دوسرے بہن بھائیوں کو جانے دیتے... صغریٰ کو بہت عرصے بعد بہت مشکل سے اجازت ملی کہ وہ اپنے میکے جاسکتی ہیں۔

انہوں نے اسے غنیمت جانتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا اور پہلی ٹرین سے کراچی آن پہنچیں... پورا ایک مہینہ رہیں خوب ہلا گلا بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر کیا۔ بچے الگ خوش تھے کہ اتنے عرصے کے بعد پھوپھو کو اپنوں سے ملنے کی آزادی ملی۔ عاطف کے ابا کا مزاج بہت بے لچک، سرد اور خشک تھا۔ ایک دفعہ کسی بات پر ان کی اپنے سسر سے تلخ کلامی ہوگئی تھی اور غصے میں ان کے سسر نے انہیں گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ اسی وقت اس گھر سے نکل گئے تھے۔ اس کے بعد ان کے سسر کا غصہ جب کچھ عرصے

بعد ٹھنڈا ہوا تو وہ انہیں خود منانے آئے مگر وہ دوبارہ کبھی وہاں نہیں گئے۔ پوری سسرال کے ساتھ ان کی خود ساختہ جنگ ہمیشہ قائم رہی... سسر کی وفات پر بھی باہر سے جنازہ پڑھ کے واپس لوٹ گئے۔ گھر کی دہلیز پار نہیں کی۔ اس خود ساختہ بیر کا نتیجہ اس وقت ابھر کر سامنے آیا جب بچے جوان ہوئے اور ان کی شادی کا وقت آیا اور تمام بہن بھائیوں نے آپس میں رشتے مزید مضبوط کیے، تب عاطف کے لیے ان کی امی نے ردا کا



انتخاب کیا مگر ابا نے طوفان اٹھا دیا تھا۔ صغریٰ بیگم نے بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے بری طرح سے بے عزت کر کے طلاق کی دھمکی بھی دے ڈالی جس نے چاندی بچے سر پر خاک انڈیلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی' وہ زندگی میں پہلی مرتبہ شوہر سے ناراض ہو کے میکے گئیں اور یہ بھی پہلی بار ہوا کہ صغریٰ بیگم نے میاں جی کی حکم عدولی کی۔۔۔ انہیں دکھ ہوا مگر اپنی انا انہیں شاید ہر رشتے سے بڑھ کر عزیز تھی تب ہی انہیں منانے خود تو نہیں گئے البتہ عاطف کی پھوپھی کو بھیج دیا۔ عاطف بھی ساتھ تھا۔۔۔ کراچی پہنچے تو امی کچھ اور ہی ٹھانے ہوئے تھیں۔ واپسی کی شرط یہ رکھی کہ عاطف کا نکاح ردا سے کیا جائے تب ہی وہ واپس آئیں گی۔ عاطف سن کے پریشان ہو گیا امی نے صاف کہہ دیا کہ "فیصلہ کر لو۔۔۔ ماں کی خواہش پوری کرو گے یا ابا کی ضد کا ساتھ دو گے۔"

ردا اس سارے معاملے سے بے خبر' اپنی محبت کو دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔۔۔ عاطف اتنا پریشان تھا کہ اندازہ ہی نہیں کر سکا کہ ردا کی آنکھیں اسے دیکھ کر کیسے جگمگاتی ہیں' روشن دیے جیسی' یوں جیسے ہیرے کی کنیاں اندھیری رات میں جگمگاتی ہوں۔ وہ عاطف کو حاصل کرنے کی خوشی میں اتنی مگن تھی کہ اس کے چہرے کی غیر معمولی سنجیدگی اور گھر میں پھیلتی ٹینشن کو محسوس ہی نہیں کر سکی۔ عاطف کو اس کی لاپروائی اور بے فکری پر رشک آتا۔۔۔ وہ مزے سے سارا دن آنگن میں لگے جھولے میں جھولتی رہتی اور گنگناتی رہتی۔۔۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹتی۔۔۔ اور اتنی روشنی بکھیرتی کہ کوئی بھی دیکھتا تو ڈوب ڈوب جاتا اس روشنی سے اپنا وجود نہارنے کے لیے مگر عاطف کو تو اتنی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس کے سامنے تو کنواں اور کھائی والا معاملہ تھا۔ نہ امی کو چھوڑ سکتا تھا نہ دوست جیسے باپ کو۔ امی نے بھی ساری زندگی کی ضد لگانے کی کسر بس یہیں پر آ کر پوری کرنے کی ٹھانی تھی۔۔۔ اور ابا کی ضد تو ویسے ہی مشہور و معروف تھی اور ان دونوں کی آپس کی جنگ میں عاطف پس رہا تھا۔

امی نے نکاح سے ایک دن پہلے عاطف کے پاس آ کر اسے بہت دعائیں بھی دیں۔ عاطف خاموش رہا۔ تو خود ہی بولیں۔

"تم بہت خوش رہو گے عاطف! تم نے اپنی ماں کا مان رکھ لیا۔ تم نے ثابت کر دیا کہ تم میرے سب سے اچھے اور پیارے بیٹے ہو' ایسے بیٹے جس کی ماں ہونے پر فخر محسوس ہوتا ہے اور ساری دنیا کو بتانے کو دل چاہتا ہے کہ دیکھو' یہ ہے میرا بیٹا جسے اپنی ماں کی خوشی اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔" عاطف خاموش رہا۔

صغریٰ بیگم نے بہت دکھ سے اسے دیکھا۔

"کچھ تو کہو عاطی۔۔۔ ورنہ مجھے لگے گا کہ میں نے سچ مچ تم سے کوئی بہت بڑی زیادتی کر دی ہے۔ میں خوش نہیں رہ سکوں گی۔۔۔"

عاطف نے ایک نظر ماں کو دیکھا اور سر جھٹکا۔ وہ بھلا کیسے اپنی ماں کی آس کو توڑ سکتے تھے۔ وہ ماں جو زمانے کے سرد و گرم سے اپنے بچوں کو بچانے کے لیے مشکلات کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاتی ہے۔

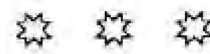
"بولو بیٹا! کیا تم خوش نہیں ہو۔۔۔؟" انہوں نے بڑی آس سے پوچھا جس میں کہیں عاطف کے انکار کا خوف بھی چھپا تھا۔

"ابو جی کو راضی کر لیں امی جان! انہیں بہت دکھ ہو گا اور پھر ہمارا سارا خاندان انہیں کتنے غلط مشورے دے گا۔ معاملات سدھرنے کے بجائے مزید خراب ہو جائیں گے۔ ابھی بھی وقت ہے' ابو جی مان جائیں گے۔ اس کے بعد ہم دھوم دھام اور عزت و آبرو کے ساتھ ردا کو رخصت کرا کے لے جائیں گے۔۔۔"

امی نے سکون سے اس کی ساری بات سنی اور مسکرا دیں۔

"تمہارے ابا مان جائیں گے مگر پہلے نکاح ہو جانے دو کیونکہ فی الوقت یہ بہت ضروری ہے۔۔۔ شام کو تیار ہو جانا۔ عقیل بھائی تمہیں بازار لے جائیں گے نکاح کا جوڑا دلوانے۔۔۔"

وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ گئیں' عاطف وہیں کا وہیں بیٹھا رہ گیا۔



شام کو وہ عقیل بھائی کے ساتھ بازار گیا اور اپنے نکاح کا جوڑا خرید لایا' مگر وہ بہت اداس تھا۔ اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا اس کے کچھ خواب تھے۔ اسے ابھی بہت سا پڑھنا تھا' امریکہ جانا تھا... وہاں آزادی کے مجسمے کے نیچے تصویریں کھنچوانی تھیں جو اس کا سب سے بڑا خواب تھا... وہ مائیکل جیکسن کا دیوانہ... اینگل برٹ کی دھنوں پہ گھنٹوں ڈانس کرنے والا' کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی ایک سانولی سلونی سی لڑکی کے ساتھ بغیر اس کی رضا پوچھے' شادی کردی جائے گی۔ یعنی کہ وہ انسان نہ ہوا کوئی بھیڑ بکری ہو گیا جس کی مرضی پوچھے بغیر ہی کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیا جائے... ابھی تو وہ محض بیس برس کا تھا۔ ابھی تو بہت وقت باقی تھا مگر امی ابو کی ضد کے سامنے وہ قربانی کا بکرا بنا دیا گیا اور وہ قربان بھی ہو گیا... وہ اداس تھا جب ہی تو نکاح کے بعد امی نے اس سے کہا تھا۔

"خوش ہو نا عاطی؟" انہوں نے محبت سے اس کے سر پہ پیار کیا تھا۔ وہ نہ سر ہلا سکا نہ مسکرا سکا۔ اسے تو ابھی شادی ہی نہیں کرنی تھی بلکہ دور دور تک اس بات کا تصور ہی نہیں تھا۔

"ردا بہت پیاری بچی ہے' تمہاری پسند میں ڈھل جائے گی۔" انہوں نے اس کی طرف آس سے دیکھا کہ شاید کچھ بولے۔

"ابا جان کو خبر کردیں امی جان!" اسے تو جان سے پیارے ابا جان کی فکر تھی۔ وہ ان کا لاڈلا بھی تو بہت تھا' کیسے نہ ان کی فکر کرتا۔

"تمہیں پتا ہے' عقیل بھائی تمہیں اپنے ساتھ امریکہ لے جائیں گے... پھر وہیں سیٹل ہو جانا تم... ٹھیک ہے نا (انہوں نے اپنے تئیں اسے خوش کرنا چاہا تھا)۔

"ابا جان کبھی نہیں مانیں گے امی جان!"

"کیوں فکر کرتے ہو عاطف...! میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ کچھ نہیں کہیں گے تمہارے ابا... تمہاری ماں ابھی زندہ ہے۔"

"امی جان!" کچھ دیر بعد وہ پر سکون ہوا تو سوال کیا۔

"ہاں قربان میرا بچہ کہو...!"

"عقیل ماموں کیا واقعی مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" وہ جھجکا... اب بھلا کیسے اتنی بے شرمی سے فوراً" ہی پوچھ لیتا۔

"ہاں... جب ہی تو میں نے ہاں کی... میں جانتی ہوں تمہیں کتنا شوق ہے امریکہ جانے کا... اب تمہارے ابا کے اتنے وسائل نہیں کہ تمہیں بھیج سکیں تو اچھا ہے نا کہ تم عقیل بھائی کے داماد بن گئے... وہ لے جائیں گے تمہیں' تمہارے خواب بھی پورے ہو جائیں گے اور زندگی بھی اچھی گزر جائے گی۔ ردا بہت ہی پیاری بچی ہے۔ تم ملے ہو نا اس سے؟"

"پتا نہیں امی! میں نے تو اسے کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں۔" اس نے بے چارگی سے جواب دیا۔

"اوہ... تم آئے بھی تو اتنے عرصے بعد ہو... میں ایسا کرتی ہوں تمہیں اس سے ملوا دیتی ہوں... آج تو اس پہ ٹوٹ کے روپ آیا ہے... یہ کہہ کر وہ وہاں سے پلٹ گئی تھیں اور تھوڑی ہی دیر بعد اس کے سامنے ایک سانولی سی' دبلی پتلی لڑکی سرخ جوڑے میں ملبوس کھڑی تھی' تھر تھر کانپتی ہوئی۔ عاطف کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے اچھی لگی ہے کہ نہیں کیونکہ اس میں ایسا کچھ نہیں تھا جو اسے پسند آتا یا اس کا گرویدہ بناتا۔ ویسے بھی وہ خاصا حسن پرست انسان تھا جس کا اندازہ انہیں بہت بعد میں ہوا تھا۔

"تمہیں سردی لگ رہی ہے؟" کچھ دیر تک اسے مسلسل کانپتے دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے سوال کیا تو ردا نے آنکھیں اوپر اٹھا کے دیکھا۔

"نن... نہیں' جج... جی ہاں۔" وہ بے ساختہ گھبرائی بھلا اس کی آنکھوں میں دیکھنا آسان کہاں تھا۔

"جاؤ۔" اب کی بار اس نے اسے سنجیدگی سے کہا تو وہ سرپٹ یوں بھاگی جیسے اگر فوراً" نہ گئی تو وہ اسے خود

ہی نکال دے گا۔ عاطف نے بند مٹھی کا مکا فضا میں لہرایا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

دو دن بعد وہ امی جان کے ہمراہ واپس لوٹ آیا تھا۔ ابا جی کا رویہ امی جان کے ساتھ نارمل تھا لیکن عاطف کے ساتھ نہیں' وہ ان سے چھپ نہیں سکتا' اس کا اندازہ اسے ابو جی کی عدالت میں جاکے ہوا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تھے۔ عاطف ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے غور سے دیکھا اور ہنکارا بھرا۔

"عاطف...!"

"جی ابو جی!" اس نے لحظہ بھر کے لیے نگاہ اٹھائی۔

"کیا ہوا تھا وہاں؟"

"جج' جی...!" وہ ہکلا گیا۔

"میں نے پوچھا' کیا ہوا تھا وہاں؟" اس بار وہ گرجے۔

"نن... نکاح ابو جی..." اس نے آہستگی سے اپنی ہکلاہٹ پہ قابو پانے کی کوشش کی...

"کس کا نکاح...؟ پوری بات بتاؤ..." وہ دھاڑے۔

"میرا کوئی قصور نہیں ابو جی... میں نے امی جان کو بہت منع کیا تھا کہ آپ کی اجازت اور موجودگی کے بغیر ایسا مت کریں مگر انہوں نے کہا کہ وہ سب سنبھال لیں گی..." عاطف نے روہانسا ہوتے ہوئے' ابو جی کا چہرہ دیکھا جس پہ بہت گہری' جامد چپ ٹھہر گئی تھی۔

"ابو جی!" عاطف نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سر اٹھا کے انہیں دیکھا... اس ایک لمحے میں نجانے اس نے کتنا کچھ سوچ لیا تھا۔ کسی انہونی کا احساس اسے یکلخت ہوا تھا۔

"ابو جی!" اس بار وہ چیخ اٹھا تھا۔ اس کے ابا جی کی چھڑی گری ہوئی تھی۔ عاطف کو سمجھنے میں لمحہ لگا کہ امی جان کی جانب سے ملنے والی چوٹ بہت شدید ہے' جس نے اس کے ابو جی کو کھڑے قد سے گرا دیا تھا۔



ابو جی کو فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ فالج ان کے دائیں جانب گرا تھا جس کی وجہ سے وہ بستر سے لگ گئے تھے۔ عاطف کو پہلی بار امی جان پہ غصہ آیا اور ہاتھ پاؤں تو صغریٰ بیگم کے بھی پھول گئے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پہ چیخنے چلانے والے ظہیر علی اتنی بڑی بات پہ بالکل ہی خاموش ہو کے رہ گئے تھے' بس ان کی آنکھوں میں شکوہ نظر آتا جو صغریٰ سے زیادہ عاطف کو شرمندہ کرتا... عاطف نے ان کی دن رات بہت خدمت کی... صغریٰ بیگم ان کے پاس آتیں تو وہ منہ پھیر لیتے۔ حالات ایک دم سے بہت سرد اور بے رحم ہو گئے تھے' بالکل ویسے ہی جیسے ہونے سے عاطف ڈرتا تھا... وہ بلا وجہ شرمندہ ہوئے جاتا۔ بار بار ان سے معافی مانگتا۔ وہ بولتے تو کچھ نہیں مگر ایک نگاہ ڈال کے رہ جاتے۔ وہ ایک نگاہ عاطف کو اندر تک شرمندہ کر جاتی۔

"ابو جی... پلیز کچھ تو کہیں... آپ کہیں تو میں ردا کو طلاق دے دیتا ہوں۔" اس دن اس نے جب بہت ہمت کر کے کہا تو وہ بے بسی سے رو پڑے تھے۔

کراچی سے عقیل ماموں اور عاطف کی خالہ آئے تھے۔ ظہیر علی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ عاطف اس قدر دل برداشتہ تھا کہ اٹھ کے ان سے ملا بھی نہیں۔ وہ لوگ تھوڑی دیر ابو جی کے پاس بیٹھے اس دوران عاطف نے محسوس کیا کہ جیسے ان کی موجودگی میں ابو جی کچھ بے چین سے ہیں' سو وہ ان کو بہانے سے باہر لے گیا تھا... مگر اس دن اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کاش وہ اتنا با اختیار ہوتا کہ ان لوگوں کو اپنے گھر سے نکال سکتا۔ مگر وہ مجبور تھا اور محض ایک کھلونا جسے سب نے استعمال کیا تھا۔

چند دن مزید سرکے۔ ابو جی کی حالت کچھ سنبھلی۔ عاطف کی اب بھی وہی روٹین تھی۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا اور دل لگا کے جی جان سے ابو جی کی خدمت کیے جاتا... ایک دن ایک بہت حیرت انگیز بات ہوئی۔ عاطف کو لگتا تھا کہ وہ ابو جی کی بیماری کا ذمہ دار ہے۔

اس روز جب ان کی طبیعت بہت خراب ہوئی تو اس نے پھر سے وہی بات کی جو پہلے کرتا تھا۔ اسے ابوجی کی حالت کا ذمہ دار اپنا آپ محسوس ہوتا تھا۔ وہ اگر امی جان اور نانی کے دباؤ میں نہ آتا تو ابوجی کی آج یہ حالت نہ ہوتی۔ عقیل ماموں واپس چلے گئے تھے امریکہ۔۔۔ امی نے عاطف کے جانے کی بات کی تو انہوں نے یہی کہا کہ ”بس جاتے ہی بلا لوں گا۔ آپ لوگ شادی کی تیاری کریں میں اس کے کاغذات تیار کرواتا ہوں۔“

وہ اپنے ابوجی کے پاؤں کی مالش کر رہا تھا جب انہوں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا وہ اب پہلے سے بہت بہتر تھے۔ دایاں ہاتھ کام کرنے لگا تھا اور وہ خود اٹھ کے بیٹھ بھی جایا کرتے تھے۔ اس روز بہت دنوں بعد انہوں نے عاطف کو ویسے ہی محبت سے دیکھا تھا جیسے پہلے دیکھا کرتے تھے پھر انہوں نے اسے کاغذ قلم لانے کو کہا۔ عاطف حیرت سے کاغذ قلم اٹھا لایا لیکن بولا کچھ نہیں۔ وہ کاغذ اور قلم انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا اور اسے جانے کو کہا حیرت سے اٹھ کے وہ باہر آگیا۔ باہر آیا تو امی جان فون پہ نانی اور خالہ سے بات کر رہی تھیں۔ امی جان کافی پریشان اور غصے میں تھیں۔

”ایسا کیسے ممکن ہے اماں۔۔۔ میں نے ظہیر کو پہلے ہی آپ کے کہنے میں آکے بہت دکھ دیا ہے۔ وہ تو مجھ سے بات تک نہیں کرتے اور عاطف تو میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔۔۔ اب آپ رخصتی کی بات کر رہی ہیں.. ممکن نہیں ہے۔“

کچن میں پانی کا گلاس پیتے ہوئے عاطف نے بے ساختہ ابوجی کے کمرے کی جانب دیکھا وہ جاگ رہے تھے اور امی جان کی باتیں بھی یقیناً ”سن رہے ہوں گے۔ امی جان کو ویسے بھی عادت تھی اونچی آواز میں بات کرنے کی۔

”نہیں اماں۔۔۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔۔۔ دھوکا کیا ہے آپ لوگوں نے میرے ساتھ۔ ارے میرے گھر کے حالات سے آپ واقف ہیں۔ میں نے عاطف کا نکاح اس لیے کر دیا تھا کہ وہ باہر جائے گا تو کم از کم گھر کے حالات سدھریں گے نہ کہ گھر میں ایک اور فرد کا اضافہ کر لوں۔۔۔ ہاں تو عقیل کیوں نہیں بنوا کے لے گیا میرے بیٹے کے کاغذات۔۔۔ اب میں کیوں رخصتی کر کے لے آؤں اس کی بیٹی۔۔۔ ہمیں تو کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ آپ کو شادی کی پڑی ہے۔“

اس سے زیادہ عاطف سے سنا ہی نہیں گیا۔ وہ پانی پی کے اوپر چھت پہ آگیا اور آسمان کی جانب دیکھا۔ شام کا وقت تھا اور آسمان پہ پرندوں کے غول کے غول واپس اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ اسے جانے کیوں ٹوٹ کے رونا آیا۔ وہ اپنی زندگی میں ویسا کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا جیسا اس کی خواہش تھی۔ ابوجی کا چلتا ہوا کاروبار اچانک ختم ہو گیا تو مصیبتوں نے ان کے گھر کا رستہ ہی نہیں دیکھ لیا تھا بلکہ وہیں مستقل ڈیرہ ہی ڈال لیا تھا۔ اسے امریکہ جانے کا کتنا شوق تھا اور اب وہ شوق سے زیادہ ضرورت بن گیا تھا۔ وہ امریکہ جاتا پیسے کماتا تو گھر کے حالات اور اپنی زندگی بہت اچھی گزار سکتا تھا مگر اب ایسا ممکن ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک اندھیری کال کوٹھری تھی جس میں وہ کھڑا تھا۔



چند دن مزید گزرے۔ امی جان پہلے سے زیادہ گم صم نظر آنے لگیں۔ ابوجی پہلے سے بہت بہتر تھے مگر عاطف پوچھ نہیں سکا کہ اس کاغذ قلم کا انہوں نے کیا کیا ویسے بھی اس کی کریدنے کی عادت نہیں تھی لیکن ایک دن یہ معمہ خود ہی حل ہو گیا۔

”عاطف!“ امی جان اس کے پاس کھڑی تھیں۔ وہ بستر پہ لیٹا تھا فوراً“ اٹھ بیٹھا۔۔۔ امی جان نے اس کی معصوم شکل دیکھی زمانے کی سختی سے بھرپور اداسی بھری آنکھیں لیکن چہرے پہ بے ریائی کی چمک لیے وہ ان کی جانب دیکھتا ہوا ان کے بولنے کا منتظر تھا۔

”جی امی جان!“

”مجھے معاف کر سکتے ہو؟“ انہوں نے آنکھوں میں نمی لیے اسے دیکھ کے پوچھا۔

”کس بات کی معافی امی جان؟“ وہ سادہ اور بے ریا

تھا مگر ماں کے چہرے پہ شرمندگی دیکھ کے بے وقوف بھی بن گیا۔

"میں نے ماں ہونے کا بہت غلط فائدہ جو اٹھالیا۔ سمجھ ہی نہیں سکی کہ تیرے بھی کچھ جذبات ہوں گے... میں نے تو تجھے کھلونا ہی سمجھ لیا عاطی...!" وہ اس کے ہاتھ تھام کے پھوٹ پھوٹ کے رودیں۔

"امی جان... کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ پورا پورا حق رکھتی ہیں مجھ پہ..." اس نے انہیں مان دیا تو وہ اور شدت سے رودیں۔

"نہیں عاطف... میں نے زیادتی کی تمہارے ساتھ بھی اور تمہارے ابو کے ساتھ بھی... عقیل نے اچھا نہیں کیا۔ وہ صرف بیٹی کا فرض ادا کرنا چاہتا تھا' اسی لیے اس نے مجھے لالچ دیا کہ تمہیں امریکہ لے جائے گا جبکہ اس کا تو شروع دن سے کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔"

"کوئی بات نہیں... شاید اللہ کو یہی منظور تھا۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں... آپ صرف ابو جی کا خیال رکھیں۔" اس نے ان کا ہاتھ تھپتھپا کے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تم ایک کام کرو عاطی..." اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا تو انہوں نے گہری سانس لے کے اسے دیکھا۔

"مجھے اپنے ابو سے معافی دلوادو..." اسے کہہ کر وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کے رودی تھیں۔



اگلے چند دن مزید برے حالات لے کے آئے تھے۔ عقیل ماموں نے وہاں دوسری شادی کر رکھی تھی انہوں نے اپنی بیٹی کا نکاح عاطف سے کیا ہی اسی لیے تھا کہ بیٹی کے فرض کی کوئی ذمہ داری نہ رہے۔ اپنے تئیں انہوں نے اس کے لیے اچھا فیصلہ کر دیا تھا' اب وہ بری الذمہ تھے... عاطف کو امریکہ لے جانے کی بات سے وہ ایسے مکرے جیسے اس بارے میں انہوں نے کبھی کچھ کہا ہی نہ ہو... خالہ کا الگ واویلا تھا انہوں نے روتے ہوئے صغریٰ بیگم کو کال کی تھی لیکن جواباً" وہ بھڑک اٹھی تھیں... طیش کے عالم میں انہوں نے اپنی بہن اور ماں کو خوب سنائی تھیں اور عاطف کو فوراً" طلاق لکھنے کو کہا تھا... حالات بے حد کشیدہ ہو گئے تھے۔ امی جان کے پاس ابو جی کو منانے کا ایک بہتر اور مناسب موقع تھا جب ہی انہوں نے طلاق لکھوانے میں جلدی کی کوشش کی تھی... لیکن جو ہوا وہ کسی کے بھی گمان میں نہیں تھا۔ اسی رات ظہیر علی کی اچانک ہارٹ فیل ہونے سے موت ہو گئی تھی۔ صغریٰ بیگم پہ تو قیامت ٹوٹ پڑی تھی... ظہیر علی کے جنازے میں سب ہی لوگ شریک ہوئے تھے۔ ردا بھی آئی تھی۔ عاطف' امی جان کے گلے لگ کے بہت رویا۔ طلاق دینے کی بات فی الحال دب گئی تھی... ابو جی کے چالیسویں کے بعد جب سب جانے لگے تو خاندان کے چند بزرگوں نے ردا کو وہیں رکھنے کی بات کی تھی لیکن صغریٰ بیگم کو اب ہر بات کا احساس ہو چکا تھا' وہ اب کسی بھی قیمت پہ شوہر کو کھونے کا بعد بیٹے کو کھونے کو رسک نہیں لے سکتی تھیں۔ انہیں وہ منظر نہیں بھولتا تھا جب عاطف بچوں کی مانند باپ کی میت پہ پھوٹ پھوٹ کے روتے ہوئے ان کی موت کا ذمہ دار خود کو ٹھہرا رہا تھا۔ اسی لیے انہوں نے سب ہی خاندان والوں کے سامنے ردا کو طلاق دینے کی بات کہہ دی تھی' سب نے انہیں بہتیرا سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر ان کی ضد تھی کہ وہ عاطف کی مرضی کے خلاف اب کوئی قدم نہیں اٹھائیں گی۔

"ٹھیک ہے عاطف کو بلایا جائے۔ دیکھو' وہ کیا کہتا ہے۔" خاندان کے بزرگوں نے بالآخر اسے بلانے کا فیصلہ کیا... کمرے میں ردا... اس کی والدہ' نانی' امی جان اور دیگر افراد موجود تھے... ردا کی آنکھوں میں خوف اترا اور جدائی کے متوقع خوف نے اس کی آنکھیں نم کردیں۔ اس نے بے ساختہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو کھوجا۔ ان میں جانے عاطف کا ساتھ ہے بھی کہ نہیں۔

"ہاں بیٹا تم بتاؤ... تمہاری والدہ چاہتی ہیں کہ یہ رشتہ توڑ دیا جائے۔ وجہ تم جانتے ہو مگر تم ہمیں بتاسکتے

ہو کہ تم کیا چاہتے ہو؟"
اس بات پہ جملہ حاضرین کا رخ اس کی جانب ہو گیا۔ عاطف نے ماں کی جانب دیکھا پھر نانی کو اور پھر خالہ کو اور گلا کھنکھار کر کہنے ہی لگا تھا کہ صغریٰ بیگم بول پڑیں۔
"عاطی.... تم چھوڑ دو' ابھی کے ابھی طلاق دے دو۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میں اب مزید کوئی زیادتی تمہارے ساتھ نہیں کر سکتی۔"
"تم چپ رہو صغریٰ.... بیٹے کو فیصلہ کرنے دو۔" نانی نے انہیں ڈپٹ دیا۔
"آپ لوگ میرے بیٹے کو مجبور نہیں کر سکتے.... چلے جائیں سب لوگ' میرے بیٹے پہ دباؤ ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ پھٹ پڑیں اور پھر پھوٹ پھوٹ کے رو دیں.... عاطف آہستگی سے اٹھا اور ماں کے قدموں میں جا کے بیٹھ گیا۔
"امی جان.... میں کبھی بھی آپ کی حکم عدولی نہیں کرتا مگر مجھے ابو جی کی خواہش اور خاندانی روایات کا پاس رکھنا ہے۔ میں ان کا بڑا بیٹا ہوں۔ میری ذمہ داری ہے کہ ان کی کہی ہر بات کا مان رکھوں.... میں یہ رشتہ ختم نہیں کروں گا.... کیونکہ یہ میرے ابو جی کی مرضی نہیں تھی۔" اس بات پہ سب ہی چونکے تھے۔
"کیا مطلب....؟" بیک وقت کئی لبوں سے نکلا تھا۔
"ابو جی نے میرے نام ایک خط لکھا تھا امی جان.... جس میں انہوں نے کہہ دیا تھا کہ سچائی جو بھی ہو' وہ لڑکی اب ہمارے خاندان کی عزت ہے اور ہمارے خاندان میں کبھی کسی کو طلاق نہیں ہوئی۔"
باقی کی بات وہ حذف کر گیا تھا۔ اس کے ابو جی نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ پہلے دن سے اپنے سسرال والوں کی چالبازی سے واقف تھے وہ اگر صغریٰ بیگم کو منع کرتے تو' وہ کبھی نہیں رکتیں لہٰذا انہوں نے خود ہی انہیں حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیا تھا۔ گو کہ وہ اندر سے بہت ٹوٹے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ عاطف کا کوئی قصور نہیں اور قصور تو اس لڑکی کا بھی نہیں تھا جو بڑوں کی چالبازی اور ظہیر علی کو نیچا دکھانے کی خاطر استعمال کی گئی تھی۔
عاطف کے لیے یہ بات باعث اطمینان تھی کہ ابو جی نے لکھا تھا کہ وہ اس سے ناراض نہیں ہیں اور انہیں اس بات پہ بہت فخر ہے کہ ان کا بیٹا ان کی طرح خاندانی روایات کی پاس داری کرنے والا ہے۔ وہ ان کا سب سے اچھا اور فرماں بردار بیٹا ہے۔ یہ بات ان کے لیے باعث فخر اور اطمینان تھی۔ اسی لیے اس نے کہہ دیا کہ ردا واپس نہیں جائے گی سو ردا واپس نہیں گئی۔
شروع کے کچھ عرصے کو چھوڑ کے پھر عاطف کو اچھی جاب بھی مل گئی تھی اور ردا نے بھی اچھی بہو اور بیٹی ہونے کا فرض ہمیشہ ہی نبھایا تھا۔ عاطف دل کا نرم اور اچھا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ ساری زندگی ردا کے ساتھ مخلص تو رہا لیکن اس سے محبت نہیں کر سکا۔ اس نے اپنے خوابوں پر سمجھوتا ضرور کیا تھا مگر ان کا سودا نہیں کیا تھا اسے اپنے خواب بہت عزیز تھے اور ہر رات وہ تکیے پہ سر رکھتے ہی اپنی من پسند دنیا میں پہنچ جایا کرتا جہاں وہ ایک کامیاب انسان تھا۔ ایک بے حد خوب صورت محبت کرنے والی بیوی جسے وہ دیکھ دیکھ کے جیتا تھا' جو اس کی من پسند تھی۔ زندگی بہت سہل گزر رہی تھی مگر اس میں ارتعاش اس وقت پیدا ہوا جب علیزے اس کی زندگی میں آئی....
وہ ایک خوب صورت اور ذہین لڑکی تھی جس کی ہنسی بہت پیاری تھی۔ جو جی بھر کے باتونی تھی اور بات بے بات قہقہہ لگاتی رہتی تھی۔ جب وہ اپنے کیبن میں بیٹھ کے اس کی بات پہ ہنستی تو عاطف کا دل چاہتا وہ بس ہنستی چلی جائے اور وہ مدہوش سا سنتے جائیں حالانکہ وہ عمر میں ان سے کہیں چھوٹی تھی۔ عاطف اب ایک میچور مرد تھے باون سالہ۔ بھرپور مرد ان کی بڑی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ تین جوان بچوں کے باپ تھے مگر خود کو بہت فٹ رکھنے کی وجہ سے کم عمر دکھائی دیتے تھے۔ ان کی شخصیت بہت متاثر کن تھی۔ جو بھی دیکھتا' دیکھتا ہی رہتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ

علیزے متاثر نہ ہوتی۔۔۔ رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوگئے' جس میں علیزے کا شعوری طور پہ کم ہاتھ تھا۔ وہ ان سے بہت محبت کرتی تھی اور عاطف تو جیسے اس کے پیچھے پاگل تھے۔ میچور مرد کی محبت میں بڑی شدت ہوتی ہے اور ایسی محبت کا نشہ سرچڑھ کے بولا کرتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی' فائدے و نقصان کی باتیں یاد ہی نہیں رہتیں۔ محبوب کی ایک خوشی کی خاطر سب کچھ تیاگنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ عاطف کی محبت کی شدت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ بھی اپنی ہر صلاحیت علیزے کو دیکھنے کے بعد سلب ہوتی محسوس کرتے تھے۔ وہ ایک ایسی جادوگرنی تھی جس کے بغیر ان کے لیے اب سانس لینا بھی دشوار ہونے لگا تھا مگر وہ ایسی نہیں تھی۔ وہ تو انہیں دیوانہ کر کے ان کی بے بسی کا مزہ لیتی تھی ان کی محبت کا جواب ویسے نہیں دیتی تھی مگر عاطف کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ اسے سارا سارا دن اپنی نگاہوں کے سامنے بٹھا کے رکھیں۔ گھر' آفس' کاروبار' سب میں ان کی دلچسپی کم ہونے لگی ردا ان کی تیس سال سے رفیق حیات تھی ان میں تبدیلی محسوس کیے بغیر رہ نہیں سکی تھی۔

"کیا بات ہے۔ آج کل بہت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہیں۔" ایک دن ناشتے کی ٹیبل پہ اس نے پوچھ ہی لیا۔

"ساری زندگی تو تم سب کے لیے قربانیاں دی ہیں اب بھی کیا میری سزا ختم نہیں ہوئی؟"

ردا تو دھک سے رہ گئی۔ ان کا یہ انداز تو نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو بہت محبت سے بات کیا کرتے تھے اور اس طرح تو کبھی بات کی ہی نہ تھی۔

کیا بات ہے' کیا کوئی پریشانی ہے؟ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ پریشان ہوں۔" انہوں نے بھی خود کو چھپایا نہیں۔

"مجھ سے شیئر نہیں کریں گے؟"

"مجھے محبت ہوگئی ہے۔" انہوں نے اقرار کیا نہ انکار۔۔۔ فوراً ہی بم پھوڑ دیا جیسے اسی انتظار میں تھے۔

"کس سے۔۔۔؟" ردا نے بہت ہمت سے پوچھا ورنہ دل تو پاتال میں اترتا جارہا تھا۔

"آفس میں کام کرتی ہے۔۔۔ میں نہیں رہ سکتا اس کے بغیر۔" ان کے لہجے میں بے بسی کی نمی اتر آئی۔ ردا نے اپنے عزیز از جان شوہر کو کسی دوسری عورت کے لیے ضبط کھوتے دیکھا۔

"مجھے لگتا ہے اگر مجھے وہ نہ ملی تو مجھے سانس نہیں آئے گا۔ میرا دل دھڑکنا بند ہوجائے گا ردا! تم تو جانتی ہو نا میں کتنا پوزیسو ہوں اپنی خواہشات کے معاملے میں' میں نے کبھی بھی زندگی میں سمجھوتا نہیں کیا لیکن' لیکن اب اس سے ملنے کے بعد میرا ہر خواب ختم ہوگیا ہے' ایک خواہش بس مجھ پہ حاوی ہوگئی ہے' مجھے بس اس کا ساتھ چاہیے۔ اس کے لیے میں ہر طرح کی قربانی دے سکتا ہوں۔ لیکن وہ سمجھتی ہی نہیں۔"

آخر میں بولتے بولتے وہ رو ہی تو دیے۔۔۔ ردا کو وہ آنسو خنجر بن کے دل میں گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اپنے شوہر کو کسی اور عورت کے لیے روتا دیکھنا قطعاً آسان نہیں تھا۔

"میں نے زندگی میں صرف قربانیاں ہی دی ہیں' سب کے لیے' کیا میری زندگی پہ میرا کوئی حق نہیں ہے؟" انہوں نے ان کے سامنے سوال کیا۔

"آپ کا زندگی کی ہر خوشی پہ حق ہے عاطف۔۔۔ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟"

"تو پھر اسے جا کے سمجھاؤ ردا۔۔۔ اسے سمجھاؤ کہ مجھے نہ تڑپائے۔ میں مرجاؤں گا اس کے بغیر۔" وہ بال نوچتے' چلا اٹھے۔

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو پھر شادی کیوں نہیں کرسکتی۔" وہ بچوں کی طرح روئے تھے۔ ردا کو بہت دکھ ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ان پہ زبردستی مسلط کی گئی تھی۔ عاطف اس سے کبھی بھی محبت نہیں کرپائے لیکن وہ اس کی عزت بہت کرتے تھے اور ردا اکثر ان سے کہا کرتی تھی۔

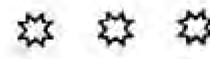
"آپ بے شک مجھ سے محبت نہ کریں لیکن جتنی

آپ مجھے عزت دیتے ہیں نا وہ میرے لیے محبت سے بھی بڑھ کر ہے۔"

لیکن آج اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کتنی بدبخت ہے کہ تیس سال ایک شخص کے ساتھ گزارنے کے بعد بھی وہ اس کی محبت کو حاصل نہیں کر پائی تھی۔ محبت اور عزت دو الگ جذبے ہیں جن کا فرق اسے بہت دیر میں سمجھ میں آیا تھا۔ وہ آج کسی اور کے لیے بیٹھا رو رہا تھا۔ جب ہی اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ عاطف نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ساری زندگی وہ کیوں قربانیاں دیں ان کی اپنی کوئی زندگی نہیں اسی لیے اس نے ان سے کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں' وہ آپ کی زندگی بن چکی ہے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ میرا اللہ مجھے اتنی ہمت دے کہ میں اسے آپ کی خوشی بنا سکوں۔"

یہ کہہ کے وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ عاطف بے بسی سے اسے دیکھتے رہے تھے۔ وہ ردا کو طلاق نہیں دے سکتے تھے نہ ہی محبت سے دستبرداری ممکن تھی ان کے لیے۔ وہ ردا کو تو چھوڑ سکتے تھے لیکن علیزے کو نہیں۔ مجبور مرد کی محبت بڑی ظالم ہوتی ہے۔ یہ وقت، حالات، رشتے ناطے کچھ نہیں دیکھا کرتی۔ عاطف بھی بھول گئے تھے' ردا کی محبت' اس کی قربانیاں۔ ہر قسم کے حالات میں وہ ان کے شانہ بہ شانہ کھڑی تھی۔ عاطف کو صرف اپنی قربانیاں یاد تھیں۔ ردا کی نہیں۔ انہیں محبت نے بہت خود غرض بنا دیا تھا مگر ردا خود غرض نہیں تھی۔



کچھ دن مزید گزر گئے۔ عاطف کی حالت سنبھلی نہ حالات۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ ردا سے ان کی حالت دیکھی نہیں گئی جب ہی ان کے پاس آئی۔

"میں اسے جا کے مناؤں گی بلکہ اسے خود اپنے ہاتھوں سے آپ کی دلہن بنا کے اس گھر میں لاؤں گی۔۔۔" ردا نے انہیں کھوئے کھوئے انداز میں بیٹھے دیکھ کے کہا۔

"میں اسے خود جا کے بتاؤں گی کہ آپ اس سے کتنی محبت کرتے ہیں۔" ردا کو ان کی خاموشی سے الجھن سی ہوئی۔ انہیں تو خوش ہونا چاہیے۔

"میں نے سوچا ہے کہ اپنا بیڈ روم اس کے لیے خالی کردوں۔ میں بچوں کے ساتھ اوپر شفٹ ہو جاؤں گی۔ آپ آرام سے نیچے رہیے گا۔ اور میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ گھر کا فرنیچر چینج کردوں اسے اچھا لگے گا اپنی پسند سے خرید لے گی سب۔۔۔۔ ردا نے ضبط سے کہا' کتنے چاؤ سے اس نے اس گھر ایک ایک چیز خریدی تھی مگر۔۔۔

اس کے لیے اس سب کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ تم کچھ مت کرو۔" عاطف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن میں تو آپ کی خوشی کی خاطر۔۔۔" مگر انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"علیزے کی شرط ہے کہ وہ اس گھر میں تب ہی آئے گی جب میں تمہیں طلاق دے دوں۔" انہوں نے اس پہ بم پھوڑا تھا۔ ردا کی سانسیں بند ہو گئیں۔۔۔ اس کی زندگی ختم ہو گئی۔ تو پھر اسے موت کیوں نہیں آ رہی تھی۔ سب کچھ تو ختم ہو گیا تھا۔



"تو آپ نے انہیں چھوڑ دیا۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔" انہوں نے گہری سانس لی تھی۔

"کیوں؟" میری آنکھوں میں استعجاب اترا۔

"کیوں کہ میں محبت سے ہار گیا تھا۔" وہ دھیمے سے مسکرائے۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں سمجھا دیتا ہوں۔" ان کے چہرے پہ پھر وہی مسکراہٹ تھی۔ "میں ردا کا درد کبھی بھی نہ سمجھ سکتا اگر خود محبت کے درد سے لذت آشنا نہ ہوتا تو۔۔۔ تم جانتے ہو میں نے ردا کو طلاق نہیں دی تھی۔ اس سے پہلے ہی وہ گھر چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کبھی بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا نام میرے نام

سے کبھی جدا ہو۔۔۔ جب میں مروں تو مجھے آپ کی زوجیت چاہیے۔ قبر کے کتبے پہ باپ کی ولدیت نہیں۔۔۔ میری محبت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ آپ اداس اور غمگین ہوں لیکن میری محبت کی موت ہو گی اگر آپ مجھ سے اپنا نام بھی چھین لیں گے تو۔۔۔" وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی تھی اس ڈر سے کہ اگر وہ میرے ساتھ رہی تو میں اسے طلاق نہ دے دوں۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔

"وہ علیزے کے پاس گئی تھی' میری وکیل بن کے اور وہ مان بھی گئی تھی۔" انہوں نے توقف کیا اور میں نے شکر کا سانس لیا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی۔ اچھا لگ رہا تھا کہ محبت کا ملن ہو گیا تھا۔

"یعنی ہیپی اینڈ ہو گیا۔" میں پرجوش ہوا۔

"نہیں۔۔۔" وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوئے تو میں چونکا۔

"تو کیا آپ نے علیزے سے شادی نہیں کی۔۔۔؟"

"علیزے نے مجھ سے شادی نہیں کی۔۔۔" انہوں نے میری فوراً" تصحیح کی۔

"کیا پہیلیاں بھجوا رہے ہیں انکل۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ جب ردا علیزے کے پاس گئی تو اسے منا کے ہی واپس آئی تھی اور وہ مجھ سے شادی پہ راضی بھی ہو گئی تھی لیکن پھر جب وہ مجھ سے ملی تو جانتے ہو' اس نے مجھے وہ حقیقت سمجھائی جو میں چھیالیس سالہ زندگی میں نہیں سمجھ سکا تھا۔"

"اس نے کہا تھا کہ مجھے محبت کی قدر نہیں ہے۔ میں' خواہشات کا مارا ہوا ایک خود غرض شخص ہوں جسے ساری زندگی ہی یہ بات دکھ دیتی رہی کہ اس کے خواب پورے نہیں ہو سکے۔ میرے لیے ہمیشہ میری ذات اہم رہی ہے۔ اب بھی میں صرف اپنی محبت کے لیے سوچ رہا ہوں اور۔۔۔" انہوں نے توقف کرتے ٹھنڈی سانس لی۔ "میں محبت کی قدر کر ہی نہیں سکتا۔۔۔" میں' جو اس کی خاطر اپنی تیس سال کی رفیق حیات کو بھی چھوڑنے کو تیار تھا۔" اسے لگتا تھا کہ مجھے اس کی محبت کی قدر نہیں ہو گی اور وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ محبت بہت خود غرض ہوتی ہے۔ یہ انسان کو اپنے علاوہ اور کچھ سوچنے ہی نہیں دیتی۔"

"تو کیا آپ کو ان دونوں نے چھوڑ دیا۔"

"نہیں' میں نے بتایا نا اس نے مجھے چھوڑ دیا۔۔۔ میچور عمر کی محبت بڑا خوار کرتی ہے۔ وہ ردا کا دکھ سمجھ گئی تھی۔ تیس سالہ ساتھ میں ہمیں کیوں نہیں سمجھ سکا۔۔۔ وہ اپنی محبت میں قربانی دے رہی تھی اور میں اپنی محبت کے حصول کی خواہش میں اس سے قربانی مانگ رہا تھا۔ اور اوپر سے خود کو مظلوم بھی تصور کر رہا تھا۔۔۔ مجھے بتاؤ میں کہاں غلط ہوں۔ ردا سے میں محبت نہیں کر سکا مگر انسیت ضرور رکھتا ہوں اور اب تو میں اس کی قدر اور بھی زیادہ کرنے لگا ہوں جب کہ علیزے کی محبت سے میں کبھی خود کو آزاد ہی نہیں کر پایا۔"

"اب کہاں ہے علیزے۔۔۔ جب وہ بھی آپ سے محبت کرتی ہے تو ایک کیوں نہیں ہو جاتے؟" میرا دل نجانے کیوں دکھ سے بھر گیا تھا جب ہی جلدی سے بولا تھا۔ وہ چپ رہے۔ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"علیزے کہاں ہے؟"

"اللہ میاں کے پاس۔" وہ دل گرفتہ ہوئے۔

"کیا۔۔۔؟ کیسے؟"

"کیونکہ اسے بھی موت گوارا تھی لیکن میرے ساتھ کے بغیر زندگی نہیں۔"

میں نے محبت کی اس انوکھی کہانی پہ انہیں حیرت اور دکھ سے دیکھا۔ میں سمجھ نہیں سکا۔ انہیں ظالم سمجھوں یا مظلوم۔۔۔ خوش نصیب سمجھوں یا بدبخت۔۔ صحیح سمجھوں یا غلط۔۔۔ یہ محبت کی کیسی کہانی تھی جس کا کوئی آغاز تھا نہ انت۔۔۔

میں نے اپنی آنکھوں میں نمی کو جھلملاتے اور انہیں پارک سے نکلتے دیکھا اور پھر ان کے جھکے کندھوں والے سر کو دیکھا 'وہ یقیناً" اپنے آنسو چھپا رہے ہوں گے۔ مجھے یقین تھا کیونکہ میری خود کی بھی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہو رہے تھے ایک انوکھی کہانی چھوڑ کر۔۔۔ ☆

نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز تھا۔ فارس غازی اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف غازی کا بھانجا ہے جو اپنے ماموں فارس غازی سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدی یوسف کی والدہ نے کڑی مشقت کر کے بچوں کی پرورش کی ہے' حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی یوسف کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ فارس غازی' سعدی یوسف کا ماموں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن

ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے... ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کاردار کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ ہاشم سونیا کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کاردار کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں' جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے۔ جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی پکڑ میں آئے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔

حنین اپنے اور سیم کے مشترکہ کمرے میں آتی ہے جب الماری کھولتی ہے تو اس کی نظر سنہری مخملیں ڈبے پر پڑتی ہے تو اس کے اندر ایک لاکٹ رکھا تھا۔ اس کی زنجیر میں سیاہ ہیرے کی شکل کا پتھر پرویا تھا جس کے اوپر سنہرے حروف میں ''اینئنس ایور آفٹر'' کندہ تھا۔ یہ سعدی کی چین کا جڑواں تھا۔

سعدی زمر سے ایک رشتے دار کی شادی میں جانے کا پوچھتا ہے۔ جس میں زمر کا سابق منگیتر حماد بھی آئے گا۔ زمر سعدی سے کہتی ہے کہ اگر وقت ملا تو وہ شادی میں جائے گی یہ بات جب بڑے ابا کو پتا چلتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

مکمل ناول



سارہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فارس آجاتا ہے۔ فارس سارہ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے خیال میں اس نے ہی وارث کو قتل کیا تھا؟ سارہ جواب میں کہتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسے پھنسایا گیا تھا۔

ہاشم کی سیکریٹری کال کرکے اسے بتاتی ہے کہ آج سعدی اپنی مصروفیت کی بنا پر نہیں آرہا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سعدی کو جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا' وہ اس سے ملاقات کو یونہی ٹالتا رہے گا۔

ہاشم سعدی کو فون کرتا ہے کہ کیا ہم اچھے وقتوں میں واپس جاسکتے ہیں! جب تم مجھے دل سے ہاشم بھائی کہتے تھے۔ ہاشم کی بات پہ سعدی "شاید نہیں" کہہ کر کال کاٹ دیتا ہے۔

دوسری طرف سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہوجاتی ہیں۔ سعدی پریشان ہوکر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اس وقت سعدی اپنے ماضی کے اچھے وقتوں کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں جب ہاشم کو دل سے بھائی کہتا تھا اور جواہرات کے دل میں اس نے کس طرح اپنی جگہ بنائی تھی اور نوشیرواں سے بھی اس کی اس وقت دوستی ہوگئی تھی۔ ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے سعدی کے سامنے کسی کہانی کے کرداروں کی طرح گھوم رہے تھے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہوجاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہوکر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آنس ایور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہوجاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہوکر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کردیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کررہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کردیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضایع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کررہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہوکر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد میل کردیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔' زرتاشہ مرجاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کرسکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہوجاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہوجاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً" بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہوجاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کرکے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی اپیل بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کرچکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں' جس کی بنا پر زمر کو

دکھ ہوتا ہے۔
جواہرات' زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے' اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔
سعدی' فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کرسکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔
سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔
زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہوجاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔
سعدی' علیشا کو راضی کرلیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔
ہاشم حنین کو بتادیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہوجاتی ہے۔
ہاشم' علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کرواچکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مرواسکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔
جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کررہا ہے۔
فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جارہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے' لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کرلے جاچکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے' کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا' جسے انکار کردیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہوجاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر' جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہوجاتی ہے۔
ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔
ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہوچکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو ماردیں گے۔
ہاشم' حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے' کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔
وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔
اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے' جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً" بعد کی تصویر ہوتی ہے' جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔
تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین، نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے، وہ کہتی ہے کہ نوشیروا پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔ سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔

سعدی، زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

"مثلاً "کون؟" زمر نے پوچھا۔

"مثلاً... مثلاً "ہاشم کاردار..." سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔

زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے۔ جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔

ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔

فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔

زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتی ہے کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کی علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے وہ ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آ جاتا ہے۔ جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے پڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔

زمر، فارس کی طرف سے مشکوک ہے۔ وہ اسے تہ خانے میں بنے کمرے میں جانے سے منع کرتا ہے لیکن زمر نہیں مانتی، وہ کمرے میں جاتی ہے تو وہ دیوار پر کچھ تصویریں لگی دیکھتی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو فارس کے مجرم ہیں۔

جسٹس سکندر (فارس کے کیس کے جج) وارث غازی کا باس الیاس فاطمی ڈاکٹر توقیر بخاری ڈاکٹر ایمن بخاری (فارس کی سائیکالوجسٹ) اور دوسرے لوگ... فارس کہتا ہے کہ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی کا انتقام لے گا۔

سعدی جب نوشیرواں سے ملنے جاتا ہے تو ڈاکٹر سارہ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ سعدی کو امید ہے کہ ڈاکٹر سارہ نے سب کو بتا دیا ہو گا۔

ہاشم نے حنین سے وہ یو ایس بی مانگی جو سعدی نے اس کے لیپ ٹاپ سے چرائی تھی۔ حنین نے دے دی تو زمر اور فارس کو بہت غصہ آتا ہے لیکن حنین بتاتی ہے کہ اس نے اصلی یو ایس بی نہیں دی تھی۔
ہارون عبید مشہور سیاست دان جواہرات کے حسن کے اسیر ہیں۔ وہ ایک اسے ہیرا تحفہ میں دیتے ہیں۔ زمر' احمر کو اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہے۔ احمر ہارون عبید کی الیکشن کمپین چلا رہا ہے۔ آب دار ہارون عبید کی بیٹی ہے۔ جو سعد کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔
فارس' زمر سے کہتا ہے کہ اس نے تین وجوہات کی بنا پر زمر سے شادی کی ہے۔
(1) زمر کے والد کے احسانات (2) شادی کرکے وہ سب کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے' وہ سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع کرچکا ہے۔
تیسری وجہ وہ زمر کے اصرار کے باوجود نہیں بتاتا۔
حنین ہاشم کے بارے میں زمر کو بتادیتی ہے۔ زمر کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتی لیکن اسے ہاشم پر بہت غصہ ہے۔ زمر اسے اپنے جرم کے بارے میں بتاتی ہے تو زمر کہتی ہے کہ ایک او سی پی ایک معمولی سی لڑکی کو دھمکی سے بلیک میل نہیں ہو سکتا۔ اس کی موت کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔
سعدی کی یاد میں ایک تقریب منعقد کی گئی ہے' جہاں احمر شفیع' ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری بھی شریک ہیں۔
زمر اور فارس' حنین کو تقریر کرنے کا کہہ کر باہر نکل آتے ہیں۔
ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری کا نیا تعمیر شدہ شان دار اسپتال جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ فارس اور زمر واپس تقریب میں آجاتے ہیں۔
حنین اور زمر' ہاشم کی سیکریٹری حلیمہ کا نام سن کر چونک جاتی ہیں۔
ہاشم' سعدی سے کہتا ہے کہ حنین اس کے کہنے پر اس سے ملنے ہوٹل آرہی ہے۔ سعدی پریشان ہو جاتا ہے' پھر ہاشم اس کو فون پر حنین کا پروفائل دکھاتا ہے' تب وہ جان لیتا ہے کہ حنین چھ منٹ پہلے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھ چکی ہے جو اس نے اپنے کمپیوٹر میں لوڈ کی تھی۔ سعدی پورے یقین سے کہتا ہے کہ "حنین ہاشم سے ملنے نہیں آئے گی۔" اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاشم تلملا کر رہ جاتا ہے۔
جسٹس سکندر کی ایک ویڈیو جس میں وہ او سی پی کو قتل کر رہے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر چل جاتی ہے۔ یہ وہی ویڈیو ہے جو سعدی نے او سی پی کے گھر سے حاصل کی تھی۔
زمر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے تو اس کو پتا چلتا ہے کہ اس کا واحد گردہ جو سعدی نے دیا تھا۔ ناکارہ ہو چکا ہے۔

بائیسویں قسط

کافر' ماکر' کاذب' قاتل

دریا کی اصل تیرتی لاشوں سے پوچھیے
ٹھہراؤ ایک چال' روانی فریب ہے

فصیح فون کان سے لگائے' تیز تیز سڑک پہ چلتا جا رہا تھا۔ اس کی سیاہ پیشانی پہ سلوٹیں تھیں اور آنکھوں میں چبھتی ہوئی ناگواری تھی۔ وہ دوسری طرف بولتے انجان آدمی کو سن رہا تھا۔

"اگر میں کہوں ہاں تو کیا مجھے انعام کی رقم ملے گی؟"
"ہاں' بالکل۔ کہاں ہے وہ تامل جاسوس؟" وہ غیر دلچسپی سے بولا اور کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا۔
"پہلے مجھے انعام کی آدھی رقم بھیجو' پھر بتاؤں گا۔"
"دیکھو مسٹر! مجھے تامل جاسوس کی لوکیشن بتاؤ' اگر اسے ہم پکڑ پائے' تب انعام ملے گا ورنہ ایک دھیلا بھی نہیں ملے گا۔" وہ بلا مبالغہ کہہ رہا تھا۔

"ایسے تو میں نہیں بتاؤں گا۔" بوڑھا سنہالی خفا ہو گیا۔

"جہنم میں جاؤ۔" اس نے کال کاٹ کر سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ پھر دوسرے سیل پہ نمبر ملا کر اسپیکر آن کیا اور کار ریورس کرنے لگا۔

"بولو فصیح۔" جواہرات تلخ لگ رہی تھی۔

"میم! ابھی تک ان دونوں کا پتا نہیں چلا۔ دونوں کے پوسٹرز الگ الگ بنوائے ہیں۔ سعدی کا نامل جاسوس کے نام سے اور خاور کا بگڑے ذہنی توازن والے لاپتا فرد کے نام سے۔ مگر لوگ بوگس کالز کرتے ہیں۔ پھر اوور اسمارٹ بن کر انعام کا ایڈوانس مانگ کر رفو چکر ہونا چاہتے ہیں۔ روز دس جگہوں پہ ان کی اطلاع ملتی ہے' میرے بندے بھاگ کر جاتے ہیں مگر سب فراڈ ہوتا ہے۔"

"مجھے اس تفصیل سے دلچسپی نہیں ہے۔ جب وہ مل جائیں تو جو تمہیں کرنا ہے' وہ کر گزرنا۔" اور اس کا "راجر میم۔" سننے سے قبل ہی جواہرات فون رکھ چکی تھی۔

وہ اس وقت اپنے بستر پہ لیٹی تھی۔ سادہ ٹائٹ شرٹ میں ملبوس' بالوں کو گول مول باندھے' لحاف لپیٹے' وہ ست اور بدمزہ سی لگتی تھی۔ بیڈ کی پائینتی کی طرف اسٹول پہ بیٹھی فیونا اس کے پیروں کا مساج کر رہی تھی۔

"مسز کاردار! کیا میری انجیو ہمیشہ کے لیے واپس آگئی ہے؟" دفعتاً" اس نے جھکی نگاہوں کے ساتھ پوچھا۔

جواہرات نے آنکھیں کھول کر ناگواری سے اسے دیکھا۔ "اپنے دماغ کو آرام دو فیونا! کون کدھر جائے گا' یہ میں طے کرتی ہوں۔ اب وہ تمہاری ہیڈ ہے' اس کو عزت دو۔" پھر اپنا پیر درشتی سے پیچھے کو کھینچا۔ فیونا کے ہاتھ خالی رہ گئے۔

"دور ہٹو۔ میرا سارا موڈ خراب کر دیا۔ باتھ تیار کرو میرے لیے۔"

چند منٹ بعد جواہرات لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ وہ بنا آستین کے لمبا گاؤن پہنے تھی' بال جوڑے میں باندھے اور زمرد جڑے آویزے پہنے' وہ تازہ دم لگ رہی تھی۔ شیرو کا کمرہ تاریک تھا۔ وہ اسٹڈی کی طرف چلتی آئی۔ اندر بتیاں جلی تھیں۔ سامنے کمپیوٹر ٹیبل پہ ہاشم چند کتابیں کھولے بیٹھا' کام کرتا نظر آ رہا تھا۔ شرٹ کی آستین کہنیوں تک موڑے' وہ کتاب میں سے کچھ پڑھ کر نوٹ پیڈ پہ لکھتا جا رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی۔ اس کے کندھے پر نرمی سے ایک ہاتھ رکھا اور دوسرا اس کی میز پہ رکھے وہیں کھڑی ہو گئی۔

"جی ممی؟" وہ سر اٹھائے بنا' منہمک سا بولا۔

"تمہارے اطمینان پہ حیرت ہے مجھے۔ تمہارا بھائی اس لڑکی کو لے آیا جس سے مجھے نفرت ہے' اس کو کمپنی کا ایک چوتھائی حصہ دے ڈالا' اس کو اپارٹمنٹ لے کر دے رکھا ہے اور دو دن سے وہ اسی شہر میں رہ رہی ہے مگر تم کچھ نہیں کر رہے۔"

"میں موو آن کر چکا ہوں' ممی۔" وہ اب لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کرنے لگا تھا۔ جواہرات کا دماغ گھوم گیا۔

"ہاشم۔۔۔ اس لڑکی سے مجھے چھٹکارا کون دلائے گا؟"

"اس لڑکی کا نام علیشا ہے اور وہ فیملی ہے ممی!"

"ہاشم۔۔۔؟"

"ممی!" اس نے عینک اتار کر رکھی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں' چہرے کے نقوش' سب جواہرات کی کاپی تھے اور ان میں بھی اتنا ہی غصہ تھا۔

"میں اس کی فیس دے رہا تھا۔ وہ ایک سمسٹر ختم کر کے پڑھائی چھوڑ چکی ہے۔ وہ ٹک کر کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میری اتنے سالوں کی فیس بچ گئی۔ اس کے بدلے شیرو نے اسے چند شیئرز دے دیے ہیں اور اچھا مجھے بھی نہیں لگا مگر میں کیا کروں؟ وہ دونوں میرے اپنے ہیں۔ رہنے دیں اسے ادھر۔ کچھ دن بعد خود ہی

اکتا کر چلی جائے گی۔ آپ کو کیا کہہ رہی ہے۔" اور واپس کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جواہرات اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا چکی تھی اور اب تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ایک وقت تھا جب اس کے شہر میں ہونے کی اطلاع نہ دینے پہ تم مجھ سے گاڑی میں بیٹھے معذرت کرتے رہے تھے۔"

مگر ہاشم پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔ "وہ وقت میں گزار چکا۔ اب موو آن کر جائیں ممی! اب میں ایک اچھا آدمی بن کر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

جواہرات غصے سے مڑی اور پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"ان دو بیٹوں کے لیے اتنے سال قربانیاں دیں۔ کیا کیا نہیں کیا' مگر اب یہ دونوں اپنی زندگی میں آگے بڑھ چکے ہیں تو ٹھیک ہے۔ رکوں گی میں بھی نہیں۔" پرس سے سیل نکالتی وہ ہارون کا نمبر ڈائل کرنے لگی تھی۔



بولے تو سہی جھوٹ ہی بولے وہ بلا سے
ظالم کا لب و لہجہ دل آویز بہت ہے

کولمبو میں اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے باہر اٹھارویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور اندر سیڑھیوں پہ کھڑا فارس دیوانہ وار بار بار اسے کال ملا رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ پریشانی اور ماتھے پہ پسینہ تھا۔

"زمر! کال اٹھاؤ' پلیز کال اٹھاؤ۔" وہ موبائل کان سے لگائے بڑبڑا رہا تھا مگر دوسری طرف وہ فون آف کر چکی تھی۔ فارس نے فون کان سے ہٹایا' مڑ کر غصے سے اوپر فلیٹ کی طرف دیکھا جہاں آبی گم ہوئی تھی اور پھر... پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا' سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آیا اور فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ تیز قدموں سے راہداری عبور کی اور لاؤنج میں بیٹھی آبی کے سر پہ جا پہنچا جو میز پہ پڑے کھانے کے پیکٹ سمیٹ رہی تھی۔

"یہ کیا تھا؟" وہ بلند آواز سے غرایا تھا۔ آبی نے سکون سے چہرہ اٹھایا' پھر اس کے برہم تاثرات دیکھ کر آنکھوں میں حیرت ابھری۔

"کیا ہوا؟"

"یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ آپ کو پتا تھا کہ دوسری طرف میری بیوی ہے۔" وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔ آبی اچنبھے سے اسے دیکھتی کھڑی ہوئی۔

"میں نے ایسا کیا کہا؟" پھر جیسے یاد کیا۔ "میں تو کھانے کا کہہ رہی تھی۔ میں سمجھی نہیں فارس' کچھ غلط ہو گیا ہے مجھ سے؟"

اب کے وہ کچھ نہیں بولا۔ کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے' چبھتی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ تنفس ابھی تک تیز تھا اور ماتھے کے بل ہنوز ویسے ہی تھے۔

"آئی ایم سوری' اگر میری وجہ سے کچھ غلط ہوا ہے تو۔ کیا انہوں نے کچھ غلط سمجھا؟ مگر وہ آپ کی بیوی ہیں' آپ کو اتنا تو جانتی ہوں گی۔ انہیں آپ کو اتنی سی بات پہ غلط نہیں سمجھنا چاہیے تھا۔" وہ تعجب سے کہہ رہی تھی پھر فکر مندانہ تاثرات چہرے پہ سجائے آگے کو ہوئی۔

"کیا میں کچھ کر سکتی ہوں آپ کے لیے؟ پریشان مت ہوں' میں فون پہ ان سے بات کر لوں گی۔"

"میرے ساتھ یہ گیمز نہ کھیلیں آبدار بی بی۔" وہ تیز تنفس پہ قابو پاتا' اسے گھور کر بولا تھا۔

آبی نے اسے دیکھتے ہوئے پلکیں جھپکیں تو ان میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

"میں نے کیا کیا ہے' سوائے آپ کی مدد کرنے کے؟" وہ بے بسی سے بولی۔ فارس نے گہری سانس لی اور سر جھٹکتے ہوئے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

"اچھا روئیں نہیں۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔" وہ صوفے کے کنارے بیٹھا اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں گرائے کچھ سوچنے لگا۔ آبدار نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ پونچھا پھر سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"میں نے شام سے کچھ نہیں کھایا' یہ کھانا بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

فارس نے چہرہ اٹھا کر اسے تکان سے دیکھا۔ "اچھا

سوری۔ مجھے آپ پہ غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

آبدار کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ نم آنکھیں رگڑتی سامنے والے صوفے کے کنارے پہ جا بیٹھی۔

"مجھے کھانا کھانا ہے۔" وہ اب بھی منہ بسورے ہوئے تھی۔

"چلیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس ٹینشن زدہ ماحول سے تو نکلیں۔"

تلخی کو پی کر وہ زخمی سا مسکرایا تو وہ مسکرادی اور کھانے کے پیکٹ سمیٹنے لگی۔ "یہ راستے میں کسی کو دے دیں گے۔"

فارس نے رک کر اپنی شرٹ کو دیکھا۔ "میں کپڑے بدل لوں۔" اور اندر کمرے کی طرف چلا گیا۔ آبی نے مسکراتے ہوئے سارے پیکٹ سمیٹے۔ پھر موبائل پہ قریبی ریسٹورنٹس سرچ کرنے لگی۔ ساحل کنارے ایک خوب صورت ریسٹورنٹ میں بکنگ کروائی اور پھر مسکراتے ہوئے فون بند کر کے سوچنے لگی۔

گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کرتی رہیں' وقت سرکتا رہا۔ جب پندرہ منٹ گزر گئے تو آبدار قدرے چونکی۔ فارس ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ اٹھی اور اس کے کمرے کے باہر جا کر آواز دی۔ ایک آواز' دو آوازیں۔ جواب ندارد۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا' پھر ڈور ناب گھمائی' دروازہ کھلتا چلا گیا۔

کمرہ خالی تھا۔ الماری کے پٹ کھلے تھے۔ اندر نہ فارس غازی کا مختصر سامان تھا' نہ وہ خود تھا۔ کمرے کی کھڑکی بھی کھلی تھی۔ آبی بھاگ کر گئی اور کھلی کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ وہاں پائپ لگے تھے۔ اور جالیاں۔ وہ ان کے نیچے سڑک پہ جا اترا تھا اور کوئی ٹک ٹک یا ٹیکسی پکڑ کر کب کا کولمبو کے ہجوم میں گم ہو چکا تھا۔ وہ بالکل سن رہ گئی۔ پھر کھڑکی کی جالی میں اٹکے نوٹ پہ نظر پڑی تو اس نے لپک کر وہ کاغذ وہاں سے اتارا۔

"میں یہاں ریسٹورنٹس کے کھانے کھانے نہیں آیا تھا۔"

آبدار گہری سانس لے کر رہ گئی۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہو یا نہ ہو' محبت کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرنا سراسر ناجائز ہوتا ہے۔



وہاں سے چند کلومیٹر دور وہ ٹیکسی سے اتر کر' بیگ کندھے پہ ڈالے' دوسرے ہاتھ میں موبائل پہ نمبر ملا رہا تھا۔ وہ اب زمر کو فون نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنا ادھورا کام مکمل کر رہا تھا۔ فون کان سے لگایا تو ایک نسوانی آواز ابھری۔

"ہیلو۔"

"صباحت۔ میں بول رہا ہوں۔ فارس۔"

"فارس؟" آواز میں خوش گوار حیرت ابھری۔ "کیسے ہو فارس؟ اتنے عرصے بعد؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ شاید۔" وہ زخمی سا مسکرایا۔

"شاید؟ یعنی ٹھیک نہیں ہو؟ کیا میں کچھ کر سکتی ہوں؟" وہ چند لمحے خاموش رہا۔

"جب پہلی دفعہ جیل گیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ آپ میرے لیے کچھ نہیں کر سکیں کیونکہ۔"

"فارس! آئی ایم سو سوری' میں کچھ نہیں کر سکی' میں نے بہت کوشش کی مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ تم نے جو میرے لیے کیا تھا' اس کا بدلہ میں ساری زندگی نہیں چکا سکتی۔" وہ انتہائی ممنونیت سے کہہ رہی تھی۔

"تم نے اپنی نوکری خطرے میں ڈال کر مجھے میرے اریسٹ وارنٹ کا بتایا تھا۔ تم کتنے سال سندھ میں پوسٹڈ رہے' میری وجہ سے اور۔۔۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا تھا۔" اس نے نرمی سے بات کاٹی۔ "میں کہہ رہا تھا کہ پہلی دفعہ آپ نے میری مدد اس لیے نہیں کی کیونکہ آپ اس وقت انڈیا میں پوسٹڈ تھیں' لیکن دوسری دفعہ جب میں جیل گیا تھا تو آپ نے مجھے سری لنکا سے فون کیا تھا۔ سری لنکا میں پوسٹڈ تھیں۔ مجھے احسان کا بدلہ مانگنا ہے۔" کرب سے آنکھیں بند کیں۔ "بالکل اچھا نہیں لگ رہا' مگر مجبور ہوں۔

جہاں اتنے جرائم کر چکا ہوں وہاں ایک اور سہی۔"

"فارس!" وہ اداسی سے مسکرائی تھی۔ "تم نے جو میرے لیے کیا، وہ جرم بھی تھا، اپنی نوکری کے ساتھ خیانت بھی، دھوکا بھی اور غیر قانونی بھی۔ مگر وہ "غلط" نہیں تھا کیونکہ کچھ چیزیں قانون سے اوپر کی ہوتی ہیں۔ تم کل بھی بے گناہ تھے اور کل بھی رہو گے۔"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "کیا آپ اب بھی کولمبو میں پوسٹڈ ہیں۔"

☼ ☼ ☼

میں تو مقتل میں بھی قسمت کا سکندر نکلا

قرعۂ فال مرے نام کا اکثر نکلا

سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے میں رات کے اس پہر مکمل خاموشی تھی۔ زمر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی، اور سیم کے سوالوں کا اس نے "اسے بتا دیا ہے" کہہ کر جواب دیا تھا۔ آگے نہ سیم نے پوچھا نہ حنین نے۔ حنہ تو وہیں لاؤنج میں نیچے بیٹھی، لیپ ٹاپ میز پہ رکھے، اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ (امی اپنے کمرے میں اپنے وظیفوں اور دعاؤں میں مشغول تھیں۔) سیم حنہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بڑے ابا بھی وہیل چیئر گھسیٹتے، ان کے ساتھ آرکے تھے اور اب فکرمندی سے بار بار حنہ سے پوچھتے تھے۔

"کیا تم سعدی کو ڈھونڈ سکتی ہو؟"

"نہیں ابا! لیکن میں امی کا پاس ورڈ بدل رہی ہوں، وہ پاس ورڈ کے لیے امی کا ای میل کھولے گا، تو میں ایک جعلی ای میل اندر محفوظ کر رہی ہوں۔ وہ اسے کھول کر اس کے لنک پہ کلک کرے گا تو اس کی لوکیشن ہمارے پاس آجائے گی۔" وہ ایک ہاتھ سے ٹائپ کرتی، دوسرے کے ناخن مسلسل دانتوں کے بیچ کتر رہی تھی۔

"حنہ... کیا بھائی ہمیں واپس مل جائے گا۔" سیم اس کا بازو جھنجھوڑ کر بار بار پوچھتا تھا۔

"ہاں سیم۔ وہ واپس مل جائے گا اور پھر دیکھنا، ہم سب ہمیشہ خوش رہیں گے۔" حنین کو یہ بہت آسان لگتا تھا۔

"کاش کہ ہمیں وہی سعدی ملے جسے ہم نے کھویا تھا حنین۔" ابا کی آواز غم زدہ ہو گئی۔ حنہ نے مڑ کر استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کیا مطلب؟" وہ چہرہ نیچے گرائے، بس سرہلا کر رہ گئے۔ وہ حنین کو مطلب نہیں سمجھا سکتے تھے۔

وہ سر جھٹک کر واپس اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر کچھ سوچ کر اس نے سیو سعدی یوسف (سعدی یوسف کو بچاؤ) پیج کھولا۔ اس کے ایڈمن میں سامنے احمر شفیع لکھا آرہا تھا۔ حنین نے پیج کو پیغام لکھا۔

"ایڈمن... میں سعدی کی بہن ہوں۔ پلیز مجھے اس پیج کا ایڈمن بنا دیں۔"

"تم اس کی ایڈمن کیوں بننا چاہتی ہو؟" سیم نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"سیم! ہمارے فونز اور لینڈ لائن وہ لوگ ٹریس کر رہے ہوں گے، کیا پتا ہمارے فیس بک اکاؤنٹس بھی دیکھ رہے ہوں۔ ہم کوئی بھی ایسی بات نہیں لکھ سکتے جو بھائی کے لیے خطرہ بن جائے۔ لیکن سیو سعدی یوسف والا پیج بھائی بھی دیکھتا ہو گا، میں اس کے ذریعے بھائی کو کوئی پیغام بھیج سکتی ہوں۔" وہ جوش سے بتا رہی تھی۔ اس کے لیے یہ بہت آسان تھا۔

ان سے ذرا فاصلے پہ، کمرے کے بند دروازے کے پیچھے جھانکو تو زمر اندھیرے کے صوفے پہ بیٹھی تھی۔ اس کی خشک آنکھیں چھت پہ جمی تھیں اور چہرے پہ



ویرانی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا وہ موٹا بھدا فون آف تھا۔ جانے کتنے لمحے سرکے.... کتنی رات گہری ہوئی.... جب اس نے وہ فون آن کرتے ہوئے گردن سیدھی کی اور پھر اس میں محفوظ واحد نمبر ملایا اور اسے کان سے لگایا۔ آنکھیں ہنوز خشک اور چہرہ سپاٹ تھا۔

فارس نے چھوٹتے ہی فون اٹھالیا تھا۔ وہ اس وقت ایک تباہ حال سے علاقے میں سڑک کنارے چل رہا تھا' ہاتھ میں پرچی تھی جس پہ لکھا پتا وہ تلاش کر رہا تھا۔ فون کان سے لگاتے ہوئے اس نے پرچی مٹھی میں دبالی اور بے چینی سے بولا۔

"اس طرح فون مت بند کیا کرو۔ میری بات تو سن لیا کرو۔"

"تم ہمیشہ مجھے مختلف روپ میں ملتے ہو۔"

"زمر! میں تمہیں...."

"مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔" وہ صوفے پہ پیر اوپر کرکے بیٹھی' سر جھکائے' انگلیاں مروڑتی کہہ رہی تھی۔ "پہلے تم میرے ایک بھولے بسرے رشتے دار تھے پھر اسٹوڈنٹ بن گئے۔ پھر ایک ایسے اسٹوڈنٹ رہ گئے جو وقت پڑنے پہ مجھے فیورز دے دیا کرتا تھا۔ پھر تم میرے سامنے ایک قاتل کی حیثیت سے آئے' جس نے اپنی بیوی کو مارا' اپنے بھائی کو مارا' اور مجھے بھی مارنے کی کوشش کی۔ پھر تم صرف ایک قیدی رہ گئے۔ جو سفید کرتے شلوار میں ملبوس' بالوں کی پونی بنائے' مجھے کبھی کبھار کچہری میں نظر آجاتا تھا۔ پھر تم مجھے ایک چال باز قیدی لگے جس نے مجھے استعمال کرکے جیل توڑنے کی کوشش کی۔ پھر تم مجھے ایک ایسے رہا ہونے والے انسان جیسے لگے جو گناہ گار ہوتے ہوئے بھی قانون کا مذاق اڑا کر جیل سے نکل آتا ہے۔ پھر مجھے لگا تم ایک منتقم مزاج انسان ہو۔ جس نے اپنا رشتہ ٹھکرائے جانے کا بدلہ مجھ سے لیا تھا۔

جب تم سے شادی کرلی تو تم ایک بے حس اور سرد آدمی لگتے تھے مجھے' جسے جو کہہ لو' اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے لگا تم وہ نہیں ہو جو لگتے ہو۔ جو ہمیشہ لگتے تھے۔ تم بے گناہ لگنے لگے مجھے یہاں تک کہ مجھے یقین آگیا کہ تم بے قصور ہو' مگر بے وقوف ہو' اپنے دشمن سے ناواقف ہو۔ پھر تم میرے شوہر بن گئے اور ایک محبت کرنے والے وفادار آدمی جیسے لگنے لگے مجھے.... مگر آج رات...."

وہ رکی۔ تیز تیز بول کر اس کا سانس چڑھ گیا تھا۔ دوسری طرف وہ بالکل خاموشی سے سن رہا تھا۔

"آج رات لگا کہ تم ان میں سے کچھ بھی نہیں ہو۔ تم ایک اداکار ہو صرف مگر اب.... اب یہ نہیں لگ رہا۔"

"اب کیا لگ رہا ہوں میں تمہیں؟" وہ تحمل سے بولا تھا۔

"ایک انسان۔ صرف ایک انسان جو اگر زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں لینا چاہے تو اس میں کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ بس پھر تمہیں مجھ سے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ میں تمہاری بیوی بنوں۔" ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر چہرے پہ لڑھک گیا۔

"کیا تم میری بات سنوگی؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہمیشہ کہتے ہو ہم نے الگ ہوجانا ہے اور مجھے نہیں پتا کہ کیوں' لیکن اگر الگ ہی ہوجانا ہے تو تم میری طرف سے آزاد ہو۔ جو کرنا ہے کرو۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں اور تم کبھی ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس لیے...." اس نے گیلی سانس کو ناک سڑک کر اندر کھینچا اور ہاتھ کی پشت سے گال رگڑے۔ "میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تم میری طرف سے پریشان ہوئے بغیر جو بھی کرو' یہ تمہارا حق ہے۔ مجھے اعتراض نہیں۔"

وہ سڑک کنارے' ایک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا' سنجیدگی سے دوسری طرف سے آتی زمر کی آواز سن رہا تھا۔ آخر میں تلخی سے مسکرایا۔

"عظیم ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر صاحبہ نے ہمیشہ کی طرح اپنی کہی' اپنی سنی اور فیصلہ سنا دیا۔ ٹھیک ہے جو تم چاہو۔" اور اسی سنجیدگی سے موبائل نیچے کیا اور کال کاٹ دی پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

زمر نے سر گھٹنوں میں دے لیا اور بازو ان کے گرد

لپیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اب ہر طرف پھر سے اندھیرا ہوگیا تھا۔

اور اسی اندھیری رات میں احمر جب لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھا تو نئے پیغام نے اسے چونکایا۔ اسے پڑھ کر اس نے بلا کسی تردد کے حنین یوسف کو اپنے پیج کا ایڈمن بنا دیا۔ پھر یونہی۔۔۔ اس کی پروفائل کھولی۔ کچھ خاص نہ تھا ادھر۔۔۔ البتہ۔۔۔ ایک چہرہ دیکھ کر وہ چونکا تھا۔۔۔

اب اس کی انگلیاں تیز تیز کی بورڈ پہ حرکت کررہی تھیں اور آنکھوں میں چمک سی تھی۔

ادھر کولمبو کے آسمان پہ سیاہ بادل اکٹھے ہونے لگے تھے گویا پورے شہر کو نہلا دینے کے لیے بے چین ہوں۔ ہوٹل کی بلند و بالا عمارت سر اونچا کیے بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ اندر۔۔۔ گراؤنڈ فلور کے سیکورٹی کنٹرول روم میں دو افراد کمپیوٹر مانیٹرز کے سامنے بیٹھے تھے۔ دفعتاً" دروازہ کھلا اور سیاہ فام فصیح اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

"تمہیں ریسپشن پہ طلب کیا جارہا ہے۔ کوئی ملنے آیا ہے تم سے۔" ایک کو اکھڑ لہجے میں حکم دے کر وہ دوسرے کی طرف آیا اور چند لمحے انتظار کیا' یہاں تک کہ پہلا نوجوان کمرے سے چلا گیا۔

"خیریت' سر؟" دوسرے آفیسر نے کرسی اس کی طرف گھما کر فکر مندی سے اسے دیکھا۔ فصیح نے جواباً" اپنے اسمارٹ فون کی اسکرین اس کے سامنے کی۔

"مجھے شام میں ایک کال آئی تھی۔ پوسٹر والے لڑکے کے لیے۔" اس بات پہ آفیسر نے اکتا کر سر جھٹکا۔

"نہیں سنو۔ بے شک وہ عام کالرز کی طرح بوگس ہی لگ رہا تھا' مگر۔۔۔" اس نے اسکرین سامنے لہرائی۔ "اس کا موبائل نمبر کینڈی کا ہے۔"

"تو؟"

"تو یہ کہ اشتہار ہم نے کولمبو میں دیا ہے۔ پھر کینڈی سے کیوں کوئی کال کررہا ہے ہمیں؟"

"ہوسکتا ہے نمبر کینڈی کا ہو مگر کالر کولمبو میں ہو۔ آدمی سم کسی بھی شہر سے لے سکتا ہے۔" مگر فصیح نے نفی میں سر ہلایا۔

"مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ سعدی یوسف کینڈی میں ہو؟"

"تو پھر اس کالر کے پاس پوسٹر کیسے آیا؟" اس نے نکتہ اٹھایا۔ فصیح نے الجھ کر سر جھٹکا۔

"اس نمبر کو ٹریس کرو۔"

"راجر' سر!" وہ فوراً" سے مانیٹر کی طرف گھوما اور کچھ ٹائپ کرنے لگا۔ پانچ منٹ بھی نہیں لگے اور اس نے سر اٹھایا۔

"نمبر آف ہے۔ سم موبائل میں نہیں ہے' ورنہ سگنل مل جاتا۔ میں اس نمبر پہ نظر رکھے ہوئے ہوں۔ جیسے ہی آن ہوتا ہے' بتاتا ہوں۔"

فصیح کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "یہ اس کی کوئی ایکسٹرا سم ہوگی۔ تم اس کا سارا کال ریکارڈ نکلواؤ۔ کس کے نام ہے سم' سب کچھ۔" پھر جوش سے اس کا کندھا تھپکا۔ "ہری اپ۔"

انعام کی رقم کے صفر فصیح کو اپنی آنکھوں میں چمکتے دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ جواہرات کا اس سے وعدہ تھا۔ ہارون کا انعام الگ۔ خون اس کی رگوں میں بہت تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔



میں دن میں بھٹکتے ہوئے جگنو کی طرح ہوں
اس شخص کی آنکھیں ہیں کسی رات کی مانند

یہ کولمبو کے ایک زبوں حال اور پسماندہ علاقے کی ایک فلیٹ بلڈنگ تھی۔ سامنے کچرے کا ڈھیر تھا۔ میلی دیواریں۔ فلیٹس کی بالکونیوں پہ سوکھتے کپڑے۔ اندر فارس گول سیڑھیاں عبور کرکے ایک دروازے کے سامنے آن ٹھہرا تھا اور اب دستک دے رہا تھا۔ اپنے ہلکے سوئیٹر کی آستینیں موڑ رکھی تھیں اور سر پہ پی کیپ لے رکھی تھی۔ دوبارہ دستک دی۔ پھر بیل بجائی۔ دروازہ ہلکا سا کھلا۔ درز سے ایک منحنی اور

سانولے سے لڑکے نے جھانکا۔

"مجھے صباحت نے بھیجا ہے۔ صباحت مرزا نے۔ کام ہے تم سے۔"

لڑکا درز سے چند لمحے اسے جھانکتا رہا۔ پھر دروازہ کھول دیا اور زنجیر گرا دی۔ وہ دروازہ پرے دھکیلتا اندر داخل ہوا۔ ساتھ ساتھ بولتا جا رہا تھا۔

"تعارف اور تمہید میں میرا وقت ضائع نہ کرواتا۔ اپنا کمپیوٹر آن کرو۔ جو صلاحیتیں تم مختلف حکومتوں کو بیچتے رہتے ہو، مجھے ان کی ضرورت ہے۔ شکل کیا دیکھ رہے ہو۔ چلو۔" اس کا موڈ پہلے ہی خراب تھا، گھرک کر بولا تو لڑکا جلدی سے اندر چلا گیا۔ فارس ماتھے پہ بل لیے اس کے پیچھے آیا۔ اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں تین کمپیوٹرز رکھے تھے۔ ایک آن تھا۔ وہ لڑکا اسی کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا تھا اور مطلوبہ پروگرام کھول رہا تھا۔

"صباحت نے کہا تھا تمہیں گورنمنٹ کے فیشل recognation سافٹ ویئر تک access چاہیے۔ تصویر دو مطلوبہ لڑکے کی۔" کی بورڈ پہ ٹائپ کرتے اس نے ہاتھ بڑھایا۔ فارس نے ایک فلیش اس کی ہتھیلی پہ رکھی اور ساتھ کھڑا اسے دیکھنے لگا۔

"اس میں سب تصاویر ہیں اس کی؟" وہ فلیش ڈرائیو لگا کر پوچھ رہا تھا۔

"نظر نہیں آ رہیں کیا؟" وہ درشتی سے بولا۔ منحنی لڑکے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، جیسے بہت ضبط کیا ہو، پھر سر جھٹک کر کام کرنے لگا۔

"میں اسے سسٹم میں ڈال رہا ہوں۔ اس چہرے کا لڑکا پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں کولمبو کے کسی اسٹریٹ کیم، ایئرپورٹ، بس، ٹرین اسٹیشن وغیرہ کے کسی بھی پبلک کیمرے کے سامنے اگر آیا ہو، تو فوٹیج مل جائے گی۔"

"کولمبو میں نہیں، اسے کینڈی میں ڈھونڈو۔" وہ کمپیوٹر ٹیبل کے کنارے بیٹھ گیا۔

وہ لڑکا، جس کا نام پریرا تھا، گہری سانس لے کر مطلوبہ الفاظ ٹائپ کرنے لگا۔

"انگریزی فلموں کے برعکس فیشل ریکوگنیشن میں کئی گھنٹے لگتے ہیں۔" تھوڑی دیر بعد پریرا جمائی روکتے، بازوؤں کا تکیہ بنا کر پیچھے کو ٹیک لگاتے ہوئے بولا تھا۔ "اگر وہ نظر آیا تو اسکرین پہ سگنل بج جائے گا۔ تم دیکھتے رہو، میں تب تک کھانا کھا لوں۔" کہہ کر وہ اٹھنے لگا، تو میز کے کونے پہ بیٹھے فارس نے اپنا پیر لمبا کر کے راستے میں رکھ دیا۔ پریرا نے چونک کر اسے دیکھا۔ فارس نے جیب سے پستول نکال کر میز پہ رکھا، پھر دوسری جیب سے نسبتاً" چھوٹا پستول نکال کر اس کے ساتھ ڈالا، پھر سخت نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ابرو سے واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جب تک وہ مل نہیں جاتا، تم کہیں نہیں جا رہے۔ واپس بیٹھو۔"

لڑکے نے ایک نظر اسے دیکھا، دوسری بے بس نظر ان دو پستولوں پہ ڈالی، پھر گہری سانس لے کر واپس بیٹھ گیا۔ پروگرام کے مسلسل چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دونوں کی نظریں اسکرین پہ جمی تھیں۔ رات دھیرے دھیرے کٹنے لگی۔



مری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کوئی نیا نہیں
ابھی روشنی ابھی تیرگی، نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

اگلی صبح دھوپ چھاؤں کا سا موسم اسلام آباد کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ اس پرشکوہ عمارت کے بالائی فلور پہ وہ ایک کشادہ سا آفس تھا۔ بلائنڈز کھلے تھے اور سنہری روشنی آدھے آفس کو روشن کر رہی تھی۔ مرکزی کرسی پہ نوشیرواں ٹیک لگائے بیٹھا ایک کرسٹل بال ہاتھ میں گھما رہا تھا۔ سامنے کھڑکی کے آگے **علیشا** کھڑی تھی۔ سیاہ بالوں کو اونچی پونی میں باندھے، اس کی بے حد گوری جلد اور سرمئی آنکھیں دھوپ کی حدت سے چمک رہی تھیں۔ **دفعتاً** اس نے چہرہ موڑ کر چبھتی ہوئی نگاہوں سے شیرو کو دیکھا۔

"اب؟ اب کیا ہوگا؟"

"کیا ہونا ہے، تم یہاں کام کروگی، آرام سے

رہو گی۔"

علیشا کاردار کی آنکھوں میں خفگی اتری۔ "تم نے مجھے یہ کہہ کر بلایا تھا کہ مجھے میرے باپ کی جائیداد سے حصہ دو گے۔"

"دے تو رہا ہوں۔" وہ حیران ہوا اور قدرے ناراض بھی۔

"مجھے کیا کرنا ہے اس کمپنی کا؟ میں سوچ رہی ہوں' ان شیئرز کو بیچ دوں۔"

نوشیرواں کے ماتھے پہ بل پڑے۔ "اور ان کے بدلے رقم لے کر واپس چلی جاؤ؟"

"ہاں نوشیرواں! میں اس رقم سے نئی زندگی شروع کر سکتی ہوں۔"

نوشیرواں ناگواری سے ابھی کچھ کہتا مگر دروازہ دستک کے ساتھ کھلا تو چوکھٹ میں زمر کھڑی نظر آئی۔ سیاہ کوٹ اور سفید لباس میں ملبوس' گھنگھریالے بال آدھے باندھے' وہ مسکرا رہی تھی۔ بالکل پرسکون' پراعتماد اور اپنی ناک کی لونگ کی طرح دمکتی ہوئی۔ رات والے واقعے کا شائبہ تک چہرے پہ نہ ملتا تھا۔

"آیئے مسز زمر۔" وہ اپنائیت سے کہتا اٹھا۔ اسے دیکھ کر ہمیشہ شیرو کو تقویت ملتی تھی۔

"تھینک یو نوشیرواں۔" وہ مسکرا کر کہتی آگے آئی۔ "ہیلو علیشا!" علیشا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اور بس صبح بخیر کہہ کر رہ گئی' البتہ سینے پہ لپیٹے بازو کھول کر پہلو میں گرا دیے تھے اور جو پہلے بے نیازی سے کھڑی تھی' اب الرٹ سی ہو گئی تھی۔

"میں صرف اطلاع دینے آئی تھی۔" کرسی کھینچ کر بیٹھتی وہ نرمی سے گویا ہوئی۔ اور پرس میز پہ رکھا۔ "مجھے صبح ہاشم کا فون آیا تھا۔"

نوشیرواں کے چہرے پہ بے چینی سی پھیلی۔ وہ آگے کو ہو کر بیٹھا اور ہاتھ باہم پھنسا کر میز پہ رکھے۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ علیشا چاہے تو آفس میں کام کرے۔ چاہے تو اپنے شیئرز اسے بیچ دے۔ وہ ان کے بدلے ایک خطیر رقم دینے کو تیار ہے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" شیرو کے چہرے پہ پہلے ہاشم کے نام سے جو زخمی پن سا پھیلا تھا' اب وہ عنقا ہو کر غصے میں ڈھل گیا۔

"مگر یہ اچھا سودا ہو گا۔" علیشا قدرے امید سے کہتی آگے آئی۔ شیرو نے بے بسی بھرے غصے سے اسے دیکھا۔

"میں نے تمہیں شیئرز اس لیے نہیں دیے تھے کہ تم انہیں ہاشم بھائی کو بیچ کر انہیں پچاس فیصد کا مالک بنا دو اور میں بالکل معذور ہو جاؤں۔"

"اب وہ میرے شیئرز ہیں' اگر تمہیں میرا خیال ہے تو۔۔۔" وہ بھی تیزی سے کہنے لگی۔

مگر زمر نے میز کو انگلی کے ناخن سے زور سے کھٹکھٹایا۔ "ایک منٹ!" آفس میں خاموشی چھا گئی۔ پھر زمر نے نرمی سے اسے پکارا۔ "نوشیرواں! کیا آپ کو مجھ پر اعتماد ہے یا نہیں؟"

"مسز زمر! اگر یہ دونوں مل گئے تو میں ان کا محکوم بن جاؤں گا' اور۔۔۔"

"نوشیرواں! آپ کو مجھ پر اعتماد ہے یا نہیں؟" وہ اب سنجیدگی سے بولی تو وہ ذرا چپ ہوا۔

"مجھے ہے مگر۔۔۔"

"تو فکر کیسی؟ میں آپ کی وکیل ہوں' آپ کے مسئلے حل کرنا میرا مسئلہ ہے۔ کچھ بھی ایسا نہیں ہو گا جو آپ نہیں چاہیں گے۔"

نوشیرواں نے ناخوشی سے سر کو خم دیا مگر وہ بے چین لگ رہا تھا۔ زمر نے اب سرد نظروں سے علیشا کو دیکھا جو بے چین نظر آ رہی تھی۔

"مس علیشا کاردار۔ آپ نے اس روز دو کاغذات پہ دستخط کیے تھے۔ وہ دوسرا کاغذ جانتی ہیں کیا تھا؟"

"آپ نے کہا تھا کہ وہ میرے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے ہے تاکہ کوئی مجھ سے زبردستی شیئرز نہ چھین لے۔"

"آ آ آ۔۔۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔" زمر نے شانے اچکائے۔ "اس کاغذ کی رو سے آپ نوشیرواں کاردار کے علاوہ کسی بورڈ ممبر کو وہ شیئرز نہیں بیچ سکتیں۔ اور

نوشیرواں کو بھی آپ ان کی مرضی کی قیمت پہ بیچیں گی۔ آپ اپنی مرضی سے وہ شیئرز نہیں فروخت کرسکتیں۔"

نوشیرواں نے چونک کر زمر کو دیکھا۔ خود علیشا بھی متحیر کھڑی رہ گئی۔

"اور یہ شرط کمپنی کے بائی لاز کے سیکشن 18 کی شق (B) کے عین مطابق ہے۔ آپ ہاشم کو وہ بیچ ہی نہیں سکتیں۔" ٹیک لگا کر بیٹھی وہ قلم دو انگلیوں میں گھماتی، اطمینان سے کہہ رہی تھی۔ نوشیرواں کے چہرے کی رنگت واپس آنے لگی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔

علیشا نے سرمئی آنکھوں میں بے بسی بھرے زمر کو دیکھا۔ "آپ نے مجھے مس گائیڈ کیا۔ کیوں مسز زمر؟"

"کیونکہ میں آپ کی نہیں، نوشیرواں کاردار کی وکیل ہوں۔ آپ کو دولت کمانی ہے **علیشا!** تو آپ کو کام کرنا ہو گا۔ دنیا کا کوئی کاروبار ایسا نہیں ہے جو انسان کو بٹھا کر کھلا سکے۔ آپ نوشیرواں کا گفٹ یوں اڑا نہیں سکتیں۔" پھر سر گھما کر نوشیرواں کو دیکھا۔

"چونکہ ہاشم نے **علیشا** کو کام کرنے کی اجازت دے دی ہے تو آپ اپنے بھائی سے صلح کرلیں۔ وہ آپ سے سب سے زیادہ مخلص اور وفادار ہے۔"

نوشیرواں اب پہلے سے بہتر نظر آنے لگا تھا۔ گردن دوبارہ اکڑ گئی تھی۔ "میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ چھری ڈال کر پانی کی گہرائی دیکھ چکی تھی، سو **علیشا** سے مخاطب ہوئی۔ "نوشیرواں کے ساتھ کام کریں اور کمپنی کو ترقی دلائیں۔ یہ اس احسان کا بدلہ ہو گا جو اس نے آپ پہ کیا ہے۔"

مگر اس فیوی ٹیل نصیحت سے وہ دونوں بے زار تھے۔ مخالف سمتوں میں رخ کیے، وہ ذہن میں اپنے تحفظ اور اپنی بقا کے تانے بانے بُن رہے تھے۔ وہ جانے لگی تو **علیشا** کسی خیال سے جاگی۔

"مسز زمر! کیا میں حنین سے مل سکتی ہوں؟"

"نہیں۔" وہ یک لفظی جواب دے کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ **علیشا** چپ رہ گئی۔ وہ مسلسل اضطرابی انداز میں انگلیاں مروڑ رہی تھی۔



کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے
مدّعا ہم کو انتقام سے ہے

کولمبو پر سورج نے سنہری شربت انڈیل دیا تھا۔ سارا شہر سونے میں نہا گیا تھا۔

فصیح نے اپنے فلیٹ سے نکلتے وقت فون کان پہ لگائے فکر مندی سے پوچھا۔ "اس کینڈی والے شخص کا فون آن ہوا یا نہیں؟ میں تمہاری طرف آرہا ہوں۔ تم اس نمبر کو نظر میں رکھنا۔" اور پھر فون بند کر کے کار کی طرف بڑھ گیا۔



کینڈی کی پہاڑیوں کے بیچ، سڑک کنارے بنی کافی شاپ کے اندر کا ماحول نرم گرم سا تھا۔ کچن میں سعدی ایپرن پہنے کھڑا، برتن ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی ٹرک کو مزید سحر انگیز بنانے کے لیے خاص برتن بھی منگوائے تھے، خود باہر جانے کی غلطی وہ نہیں کر رہا تھا۔ اگر وہ کسی اسٹریٹ کیم کی زد میں آگیا تو وہ لوگ اسے ڈھونڈ لیں گے، وہ جانتا تھا۔

کام ختم کر کے وہ کونے میں آیا اور کامنی کا لیپ ٹاپ کھولا اور اسٹول پہ بیٹھ گیا۔ کی بورڈ پہ دونوں ہاتھ رکھے وہ فیس بک اکاؤنٹ لاگ ان کرنے لگا۔ پھر آنکھیں حیرت سے سکڑیں۔ پاس ورڈ نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کلک سا ہوا۔ پھرتی سے اس نے فیس بک بند کیا اور کمپیوٹر آف کر دیا۔ اسے مزید اسی کے اکاؤنٹ کو نہیں کھولنا تھا۔ کسی کو پتا چل گیا تھا کہ وہ اکاؤنٹ کھول رہا ہے اور یقیناً اس کے لیے کوئی جال بچھا کر رکھا گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ حنین ہو، مگر وہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔



واپس کولمبو میں آؤ تو کمپیوٹر اسکرین کے سامنے

بیٹھے' کھٹا کھٹ ٹائپ کرتے ہوئے شخص نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ نمبر ابھی تک آن نہیں ہوا۔"

وہ کرسی کے پیچھے آکھڑا اور سوچتی نظروں سے اسکرین کو دیکھا۔ "کیا آف نمبر کو ٹریس نہیں کیا جاسکتا؟"

"نہیں۔ جب تک وہ نمبر آن نہیں ہو گا' ہم اس کو ٹریس نہیں کرسکتے۔ اب؟" مڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"وہ کینیڈی میں ہے' مجھے اس کا یقین ہے۔ ایسا کرو' اس نمبر کو ابھی چھوڑو۔ تم ایک اور کام کرو۔" وہ آگے پیچھے ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"کیا کروں؟ اتنے بڑے کینیڈی میں ایک شخص کو ڈھونڈنا ناممکن ہے۔"

"ڈارک نیٹ پہ اس کا پوسٹر دیکھا ہے نا تم نے؟ اس پہ موجود انعامی رقم کا نصف دوں گا' اگر ہم نے اسے پکڑ لیا تو۔"

"مجھے یقین نہیں ہے۔ تم اس کو ڈھونڈ کر اسے گولی مار دو گے' مجھے معلوم ہے۔" کمپیوٹر اسکرین کی طرف واپس گھومتے اس نے خفگی سے کہا تھا۔ "اب بتاؤ' کیسے ڈھونڈیں گے ہم اسے؟"

وہ سوچتے ہوئے بولنے لگا۔ "وہ کہیں کسی محفوظ جگہ پناہ لیے ہوئے ہے۔ وہ خود کو محفوظ سمجھتا ہے ادھر۔ اسی لیے باہر نہیں نکل رہا۔ ہم اسے باہر نکالیں گے۔"

"مگر کیسے؟" اس نے چونک کر مڑ کر دیکھا۔

"میرے اور تمہارے برعکس' وہ ایک اچھا انسان ہے۔ رحم دل اور مہربان۔ ہم اس کی رحم دلی کو اس کے خلاف استعمال کریں گے۔ اگر وہ کچھ ایسا سنے جو اس کے مہربان دل کو دہلا دے' تو وہ باہر نکل آئے گا اور میں اسے جالوں گا۔"

"یعنی کہ ہم اس کے لیے جال بچھائیں۔ گڈ۔ لیکن ایسا کیا ہو سکتا ہے جسے سن کر وہ نکل آئے؟" اور مڑ کر دوبارہ اسکرین کو مایوسی سے دیکھا۔

"وہ نمبر ابھی تک آن نہیں ہوا۔"



دھیمی دھیمی چال سے ہم کو راہ گزر طے کرنی ہے
ناز تھا جن کو تیز روی پر منزل تک وہ آئے کم

زمر گھر میں داخل ہوئی' چیزیں حسینہ کو پکڑائیں' اس کو مارکیٹ سے چند ادویات لانے کے لیے بھیجا اور خود ڈائننگ ہال میں چلی آئی۔ حنہ کرسی پہ پیر اوپر کیے بیٹھی تھی۔ چائے کے دو خالی مگ ساتھ رکھے تھے اور وہ لیپ ٹاپ پہ نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

"بھائی نے ایک دفعہ فیس بک کھولا' پاس ورڈ بدلا ہوا دیکھ کر ای میل نہیں کھولی۔ وہ جیسے پیچھے ہٹ گیا ہے۔" وہ نم آنکھوں سے اسکرین کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔ سیم بھی رات والے کپڑوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ قریب بیٹھا تھا۔ چہرے پہ مایوسی تھی۔

"سیم! اٹھو۔ امی اور بڑے ابا کو بلاؤ۔" زمر نے کہا۔

"کیوں پھپھو؟" سیم نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کیونکہ ہمیں ایک فیملی میٹنگ کرنی ہے اسامہ یوسف۔" تحکم سے کہہ کر وہ سربراہی کرسی کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ اسامہ ڈھیلا سا اٹھ گیا۔ حنہ اسی طرح دل مسوس کر بیٹھی رہی۔

ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی' سو ندرت گھر پہ ہی تھیں۔ وہ آئیں اور فکر مندی سے باری باری ان سب کے چہرے دیکھتے پہلی کرسی پہ بیٹھیں۔ سیم ابا کی وہیل چیئر بھی دھکیلتا آیا۔ پھر سلائیڈنگ ڈور بند کر دیا۔

"مجھے آپ سب سے بات کرنی ہے۔" وہ کرسی کی پشت پہ دونوں ہتھیلیاں جمائے کہہ رہی تھی۔ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے' سوائے حنین کے۔ زمر آگے آئی' لیپ ٹاپ کے پاور بٹن پہ انگلی رکھ کر اسے دبایا۔ اسکرین آف ہو گئی۔ حنہ نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

"زمر! میں بھائی کے لاگ ان کا انتظار۔۔۔"

"میں نے کہا' ہم ایک فیملی میٹنگ کرنے جا رہے ہیں' تو تمہیں متوجہ ہونا چاہیے۔ اگر تمہارا بھائی رابطہ نہیں کر رہا تو اس کی کوئی وجہ ہو گی۔" وہ ڈپٹ کر بولی تو

حنین بے دلی سے سیدھی ہو کر بیٹھی۔
"کل رات آپ سب نے مجھے الزام دیا۔۔۔ بھابھی! میری بات سنیں۔ یہ معاملے میں آپ لوگوں سے بہتر ڈیل کر سکتی ہوں اور چاہے آپ مجھ سے بڑے ہوں، آپ کو ان معاملات میں میری بات ماننی ہو گی۔" ندرت کو لب کھولنے سے پہلے ہی اس نے خاموش کرا دیا۔
"فارس اور میں نے یہ سب چھپایا اس لیے نہیں کہ ہمیں راز رکھنے کا شوق ہے، بلکہ اس لیے کہ خطرناک راز بم کی طرح ہوتے ہیں، انہیں ہم اپنے "اپنوں" کے ہاتھوں میں اس لیے نہیں دیتے کہ ان کی ذرا سی لاپروائی ان ہی پہ کوئی ٹریجڈی نہ لے آئے، مگر اب آپ لوگ جان ہی گئے ہیں تو سنیں۔"
باری باری سب کی طرف نظریں گھماتی، وہ دو ٹوک انداز میں کہہ رہی تھی اور سب دھیان سے اسے سن رہے تھے۔
"کاردار زعزت دار لوگ ہیں۔ وہ کرپٹ ہیں، سب جانتے ہیں، مگر وہ قاتل ہیں، یہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ صرف ہم جانتے ہیں، مگر ان کو علم نہیں ہے کہ ہم جانتے ہیں۔ جس دن ان کو یہ پتا چلا کہ ہم جان چکے ہیں، اس دن زمین ہمارے لیے تنگ ہو جائے گی، اس دن کو ابھی نہیں آنا چاہیے۔ کم از کم جب تک ہمارا سعدی ہمارے پاس نہیں ہے، تب تک نہیں۔ اس لیے آپ سب دوبارہ ان الفاظ کو نہیں دہرائیں گے۔"
اس کا لہجہ اب بھی بے لچک تھا۔
"کوئی اب اس بات کا ذکر نہیں کرے گا۔ کاردارز کیا کر چکے ہیں، آپ جیسے جانتے ہی نہیں۔ وہ لوگ ہمارے فونز ٹیپ کر رہے ہوں گے، ہماری کالز سن رہے ہوں گے۔ کوئی بھی فون پہ یا ایسے بھی کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرے گا۔ بلکہ ہر کال میں آپ یوں مایوسی کا اظہار کریں گے کہ جیسے ہم ابھی تک سعدی کے بارے میں بے خبر ہیں۔ ابھی جنگ کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ہم نے خود کو نارمل ظاہر کرنا ہے۔ اسامہ تم کل سے اسکول جاؤ گے بلاناغہ اور بھابھی آپ ایک گھنٹے کے لیے بھی ریسٹورنٹ سے غائب نہیں ہوں گی، کیونکہ ہماری ہر نقل و حرکت پہ وہ لوگ نظریں رکھے ہوں گے۔ ہمیں ان کو "شک" کا موقع نہیں دینا۔ ہمیں ان کو اپنی طرف سے پرسکون رکھنا ہے۔ سب نارمل ایکٹ کریں گے۔"
بالآخر خاموش ہو کر اس نے سامنے بیٹھے حاضرین کو دیکھا۔ سب متفق تھے یا غیر متفق، سب بات مان چکے تھے۔ صرف ندرت کے لبوں سے نکلا۔
"اور سعدی؟ اس کا کیا؟" ان کی آواز تک کانپ گئی۔
زمر نے میز سے اپنا پرس اور سیل فون اٹھاتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔
"فارس سنبھال لے گا۔" اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔



شاید وفا کے کھیل سے اکتا گیا تھا وہ
منزل کے پاس آکے جو رستہ بدل گیا

صبح ابھی پوری طرح دوپہر میں نہیں ڈھلی تھی، مگر فاطمہ اختر کا آفس سورج کی کرنوں سے مکمل طور پہ روشن تھا۔ وہ فائل ریک کے سامنے کھڑی سوچ کر ایک ایک فولڈر نکالتی، پھر نفی میں سر ہلا کر واپس رکھتی۔ دفعتاً "دستک پہ مڑی۔ چوکھٹ میں احمر کھڑا تھا۔ فینسی شرٹ اور کوٹ میں ملبوس، وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا۔ فاطمہ نے بھی مسکراتے ہوئے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔
"اور صبح سویرے جناب احمر شفیع نے مجھے یہ اعزاز کیونکر بخشا؟" وہ اپنی سیٹ پہ تھکن سے گرتے ہوئے بولی۔
احمر تیزی سے آگے آیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھا۔
"مجھے معلوم ہے میں آج کل کسی کو وقت نہیں دے پا رہا۔ میری جاب۔۔۔ بہت ٹف ہوتی جا رہی ہے۔"
"تم کرنل خاور سے بہتر غلام بننے کی کوشش

کررہے ہو' مگر وہ ہیسٹ تھا۔" احمر کے چہرے پہ سایہ سالہرایا' مگر پھر سر جھٹک کر آگے کو ہوا۔

"میں نے تمہیں حنین یوسف کو ریسرچ کرنے کے لیے کہا تھا۔"

"وہ کلین ہے احمر! میں نے بہت ڈھونڈا' مجھے کچھ نہیں ملا۔" فاطمہ نے شانے اچکائے۔

"کوئی بھی کلین نہیں ہوتا فاطمہ۔" وہ زخمی سا مسکرایا' پھر اپنا ٹیب اس کے سامنے رکھا۔ "کل رات اس نے مجھے میسج کیا کہ میں اسے سیو سعدی یوسف کا ایڈمن بنادوں۔"

"تو بنادو۔ اس کے بھائی کے نام کا پیج ہے وہ۔"

"بات یہ نہیں ہے۔" وہ دبے دبے جوش سے بول رہا تھا۔ "بات یہ ہے کہ میں نے پہلی دفعہ اس کی فیس بک پروفائل دیکھی ہے۔"

"میں کب کی دیکھ چکی ہوں' اس میں کچھ نہیں ہے۔" وہ بے زار آگئی تھی۔

"اس میں واقعی کچھ نہیں ہے' مگر اس میں "کوئی" ہے۔" کہہ کر اس نے اسکرین فاطمہ کے سامنے کھڑی کی۔ وہ اچنبھے سے آگے ہوئی۔

"یہ ایک لڑکی ہے حمیرا نام کی۔ اس نے اپنے باپ کی تصویر کو پروفائل تصویر کے طور پہ لگا رکھا ہے۔ ایف وائی آئی' یہ آدمی ایک بورڈ کا او سی پی تھا اور اس کو جسٹس سکندر نے قتل کردیا تھا' اسی ویڈیو کو سعدی اور میں نے۔۔۔ استعمال کیا تھا۔" فارس کا نام نہیں لے سکا۔ چپ ہوگیا۔

"او کے تو؟"

"تو یہ کہ اس کی بیٹی اور حنین یوسف فرینڈز تھیں۔ سعدی نے مجھ سے کہا تھا' وہ ندامت لے کر او سی پی کے گھر گیا تھا جب اس کو وہ پین کیمرہ ملا۔ وہ گلٹی تھا مگر کیوں؟ وہ تو کبھی او سی پی سے نہیں ملا تھا۔ پہلی دفعہ ان کے گھر گیا تھا۔ جب یہ بات میں نے غازی اور مسز زمر کو بتائی تو وہ چھوٹی لڑکی بھی ساتھ بیٹھی تھی اور اس کی شکل عجیب سی ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ ایسا کیا تھا جس پہ سعدی گلٹی تھا۔"

فاطمہ دلچسپی سے آگے کو ہوئی۔ "مگر کیا؟"

"یہی جاننے کے لیے میں نے اس لڑکی کا اکاؤنٹ ہیک کیا۔"

"حنین کا؟"

"نہیں۔ وہ خطرناک ہے۔ میں نے اس حمیرا کا اکاؤنٹ ہیک کیا اور حنین سے اس کی گفتگو پڑھی۔ دو سال پرانی گفتگو اور جانتی ہو' مجھے اس سے کیا معلوم ہوا؟"

"کیا؟" فاطمہ سانس روکے سن رہی تھی۔

"او سی پی کی بڑی بیٹی کی ویڈیو کسی کے پاس تھی' انہوں نے حنین سے مدد مانگی' حنین نے کہا کہ انکل خود آکر مجھ سے کہیں۔ پھر گفتگو سے لگتا ہے کہ کام ہوگیا۔ چند ماہ بعد حنین نے اس سے اس کے ابو کا نمبر مانگا اور کہا کہ وہ ان سے بات کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد حنین نے اس کو کوئی میسج نہیں کیا۔ سارے میسج اسی لڑکی کے ہیں۔ وہ گلہ کررہی ہے کہ حنین ابو کی وفات پہ آئی بھی نہیں نہ تعزیت کا فون کیا۔ حنین نے جواب نہیں دیا۔ وہ گلٹی تھی۔"

"مگر کس چیز پہ؟"

"یہی میں نے سوچا۔ جس دن اس او سی پی کو فون کیا گیا ہوگا' اسی دن ان کی موت ہوئی۔ حنین موت کی اصل وجہ سے واقف نہیں تھی۔ اس نے سمجھا کہ۔۔۔ کہ اس کی وجہ سے ہوا ہے یہ۔"

"تمہیں کیسے پتا کہ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے؟"

"کیونکہ فاطمہ! اس دن اس کا بورڈ کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ حنین مجھ سے کس بات پر چڑتی تھی؟ جب میں نے اس سے اس کے رزلٹ کا پوچھا۔ میں نے کہا تھا' آپ نے نقل مار کر تو ٹاپ نہیں کیا تھا کیا؟ فاطمہ۔۔۔ فاطمہ۔۔۔ اس نے نقل سے ہی ٹاپ کیا تھا۔ اس نے ویڈیو ہٹانے کے لیے اس لڑکی کے باپ سے کیا مانگا ہوگا؟ اس نے بعد میں انجینئرنگ میں کیوں داخلہ نہیں لیا؟ وہ میرے منہ سے کون سا ذکر سن کر میری طرف سے ان سیکیور فیل کرنے لگی' اتنا کہ اس نے مجھے یہ تاثر دیا جیسے غازی کو میری شکایت لگارہی ہو۔ وہ یہی راز

چھپا رہی ہے۔" اس نے ایکسائٹمنٹ سے میز پہ ہاتھ مارا۔

"اتنی جھوٹی اور چالاک لڑکی میں نے پہلی دفعہ دیکھی ہے۔" فاطمہ نے جھرجھری لی۔ مسٹری حل ہو گئی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا' کوئی بھی کلین نہیں ہوتا۔" مسکرا کر قطعیت سے کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فاطمہ نے ایک دم چونک کر سر اٹھایا۔

"لیکن تم ان کی فیملی کے دوست ہو۔ اس راز کا کیا کرو گے؟ یہ تو بے کار ہے تمہارے لیے۔"

وہ جو ایک معمہ حل کر کے' فاتح اور مطمئن سا اٹھ رہا تھا' جاتے جاتے رک کر اسے دیکھا اور پھر زخمی سا مسکرایا۔

"ہر راز کی قیمت ہوتی ہے فاطمہ۔ کبھی نہ کبھی' کسی نہ کسی طرح' وہ ہمارے کام آسکتا ہے۔ ویک اینڈ پہ ملتے ہیں۔" چابیوں والا ہاتھ ہلا کر وہ باہر نکل گیا اور فاطمہ سوچتی رہ گئی۔



راہ وفا میں ہر سو کانٹے' دھوپ زیادہ سائے کم
لیکن اس پر چلنے والے خوش ہی رہے پچھتائے کم

سعدی یوسف کو اس کافی شاپ میں کام کرتے چوتھا روز ہونے کو آیا تھا۔ بوڑھے سنہالی روپا سنگھی نے ابھی تک اپنا نمبر آن نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ دن میں کولمبو جا کر خود سے اس معاملے کی تحقیق کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کامنی سعدی کے کام سے خوش تھی' اور چار دن میں اس نے دیکھا تھا کہ چار پانچ لوگ پلٹ کر آئے تھے اور اپنے ساتھ مزید مہمان بھی لائے تھے۔ کامنی کا بیٹا اسی طرح خاموش سا کونے میں بیٹھ کر سب کو دیکھتا رہتا تھا۔

اس صبح سعدی کچن میں کھڑا برتن ڈش واشر میں سیٹ کر رہا تھا جب اسے کامنی کی آواز سنائی دی۔

"یہ تو مونچھ جتنا ہے۔" سعدی ہاتھ پونچھتا باہر آیا تو دیکھا' وہ گردن اونچی کیے' ایک ہاتھ کمر پر رکھے کھڑی افسردگی سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"کینڈی میں بم بلاسٹ ہوا ہے۔" کامنی نے مڑے بغیر کہا۔ سعدی کی نظریں ٹی وی تک گئیں۔

"تم نے نہیں دیکھا؟ صبح سے یہ خبر چینل پہ چل رہی ہے۔ غیر مصدقہ اطلاع ہے کہ ایک عورت جاں بحق ہو گئی ہے' اور اس کا بچہ زخمی ہے۔ اسپتال والے اس کا علاج نہیں کر رہے کیونکہ وہ غیر قانونی ہے۔"

"غیر قانونی" لفظ پہ سعدی نظریں چراتا اندر کو مڑا جب وہ بولی۔

"بے چاری فلپنیو عورتیں۔ نوکری کے لیے کتنے دھکے کھاتی ہیں۔ اور اس کے بچے کو کینسر ہے۔" وہ ایک دم ٹھہر گیا۔ بالکل شل۔ ساکت۔ پھر دھیرے سے مڑا۔ نگاہیں اٹھائیں۔ اسکرین پہ اس بچے کی زخمی تصویر نظر آرہی تھی۔

تصویر دیکھ کر اس کا سانس تھم گیا۔ وہ میری **اینجیو** کا بچہ تھا۔

کافی شاپ کی اوپری منزل پہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک پلنگ رکھا تھا۔ الماری کا دروازہ شیشے کا بنا تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا غسل خانہ تھا۔ کمرے میں کھڑکی نہ تھی۔ سعدی خاموش سا بیڈ کے کنارے بیٹھا تھا۔ سوچیں دل و دماغ میں طوفان برپا کر رہی تھیں۔ شور ہی شور۔

پھر اس نے چہرہ اٹھایا اور الماری کے دروازے میں اپنا عکس دیکھا۔ "استرا" پھرے سر اور بڑھی شیو والا سعدی پریشان نظر آتا تھا۔

"میری کا ہی بچہ ہے وہ' میں پہچانتا ہوں۔ مگر وہ تو امریکہ میں زیر علاج تھا نا۔ یہاں کیسے آگیا؟"

آئینے میں اس کو اپنا عکس اسی طرح پلنگ کنارے بیٹھا ہوا نظر آرہا تھا۔ **دفعتاً** اس کے عقب میں.... ایک اور عکس ابھرا۔ وہ ٹی شرٹ پہنے' کلین شیو اور گھنگھریالے بالوں والا سعدی تھا۔ پرانا سعدی۔

"تمہیں کیسے پتا کہ وہ امریکہ تھا؟"

"میری نے تو یہ بھی کہا تھا کہ تم انڈیا میں ہو۔ میری

کو خود بھی معلوم نہ ہو شاید کہ اس کا بیٹا ادھر ہی ہے۔ تم نے میری کو استعمال کر کے جیل توڑی' انہوں نے اس جرم کی پاداش میں میری اور اس کے بیٹے کو دھماکے میں حادثاتی موت کا شکار کرنا چاہا۔"

"نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ "یہ ٹریپ ہے۔ وہ مجھے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔ میری کا بچہ بالکل ٹھیک ہو گا اور خود میری بھی۔"

"اور اگر ایسا نہ ہوا؟ اگر تمہاری وجہ سے وہ مر گئی ہو' اور اس کا بچہ آج بے یار و مددگار پڑا ہو تو پوچھ کس کی ہو گی' شفیع احمر؟" گھنگریالے بالوں والے لڑکے نے طنز اور ملامت سے پوچھا تھا۔

"میں اب تمہاری طرح نہیں رہا۔ میں بدل گیا ہوں۔ میں نہیں جاؤں گا۔ یہ فصیح کا کوئی پلان ہے۔" وہ دبا دبا سا چیخا تھا۔

"لوگ نہیں بدلا کرتے۔ تم بھی نہیں بدل سکتے۔"

"شفیع..." دروازہ بجا تو وہ چونکا۔ چوکھٹ میں کامنی کھڑی تھی۔

سعدی نے چونک کر آئینے میں دیکھا۔ وہ عکس اب غائب ہو چکا تھا۔ وہ وہاں تنہا تھا۔

"نیچے آجاؤ۔ گاہک آئے ہیں۔" وہ پلٹنے لگی جب اس نے اٹھتے ہوئے پکارا۔

"کامنی جی۔" وہ ٹھہر کر مڑا اور استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اگر... یہ ممکن ہو... ہو سکتا ہے کہ یہ ممکن ہو کہ کوئی دوسرا انسان مشکل میں ہو' اور اس کو بچانے کے لیے آپ کو اپنی جان خطرے میں ڈالنی پڑے تو انسان کو کیا کرنا چاہیے؟"

"انسان کو وہ کرنا چاہیے جس کی وجہ سے وہ "انسان" کہلاتا ہے' کیونکہ اگر وہ انسانیت نہیں دکھائے گا' خطرہ نہیں لے گا' تو وہ کیسا انسان ہوا؟ میں نہیں جانتی تمہیں مگر تمہارے لیے خطرہ مول لیا نا۔ اب فائدہ ہی اٹھا رہی ہوں نا۔"

نرمی سے سمجھانے والے انداز میں کہہ کر وہ مڑ گئی اور سعدی یوسف کا دل ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ میری کے بیٹے کو ڈھونڈنے جائے گا۔ بھلے آگے کچھ بھی ہو۔



تیرے نغمے تیری باتیں نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی
ہمیں یہ چاندنی راتیں نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی

اس صبح سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے میں اپنے کمرے میں بیٹھی حنین بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے' گھٹنوں پہ کمبل ڈالے' سست روی سے موبائل اسکرین پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ بال پونی میں بندھے تھے اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔ ان دنوں میں نہ فارس کا کوئی فون آیا۔ نہ سعدی نے امی کا اکاؤنٹ لاگ ان کیا۔ اب وہ اسے کہاں ڈھونڈے؟ اس نے بھائی کا گروپ کھولا جہاں کی وہ خود بھی ممبر تھی' بلکہ امی کو تو بھائی نے ادھر کا ایڈمن بنا رکھا تھا اور خود وہ وہاں اپنی قرآن میں تدبر کی ویڈیوز پوسٹ کرتا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کی پرانی ویڈیوز دیکھتی رہی۔ پھر گروپ کی وال چیک کی۔ لوگ اب بھی قرآنی آیات' لیکچرز اور اپنے اپنے تدبر پوسٹ کرتے تھے مگر سعدی والی بات کہاں تھی؟ وہ بے دلی سے وال نیچے کرتی گئی۔ دفعتاً" ٹھٹکی۔ آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"ندرت ذوالفقار یوسف نے Weasley Ronald کو گروپ ممبر بنانے کی درخواست قبول کر لی ہے۔"

یہ ایک خبر تھی۔ اطلاع تھی۔ یعنی ایک شخص جس نے اپنا نام رونلڈ رکھا ہوا تھا' اس نے اس گروپ میں داخلے کی درخواست بھیجی اور اسے ندرت نے بطور ایڈمن قبول کر کے اسے گروپ میں داخل کر لیا۔

حنین بالکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ پرسوں کی اطلاع تھی۔ پاس ورڈ بدلنے سے بھی پہلے ندرت یوسف کی آئی ڈی پہ کام کر چکی تھی۔ سعدی ایک دفعہ زمر کے موک ٹارئل میں رونلڈ ویزلی (ہیری پورٹر کا ایک کردار) بنا تھا۔ ندرت تو اس گروپ کو چیک بھی نہیں کرتی تھیں' کجا کہ داخلے کی درخواست قبول یا رد کرنا۔

دوسرے ایڈمنز یہ کام کرتے تھے۔
دو دن سے وہ رونلڈ ویزلی چند آیات پوسٹ کرتا تھا۔ سورۃ النمل کی اور ان کے بارے میں اپنے "ریفلیکشن" لکھتا تھا۔ اسے کسی نے خاص توجہ نہیں دی تھی۔ دو چار لائکس آگئے' اور دو تین "سبحان اللہ' جزاک اللہ" لکھ کر لوگ آگے بڑھ گئے' مگر حنین نہیں بڑھ سکی۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔ بالکل ساکت و جامد۔
وہ آئی ڈی گویا خالی تھی۔ کچھ بھی نہ تھا اس میں۔ وہ اسے صرف گروپ میں پوسٹ کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ سورۃ النمل کی تقریباً" آدھی آیات اس نے لکھ ڈالی تھیں' پھر رک گیا تھا۔ شاید اس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ شاید وہ اب قرآن نہیں پڑھ رہا تھا۔ وہ اس کا ایک ایک انداز پہچانتی تھی۔ وہ اس کا بھائی تھا۔
حنین نے نم آنکھوں کے ساتھ اسکرین کو چھوا۔ اس نے پروفائل پکچر میں گلاب کا پھول لگا رکھا تھا جس کا سرخ خون بہہ رہا تھا۔ انسان جس بھی حالت میں ہو' قید ہو' یا آزاد ہو' وہ اپنی عادتیں نہیں چھوڑ سکتا' وہ بھی خود کو بیان کرنے کے انوکھے طریقے نہیں چھوڑ سکا تھا۔
سرخ خون گراتا گلاب۔ اس ایک تصویر نے ہر شے کی عکاسی کردی تھی۔
ایک دم اسکرین پہ ایک نمبر جلنے بجھنے لگا۔ میمونہ کی کال آرہی تھی۔ حنین نے آنکھیں صاف کر کے فون کان سے لگایا۔ وہ اس کی "نگہبان" تھی۔ اس کو وہ روز رپورٹ کرتی تھی کہ آج اس نے کتنی نمازیں پڑھیں اور ماہ کامل کی صبح سے ان کی تعداد پانچ ہی ہوتی تھی۔ کل کی بھی پانچ تھیں۔ اس نے بہت ادب سے پچھلے دن کی رپورٹ پیش کی۔
"اللہ تمہیں اپنی نماز کی حفاظت کرنے والی اور ان پہ دوام اختیار کرنے والی بنائے۔ آمین۔" میمونہ نے فوراً" سے دعا دی' پھر پوچھنے لگی۔ "اور تم اپنا قرآن کس وقت دہراتی ہو؟"
"جی؟" وہ بالکل دم بخود رہ گئی' پھر خشک لبوں پہ زبان پھیری۔ "میں حافظ قرآن نہیں ہوں' صرف چند سپارے حفظ کیے تھے۔"
"حنین! ہر مسلمان حافظ قرآن ہوتا ہے اگر اس نے ایک آیت بھی حفظ کر رکھی ہو۔ چاہے صرف سورۃ فاتحہ' چاہے آخری چند سورتیں۔ کچھ بھی اگر اس نے یاد کیا ہے' کبھی تو وہ اسے ساری زندگی "نبھانا" پڑے گا۔ تم "نبھا" رہی ہو؟"
وہ چپ ہو گئی۔ میمونہ چند لمحے اس کے سانسوں کی آواز سنتی رہی۔
"میں نے بہت سے مسلمان دیکھے ہیں جو قرآن یاد کر کے بھول جاتے ہیں۔ پھر ان کی زندگیاں جہنم بن جاتی ہیں۔ ذہنی توازن کھو دیتے ہیں' کچھ ذلیل و رسوا ہوتے ہیں' کچھ دوسروں کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ جہنم میں بھی ان کے سر کچلے جائیں گے۔ بڑے بڑے پتھر مار کر۔ لیکن اکثر مسلمانوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بھی حفاظ کی کیٹگری میں آگئے ہیں اگرچہ انہوں نے صرف بھی الناس اور الفلق ہی یاد کی ہو۔"
"تو پھر ایسے لوگ کیا کریں؟" وہ بے چینی سے بولی۔
"وہ دو باتیں ذہن میں پکی بٹھالیں۔ پہلی یہ کہ اگر انہیں لگتا ہے کہ قرآن کو دوبارہ یاد کیے بغیر ان کی نجات کی کوئی صورت ہے تو ایسا نہیں ہے۔ حرام ہے ان کے اوپر دنیا اور آخرت کا سارا سکون اور کامیابی جب تک وہ واپس اس قرآن کو یاد نہیں کریں گے۔ اور دوسری بات' اگر انہیں لگتا ہے کہ عمر بڑھنے اور مصروفیات کی زیادتی کے باعث وہ اب آکر قرآن حفظ نہیں کر سکتے تو وہ غلط ہیں۔ قرآن ستر سال کی عمر میں بھی حفظ کیا جا سکتا ہے اگر بندے کے دل میں اللہ کی خشیت ہو۔"
"مجھ سے اب نہیں ہو گا۔" اس نے خود ہی طے کر لیا تھا۔
"ہو گا نہیں حنین! کرنا پڑے گا۔ آہستہ آہستہ شروع کرو۔ اللہ کہتا ہے کہ نا کہ "اس کو یاد کروانا ہمارے ذمے ہے۔" اور یہ کہ "ہم اسے آپ کو ایسے پڑھادیں گے کہ پھر آپ نہیں بھولیں گے۔" تم

شروع کروگی دوبارہ حفظ کرنا اور اسے مکمل اللہ تعالی کروائے گا۔"

میمونہ بہت سلجھی ہوئی اچھی لڑکی تھی۔ سمجھ داری کی باتیں کرتی تھی۔ مگر اتنی اچھی باتیں کر لیتی ہوگی' حنہ کو پہلی دفعہ پتا چلا تھا۔ اس کے دل میں امید سی بندھی۔

"اوکے۔ میں کوشش کروں گی۔"

"اور کس وقت کروگی؟"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوئی۔

"وقت ہی تو اہم ہے۔ کیا تم نے نہیں پڑھا کہ "بے شک رات کا اٹھنا (تہجد میں اٹھنا) زیادہ شدید ہے نفس کو قابو کرنے کے لیے اور کلام پاک کو پڑھنے کے لیے۔ بے شک دن میں آپ کے لیے مصروفیات ہیں طویل۔"

"اسی لیے... قرآن فجر کے وقت ضرور پڑھنا چاہیے۔" "منہ اندھیرے۔"

"حفظ کا تو وقت وہی ہوتا ہے۔ ایک امام کا قول ہے کہ حفظ کا بہترین وقت تہجد کا ہے' مطالعے کے لیے صبح کا وقت' لکھنے کے لیے دن کا وقت اور بحث کے لیے شام کا وقت۔"

"اچھا۔" وہ متعجب ہوئی۔ پھر بولی۔ "اوکے۔ میں روز صبح فجر کے وقت اپنا قرآن دہراؤں گی۔"

"اور تمہیں یہ کس نے کہا ہے کہ قرآن صرف صفحے پہ ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کرکے دہرا لینے سے یاد ہوجاتا ہے؟" میمونہ نرمی سے سوال پوچھتی تھی ٹوکتی کم تھی' مگر حنین چپ سی ہوجاتی تھی۔

"پھر کیسے یاد ہوتا ہے؟"

"قرآن یاد ہوتا ہے کسی انسان کو روز سنانے سے' اور پکا ہوتا ہے نماز میں روز اللہ کو سنانے سے۔ خود سے خالی خولی دہرا لینے سے کچھ یاد نہیں ہوجاتا۔ تم یوں کرو' روز کا سبق اور پچھلا سبق مجھے فجر میں سنا دیا کرو۔" وہ دو چھوٹے بچوں کی ماں تھی' پھر بھی یوں کہہ رہی تھی گویا سبق سننا اس کے لیے مسئلہ ہی نہ ہو۔

"اوکے' میں نے آخری دس پارے کیے تھے یاد۔ پھر کل میں اکیسویں سپارے سے سناؤں گی۔" وہ بھی جانے کیوں پرجوش ہوگئی تھی۔

"اور حنین! جب حافظ قرآن اپنا قرآن بھول جاتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن اول پارے سے نہیں یاد کیا جاتا' آخر سے کیا جاتا ہے۔ تم کل مجھے صرف الناس اور الفلق سناؤ گی۔" وہ سارے فیصلے خود ہی کر رہی تھی' مگر اچھی بات ہے۔ کچھ باتوں کے لیے ہمیں خود پہ سختی کروانی پڑتی ہے۔

"اوکے' کل سے میں الناس سے شروع کروں گی۔" پھر ٹھہر کر بولی۔ "میمونہ باجی' ہوسکتا ہے میں... اصل میں میرا بھائی... وہ نہیں ہے اور میں پریشان رہتی ہوں تو کبھی ہوسکتا ہے سبق یاد نہ کرسکوں تو۔"

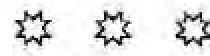
"تمہیں پتا ہے لوگ مجھ سے اکثر پوچھ لیتے ہیں... میں سائیکولوجسٹ ہوں نا' تو وہ اکثر پوچھتے ہیں کہ ہم نمازیں بھی پڑھتے ہیں' قرآن بھی' پھر ہماری حاجتیں کیوں نہیں پوری ہوتیں؟ دولت' اولاد' اچھا رشتہ' اچھی نوکری' عزت' یہ سب کیوں نہیں ملتا؟ میں کہتی ہوں' ان سب کے لیے قرآن اور نماز نہیں پڑھتے ہم۔ اور یہ سب نماز اور قرآن سے نہیں ملتا۔ یہ دعا سے ملتا ہے۔ دنیا کے ساڑھے سات ارب انسانوں کے پاس خواہشات کی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے' مگر قرآن آپ کو وہ سب نہیں دے گا۔ قرآن آپ کو وہ دے گا جس کے لیے آپ یہ سب چاہتے ہیں۔ سکون اور برکت۔ میں لوگوں سے کہتی ہوں' قرآن حفظ کرنا شروع کردیں' روز کی ایک آیت کریں' آپ سوچ نہیں سکتے' آپ کی زندگی کتنی بابرکت ہوجائے گی۔ حنین! تم حفظ شروع کرو' پہلے تو بڑوں کی زبردستی پہ کیا تھا تم نے حفظ' اب دل سے کروگی تو دیکھو گی کہ تمہارے گھر میں وہ برکت اور وہ نور آگیا ہے۔ جس کے لیے لوگ مال' اولاد' خوب صورتی' "اسٹیٹس" طاقت سب ہو کر بھی ترستے ہیں۔ تمہاری زندگی "بابرکت" ہوجائے گی۔ تم آنکھیں بند کرکے میری بات پہ یقین کرلو۔ میں تجربے سے کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔ "یعنی اب میں

پریشان نہیں ہوا کروں گی۔"

"ہوگی بھی تو قرآن تمہیں دلاسا دے دے گا۔"

اور یہ تسلی حنین کے لیے کافی تھی۔ ان گزرے چار دنوں میں پہلی دفعہ وہ خود کو پرسکون محسوس کرنے لگی تھی۔



خفا اگرچہ ہمیشہ ہوئے مگر اب کے
وہ برہمی ہے کہ ہم سے انہیں گلے بھی نہیں

وہ اسپتال جہاں میری کا بچہ مبینہ طور پہ داخل تھا کافی شاپ سے تیس پینتیس منٹ کی ڈرائیو پہ تھا۔ وہ اس سے ذرا دور ٹک ٹک سے اتر گیا تھا۔ نقشہ ذہن نشین کرکے نکلا تھا۔ سر پہ پی کیپ پہنے وہ محتاط نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتا چل رہا تھا۔ اسپتال پہاڑی پہ اونچائی کی طرف تھا۔ وہ سڑک کے بجائے دوسری طرف سے پہاڑی پہ چڑھنے لگا تھا۔ گو کہ وہ میری انجیو کے لیے فکر مند تھا مگر وہ محتاط بھی تھا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ دور چائے کے باغات سے آتی سوندھی مہک نے سر سبز پہاڑوں کو مزید سحر انگیز بنا دیا تھا۔ کہیں کہیں بادل گرجنے اور بجلی چمکنے کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ایسے میں وہ خاردار اور دشوار ڈھلان پہ اپنے جوگرز کی مدد سے چڑھتا جا رہا تھا۔ ذرا اونچائی پہ آکر اسے اسپتال کی عمارت دور سے دکھائی دینے لگی تھی۔ وہاں کچھ بھی غیر متوقع نہ لگتا تھا۔ معمول کا رش تھا۔ سب ٹھیک تھا۔

لیکن سعدی نے سر جھٹک دیا۔ اسے کامنی کی بات عمل کرنا تھا۔ انسان کو انسان کے لیے خطرے مول لینے ہوتے ہیں۔ اگر وہ آج نہیں گیا تو ساری عمر پچھتائے گا' اور پہلے زندگی میں پچھتاوے کم تھے جو مزید بوجھ اٹھاتا؟ کامنی نے بھی تو اس کے لیے خطرہ مول لیا تھا نا۔

اور یک دم کسی نے جیسے ٹھنڈی ٹھار برف سعدی کے اوپر گرا دی۔ ایک خیال نے اسے منجمد کر دیا۔ وہ بالکل ٹھہر گیا۔

"لیکن کامنی تو غلط تھی! وہ کوئی ناکام عاشق تو نہیں تھا۔ وہ تو جھوٹی کہانی تھی۔ وہ ایک قاتل تھا اور ان کو دھوکا دے رہا تھا۔" وہ ایک دم چونکا۔ کامنی نے غلط کیا تھا۔ وہ بھی غلط کر رہا تھا۔

ایک دم سے ساری تصویر اس کے اوپر واضح ہو گئی۔ کیبل نیٹ ورک میں سے کسی کو خرید کر ایک پٹی چلانا اور بار بار ایک تصویر دکھانا کیا مشکل تھا؟ فصیح جیسے لوگ تو ٹی وی چینلز کو خرید سکتے تھے' یہ سب تو بہت آسان تھا۔

وہ ایک دم تیزی سے پلٹا اور سبک قدموں سے ڈھلان اترنے لگا۔ تیز' مزید تیز۔ یہاں تک کہ اس کا سانس بے ترتیب ہونے لگا مگر رفتار بڑھتی گئی۔ یہ سب ایک پھندا تھا' وہ جان گیا تھا۔ اسے اب کوئی شک نہیں رہا تھا اور اب اسے جلد از جلد وہاں سے نکلنا تھا۔

وہ پہاڑی سے اتر کر سڑک پہ آگیا اور سر جھکائے تیز تیز چلنے لگا مگر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ مگر کوئی تھا۔ سعدی کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ وہ مزید تیز چلنے لگا۔ اس کی حساسیت اب پہلے سے کہیں تیز ہو چکی تھی۔ کوئی اس کے عقب میں تھا۔ فاصلے سے اس کا پیچھا کر رہا تھا مگر سعدی اس کو دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

جلد ہی بازار کا رش والا حصہ شروع ہو گیا۔ وہ اب تیزی سے لوگوں کے درمیان راستہ بناتا' تقریباً" بھاگنے لگا تھا۔ مگر کوئی مسلسل اس کے تعاقب میں تھا' سعدی یوسف کی چھٹی حس بار بار سرخ سگنل بجا رہی تھی۔

ایک گلی کا موڑ مڑ کر وہ ایک دم بھاگنے لگا۔ اندھا دھند۔ آگے پیچھے کے لوگوں کو ہاتھ سے پرے ہٹاتا' وہ بے قابو تنفس' اور سفید پڑتے چہرے کے ساتھ دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ دیکھ لیا گیا ہے' وہ پکڑ لیا گیا ہے' یہ خیال جان لیوا تھا۔

وہ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتا بھاگ رہا تھا' دفعتاً" اسے احساس ہوا کہ پیچھے اب کوئی نہیں ہے۔ وہ گلی میں تنہا تھا۔ شام ڈھلتی جا رہی تھی۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔

ایسے میں وہ رک کر پیچھے دیکھنے لگا۔ ارد گرد سکون تھا۔ سکوت۔ سب ٹھیک تھا۔ سرخ الارم بند ہو گیا تھا۔ اس کا تعاقب کرنے والا وہاں نہیں تھا۔

ایک گہرا سانس لے کر وہ واپس مڑا تو کسی نے زور سے اس کے منہ پہ مکا دے مارا۔ سعدی دہرا ہو کر نیچے گرا۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ پتھریلی سڑک پہ ہاتھ رکھ کر اس نے سر اٹھانا چاہا۔ تعاقب کرنے والے کے جوگرز اسے صاف نظر آرہے تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ پاتا' اس شخص نے یکے بعد دیگرے بوٹ اور مکے سے اسے دو تین ضربیں رسید کیں۔ چند لمحوں کے لیے سعدی یوسف کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

اسے اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھیں بند اور گردن ڈھلکی ہوئی ہے۔ اور کوئی اسے کندھوں سے گھسیٹتا ہوا لے کر جا رہا ہے۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ برس رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں پہ بادلوں سے برستا پانی پڑا تو ذہن کی تاریکی چھٹنے لگی۔ اس شخص نے سعدی کو درختوں کے ایک جھنڈ سے گزار کر کچی زمین اور گھاس پہ ایک طرف لا پھینکا تھا۔ سامنے ایک جھیل تھی' گھپ اندھیرے میں وہ جگہ کینڈی کی درجنوں جھیلوں کی طرح سنسان پڑی تھی۔ تکلیف کے باوجود سعدی نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے تیزی سے اٹھنا چاہا۔ مگر۔۔۔ جیب خالی تھی۔

"کیا تم اس پستول کو ڈھونڈ رہے ہو' سعدی یوسف؟" وہ جو گھٹنوں کے بل زمین پہ ہتھیلیاں رکھے اٹھنے لگا تھا ________ وہ بالکل ٹھہر گیا۔ منجمد ہو گیا۔ اور پھر اس نے شکست مان کے سر جھکا لیا۔ اسی طرح زمین پہ گرے ہوئے' جھکے ہوئے گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ وہ گویا ڈھے چکا تھا۔ وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔

"تو کیا لگا تھا تمہیں؟ میرے ساتھ یہ گیمز کھیل کر تم چھپ جاؤ گے؟ تمہیں لگا میں تمہیں ڈھونڈ نہیں سکوں گا۔" غصے سے بولتے ہوئے اس نے سعدی کے کندھے پہ بوٹ مارا۔

"تمہیں معلوم ہے میرے لیے کیبل نیٹ ورک پہ ایک خبر چلانا کتنا آسان تھا؟ تمہیں واقعی لگا میں تمہیں تمہارے بل سے نہیں نکال سکتا؟" وہ اس کے گرد چکر کاٹتے ہوئے کہہ رہا تھا' اور بات ختم کر کے اس نے زور سے اس کی ٹانگ پہ بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ سعدی کراہ کر رہ گیا۔ بارش اسی طرح ہلکی ہلکی برس رہی تھی۔

"پھر بھی مجھے لگا' تم نہیں آؤ گے۔ مجھے مزید خوار ہونا پڑے گا۔ مگر نہیں۔۔۔ میری انجیو اور اس کا بچہ تمہارے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ ان کے لیے تم آئے۔"

"میں کتنا خوار ہوا تمہاری تلاش میں اور تم؟ یہاں کینڈی میں چھپے بیٹھے ہو۔ تمہیں واقعی لگا کہ تم مجھ سے چھپ سکتے ہو؟" اس نے سعدی کو گردن سے پکڑ کر آگے کھینچا۔ "تمہیں لگا میں تمہارے پیچھے نہیں آؤں گا؟ تمہیں لگا تم یوں چھپ کر بیٹھ جاؤ گے اور سب صحیح ہو جائے گا؟ بزدل انسان۔"

سعدی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ آنکھیں موندے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"آٹھ ماہ۔۔۔ آٹھ ماہ میں نے۔۔۔ قید میں سوچا۔۔۔" سعدی نے نیم غنودگی سی آنکھیں کھول کر نقاہت سے سامنے افق پہ ڈوبتے سورج کو دیکھ کر کہنا چاہا۔ "کہ وہ لمحہ کیسا ہو گا۔ جب ہم ملیں گے۔ مجھے لگا تھا۔۔۔ آپ مجھے گلے سے لگائیں گے' مگر۔۔۔ مگر آپ تو مجھے مار رہے ہیں' فارس ماموں!"

اور یہ کہنے کے ساتھ سعدی نے بھیگی آنکھوں کا رخ پھیرا اور اسے دیکھا۔ جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جھیل کی طرف پشت کیے۔۔۔ اور سعدی کی طرف رخ کیے۔۔۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جینز کے اوپر بھوری جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ بال اسی طرح چھوٹے تھے اور ماتھے پہ بل تھے۔۔۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔۔۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں پہ رکھے' وہ سنہری آنکھوں میں شدید غصہ لیے اسے گھور رہا تھا۔ اندھیرے میں بھی اس کے چہرے کی برہمی صاف دکھائی دیتی تھی۔

وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔۔۔۔ تڑتڑ برستی بارش اس کو بھگو رہی تھی۔۔۔۔ اس کے خفا چہرے پہ پانی کے قطرے لڑھک رہے تھے۔

فارس غازی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کیوں؟" اس نے تکان سے فارس کا چہرہ دیکھ کر دہرایا۔ "آپ کیوں مجھے مار رہے ہیں؟"

"کیونکہ تم اسی قابل ہو۔"

یہ پہلی چوٹ تھی جو بری طرح سے لگی۔ سعدی نے شدید درد سے آنکھیں میچ لیں۔ پانی کے قطرے اس کے چہرے پہ مسلسل گر رہے تھے اور لبوں سے خون رسنے لگا تھا۔ بہت سا پانی آنکھوں میں بھی جمع ہو رہا تھا مگر ہر آنسو۔۔۔۔ اذیت کا آنسو نہیں ہوتا۔ نہ وہ خوشی کا ہوتا ہے' نہ دعاؤں کی قبولیت کا' نہ محبت کا' نہ شکوے کا۔ وہ بس آنسو ہوتا ہے اور اسے بہنا ہوتا ہے۔

"میں سمجھا۔" سعدی نے چہرہ جھکائے۔۔۔۔ آستین سے منہ رگڑا۔ "یہ فصیح ہو گا۔"

"وہ تمہیں مجھ سے زیادہ نہیں جانتا۔ جو اسے معلوم ہو' ہمارا یونیورسل رحم دل سعدی' کس بات پہ نکلے گا اپنے بل سے۔" طنزیہ سا وہ غرایا تھا۔ "میری انجیو۔ اور اس کا بیٹا۔" دونوں ہاتھ اٹھا کر اس نے "بہت ہو گیا" والے انداز میں کہا۔ "بس یہی دو اہم لوگ رہ گئے تھے تمہاری زندگی میں جو ان کے لیے خطرہ مول لینے کو تیار ہو گئے۔ اور تمہارا خاندان؟ تمہاری ماں' تمہارے بہن بھائی' وہ سب جو تمہاری ایک کال کے لیے ترس رہے تھے' ان کا کیا؟ ہاں؟"

بات کے اختتام پہ' فارس آگے آیا' اور اس کو گدی سے پکڑ کر سر کو نیچے جھکا کر گویا جھنجوڑا پھر جھٹکے سے اسے چھوڑا۔ سعدی نے جھکا سر نہیں اٹھایا۔ آنسو اس کے چہرے پہ لڑھک رہے تھے۔ بارش کے قطروں جیسے آنسو۔

"بزدل انسان۔" وہ اب اس کی جانب پشت کر کے اور جھیل کی طرف منہ کیے دور جا کھڑا ہوا تھا۔ وہ خفا تھا' وہ غصے میں تھا۔

"اگر کوئی چیز میں تمہیں بھیج سکتا ہوں تو کیا یہ نہیں جان سکتا کہ تم وہاں سے بھاگ گئے ہو؟ کیا ایک پیغام نہیں چھوڑ سکتے تھے تم میرے لیے؟ ہزار طریقے تھے پیغام دینے کے مگر نہیں۔" اس کی سنہری آنکھیں جو جھیل پر جمی تھیں' ان میں دکھ سا ابھرا۔ "تمہیں لگا' فارس تمہارے لیے کبھی نہیں آئے گا۔"

سعدی نے گیلی آنکھیں اور گیلا چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ پہلو میں گرے دائیں ہاتھ کی پشت پہ سعدی کا خون لگا تھا۔

"تمہیں مجھ سے امید ہی نہیں تھی کہ میں آؤں گا۔ تمہیں لگا ہی نہیں کہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ تم نے سوچا اگر ماموں آٹھ ماہ نہیں آیا تو اب کیا آئے گا؟ مگر جنگ وہ جیتتا ہے سعدی یوسف! جسے معلوم ہوتا ہے کہ کب لڑنا ہے اور کب نہیں لڑنا۔"

سعدی گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھا تھا۔ گیلی کیچڑ والی زمین پہ۔ اب آہستہ سے اٹھا۔ انگ انگ دکھ رہا تھا۔ مگر کراہ نہیں نکلی۔ ہر مار بری نہیں لگتی۔ کوئی اچھی بھی لگتی ہے۔ کوئی مارنے والا بھی اچھا لگتا ہے۔

"لیکن اگر تم میں اتنی عقل ہوتی تو میرے پاس آتے پہلے دن' مگر نہیں۔۔۔۔ تم کاردارز کے پاس چلے گئے۔ ان کا مقابلہ کرنے۔ تمہیں مجھ سے امید ہی نہیں تھی سعدی۔" وہ برہمی سے کہہ رہا تھا۔ سعدی قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹ سے خون ہنوز رس رہا تھا۔ وہ فارس کو دیکھ رہا تھا اور فارس ابرو بھینچے' ماتھے پہ بل لیے' سامنے جھیل پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"پہلے بھی تم نے یہی کیا' ہر چیز اکیلے کرنی چاہی۔ اور اب بھی تمہیں لگا کہ تم یوں۔"

سعدی آگے بڑھا اور اس کے گلے لگ کر' اس کے کندھے پہ اپنی آنکھیں رکھ کر۔۔۔۔ رونے لگا۔ چھوٹے بچوں کی طرح۔۔۔۔ آواز سے۔۔۔۔ سسکیوں سے۔۔۔۔ ہچکیوں سے۔۔۔۔

فارس کے الفاظ خود بخود ٹوٹ گئے۔ اس کے ماتھے کے بل ڈھیلے ہوئے۔ نگاہوں میں نرمی سی ابھری۔

غصے کا ابال ٹھنڈا ہوا۔ چند لمحے وہ اسی طرح کھڑا رہا پھر ہلکا سا اس کے کندھے کو تھپکا۔ "اچھا بس۔ ٹھیک ہے۔" آواز میں وہی سختی تھی۔ پھر چہرے پر دوبارہ برہمی طاری کرلی' پیشانی کی سلوٹیں واپس لے آیا' اور اسے شانوں سے پکڑ کر پرے کیا۔

"اچھا۔ اب دور ہٹو۔ میری بیوی پہلے ہی مجھ پہ شک کرتی ہے۔" ایسا کر کہتا وہ مڑ گیا' سعدی کو اس کی آواز گیلی لگی تھی' مگر اس نے فارس سے نظریں نہیں ملائیں۔ ملا نہیں سکا۔ بس سر جھکائے' اپنی آنکھیں رگڑنے لگا۔ آنسو ابھی تک امڈ امڈ کر آرہے تھے اور وہ کہیں دور... سندر بن کے کسی گھنے جنگل میں... بے خوف ہو کر... کسی درخت تلے بیٹھ کر... ڈھیر سارا رونا چاہتا تھا۔



آہ یہ ظالم تلخ حقیقت جتنے سفینے غرق ہوئے
اکثر اپنی موج میں ڈوبے' طوفان سے ٹکرائے کم

اس پُر تعیش ریسٹورنٹ کے ماحول کو مدھم زرد بتیوں نے پُرفسوں اور سحر انگیز بنا رکھا تھا۔ اس کارنر ٹیبل پہ رکھے اسٹینڈ میں کھڑی تینوں موم بتیاں روشن تھیں اور ان کے دونوں اطراف میں بیٹھے ہارون اور جواہرات ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کھانا ابھی تک نہیں آیا تھا مگر جواہرات یہاں کھانا کھانے نہیں آئی تھی۔

سلک کی سبز قمیص میں' بالوں کو سمیٹ کر چہرے کے دائیں طرف ڈالے' وہ گہرا میک اپ اور قیمتی نگینے پہنے ہوئے تھی۔ ہارون کا سوٹ گہرا نیلا تھا' اور سرمئی آنکھیں وہ کبھی جواہرات پہ ڈال لیتے کبھی اپنے فون پہ۔

"جو تمہاری مخالف کے ساتھ میں نے کروایا' اس پہ تم نے شکریہ نہیں کہا۔" مسکارے سے لدی آنکھوں سے اسے دیکھتی وہ گلہ کرنے لگی۔

"میں نے تم سے کچھ بھی کرنے کو نہیں کہا تھا۔"

جواہرات کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ آنکھوں میں بے چینی جھلکی۔ "مگر میں نے تمہارا انتقام لیا اس سے۔ اس نے تمہاری..."

"جب میں نے تم سے کہا ہی نہیں تو مجھے کیوں جتا رہی ہو؟ تم نے جو کیا اپنے لیے کیا۔" شانے اچکا کر انہوں نے گلاس سے گھونٹ بھرا۔ جواہرات پیچھے ہو کر بیٹھی' اور سینے پہ بازو لپیٹے' تیکھی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ "تمہارا رویہ بدلا بدلا سا ہے۔"

ہارون نے گلاس رکھ کر سنجیدہ چہرہ اس کی طرف موڑا۔

"تمہارا بیٹا میرے گھر میں گھس کر... مجھے ہی دھمکی دے کر جاتا ہے اور تم کہتی ہو کہ میرا رویہ بدل گیا ہے؟"

جواہرات کے تاثرات نرم پڑے' وہ ہلکا سا مسکرائی۔ "میں اس کے لیے معذرت کر چکی ہوں۔ میں نے ہاشم کا ساتھ صرف اس لیے دیا تاکہ اس کو شک نہ ہو کہ سعدی کو مارنے کے لیے گارڈ کو ہم نے بھیجا تھا۔"

"ہم نے نہیں' تم نے بھیجا تھا۔ میں ان معاملات میں شریک نہیں ہوں' صرف تمہارے لیے اپنے بندے پیش کر دیتا ہوں۔" انہوں نے سختی سے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔

"اچھا ٹھیک ہے' ہو گیا جو ہونا تھا۔" اس کا انداز بہلانے کا سا تھا۔ نرمی سے ان کے ہاتھ کو دبا کر بولی۔ "اب وہ سب ماضی میں رہ گیا۔ کیوں نہ ہم اب مستقبل کی بات کریں۔" ہارون نے ایک نظر اس کے انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ کو دیکھا جو ان کے ہاتھ پہ بہت لجاجت سے رکھا گیا تھا۔ پھر گہری سانس لے کر پیشانی کی سلوٹیں ذرا کم کیں۔

"مستقبل؟ تمہارے ساتھ مستقبل گزارنے کے لیے مجھے تمہارا اعتماد کمانا تھا جو تم بھیک میں کبھی نہیں دیا کرتیں۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے' تم نے ابھی تک میرا اعتماد نہیں کمایا؟" وہ مسکرا کر بولی تو ہارون ذرا سا مسکرائے۔

"کیا میں نے کما لیا ہے؟"

"جس طرح تم نے اپنے بندے میرے لیے پیش کیے' میرا ساتھ دیا' اس۔۔۔ درد سر جیسے مسئلے سے نپٹنے کے لیے۔۔۔ میرے دل میں تمہاری قدر مزید بڑھ گئی ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ ہم ماضی کی ساری تلخ یادیں بھلا کر اپنے مستقبل کو تعمیر کریں۔" زرد روشنیوں سے جگمگاتے پرُفسوں ماحول میں وہ آس پاس سجی محفل سے بے نیاز' بے خبر' آنکھیں ان کی آنکھوں پہ جمائے ہوئے تھی۔

"میں چاہتی ہوں ہارون' کہ میں اورنگ زیب کے دیے سارے زخموں کو اپنے دل سے کھرچ کر تمہارے ساتھ زندگی کا ایک نیا باب شروع کروں۔ ہم دونوں "ایک" بن کر اپنے Ambitions (عزائم) کے لیے جدوجہد کریں۔ دولت' طاقت' اپنی ہر شے کو اکٹھا کرلیں' اور مل کر اپنے طبقے پہ حکمرانی کریں۔" اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ہارون نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"اور تمہارے بیٹے؟"

"وہ کھلے ذہن کے ہیں۔ ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ہمیں اسی مہینے کوئی اناؤنسمنٹ کردینی چاہیے تاکہ ہمارے حلقہ احباب میں سب کو پتا چل جائے کہ میں۔۔۔" وہ جوش سے کہہ رہی تھی۔

"اور میرا اعتماد؟" انہوں نے سکون سے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔ ملکہ بولتے بولتے رکی۔ ہارون پہ جمی اس کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔

"میرا اعتماد جواہرات؟ تم نے اسے کمایا ہے کیا؟"

وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

"جو عورت اپنے محبوب بیٹے سے جھوٹ بولے' وہ اس قیدی جس کو اس نے اپنی امان میں لے رکھا تھا' مروانے کی سازش کرے' جو اپنے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے ابھی اپنے ایک کزن سے تعلق قائم رکھے' انکار مت کرنا کیونکہ بہت سے لوگ اس قصے سے بھی واقف ہیں۔ میں اس عورت پہ کیسے اعتبار کر سکتا ہوں؟"

وہ بالکل پتھر ہوئی' بنا پلک جھپکے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ گویا ریت کا مجسمہ ہو۔ ہاتھ لگانے سے ڈھے جائے گی۔

"تمہیں لگا تھا' میں تمہیں اپنا لوں گا؟" وہ اس کے قریب جھکے' اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "کیا تم وہ وقت بھول گئیں جب میں نے تمہیں پروپوز کیا تھا اور تم نے انکار کیا تھا؟ تم مجھے خود اس مقام تک لائی تھیں جہاں آکر میں تمہیں انگوٹھی پیش کرسکوں اور پھر جب میں نے یہ کیا تو تم نے مجھے دھتکار دیا۔" اس کے کان کے قریب وہ دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے اور وہ بالکل پتھر ہوئی سن رہی تھی۔

"میں نے تمہارا ساتھ تمہارا اعتماد کمانے کے لیے نہیں دیا' تمہیں اس مقام تک لانے کے لیے دیا تھا جہاں تم مجھے انگوٹھی پیش کرو اور میں تمہیں دھتکار سکوں۔ اور تمہارا احسان لوٹا سکوں۔ میں خوش ہوں کہ تم نے مجھے انکار کیا۔ تم جیسی ذہنی مریض عورت کے ساتھ زندگی گزارتا تو شاید میں بھی اورنگ زیب کی طرح قبر میں پڑا ہوتا۔ تمہیں لگا ہم دوست ہیں مگر بیگم جواہرات کاردار۔۔۔!" ان کی آواز سرگوشی سے بھی آہستہ تھی۔

"میں تم سے نفرت کرتا ہوں' اور بہت جلد بہت دلچسپی سے تمہاری اور تمہارے خاندان کی بربادی کا تماشا دیکھوں گا' کیونکہ تم نے میری سیاسی حریف کا اسکینڈل بنوا کر اسے اپنا دشمن تو بنایا ہی ہے' مگر اس کے علاوہ بھی تم اپنے ایسے دشمنوں سے ناواقف ہو جن میں تمہیں جیت کرنے کا ٹیلنٹ موجود ہے۔ جلد ہم تماشا دیکھیں گے لیڈی کاردار۔"

بولتے ہوئے اس کے ہاتھ کو جھٹک کر اپنا ہاتھ اٹھایا اور کوٹ کا بٹن بند کرتے اٹھ گئے۔ وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ' بے دم سی بیٹھی' ویران آنکھوں سے سامنے خلا میں دیکھ رہی تھی۔



شاید خوشی کا دور بھی آجائے اے عدم

غم بھی تو مل گئے ہیں تمنا کے بغیر

کینڈی میں بارش اب تھم چکی تھی۔ رات گہری سیاہ ہو چکی تھی اور شہر کی بتیاں جل اٹھی تھیں' لگتا تھا دور دور تک ٹمٹماتے سنہری دیے بکھرے ہوں۔ ایسے میں پہاڑی کے اوپر ایک مندر سا بنا تھا' جس کے باہر چوڑی اور طویل سیڑھیاں بنی تھیں۔ عبادت اور سیاحت کے لیے آئے لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہے تھے' کچھ کھڑے تصاویر بنوا رہے تھے' غرض ہر طرف گہما گہمی تھی۔ آخری سے اوپر والی سیڑھی پہ سعدی بیٹھا تھا اور ٹشو سے پھٹا ہوا' جمے خون والا ہونٹ دبا رہا تھا۔ فارس چلتا ہوا آیا اور آئس پیک اور مرہم کا شاپر اس کی طرف بڑھایا۔

"سوری' اس کے لیے۔" اپنے ہونٹوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ کس چوٹ کی بات کر رہا تھا۔ سعدی نے جل کر اسے دیکھا اور رکھائی سے اس کے ہاتھ سے شاپر لیا۔

"ہاں' صرف اس کے لیے سوری' باقی جو دو سو چھپتر چوٹیں لگائیں' ان کی تو خیر ہے' وہ تو آپ کے لیے لہو گرم رکھنے کے بہانے ہیں۔"

"بکواس نہ کرو۔" وہ خفگی سے سر جھٹک کر کہتا اس کے قریب سیڑھی پہ بیٹھا۔ سعدی بڑبڑا کر اپنے ہونٹوں پہ آئس پیک رکھنے لگا۔ گرم گرم زخم کو ٹھنڈک ملی۔ "اف!!"

"اور؟" فارس گھٹنوں پہ بازو رکھے' آگے کو ہو کر بیٹھا تھا' ایسے میں جب بولا تو آواز میں سختی کم تھی۔ "کیسے ہو؟"

سعدی کے زخم پہ زور سے برف لگی تھی' اندر تک کچھ پگھل کر جما تھا' جم کر پگھلا تھا۔ اس کی گردن کی گلٹی ڈوب کر ابھری۔ اس سوال کا جواب بہت طویل تھا' اور اس کا جواب بہت مختصر تھا۔

"زخمی ہوں۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے تلخی سے بولا تھا۔

"بالوں کو کیا کیا ہے؟"

"جو نظر آ رہا ہے۔"

"کہا نا سوری۔ مجھے غصہ تھا تم پہ بہت۔"

سعدی نے بڑبڑا کر سر جھٹکا۔ فارس اسی طرح گردن موڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ سر سے پاؤں تک۔

"کہاں رہ رہے ہو؟"

"ایک کافی شاپ ہے۔ اس کی مالکن کا اعتماد جیتا تو اس نے رہنے دیا مجھے۔" پھر نظروں کا زاویہ گھما کر فارس کو دیکھا۔

"آپ نے کیسے ڈھونڈا مجھے؟" کینڈی کا کیسے پتا چلا؟"

"حنین نے بتایا تھا۔ ندرت آپا کا اکاؤنٹ کھولتے تھے تم تو ان کو ای میل آ گئی کہ کینڈی سے کھل رہا ہے اکاؤنٹ۔ میری ایک پرانی کولیگ تھی' جس کے اریسٹ وارنٹ کی مخبری کرنے پہ مجھے سزا ملی تھی۔ وہ ایمبیسی میں ہوتی ہے۔ اس کا جاننے والا ایک نمونہ تھا۔ اس کے پاس گیا میں۔ اس نے تمہیں بہت ڈھونڈنے کی کوشش کی' مگر بے سود۔ پھر میں نے اسے کہا کہ انعامی رقم کی آدھی دوں گا اسے' تمہارا پوسٹر ڈارک سائٹس پہ ہر جگہ گھوم رہا ہے' وہاں سے رقم وہ دیکھ چکا تھا۔ مگر اسے یقین تھا میں نے تمہیں ڈھونڈ کر گولی مار دینی ہے۔ اور واللہ دل میرا ابھی یہی تھا' خیر۔"

اس نے سر جھٹکا اور بتانے لگا۔

"میں نے اس کو کہا کہ تمہیں باہر نکالنے کے لیے تمہاری مہربان طبیعت کو استعمال کرتے ہیں۔ (سعدی خفگی سے کچھ بڑبڑایا تھا جو اگر فارس کے کانوں تک پہنچ جاتا تو اس کا دوسرا ہونٹ بھی پھٹ جاتا تھا۔) ہم نے کیبل نیٹ ورک پہ خبر چلوائی۔ ذرا سا کام تھا۔ جانتا تھا تم نیوز ضرور دیکھتے ہو گے۔ اگر نیٹ استعمال کر سکتے ہو تو نیوز بھی دیکھ سکتے ہو۔ اور بس' تم میری کے بیٹے کو بچانے فوراً" آ گئے۔" ساتھ ہی برہمی سے اسے دیکھا۔ "کم عقل!"

سعدی خاموشی سے برف کا پیک گال پہ رکھ کر دبانے لگا۔ فارس نے گہری سانس لی۔ "پوچھا تو نہیں ہے تم نے مگر پھر بھی بتا دیتا ہوں کہ تمہارے گھر والے کیسے ہیں۔"

فارس سامنے دیکھتے ہوئے ذرا نرمی سے کہنے لگا۔

"تمہاری امی ٹھیک ہیں، صحت بھی ٹھیک ہے، ریسٹورانٹ جاتی ہیں، پہلے ہم انیکسی میں رہتے تھے، پھر میں نے وہ اس بوڑھی جادوگرنی کو بیچ دی، اور ہم تمہارے پرانے گھر کے قریبی علاقے میں آگئے تمہارے بڑے ابا پہلے سے زیادہ ضعیف لگتے ہیں مگر اندر سے پہلے سے زیادہ مضبوط ہوگئے ہیں اور زمر..." سامنے ٹہلتے دیکھتے فارس کی سنہری آنکھوں میں کرچیاں سی ابھریں۔

"زمر ہمیشہ کی طرح "زمر" ہے، مگر تمہارے لیے وہ بہت.... بہت کام کرتی ہے۔ حنین.... (سعدی نے اس نام پہ پہلو بدلا اور زور سے برف ہونٹ پہ دبائی۔) وقت کے ساتھ بہت مثبت ہوتی جارہی ہے۔ زمر اور اس کی دوستی ہوگئی ہے۔ سیم بھی اب بہن سے نہیں لڑتا۔ دونوں اکثر ساتھ آتے جاتے ہیں۔ سیم کے اسکول میں...."

"آپ کیسے ہیں؟" اس نے سنجیدگی سے فارس کو دیکھ کر بات کاٹی تو وہ ٹھہر گیا۔ منجمد ہوا۔ لاجواب ہوا۔ چہرہ موڑ کر سعدی پہ نظریں جمائیں۔

"میں؟" ہلکے سے کندھے اچکائے۔ "ٹھیک ہوں۔"

"اور میں سعدی ہوں" وہ زخمی سا مسکرایا۔ اتنے عرصے میں پہلی بار وہ مسکرایا۔ "کل بھی اپنے گھر والوں کی آنکھوں سے ان کے دل کا حال پڑھ لیتا تھا، آج بھی پڑھ سکتا ہوں۔"

"مجھے کیا ہونا ہے سعدی؟"

"آپ بھی زخمی ہیں۔" وہ اس کے چہرے کو دیکھتا گویا پڑھ کر بتا رہا تھا۔ "اندر تک زخمی ہیں۔ فرسٹریٹڈ ہیں۔ کرب مسلسل میں ہیں۔ لوگوں سے خفا ہیں۔ دکھی ہیں۔ مگر جو اہداف آپ نے زندگی میں طے کر لیے ہیں، ان کی طرف جانے کی تگ و دو میں لگے ہیں۔ مجھ سے مل کر آپ کے چہرے پہ خوشی بھی ہے اور سکون بھی، مگر ٹھہراؤ، نہیں ہے کسی احساس میں۔ جیسے یہ آپ کا صرف پہلا ہدف تھا، آپ مجھے واپس لے جانا چاہتے ہیں اور پھر اپنے اگلے ہدف میں مصروف ہو جانا چاہتے ہیں۔ اب بھی آپ ذہن میں لائحہ عمل طے کر رہے ہیں مگر یہ سب کر کے آپ اندر سے تھک چکے ہیں.... اور شاید...." اس نے آنکھیں چندھی کر کے فارس کی آنکھوں کو غور سے پڑھا۔ "شاید مایوس بھی...."

فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا، اس کے چہرے پہ کوئی احساس نہ تھا اور اس کے چہرے پہ سارے احساس تھے۔ گردن کی گلٹی بھی ڈوب کر ابھری تھی۔ آنکھوں میں بے بسی کے سائے تھے اور ان میں کہیں دور امید کے ٹمٹماتے دیے بھی تھے۔ وہ امید اور مایوسی کے درمیان کہیں معلق تھا، شاید اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں کھو چکا ہے۔

"سعدی!" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دھیرے سے بولا۔ "ایک بات میں تمہیں بتا نہیں سکا۔ تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے گھر میں ایک حادثہ ہوا ہے۔"

سعدی ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ آنکھوں میں بے یقینی اور خوف لیے اس نے بے قراری سے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"تمہیں اپنا دل بڑا کر کے سننا ہوگا۔ جو خبر میں تمہیں دینے جا رہا ہوں، وہ تمہیں اندر تک ہلا دے گی۔ تمہارے گھر کے ایک فرد نے بہت فاش غلطی کر دی ہے۔ جس کا خمیازہ اسے ساری زندگی بھگتنا پڑے گا۔"

"مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟" وہ تیزی سے بولا۔ دل لرز رہا تھا۔ (حنین؟) فارس نے ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"صداقت نے شادی کر لی ہے، وہ بھی ایک حسینہ سے۔"

ایک لمحے کو سعدی بالکل ساکت سا اسے دیکھے گیا، اور پھر ہنس پڑا۔ دل کھول کر۔ گردن پیچھے پھینک کر وہ ہنستا جا رہا تھا۔ فارس بھی سر جھکائے ہنسنے لگا تھا۔ ارد گرد گزرتے لوگوں نے مڑ مڑ کر ان دونوں کو دیکھا تھا، وہ دونوں بارش کے باعث ابھی تک گیلے کپڑوں میں بیٹھے

تھے، کپڑوں پہ کیچڑ بھی لگی تھی اور پھر بھی وہ ہنستے جارہے تھے۔

دفعتاً فارس کا فون بجا تو اس نے نکال کر دیکھا۔ پھر میسج پڑھ کر واپس جیب میں ڈال دیا۔

"کون ہے؟"

"اسی نمونے کا میسج تھا۔ آبدار کا نمبر دے کر اسے کہا تھا کہ اس کی لوکیشن پتا کرو، وہ کہہ رہا ہے کہ نمبر ابھی تک آن نہیں ہوا۔ اور اپنے پیسے مانگ رہا ہے۔"

"تو پیسے دیں گے آپ؟" سعدی نے حیرت سے پوچھا۔

"میرے باپ کی فیکٹریاں لگی ہیں جو میں پیسے دوں گا؟" وہ بگڑ کر بولا۔ سعدی مسکرا دیا۔ "تو اسے کیا کہا؟"

"یہی کہ نہیں دیتا، بے شک پولیس کے پاس چلے جاؤ۔" اور وہ دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنس دیے۔ پھر فارس اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو آؤ سعدی، میں تمہیں کھانا کھلاتا ہوں۔" اس کا کندھا تھپک کر وہ بولا تھا۔ (اف۔ اسی جگہ جہاں ٹھوکر ماری تھی۔)

"بہت شکریہ۔ جو پہلے کھلایا تھا اس سے میرا پیٹ بھر چکا ہے۔" وہ جل کر کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ فارس نے ہنس کر سر جھٹکا اور زینہ اترنے لگا۔

"اور یہ آبدار کا کیا قصہ ہے؟ پہلے اس کے ذریعے مجھے پیغام بھجواتے رہے، اب اس کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ کر کیا رہی ہے آپ کے ساتھ؟" مشکوک نظروں سے اسے دیکھا، وہ اس کے ساتھ زینے اتر رہا تھا۔

"زیادہ میرا دماغ خراب نہ کرو ایسے مجھے دیکھ کر، بھتیجے تم اسی کے ہو آخر۔۔۔"

وہ دونوں اب دور جارہے تھے اور ان کی آوازیں مدھم ہوتی جارہی تھیں۔



میرے قاتل کو پکارو کہ میں زندہ ہوں ابھی
پھر سے مقتل کو سنوارو کہ میں زندہ ہوں ابھی

صبح اپنے ساتھ ڈھیروں سرد ہوائیں لیے نمودار ہوئی تھی۔ دھند بڑھ گئی تھی۔ سورج چھپ گیا تھا۔ سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے کی کھڑکی سے اندر جھانکو تو ایک سنگل بیڈ رکھا تھا، اس پہ گلابی بیڈ کور بچھا تھا اور حنین اکڑوں بیٹھی، سر پہ دوپٹا لیے فون کان پہ لگائے سنا رہی تھی۔ "ویل لکل ھمزۃ لمزہ۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔" رک کر سوچا۔ آنکھیں میچ کر۔

"الذی جمع مالا وعددہ۔" دوسری طرف میمونہ نے نرمی سے بتایا تھا۔ "یہ تم سے کل بھی غلطی ہوئی تھی حنہ۔"

"حالانکہ جب میں نے یاد کیا تھا تب ٹھیک یاد تھا۔" وہ روہانسی ہوئی۔ ایک تو کچھ دن سے اس کی گردن (مسلسل موبائل اور کمپیوٹر اسکرین پہ چہرہ جھکانے کے باعث) شدید درد کرنے لگی تھی۔ زیتون کے تیل کی مالش، پٹھوں کی سوجن کم کرنے والی کریم اور گردن کی ایکسرسائز، سب کر کے دیکھ لیا، مگر فرق ندارد۔ امی کی ایک کزن ڈاکٹر سے بھی پوچھا تو انہوں نے کہا کہ گردن میں کالر پہنا کرو۔ اور گردن کم جھکایا کرو۔ یہ حفظ سے پہلے کی بات ہے۔ اب حفظ شروع کرنے کے بعد گردن مزید جھکانی پڑتی قرآن پڑھتے وقت۔ (یعنی گردن کے پٹھے اب مزید خراب ہوں گے) مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے محسوس کیا تھا کہ بلا مبالغہ ہر روز اسے کوئی چھوٹی موٹی چوٹ لگ جاتی تھی۔ کبھی وہ بیڈ کے کنارے سے ٹکرا جاتی، کبھی پاؤں رپٹ جاتا اور گھٹنا چھل جاتا۔ کبھی بخار، کبھی آدھے سر کا درد۔ اف، وہ کہاں جائے؟

ادھر میمونہ کہہ رہی تھی۔ "جو بھی حفظ کرنا ہو پہلے اسے دیکھ کر دس دفعہ پڑھا کرو۔ ہر آیت یاد کرنے کے بعد اسے پچھلی تمام آیات سے ملا کر دہراؤ۔ اور سنو! قرآن نیچے رکھ کر گردن جھکا کر نہ یاد کیا کرو۔ انسانی دماغ وہ الفاظ صحیح سے حفظ نہیں کر پاتا جن کے لیے گردن جھکائی جائے۔ صرف وہی یاد رہتا ہے جو اس کو آئی لیول پہ نظر آتا ہے، یعنی قرآن ہو یا کورس کی کتاب کارٹا لگانا ہو، کتاب کو اٹھا کر چہرے کے برابر لا کر یاد کیا کرو۔"

میمونہ کے پاس ان گنت ٹوٹکے ہوتے تھے جو وہ وقتاً "فوقتاً" بتاتی رہتی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد حنہ نے سوچا۔ کیا حفظ سے کچھ بدلا تھا؟ سوائے صبح جلد اٹھنے کے (جس سے دل میں ہلکی سی خود پسندی بھی جاگی تھی کہ اب تو میں اچھی ہو رہی ہوں۔) کوئی برکت' نور' وغیرہ؟ مگر ابھی وہ کوئی خاص اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی۔ دفعتاً" چوکھٹ میں زمر نظر آئی۔ گھنگھریالے بالوں کی پونی باندھے' ناک میں سونے کی لونگ پہنے' وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"میں شیرو کے آفس جا رہی ہوں۔ اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔"

حنین چھلانگ مار کر نیچے اتری اور بک شیلف پہ رکھی فلیش ڈرائیو اٹھا کر زمر کو دی۔ "یہ صرف ہاشم کے لیپ ٹاپ میں لگا دیں' اور۔۔۔" وہ جوش سے سمجھا رہی تھی اور زمر غور سے فلیش ڈرائیو کو دیکھتی سن رہی تھی۔

چند کلو میٹر کے فاصلے پہ واقع قصر کاردار کو بھی سرمئی دھند نے اپنے پروں تلے دبا رکھا تھا۔ لاؤنج میں ملازموں کی گہما گہمی تھی مگر ڈائننگ ہال خالی تھا۔ عرصہ ہوا' وہ تینوں اکٹھے بیٹھ کر ناشتا کرنا چھوڑ چکے تھے۔ ہاشم صبح سویرے آفس جا چکا تھا۔ نوشیرواں اپنے کمرے میں تیار ہو رہا تھا اور جواہرات۔۔۔ اس کا کمرہ خالی تھا۔ بیڈ پہ بیڈ کور آدھا زمین پہ گرا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ پرفیومز کی ٹوٹی بوتلیں بکھری تھیں۔ کل رات کے پہنے جوتے ادھر ادھر پڑے دکھائی دیتے تھے۔ رات والا زیور بھی گویا نوچ کر اتار پھینکا پڑا تھا۔ ایک دیوار پر' پرفیوم کی شیشی کے مارے جانے کا نشان بھی تھا اور کمرہ بے حد معطر تھا۔

باتھ روم کے آدھی دیوار پہ لگے آئینے کے سامنے کھڑی جواہرات' سرخ بھیگی آنکھوں سے اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ سلیولیس نائٹی میں اس کے بازوؤں کی جھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ بکھرے بال' رات کا آدھا مٹا' آدھا موجود میک اپ۔ وہ بیمار اور بوڑھی لگنے لگی تھی۔ اس کا دل بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس نے ٹونٹی تلے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر رکھا۔ پانی کسی بھیک کی طرح کشکول میں گرنے لگا۔ چلو بھر کر اس نے منہ پہ پھینکا اور پھر پھینکتی گئی۔ یہاں تک کہ چہرہ دھل گیا۔ پھر تولیے سے منہ خشک کر کے خود کو آئینے میں دیکھا۔ اب آنکھیں خشک تھیں۔

"مجھے زوال کبھی نہیں آئے گا۔ میں آج بھی دولت مند' طاقت ور اور خوب صورت ہوں۔ کیا سمجھتا ہے وہ خود کو؟" شعلہ بار نظروں سے آئینے میں دیکھتی' وہ کہہ رہی تھی۔ "میں ہار مان جاؤں گی؟ ہرگز نہیں۔ جب میں نے اورنگ زیب کے آگے ہار نہیں مانی تو تمہارے سامنے کیوں؟"

آنکھیں رگڑ کر ایک عزم سے خود کو دیکھا۔ "میں دوبارہ کھڑی ہوں گی۔ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر۔"

اور جب وہ باہر آئی تو اپنے ڈاکٹر کا نمبر ملا کر کہہ رہی تھی۔

"میری ٹھوڑی کے نیچے سے اسکن لٹکنے لگی ہے' اور میں سوچ رہی ہوں ہونٹوں کے گرد لاف لائنز میں فلر۔۔۔"

دو گھنٹے بعد وہ بال کرل کر کے' براق سفید بلاؤز میں ملبوس' سرخ لپ اسٹک لگائے' مسکرا کر پورے اعتماد سے آفس کی راہداری میں چلتی جا رہی تھی۔ ارد گرد موجود لوگوں کے سلام کا مسکرا کر جواب دیتی۔ گردن کا سریا واپس آ گیا تھا مگر دل بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کو جوان رکھنے کا کوئی علاج نہ تھا اس کے پاس۔

نوشیرواں کے آفس کا دروازہ اس نے کھولا تو وہ آفس ٹیبل کے پیچھے اپنی کرسی پہ بیٹھا نظر آیا۔ جواہرات مسکرائی اور دروازہ پورا کھول دیا۔ پھر مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ شیرو کے سامنے کرسی پہ سیاہ کوٹ والی لڑکی کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ بھورے گھنگھریالے بالوں کی اونچی پونی۔۔۔ جواہرات اندر تک سلگ گئی۔ بے اختیار ہاتھ اپنے مصنوعی گھونگھر تک گیا۔

"ممی!" شیرو نے پکارا تو زمر نے گردن موڑ کر دیکھا اور مسکرائی۔

"گڈ مارننگ مسز کاردار!" پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور شیرو سے بولی۔ (جو تذبذب کا شکار لگتا تھا۔) "اپنی ممی کے ساتھ نرمی سے بات کیجیے گا نوشیرواں ورنہ آپ اپنے والد کے آگے جواب دہ ہوں گے۔" اور قدم قدم چلتی چوکھٹ میں کھڑی جواہرات تک آئی' جو سلگتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرے کلائنٹ کے ساتھ نرمی سے بات کیجیے گا ورنہ آپ میرے آگے جواب دہ ہوں گی۔" دھیرے سے کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ اور جواہرات سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ تن فن کرتی آگے کو آئی۔

"تو اب تم دشمنوں کے ساتھ مل گئے ہو؟"

"وہ میری وکیل ہیں اور جیسے وقت پڑنے پہ آپ لوگ ہارون عبید کو دوست بنا لیتے ہیں حالانکہ ڈیڈ اسے کتنا ناپسند کرتے تھے' ایسے ہی میں مسز زمر کو اپنا وکیل بنا سکتا ہوں۔"

"میں تمہاری زبان دیکھ رہی ہوں نوشیرواں کاردار۔" جواہرات نے غصے میں زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔

"کہا نا آپ صرف اپنی مصروفیات دیکھیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور برہمی سے بولا۔ جواہرات سُن ہو گئی۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

"میری مصروفیات صرف میرے بیٹے ہیں' شیرو!" اس کا لہجہ کانپا۔

"بے کار باتیں مت کریں۔ جب آپ اپنے ایک بیٹے سے دوسرے کو پٹوانے میں مصروف نہیں ہوتیں تو ریسٹورنٹس میں ہارون عبید کے ساتھ ڈنر کر رہی ہوتی ہیں۔ میرے دوست نے دیکھا تھا آپ کو کل رات ہاں۔" وہ کوفت سے بولا تھا۔

"اس سے آگے ایک لفظ نہ بولنا۔" سرخ چہرے کے ساتھ اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔ "جس عورت کی باتوں میں آ کر تم اپنی ماں اور بھائی سے دور جا رہے ہو' اس کو یہ نہیں بتایا تم نے کہ اس کے بھتیجے کو تین گولیاں بھی تم نے ماری تھیں؟"

نوشیرواں کے چہرے پہ زلزلے کے آثار نمایاں ہوئے۔ بہت سے سائے اس کی آنکھوں کے آگے لہرائے۔ وہ آگے ہوا اور غرایا۔ "وہ اسی قابل تھا! سنا آپ نے؟ میں نے جو کیا' ٹھیک کیا۔ رہیں مسز زمر تو ان سے میرا تعلق مختلف نوعیت کا ہے۔ وہ ایک اچھی خاتون ہیں۔"

جواہرات نے طیش میں ہاتھ مار کر میز پہ رکھے پین اسٹینڈ اور فائلز گرا دیں۔

"جو عورت کسی اولاد کو اس کی ماں سے دور رکھنے کی سازش کرے' وہ conspirator (مکر کرنے والی) ہوتی ہے' اچھی نہیں۔"

"اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ میں نے تو سعدی کو مارا تھا' قید میں تو آپ لوگوں نے رکھا ہوا ہے اسے؟" وہ تلخی سے بولا تھا۔

"اوہ!" جواہرات کے ابرو اٹھے' پھر لبوں پہ تلخ مسکراہٹ در آئی' چند گہرے سانس لیے اس نے۔ "نوشیرواں کاردار! خود کو اپ ڈیٹ کر لو۔ سعدی یوسف اب قید میں نہیں ہے۔ وہ بھاگ چکا ہے۔ اور بھاگنے سے پہلے وہ ایک گارڈ کو قتل بھی کر چکا ہے۔ اس کے پاس اسلحہ بھی ہے اور دماغ بھی۔ وہ تمہارے خون کے لیے آئے گا اور تم تو وہ ہو جس سے ایک قتل بھی ٹھیک سے نہیں ہوا۔ سو اب بھی وقت ہے' اپنے بھائی اور ماں سے بنا لو' ورنہ سعدی کا مقابلہ اکیلے کرو۔"

اور ایک شعلہ بار نظر اس پہ ڈالتی پلٹ گئی۔ نوشیرواں بالکل سُن' سفید چہرہ لیے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ سیٹ پر ڈھے سا گیا اور نم ہوتی پیشانی کو آستین سے رگڑ کر صاف کیا۔

"سعدی قاتل بن گیا ہے؟ اس نے قتل کر دیا ہے۔ اس کے پاس اسلحہ ہے۔" وہ بالکل گم صم سا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دیکھے تو ان میں سرخ پانی جمع تھا۔ بے اختیار اسے ابکائی آئی تھی۔ وہ تیزی سے ڈسٹ بن پہ جھکا تھا۔ دل میں بہت سے آنسو بھی گرے تھے۔ احساس جرم زیادہ شدید تھا' یا صدمہ ناپنے کا کوئی پیمانہ نہ تھا۔

نہ تجھ کو مات ہوئی ہے نہ مجھ کو مات ہوئی
سو اب کے دونوں ہی چالیں بدل کے دیکھتے ہیں

جواہرات کو لفٹ کی طرف جاتے دیکھ کر زمر اٹھی اور ہاشم کے آفس کی طرف آئی۔ باہر بیٹھی سیکرٹری پریشانی کے عالم میں فون پہ مصروف تھی۔ زمر نے اسے نظرانداز کر کے دروازہ کھولا۔ ہاشم اسی طرح بیٹھا کام کر رہا تھا۔ آہٹ پہ نظروں کا رخ پھیرا تو ذرا چونکا۔ چوکھٹ میں گھنگھریالے بالوں کی اونچی پونی والی زمر کھڑی تھی۔ مسکرا کر اس نے دروازے پہ دستک دی۔

ہاشم عینک اتار کر اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرا کر بولا۔ "مسز زمر! تو کیا نوشیرواں نے....."

"میں زمر کی حیثیت سے آئی ہوں، وکیل کی حیثیت سے نہیں۔" وہ قدم قدم چلتی آگے آئی اور میز سے ذرا فاصلے پہ ٹھہر گئی۔

"ایک وقت تھا جب آپ میرے آفس آیا کرتے تھے، بنا پوچھے میری چائے لے لیتے تھے، انتہائی ناپسندیدہ باتیں کرنے کے بعد اٹھ کر کہتے تھے، ہم دونوں "ٹھیک" ہیں نا؟"

ہاشم ہلکا سا مسکرایا۔ "ناسٹلجیا۔"

"سو اب میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں، کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ ٹھیک ہیں؟" اس پہ نگاہیں جمائے وہ نرمی سے پوچھ رہی تھی۔ ہاشم کرسی کی طرف اشارہ کر تا واپس بیٹھا اور مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"آپ کو میرے بھائی نے اپروچ کیا اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

"آپ کو میری بھتیجی نے کالج بلایا تھا اور آپ نے بھی مجھے نہیں بتایا تھا۔ جیسے وہ اٹارنی کلائنٹ پریولیج تھا، ویسے ہی یہ بھی پریولیج کا حصہ ہے۔"

وہ کرسی پہ بیٹھی اور پرس اپنے پہلو میں رکھ لیا۔ ہاتھ پرس کے قریب ہی تھا۔ زپ کے اندر سامنے ہی وہ فلیش رکھی تھی۔

"عذر قبول کیا۔ چائے لیں گی یا کافی؟"

"صرف یہ تسلی کہ آپ مجھے قصور وار نہیں ٹھہراتے شیرو اور اپنے معاملے میں۔"

"ہم بھائی ہیں مسز زمر! اور ہم کل کو پھر سے ٹھیک ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات مجھ سے چھپا کر، علیشا کو بلا کر، میری پیٹھ کے پیچھے یہ سب کر کے آپ نے اپنی اچھائی کو داغ دار کر دیا ہے۔ میں چھپا سکتا ہوں، کیونکہ میں برا ہوں، لیکن آپ تو اچھی تھیں اور جب اچھے لوگ برے کام کریں، برے نہ سہی، مشکوک کام کریں، Grey کام کریں، تو میرے جیسے برے لوگوں کا یقین بھی اچھائی سے اٹھ جاتا ہے۔ ہم اچھائی کے راستے پہ چلنے سے پہلے رک کر سوچنے لگتے ہیں۔" ٹیک لگا کر بیٹھا، مسکرا کر وہ کہہ رہا تھا۔ زمر نے گھٹنوں کے گرد دونوں ہاتھ ملا کر رکھے، اسی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

"اور برے لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ توبہ نہ کرنے اور اچھائی کی طرف نہ پلٹنے جیسی خالصتاً اپنی کمزوریوں کے لیے بھی دوسروں کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔"

ہاشم دھیرے سے ہنس دیا۔ اسے اس بات نے محظوظ کیا تھا۔ تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ "او کے، اب ہم ٹھیک ہیں۔"

اسی اثناء میں دروازہ کھلا اور بوکھلائی ہوئی حلیمہ اندر داخل ہوئی۔

"سر! آپ کا فون آف ہے اور دوسرا فون آپ نے ہیلڈ کر رکھا ہے۔" وہ پریشانی سے کہہ رہی تھی۔ زمر مڑ کر اسے دیکھنے لگی اور ہاشم ابرو بھینچ کر ذرا آگے کو ہوا۔

"آپ نے کالز فارورڈ کرنے سے بھی منع کیا تھا، مگر.... بری خبر ہے۔" بولنے کے ساتھ اس نے میز پہ پڑا ریموٹ اٹھایا اور مڑ کر دیوار پر نصب ایل سی ڈی کی جانب اٹھا کر بٹن دبایا۔ اسکرین روشن ہوئی۔ حلیمہ نے دو چار مزید بٹن دبائے اور ایک نیوز چینل سامنے نظر آیا۔ اس پہ چلتی پٹی دیکھ کر ہاشم بے اختیار اٹھا۔ چہرہ سفید پڑا۔ سہارے کے لیے میز کے کنارے کو

مضبوطی سے تھاما۔

"سر! کالز پہ کالز آرہی ہیں' نیوز میں بھی آگیا ہے۔ ہمارے پاور پلانٹ کی مرکزی مشینری میں بلاسٹ ہوا ہے۔ بڑے پیمانے پہ explosives (دھماکہ خیز مواد) استعمال کیا گیا ہے۔ تیل کو آگ لگ گئی ہے اور اب یہ آگ تب ہی بجھے گی جب ہمارا پلانٹ ناکارہ ہو چکا ہو گا۔"

زمر بھی ساتھ ہی کھڑی ہوئی۔ وہ بار بار ہاشم کا چہرہ دیکھتی' پھر حلیمہ کو کہتی' "بس کریں' خاموش ہو جائیں۔"

"پلانٹ اب نئے سرے سے اسٹارٹ کرنا ہو گا۔ ایک بند ہوئے پلانٹ کو دوبارہ شروع کرنے کے لیے ... اربوں روپے کی ضرورت ہوتی ہے' اوہ سر' میں تو ..."

"حلیمہ!" زمر غصے سے اس کی طرف مڑی۔ "شٹ اپ!"

حلیمہ دم بخود اسے دیکھنے لگی۔ اب وہ ہاشم کی طرف گھومی۔ وہ ابھی تک ششدر کھڑا' اسکرین پہ چلتے مناظر دیکھ رہا تھا۔ صرف ایک گھنٹے کے لیے وہ دنیا سے کٹ کر بیٹھا تھا اور یہ سب ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا' ماتھے پہ پسینہ آرہا تھا۔ وہ میز کے کنارے کو پکڑے' دو قدم آگے بڑھا پھر فون اٹھایا۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

"فون رکھیں ہاشم۔" زمر نے اس سے ریسیور لے کر واپس رکھا۔ "اور پلیز آرام سے بیٹھ جائیں۔" وہ فکر مندی سے بولی۔

وارث غازی کی جھومتی ہوئی لاش ... وہ اور زرتاشہ ایک ریسٹورنٹ میں کھڑی تھیں ... سعدی کی زخمی چہرے والی تصاویر ... ہر شے پس منظر میں چلی گئی۔ اگر کچھ رہ گیا تو صرف ایک احساس۔ انسانیت۔

ہاشم نہیں بیٹھا۔ وہ شل سا کھڑا رہا۔ چہرہ جھکائے' وقفے وقفے سے نفی میں سر ہلاتا۔

"ہاشم! آپ بیٹھ جائیں۔" اس نے نرمی سے کہا۔ ہاشم نے سرخ ہوتی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "وہ گیٹ آؤٹ۔" دروازے کی طرف ہاتھ بلند کیا۔ "جائیں یہاں سے۔" حلیمہ جلدی سے باہر بھاگ گئی۔ زمر نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے' پھر بند کر لیے۔ پرس اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ باہر نکل کر وہ چند قدم آگے گئی۔ پھر رکی۔ نفی میں سر ہلایا۔ اور واپس ہاشم کے آفس کی طرف آئی۔

آفس خالی تھا۔ میز کے پیچھے اب ہاشم نہیں تھا۔ زمر کی آنکھوں میں تحیر ابھرا' اور پھر وہ تیزی سے آگے آئی تو دیکھا ...

وہ اپنی کرسی کے قریب فرش پہ گرا ہوا تھا' اس کا ہاتھ سینے کو مسل رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ وہ تکلیف میں تھا' اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

"ایمبولینس بلاؤ ... گاڑی نکلواؤ ..." وہ چلا کر حلیمہ سے بولی تھی جو باہر کھڑی تھی۔ "ہاشم کو ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے۔ جلدی کرو' جاؤ۔" اور پرس پھینکتی وہ اس کی طرف بڑھی تھی' جس کی سانس اکھڑ رہی تھی اور سینہ جکڑ رہا تھا۔



منزلیں تیرے علاوہ بھی ہیں لیکن
زندگی اور کسی راہ پر چلنا ہی نہیں چاہتی

کولمبو میں واقع اس بلند بالا ہوٹل کا ریسپشن دن کے وقت بھی روشنیوں سے منور تھا۔ ایک کونے میں صوفے پہ آفتاب بیٹھا تھا اور فون کان سے لگائے دوسری طرف ہارون کو سن رہا تھا' جو پوچھ رہے تھے۔

"آبدار کیسی ہے؟" وہ جواباً بتانے لگا۔

"جب سے وہ مس آبدار کے اپارٹمنٹ سے گیا ہے مس واپس ہوٹل آگئی ہیں اور یہاں سے نہیں نکلیں۔"

چند منزلیں اوپر ... ایک کشادہ اور پرتعیش بیڈ روم کے پردے گرے تھے اور اندر اندھیرا سا تھا۔ وہ صوفے پہ پیر اوپر کر کے بیٹھی تھی۔ سرخ بال کمر پہ پھسل رہے تھے اور چہرہ ٹھوڑی پہ گرائے گم صم نظر آتی تھی۔

"وہ کھانا بھی اندر منگواتی ہیں۔ اداس ہیں اور غم زدہ بھی۔"

آبدار نے سائیڈ ٹیبل سے نیل پالش کی شیشی اٹھائی اور اپنا پیر میز کے کنارے رکھا، پھر برش کو پالش میں ڈبو ڈبو کر ناخنوں پہ لگانے لگی۔

"وہ بار بار ریسپشن پہ کال کر کے پوچھتی ہیں کہ کوئی ان سے ملنے تو نہیں آیا، یا ان کے لیے کوئی فون تو نہیں آیا۔ مگر اپنا سیل فون انہوں نے آف کر رکھا ہے۔" انگوٹھے اور دو انگلیوں پہ سرخ نیل پالش لگا کر وہ رکی، اور پھر ایک دم شیشی اٹھا کر دیوار پہ دے ماری۔ شیشی دیوار کو داغدار کر کے ٹوٹ گئی۔ اب وہ سرخ رومال سے ناخن رگڑ رہی تھی۔ گیلی سوکھی پالش خلط ملط ہو گئی، کچھ مٹی، کچھ انگلیوں پہ لگ گئی۔

"مجھے وہ بیمار لگنے لگی ہیں، سر۔ میرا خیال ہے آپ کو ان کے پاس ہونا چاہیے۔"

وہ اب گھٹنوں پہ سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"مشورہ نہیں مانگا، رپورٹ مانگی ہے، دیتے رہو۔" ہارون نے کوفت سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ ادھر وہ ابھی تک روئے جا رہی تھی۔



لاکھ موجوں میں گھرا ہوں مگر ڈوبا تو نہیں
مجھ کو ساحل سے پکارو کہ میں زندہ ہوں ابھی

کینڈی کی سرسبز پہاڑیوں نے روئی کے گالوں جیسے بادلوں کا تاج پہن رکھا تھا۔ صبح کی تازہ ہوا درختوں کے پتوں کے درمیان سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی اور پہاڑی کو کاٹ کر بنے اس اوپن ایئر کیفے کے فوارے کے پانی سے کھیل رہی تھی۔ حوض میں گرتے پانی کی دھاروں میں دھنک کے ساتوں رنگ دکھائی دیتے تھے۔ فوارے سے نظر دائیں جانب کرو تو کونے کی ایک میز پہ فارس بیٹھا تھا۔ جھک کر کہنیاں میز پہ رکھے، وہ کافی کے مگ میں چمچ ہلا رہا تھا۔ دفعتاً" اس نے نگاہ اٹھائی اور سامنے والی کرسی سنبھالتے سعدی کو دیکھا۔ وہ ابھی ابھی آیا تھا۔ جینز پہ سوئیٹر پہن رکھا تھا جس کی ہڈ گردن کے پیچھے گری تھی۔

"مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ جہاں کام کرتا ہوں، وہاں کی مالکن کو کل پوری شام غائب رہنے کی لمبی کہانی سنائی تھی، اب صبح دوبارہ جانے سے پہلے اسے مطمئن کرنا ضروری تھا۔" وہ فارس کو دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ ہونٹ کا زخم پہلے سے بہتر تھا البتہ سوجن زیادہ تھی۔ فارس نے آنکھیں چندھی کر کے غور سے اسے دیکھتے مگ لبوں سے لگایا۔

"کیا کہا ہے اس سے کہاں جا رہے ہو؟"

"یہی کہ میری محبوبہ کینڈی میں آئی ہوئی ہے، اس سے "چھپ" کر ملنے جاتا ہوں۔" مسکرا کر بتانے والے انداز میں بولا۔

فارس نے سر جھٹکا۔ "استغفراللہ۔"

سعدی اپنے لیے ناشتہ آرڈر کرنے لگا۔ پھر فارس کی طرف خوشگوار انداز میں گھوما۔ "آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

فارس نے سنجیدگی سے مگ رکھا۔ "یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ میں اور تم آج واپس جا رہے ہیں۔"

سعدی کے چہرے کی جوت بجھ گئی۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "کیا یہ اتنا آسان ہے؟"

"ابھی تک تمہارا دماغ درست نہیں ہوا؟ دو ہاتھ اور لگاؤں؟"

"اچھا آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"میرے ساتھ واپس چلو، ہاشم سے کہو کہ تم اس کا راز راز رکھو گے۔ تم اپنے گھر والوں کے ساتھ رہو۔ اپنی جاب دوبارہ شروع کرو۔ اور مجھے ہاشم سے تمہارا اور اپنا انتقام لینے دو۔"

"میرا مجرم ہاشم نہیں نوشیرواں ہے۔ مجھے گولیاں نوشیرواں نے ماری تھیں۔ ہاشم نے مجھے غائب کروایا تھا مگر گولیاں مجھے نوشیرواں نے ماری تھیں۔" وہ ایک دم میز پہ ہاتھ مار کر تیزی سے بولا۔ فارس پہ گڑی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ "آٹھ ماہ۔۔۔ پورے آٹھ ماہ

انہوں نے مجھے بند رکھا۔ ایک ایسی جگہ جہاں میں سورج سے بھی محروم تھا... آٹھ ماہ میں نے ہر صبح انتظار کیا کہ آپ آئیں گے مگر آپ نہیں آئے۔ میں نے اپنے خاندان والوں کا انتظار کیا مگر کوئی نہیں آیا۔ آپ سب ہاشم کاردار کے ساتھ ایک میز پہ بیٹھ کر عید کا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ کوئی نہیں آیا میرے لیے۔"

بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا۔ تو فارس نے گہری سانس لی۔

"مجھے جیل میں ڈھائی سال ہو گئے تھے جب تم نے مجھ سے معافی مانگی تھی کہ تم میرے لیے پہلے اس طرح نہیں آئے جیسے اب آئے۔ کیا تمہیں الزام دیا تھا میں نے؟ نہیں۔ صرف اس لیے کہ تم نے مجھے قید میں نہیں ڈالا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قید میں ڈالا تھا۔"

"اوہ واؤ... اوکے... سو اب میں گلٹی پارٹی ہوں۔ ٹھیک ہے فائن۔" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر تلخی سے کہا۔ "میں نے اپنے آپ کو خود قید میں ڈالا۔ مجھے پہلے آپ کے پاس جانا چاہیے تھا مگر میں نہیں آیا۔ میں اکیلے سب کچھ کرنا چاہ رہا تھا۔ میں غلط تھا۔ فائن۔ مگر آپ... آپ تو سب جانتے تھے۔ یہ بھی کہ میں کہاں ہوں، کس کے پاس ہوں، تو آپ کیوں نہیں آئے میرے لیے۔ آٹھ ماہ پہلے کیوں نہیں آئے؟"

"کیونکہ تمہارے برعکس میں ایک بات جانتا ہوں کہ انسان اکیلا ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" وہ بھی اتنی ہی درشتی سے بولا تھا۔ "میں بالفرض کولمبو آ بھی جاتا تو میرے پاس یہاں اتنے بندے، اتنا اسلحہ اور اتنے وسائل نہیں تھے کہ میں ان کے ہوٹل پہ حملہ کرتا اور تمہیں وہاں سے نکال لیتا۔ اگر میں ایسی کوئی کوشش کرتا بھی تو میرا ایک خاندان ہے۔ سعدی یوسف! وہ کسی کو نہ چھوڑتے۔ جنگ شروع کرنے سے پہلے اسے جیتنا ہوتا ہے، اور ہم یہ جنگ جیتنے کے قریب ہیں۔ ہم اسے جیت کر ہی شروع کریں گے۔ وہاں سے اپنے آپ کو صرف تم خود نکال سکتے تھے اور میں نے تمہیں نکلنے کا طریقہ بتایا تھا اور وہ طریقہ کارگر رہا۔"

سعدی چند لمحے کے لیے کچھ بول نہیں سکا۔ صدمے سے اسے دیکھتا رہا۔ "کارگر؟ ہر گزرتا دن میری گردن میں پھندا کستا رہا، میں اندر سے مر گیا اور اب آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہو پایا، اور آپ کہتے ہیں کہ وہ کارگر رہا۔"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ ہاشم کو کسی بھی طرح کا شک ہو۔ ہمیں ہاشم کو اپنی طرف سے مطمئن رکھنا تھا۔"

"مگر کیوں؟ کیا کر لیتا ہاشم کاردار؟ زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا؟"

فارس نے افسوس سے اسے دیکھا۔ "تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ جب اسے پتا چلے گا تو وہ کیا کرے گا۔"

"وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا، اس کو ڈاج دینے کے دو ہزار طریقے میں جانتا ہوں۔ بہرحال میں واپس نہیں جا رہا۔ ابھی نہیں۔" اور وہ رخ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ فارس نے طویل سانس لبوں سے خارج کی۔

"مگر کیوں؟ کیا تم اپنے گھر والوں سے ملنا نہیں چاہتے؟" سعدی نے نظریں چرائیں۔

"مجھے تیاری کرنی ہے، ابھی میں تیار نہیں ہوں۔"

فارس ایک دم بالکل ٹھہر گیا۔ آنکھوں میں حیرت چمکی ابھرا۔ "کس چیز کی تیاری؟ میں نے کہا نا تمہارا انتقام میں لوں گا۔"

سعدی نے نظروں کا رخ اس کی طرف موڑا، ان میں اب صرف سنجیدگی تھی۔ "مجھے انتقام نہیں چاہیے ماموں۔ یہی فرق ہے آپ میں اور مجھ میں۔ مجھے... انصاف چاہیے۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" فارس ایک دم ہوشیار سا ہو کر بیٹھا۔ سعدی نے نظریں جھکائیں، پھر آنکھیں بند کیں۔ اس کے بعد اس نے گردن اکڑائی... آنکھیں کھولیں اور ان میں سرد سا تاثر لیے فارس کو دیکھا۔

"سرکار بنام نوشیرواں کاردار!"

فارس کی ساری دنیا ایک دم سناٹے میں آگئی۔ وہ بالکل شل سا سعدی کو دیکھے گیا۔ پھر اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "نہیں، کبھی نہیں سعدی۔" وہ تیزی سے آگے ہوا۔ "تم ایسا کچھ نہیں کرو گے تمہیں انتقام چاہیے تو ہم لیں گے انتقام مگر۔۔۔"

"مجھے انتقام نہیں چاہیے۔" وہ جواباً "غرایا تھا۔

"مجھے۔۔۔ انصاف چاہیے۔"

"تمہیں انصاف کا مطلب بھی پتا ہے؟ سعدی! وہ ہمارے خاندان کی عورتوں اور بوڑھوں کو کورٹ میں گھسیٹیں گے۔ ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ زمر، حنین، تم خود۔ پاکستان میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے سعدی اور اب ہم میں سے کوئی معصوم نہیں رہا۔

سعدی! میں ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ رہوں گا، لیکن ایک بات مجھے پورے یقین سے بتاؤ۔ کیا تم اس فیصلے پہ قائم رہو گے؟ کیا تم کاردارز سے کورٹ میں جنگ کرنا چاہتے ہو؟"

"میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ سعدی یوسف کی کہانی ایک کورٹ ٹرائل کے بغیر ختم نہیں ہو گی۔ میں جانتا ہوں ٹرائل لمبا ہو گا، تکلیف دہ ہو گا، مجھ سے اور کاردارز سے وابستہ ہر شخص کو عدالت کے کٹہرے میں آکر قرآن پہ ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کا حلف اٹھانا ہو گا، میرے خاندان کی عورتوں پہ بھری کچہری میں کیچڑ اچھالی جائے گی، ہمیں ذلیل اور رسوا کیا جائے گا، میں سب جانتا ہوں، مگر۔۔۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ مجھے "سر کاربنام نوشیرواں کاردار" چاہیے ہے۔"

فارس نے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار نہیں کیا، وہ والٹ سے چند نوٹ نکالتا اٹھ کھڑا ہوا اور ان کو گلاس تلے رکھا۔

"تمہارا نیا پاسپورٹ تمہیں دو دن کے اندر مل جائے گا۔ یہ تمہارے آف شور بینک اکاؤنٹ کی ساری تفصیلات ہیں۔" جیکٹ کے اندرونی جیب سے چند کاغذ نکال کر سامنے رکھے۔ "مجھ سے کیسے کانٹیکٹ کرنا ہے تمہیں معلوم ہے، پیسے چاہییں ہوں تو بتانا۔ میں آج رات تک واپس چلا جاؤں گا۔"

سعدی کا دل ایک دم ویران سا ہو گیا۔ اس نے یاسیت سے اسے دیکھا۔

"آپ جا رہے ہیں؟"

"اب رکنے کا فائدہ نہیں ہے۔ تم نے ایک غلط فیصلہ کیا ہے سعدی، اور میں اس میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ لیکن تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہے کہ ہاشم کیا کرے گا جب اس پہ حقیقت کھلے گی۔ مجھے اندازہ ہے، اور مجھے۔۔۔ تیاری کرنی ہے۔ مجھے اپنے خاندان کی حفاظت کرنی ہے۔"

سعدی اٹھ کھڑا ہوا۔ کاغذات کو اس نے چھوا تک نہیں۔ آگے بڑھا اور فارس سے گلے ملا۔ حلق میں بہت سے آنسو پھنس گئے۔

"ہاں ٹھیک ہے، اب دور ہٹو۔" سنجیدگی سے کہہ کر اسے پرے ہٹایا۔ سعدی نے نم آنکھوں سے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ زمر نے ابھی تک آپ کو زہر نہیں دیا۔ ویسے وہ آپ کے ساتھ ٹھیک ہیں اب؟"

"Its complicated" (یہ بہت الجھا ہوا سلسلہ ہے) وہ گہری سانس لے کر بولا تھا۔

"اور یہ آبدار کا کیا چکر ہے؟ اس کے نمبر کی اتنی فکر کیوں ہے آپ کو؟" یوسف خان کے بیٹے نے آنکھوں میں شک بھر کے فارس غازی کو دیکھا تھا۔

"اس نے احسان کیے ہیں مجھ پہ اور میں اس کو ڈاج دے کر گیا تھا۔ وہ جذباتی سی لڑکی ہے، مجھے فکر ہے کہ کچھ کر نہ لے۔ اسی لیے اس کی طرف دھیان لگا رہتا ہے۔ خبر تو رکھنی پڑتی ہے۔ خیر تم ایک دو دن میں واپس آجانا، زیادہ مت ٹھہرنا۔ میں اب چلتا ہوں۔"

اس کا کندھا ہلکے سے تھپک کر وہ کہہ رہا تھا۔ اب وہ جلدی میں لگتا تھا۔ اسے واپس جانا تھا۔ جلد از جلد۔



اے دل تجھے دشمن کی بھی پہچان کہاں ہے
تو حلقہ یاراں میں بھی محتاط رہا کر!

ہسپتال کے پرائیوٹ وارڈ کا وہ پر تعیش کمرہ پھولوں

کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اندر بیڈ پہ ہاشم تکیوں کے سہارے لیٹا نظر آرہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ہسپتال والی شرٹ پہن رکھی تھی۔ زمر نے دروازے پہ دستک دی تو اس نے آنکھیں کھولیں ' پھر نقاہت سے مسکرایا۔ ساتھ کھڑے ڈاکٹر نے بھی اسے دیکھا۔

"آیئے۔" وہ مسکراتی ہوئی آگے آئی اور قریبی کاوچ کے کنارے بیٹھ گئی۔

"تھینک یو۔۔۔ میں نے اس دن آپ کو نکال دیا تھا اس کے باوجود دوبارہ واپس آنے کے لیے۔" وہ نرمی سے بولا تھا۔

"نوپرابلم' میں نہ بھی آتی تو کوئی اور آجاتا۔ یہ ہارٹ اٹیک نہیں تھا' صرف اینگزائٹی اٹیک تھا۔ چوں کہ اس کی علامات دل کے دورے جیسی ہوتی ہیں تو میں سمجھی۔۔۔ خیر مبارک ہو' آپ کا دل بالکل محفوظ اور توانا ہے۔"

وہ ہلکا سا ہنس دیا۔ پھر خاموش ہو گیا۔ ماحول میں عجیب سا تناؤ در آیا۔ ڈاکٹر باہر گیا تو ہاشم نے کہا۔

"زمر۔۔۔ کیا آپ میرا ایک کام کریں گی۔"

زمر نے گہری سانس لی۔ "جی کہیے۔"

"ایک ڈرافٹ تیار کروانا ہے' اگر آپ نوٹ پیڈ پہ لکھتی جائیں تو۔۔۔ اور پلیز مجھے کام سے باز رہنے کو نہ کہیے گا۔"

"شیور' آپ بتائیں۔" وہ اس کو کام سے باز رہنے کی نصیحت کر بھی نہیں سکی۔ مصروف رہے گا تو ذہنی دباؤ کم ہو گا۔ اس نے نوٹ پیڈ اٹھایا اور پین کھولا۔ ہاشم تکیے پہ سر رکھے' آنکھیں موندے بولنے لگا۔ بار بار رکتا' اٹکتا' پھر نفی میں سر ہلا کر دوبارہ سے شروع کرتا۔ وہ بنا کسی کوفت کے لکھتی گئی۔

اس دوران اس سے ملنے کوئی نہیں آیا۔ شام کو جب وہ تھک کر کاغذوں کا پلندہ اس کے سرہانے رکھ کر اٹھنے لگی تو از راہ ہمدردی بولی۔

"اب اس بات کا دباؤ مت لیجئے گا کہ دوستوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے ان کو معلوم نہ ہو۔"

ہاشم تلخی سے مسکرایا۔ "باس کی بیماری کی خبر آفس میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلا کرتی ہے۔ سب کو معلوم ہے مسز زمر!"

"میں۔۔۔ اپنے ڈاکٹر سے مل لوں۔" وہ پرس اٹھا کر جانے لگی۔

ہاشم نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ "آپ کا ڈاکٹر بھی اسی ہسپتال میں ہے؟"

"یہ آپ کا پسندیدہ ہسپتال ہے ہاشم اور میری سرجری کے وقت مسز کاردار نے ہی یہ ہسپتال ریکمنڈ کیا تھا۔ کیا آپ بھول گئے؟" ہاشم نے محض سر ہلا دیا۔ وہ ایسے معاملات ممی کے لیے چھوڑ دیا کرتا تھا' سو اس کو اس کی خبر نہ تھی۔

زمر چند منٹ کی مسافت پہ واقع اپنے ڈاکٹر کے کمرے تک آئی تو وہ اندر نہیں تھے۔ اس دن کے بعد سے بس ان سے فون پہ بات ہوئی تھی' انہوں نے اسے نئی رپورٹ کے حوصلہ افزا ہونے کا بتایا تھا۔ مزید کچھ نہیں۔ اس نے باہر استقبالیہ پر موجود لڑکے سے پوچھا۔

"ڈاکٹر قاسم کہاں ہیں؟"

وہ بے اختیار' تعجب سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ "آپ کو نہیں معلوم؟"

"نہیں۔ کیا ہوا؟" زندگی میں اتنے حادثے دیکھے تھے کہ بغیر کسی دھڑکے کے سکون سے بولی۔

"ان کا بہت بڑا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ بہت چوٹیں آئی ہیں۔ وہ ایک دوسرے ہسپتال میں داخل ہیں۔ پسلیاں ٹوٹی ہیں۔ جبڑے کی ہڈی بھی اور۔۔۔" وہ ہمدردی سے سنتی گئی' پھر آگے بڑھ گئی۔ اب دوسروں کی مصیبتیں اور تکالیف اثر نہیں کرتی تھیں۔

"تو آپ نے فائلز کاپی نہیں کیں؟" حنین کے سامنے جب رات گئے وہ آکر بیٹھی تو ساری کتھا سن کر اس نے خفگی سے پوچھا۔

"حنین' تمہارے خیال میں میں اتنی چال باز عورت ہوں کہ وہ آدمی زمین پہ گرا ہو گا' اپنے سینے کو تکلیف سے مسل رہا ہو گا اور مجھے فائلز کی فکر ہو گی؟" اس نے سکون سے پوچھا تھا۔

"anxiety اٹیک ہی تھا نا۔ مرتو نہیں گیا تھا وہ۔ آپ نے اتنا اچھا موقع ضائع کردیا۔"

"اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کے بعد مجھ میں اور اس میں کیا فرق رہ جاتا۔؟"

"ہاں بالکل 'ہم تباہ ہو جائیں گے' مگر چلو 'ہم ان سے بہتر تو ہوں گے۔" حنین طنز سے بولی تھی۔ زمر چپ رہی۔

"خیر۔ آپ کو پتا ہے... سعدی بھائی اپنے قرآن والے گروپ میں دوبارہ سے آگیا ہے۔" وہ بوجھل ماحول کو ہلکا بناتے ہوئے ٹیب کھول کر اس کے سامنے کرکے دکھانے لگی۔ زمر کے تاثرات بدلے۔ وہ تیزی سے آگے ہوئی۔ پھر اسکرین پہ ہاتھ رکھا۔ آنکھوں کے کنارے نم ہوئے۔

"وہ سورۃ النمل پہ تدبر کرتا ہے۔ مگر کرتے کرتے اب رک گیا ہے۔ آدھی سورۃ کے بیچ۔" احتیاط سے اس کے تاثرات دیکھ کر کہنے لگی۔ "آپ بھی اچھا بولتی ہیں بھائی کی طرح۔ آپ کو چاہیے... کہ اس کی ادھوری سورۃ مکمل کردیں۔ کچھ لکھ دیں۔ شاید اسے ضرورت ہو۔"

زمر سر جھٹک کر اٹھ گئی۔ "مجھے کام ہیں بہت۔" اس سے نظریں ملائے بغیر وہ باہر نکل گئی اور حنین گہری سانس لے کر رہ گئی۔



لے جائیں مجھ کو مال غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا

اس رات کولمبو میں واقع پاکستانی سفارت خانے میں خاموشی اور اندھیرا چھایا تھا۔ دفاتر مقفل تھے 'سب چھٹی کرکے جاچکے تھے۔ ایسے میں ایک اندھیرے کمرے میں جہاں بہت سے کمپیوٹرز پڑے تھے 'ایک کمپیوٹر کی اسکرین روشن تھی اور اس کے سامنے بیٹھی عورت کھٹاکھٹ کی بورڈ پہ ٹائپ کررہی تھی۔ باربار احتیاط سے دروازے کی طرف بھی دیکھتی۔ اس کی گود میں رکھے پاس پہ کسی مرد کی تصویر بنی تھی۔ (یہ وہ پاس تھا جس کو استعمال کرکے وہ اس جگہ داخل ہوئی تھی۔)

دفعتاً" پرنٹر سے زوں زوں کی آوازیں آنے لگیں۔ صباحت پرنٹر پہ رکھی شے کو احتیاط سے درست کرنے لگی۔ ساتھ ہی وہ کیز بھی دبا رہی تھی۔ رات گہری ہوتی جارہی تھی۔

چند منٹ بعد وہ پرنٹ شدہ کاغذوں کو جوڑ رہی تھی۔ ان کا کور گہرا سبز تھا اور ان پہ اسلامک ری پبلک آف پاکستان لکھا تھا۔

فصیح ہوٹل کی لابی میں تیز قدموں سے چلتا جارہا تھا۔ جب اس کا فون بجا۔ اس نے سرعت سے اسے کان سے لگایا۔

"سر! وہ نمبر آن ہوگیا ہے۔ ابھی دو منٹ پہلے۔"

"اچھا تو یوں کرو..." فصیح ہدایت دینے لگا کہ ٹوں ٹوں سنائی دینے لگی۔ درمیان میں کسی اور کی کال آرہی تھی۔ اس نے جھنجلا کر فون کان سے ہٹایا تو ایک دم منجمد ہوگیا۔ اسی نمبر سے کال آرہی تھی۔

"وہ مجھے کال کررہا ہے۔ تم اس کی لوکیشن ٹریس کرو۔" تیزی سے کہہ کر اس نے دوسری کال اٹھائی۔ "کہیے۔"

"میں پوسٹر والے لڑکے کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" دوسری طرف بوڑھا سنہالی بدقت کہہ رہا تھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں کہ اس دن آپ کو ڈپٹ دیا۔ میں انعام کی رقم ایڈوانس میں دینے کو تیار ہوں۔" اب وہ سبھاؤ سے بات کررہا تھا۔

اسلام آباد کے اس ہسپتال کے کمرے میں اس رات اداسی اور تنہائی تھی۔ ویران موسم 'ویران دل۔ وہ گھر جاسکتا تھا مگر خود ہی نہیں گیا۔ تنہا کمرے میں لیٹا رہا۔ نگاہیں چھت پہ جمی تھیں۔ وجیہہ چہرہ زرد سا تھا۔

اس سے ملنے کوئی نہیں آیا تھا۔ جواہرات کو اس نے ہوش میں آتے ہی کال کی تھی اور اس پہ چیختا چلایا تھا۔ جواب میں جواہرات اتنے ہی ہذیانی انداز میں اس پہ غرائی تھی۔ "مجھے کسی چیز کا الزام نہ دو۔ میں کس کرب سے گزر رہی ہوں تمہیں احساس ہی نہیں۔"

نوشیرواں کو اس نے کال نہیں کی تھی' مگر دل سے وہ چاہتا تھا کہ کاش وہ آجاتا۔ ایک دفعہ۔ باقی کسی سے بھی ملنے سے اس نے خود انکار کر دیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ کوئی آیا ہی نہیں تھا۔ نہ آفس سے' نہ دوستوں میں سے۔ پتا نہیں کیوں؟

اور جب سعدی یوسف ہسپتال سے کھو گیا تھا... تو کتنے ہی دن اس کے دوست اور قرابت دار اسی ہسپتال کے باہر پھولوں کے گلدستے رکھتے رہے تھے۔ فرق کہاں سے آیا تھا؟ کس نے ڈالا تھا؟

دفعتاً" اس نے تکیے کے ساتھ رکھا موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ملا کر اسے کان سے لگایا۔ "ادریس...." بولا تو آواز میں ذرا نقاہت تھی۔ "کراچی میں سب ٹھیک ہے؟"

"جی کاردار صاحب' آپ کے بارے میں سنا تھا' اب طبیعت کیسی..."

"فارس کا بتاؤ۔" اس نے درشتی سے بات کاٹی۔ اپنی "کمزوری" کے عیاں ہونے کا احساس بہت تکلیف دہ تھا۔

"غازی؟ وہ ٹھیک ہے' کام کرتا ہے۔ مزاج برہم رہتا ہے' مگر وہ بندہ برا نہیں ہے۔"

ادریس اب اسے فارس کی "رپورٹ" دے رہا تھا۔ ہاشم نے مطمئن ہو کر فون رکھا اور ایک دفعہ پھر اپنے گرد پھیلی تنہائی کو دیکھا۔

جو فیصلہ وہ شہرین سے طلاق کے ان دو سالوں میں نہیں کر سکا تھا' وہ چند ساعتوں میں ہو گیا تھا۔ اس نے ایک ٹیکسٹ لکھا (ہم کب مل سکتے ہیں' ریڈ؟) اور آبدار کے نمبر پہ بھیج دیا۔ پھر قدرے سکون سے تکیے پہ سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے' لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے میں رات کے اس پہر سناٹا چھایا تھا۔ کسی کسی کمرے میں کوئی لیمپ جل رہا تھا۔ ندرت اپنے کمرے میں بیڈ پہ جائے نماز بچھائے بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ (گھٹنوں کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھتی تھیں۔) ساتھ والے کمرے میں جھانکو تو حنین دوپٹہ اوڑھ کر قرآن اٹھائے بیٹھی' سبق یاد کر رہی تھی۔ کل کے سبق میں سورۃ البینۃ سنانی تھی اسے' اور وہ مسلسل آیات کو خلط ملط کر رہی تھی۔

"اف حنین' فوکس کرو' کیوں تم بار بار ایمان والوں کو "نار جہنم" میں پہنچا رہی ہو۔ اور مشرکین کو باغات میں؟ اف۔" اس کے اپنے مسئلے تھے اور یہ مسئلے اس کو اب اپنے مرض مستمر کو سوچنے ہی نہیں دیتے تھے۔

سیم' بڑے ابا کے کمرے میں سو رہا تھا۔ (گو کہ اس کا اپنا کمرہ بھی تھا مگر رات کو وہ ادھر ہی سوتا تھا۔) زمر کے کمرے میں بھی لیمپ جل رہا تھا۔ وہ کارپٹ پہ جائے نماز بچھائے چہرے کے گرد دوپٹہ لپیٹے بیٹھی تھی۔ وہ کب کا سلام پھیر چکی تھی مگر یونہی بیٹھی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ بیڈ کی دوسری طرف کو اٹھ جاتیں۔ بس ایک رات ہی رہا تھا وہ اس کمرے میں۔ پھر چلا گیا۔ اب وہ کب آئے گا؟

"اللہ تعالیٰ' میں بہت بری ہوں۔" وہ گہری سانس لے کر کہنے لگی۔ زرد لیمپ میں مدھم روشنی میں بھی اس کا چہرہ اور ناک کی لونگ دمک رہی تھی۔ "میں بہت سخت دل ہو گئی تھی' میں نے فارس کے ساتھ بہت زیادتی کی' مگر اس سے معافی نہیں مانگی۔ اس کے لیے انصاف حاصل کیا مگر اس سے معافی نہیں مانگی۔ میرا دل اس جتنا بڑا نہیں ہے۔ میں اس سے غلط باتوں پہ لڑتی ہوں۔" وہ یاسیت سے کہہ رہی تھی۔ "جب مجھے پتا تھا کہ وہ سعدی کے لیے ادھر گیا تھا' اور اسے آبدار کی... ضرورت تھی اور ذرا سوچنے پہ مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ آبدار نے جان بوجھ کر ایسی بات کہی تھی' ان کے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر... اب میں بات کیوں نہیں کرتی اس سے؟ مگر نہیں... میری انا!"

پھر اس نے چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔

"مگر آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے یہ سمجھایا کہ دل

کی نرمی تب ملتی ہے جب ہم قرآن کی باتیں کرتے ہیں۔ جب ہم دل سے قرآن کی باتیں کرتے ہیں۔ اور کیا ہوا جو وہ اپنی سورۃ مکمل نہیں کرسکا۔ اس سے پہلے بھی تو میں نے سعدی کے بہت سے کام کیے ہیں نا' آج ایک اور سہی۔"

فارس اور اپنی معلق قسم کی ازدواجی زندگی کی ساری کلفت اور بد دلی عنقا سی ہو گئی۔ وہ نم آنکھوں سے مسکرائی اور اٹھ گئی۔ پھر اسٹڈی ٹیبل پہ آبیٹھی اور لیپ ٹاپ کی اسکرین کھولی۔

وہ گروپ میں مزید کچھ پوسٹ کر نہیں سکا تھا۔ وہ سورۃ مکمل نہیں کرسکا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ وہ کرلے گی۔

پہلے وہ اس کی لکھی تدبّر اور تفکّر کی باتیں غور سے پڑھنے لگی۔ اس نے النمل کی 58 آیات لکھی تھیں۔ کل آیات 93 تھیں۔ وہ آدھی سے زیادہ سورۃ کرچکا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ۔۔۔ چیونٹیوں کی ملکہ کا قصہ۔۔۔ سلیمان اور ملکہ سبا کا قصہ۔۔۔ حضرت صالح علیہ السلام کا قصہ۔۔۔ حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ۔۔۔ اور بس! ابھی 35 آیات رہتی تھیں۔ ابھی النمل کا ایک بڑا حصہ رہتا تھا۔ ابھی اس کی تکمیل میں چند بڑے واقعات کو شامل ہونا تھا۔

زمر نے اگلی چند آیات وہاں لکھیں اور پھر۔۔۔ جی کڑا کرکے' ایک نئے عزم کے ساتھ۔۔۔ وہ ہر آیت کے نیچے اپنے الفاظ۔۔۔ اپنے دل سے کہے گئے الفاظ لکھنے لگی۔

میں پناہ چاہتی ہوں اللہ کی دھتکارے ہوئے شیطان سے۔ شروع اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

"آپ کہہ دیجیے کہ تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔۔۔ اور سلام ہے اس کے بندوں پر۔۔۔ وہ لوگ جن کو اس نے "چن" لیا ہے۔۔۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنہیں یہ لوگ (اس کا) شریک ٹھہراتے ہیں؟"

"اوہ اللہ!" اس نے آنکھیں بند کرلیں' پھر سر جھٹک کر کی بورڈ پہ انگلیاں رکھے ٹائپ کرنے لگی۔

الفاظ جانے کہاں سے آکر انگلیوں سے کیز میں منتقل ہونے لگے۔

"میں ان آیات کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل یہ سوچ رہی تھی کہ میں انہیں کسی اور کی تشفی کے لیے لکھ رہی ہوں' مگر نہیں۔ قرآن جب آپ سے مخاطب ہو تو وہ صرف آپ کے لیے ہوتا ہے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمام حمد اللہ کے لیے ہے۔۔۔ بلکہ یہ فرمایا کہ "آپ کہہ دیں کہ تمام حمد اللہ کے لیے ہے۔" لکھتے لکھتے اس کی انگلیوں میں روانی آرہی تھی۔ "حمد کہتے ہیں کسی کی کاملیت کی تعریف کو۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ اللہ ہی پرفیکٹ ہے' پرفیکٹ تعریف بھی اسی کی ہوسکتی ہے' مگر یہ بات ہمیں دوسروں کو بار بار بتاتے رہنا چاہیے کہ اللہ بہترین ہے۔ بہترین دوست بہترین مددگار۔ ورنہ جب لوگ کافر ہونے لگتے ہیں' athiest (دہریے) بنتے جاتے ہیں' تو وہ اس لیے ایسا کرتے ہیں کیونکہ انہیں لگتا ہے اللہ ان کے لیے بہترین مددگار نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ کل بھی آپ کا تھا' آج بھی ہے۔ ہمیں یہ پشیمانی اور ڈپریشن رہتا ہے کہ ہم اس کے اب بہترین بندے نہیں رہے' مگر ہم تو اس کے بہترین بندے کبھی بھی نہیں تھے۔ ساری تعریف' ساری حمد' ساری پرفیکشن "ہمارے لیے" تو کل بھی نہیں تھی۔ جس پشیمانی کو ہم دیوار بنا کر اللہ اور اپنے درمیان لے آتے ہیں' وہ تو ہمیشہ ساتھ رہے گی۔ آج اس غلطی پہ شرمندہ ہیں' کل کسی اور پہ نادم تھے۔ ہم پرفیکٹ نہیں ہوسکتے تو پھر اللہ سے بات کرنے سے جھجکتے کیوں ہیں؟ غلطی ہوئی ہے تو معافی مانگو اور نئے سرے سے اللہ کے بندے بن جاؤ۔ کچھ لوگوں کو اللہ نے اپنے دین کے لیے چن لیا ہوتا ہے۔ ان کو قرآن پہ تدبر کرتے رہنا چاہیے' اپنے لیے نہ سہی تو دوسروں کے لیے۔ خوشی سے نہیں کریں گے تو قدرت آپ کو کھینچ کر گھسیٹ کر اس طرف لے آئے گی مگر یہ آپ کو کرنا ہے۔ آپ منتخب ہیں' پرفیکٹ نہیں ہیں تو اپنی کوتاہیاں اور گناہ دیکھ کر پریشان نہ ہوا کریں۔ توبہ کریں' اور

پھر سے شروع کریں۔ صرف اللہ ہی کے ساتھ تو انسان ہمیشہ ہر چیز نئے سرے سے شروع کر سکتا ہے!"

ٹھہر کر اس نے اگلی آیت دیکھی۔

"بھلا بتاؤ تو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟
کس نے آسمان سے بارش برسائی؟
پھر اس سے ہرے بھرے بارونق باغات اگا دیے۔
تم تو ہرگز نہیں اگا سکتے تھے ان باغوں کے درختوں کو۔
کیا اللہ کے ساتھ اور بھی کوئی معبود ہے؟ بلکہ یہ لوگ تو وہ ہیں جو حق سے انحراف کرتے ہیں۔"

"مجھے بہت اچھے لگتے ہیں قرآن میں پوچھے گئے سوال۔" وہ سر جھکائے بورڈ پہ تیز تیز ٹائپ کر رہی تھی۔

"ہر دفعہ اپنا دفاع کرنا، اپنے حق میں دلائل دینا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کوئی اللہ کے وجود کو ماننے سے انکاری ہو تو اس کی طرف سوال ڈالا کریں، اسے سوچنے پہ مجبور کریں۔ کوئی تو ہے نا جس نے اتنی حکمت سے زمین اور آسمان بنائے۔ تو کیا وہ ہمیں انصاف نہیں دلائے گا؟ کوئی تو ہے نا جو آسمانوں سے بارش برساتا ہے، کبھی زمین پہ، کبھی دل پہ۔ اور اس بارش سے اگنے والے باغات انسان خود نہیں اگا سکتا۔ مردہ زمین اور مردہ دلوں کو صرف اللہ زندہ کر سکتا ہے۔ صرف اللہ کا قرآن کر سکتا ہے۔ تو بجائے اپنے مردہ دل کا ڈپریشن لینے کے، کیوں نہ اللہ سے کہہ دیا جائے کہ آپ مدد کریں، مجھ سے تو نہیں ہو رہا۔ تو کیا وہ نہیں کرے گا مدد؟ میں ایک بہت پریکٹیکل انسان ہوں۔ میں اس بات پہ یقین رکھتی ہوں کہ اللہ انسان کو سارے وسائل دے دیتا ہے مگر انسانوں کو اس سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ خود زمین پہ آ کر ہمارے کام جادوئی طاقت سے سنوار دے گا۔ اس نے آپ کو عقل دی ہے، سو یہ اس کی بہترین مخلوق کی توہین ہے کہ اس کو ہر شے پلیٹ میں دی جائے۔ جیسے رزق کمانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ ویسے ہی اپنے دل کو زندہ کرنے کے لیے بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یوں احساسِ گناہ اور ڈپریشن لے کر بیٹھنے سے کچھ نہیں ہو گا۔"

لکھ لکھ کر وہ اب تھک چکی تھی مگر جوش اور عزم ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اگلی آیت آن لائن قرآن سے کاپی پیسٹ کی اور پھر اس کو زیر لب پڑھا۔

"بھلا کس نے بنایا زمین کو قرار گاہ
اور جاری کر دیں اس کے درمیان نہریں
اور اس کے لیے پہاڑ بنائے
اور بنائی دو سمندروں کے درمیان آڑ
کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں۔"

"اچھا لگتا ہے آپ کی بیان کی گئی مثالیں پڑھنا، اللہ تعالیٰ۔" وہ زیر لب مسکراتی ہوئی ٹائپ کیے جا رہی تھی۔ بھوری آنکھیں کی بورڈ پہ جھکی تھیں۔ ان آیات میں زمین، آسمان، پہاڑوں اور سمندروں کی بابت پڑھ کر کبھی کبھی انسانوں کا خیال آتا ہے۔ کہ وہ بھی ان ہی تخلیقات کی مانند ہیں۔

کچھ انسان زمین جیسے ہوتے ہیں۔ اتنا بوجھ اٹھا کر بھی قرار و سکون میں ہوتے ہیں۔ ہلتے نہیں، لڑھکتے نہیں۔ کچھ نہروں جیسے ہوتے ہیں، سب کو سیراب کرتے ہیں، فائدہ پہنچاتے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ پہاڑوں جیسے ہوتے ہیں۔ مضبوطی سے اکڑ کر سر اٹھائے کھڑے ہوتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ اپنا بوجھ تو کسی اور پہ... ایک پُرسکون زمین پہ... ڈالے ہوئے ہیں۔ خود تو قرآن کا بوجھ بھی نہ اٹھا سکتے تھے۔ اور کچھ سمندر کے پانی جیسے ہوتے ہیں۔ کڑوا اور میٹھا پانی سمندر میں کتنی ہی جگہوں پہ ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا ہے مگر دونوں کے درمیان آڑ ہوتی ہے۔ گوگل کرو تو کتنی ہی تصویریں نکل آتی ہیں جہاں پانی بھی پانی سے مل نہیں سکتا۔ دونوں کا رنگ فرق ہے، ذائقہ فرق ہے مگر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک اچھا ہے ایک برا، دونوں متضاد ہیں مگر ایک سمندر میں رہتے ہوئے ان کو ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ جس دن یہ آڑ ٹوٹی، سمندر میں طوفان برپا ہو جائے گا۔ ہر طرح کے لوگ دیکھ کر جاننے والے واقعی کہہ اٹھتے ہیں کہ اللہ کے سوا کون ان کو بنا سکتا تھا؟ اور اللہ کے سوا کس کے سامنے ان

سب کو جھکنا چاہیے ؟"

اب کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اس نے مسکرا کر اپنے لکھے الفاظ کو دیکھا۔ اگر وہ پڑھے گا تو وہ بھی اچھا محسوس کرے گا کیونکہ قرآن کا پڑھنا پڑھانا تو عطر بیچنے والے جیسا ہوتا ہے۔ دوسروں کو عطر کی شیشیاں تھماتے تھماتے چند قطرے دکاندار کے اپنے ہاتھوں پہ بھی لگ جاتے ہیں اور وہ خود بھی معطر ہو جاتا ہے چاہے آخر میں اس کے پاس ایک شیشی بھی نہ بچے۔

اور زمر کو اتنے سال بعد اپنے کمرے سے خوشبو آنے لگی تھی۔ آج وہ واقعی خوش تھی۔



کل تاریخ یقیناً" خود کو دہرائے گی
آج کے اک اک منظر کو پہچان میں رکھنا

وہ صبح جب قصر کاردار پہ اتری تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مغرور انسانوں کی طرح وہ صرف دیکھنے میں وزنی لگتے تھے 'اندر سے کھوکھلے تھے۔ گرج رہے تھے مگر خیر و برکت کے قطرے برسانے والے نہیں لگتے تھے۔

اونچے ستونوں والے برآمدے کے سامنے سبزہ زار کار آرکی اور ڈرائیور نے جھٹ سے دروازہ کھولا۔ پچھلی سیٹ سے علیشا باہر نکلی۔ اس کے سیاہ بال کندھوں تک آتے تھے 'گرے ٹاپ کے گریبان پہ سن گلاسز لٹکے ہوئے تھے 'اور ماتھے کے اوپر ہیئر بینڈ لگا کر بال پیچھے کر رکھے تھے۔ سرمئی آنکھیں اٹھا کر اس نے برآمدے میں کھڑی جواہرات کو دیکھا جو نک سک سے تیار' چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

علیشا نے تھوک نگلا اور جی کڑا کر کے برآمدے کے زینے پہ چڑھنے لگی 'یہاں تک کہ وہ جواہرات سے دو زینے نیچے رہ گئی۔

"آپ نے مجھے بلوایا؟ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ تحکم سے کہتی مڑ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ علیشا نے ایک نظر آس پاس ہاتھ باندھے کھڑے ملازموں پہ ڈالی پھر اس کے پیچھے ہولی۔

"یہ میرے والد کی تصویر ہے۔" لاؤنج کی ایک دیوار کے قریب رک کر جواہرات نے چتون سے اشارہ کیا۔ وہ ہنوز سینے پہ بازو لپیٹے ہوئے تھی اور بھورے بال ڈھیلے جوڑے میں بندھے 'گردن کی پشت پہ پڑے تھے۔ "اور یہ میرے دادا کی۔ یہ میرے کزنز ہیں۔ یہ میری والدہ کی فیملی ہے۔" وہ مختلف تصاویر کے اوپر نگاہ دوڑاتے کہہ رہی تھی۔

"یہ سب خاندانی تھے۔ اپنے علاقوں کے رئیس تھے۔ سیاسی اکابرین تھے۔ عزت دار لوگ تھے۔ مگر اورنگ زیب..." اب کے وہ پلٹ کر علیشا کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں وہی سرد مہری تھی۔ علیشا خاموشی سے سنے گئی۔ "اورنگ زیب ان کی طرح رئیس تھا نہ دولت مند 'مگر وہ خاندانی تھا۔ عزت دار تھا۔ اسی لیے اس کو میں نے اپنے لیے منتخب کیا۔ اس کو دو بیٹے دیے۔ خاندانی اور با اثر بیٹے۔ ہمارے سارے خاندان میں... سات نسلوں میں..." انگلی گھما کر اشارہ کیا۔ "کوئی اتنا نجس 'پیچ اور غلیظ نہیں ہے جتنی کہ تم!"

"مسز کاردار!" علیشا کی آنکھوں میں سرخ لکیریں ابھریں۔ آواز کانپی۔

"آواز نیچی رکھو۔" وہ جواباً" اتنے زور سے غرائی کہ علیشا بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی۔ "تم میرے سامنے کھڑی ہو 'اور میں... یہاں کی ملکہ ہوں! اگر تمہیں رہنا ہے اس گھر میں تو تم میرے متعین کیے طریقے سے رہو گی۔ یہ مت سمجھنا کہ میرا بے وقوف بیٹا تمہاری مدد کو آئے گا۔ ہاشم کی پیشکش پہ ہامی بھرنے کا ارادہ ظاہر کر کے تم نے نوشیرواں کی حمایت کھو دی ہے۔ وہ تمہارے اپارٹمنٹ کا مزید کرایہ نہیں بھرے گا۔ اوہ! ایسی شکل نہ بناؤ۔ میں نے آفس میں 'رپورٹ کرنے والے بہت سے پرندے پال رکھے ہیں۔"

علیشا بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"تم نیچے والے سرونٹ رومز میں سے ایک میں رہو گی۔ ان شیئرز کو تم بیچ نہیں سکتیں 'اس لیے تمہارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر اس شہر میں رہنا ہے

اوران شیئرز کا منافع وصول کرتے رہنا ہے تو۔" ابرو سے دور کھڑی میری کو اشارہ کیا۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے آئی۔ "تو میری کے ساتھ جاؤ اور اپنا کمرہ دیکھ لو۔"
علیشا نے ایک بے بس نگاہ میری کے اوپر ڈالی ' اور پھر اس کے ساتھ خاموشی سے چل دی۔
"ملکہ سے ٹکر نہیں لینی چاہیے علیشا!" جواہرات نے پیچھے سے پکارا تھا۔ میری اینجیو نے اس بات پہ گردن ذرا موڑ کر لاؤنج کے پودوں پہ اسپرے کرتے فیونا کو دیکھا جو اندر تک کلس گئی تھی۔
"کیونکہ شطرنج کی بساط پہ صرف ملکہ ہوتی ہے، جو جب چاہے ' جتنی چاہے چالیں چل سکتی ہے۔" علیشا مڑی اور ایک نظر اسے دیکھا۔
"مگر شہ مات صرف بادشاہ دے سکتا ہے ' مسز کاردار ' اور ملکہ سب سے بڑی چال باز تو بن سکتی ہے ' مگر وہ بادشاہ نہیں بن سکتی۔" اور مڑ گئی۔
"میں اپارٹمنٹ سے اپنا سامان لے آؤں۔" میری کے ساتھ جانے کے بجائے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جواہرات کی چبھتی ہوئی نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔
آدھے گھنٹے بعد ' اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی وہ موبائل پہ ایک نمبر ملا کر فون کان سے لگائے ' اپنا سامان اکٹھا کر رہی تھی۔
"ہیلو.... مسز ندرت.... میں علیشا بات کر رہی ہوں۔ جی میں ٹھیک ہوں۔ میں نے مسز زمر سے بات کی تھی مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا ' میں حنین سے ملنا چاہتی ہوں مگر وہ نہیں چاہتی۔ کیا آپ میرے اور اپنے درمیان یہ بات رکھیں گی اگر میں آپ سے کہوں مجھے آپ کی مدد چاہیے۔" ذرا دیر کو ٹھہر کر بات سنتی ہوئی وہ اپنے کپڑے بیگ میں اڑس رہی تھی۔
"مجھے اپنا Ants everafter والی کی چین واپس چاہیے۔ کیا حنین اور زمر کے علم میں لائے بغیر آپ مجھے وہ دے سکتی ہیں؟ میں وعدہ کرتی ہوں دوبارہ آپ کو یا آپ کی بیٹی کو تنگ نہیں کروں گی۔" وہ بہت منت سے کہہ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگر پڑ جائے عادت آپ اپنے ساتھ رہنے کی
یہ ساتھ ایسا ہے کہ انسان کو تنہا نہیں کرتا

کینڈی کی اس کافی شاپ کے کچن میں سعدی کھڑے کھڑے کاؤنٹر پہ جھکا لیپ ٹاپ کی اسکرین دیکھ رہا تھا۔ جو وہ پڑھ رہا تھا وہ خوش کن بھی تھا اور اداس کرنے والا بھی۔ اس نے جو سورۃ شروع کی تھی ' کوئی اور اسے مکمل کر رہا تھا۔ قرآن انسانوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ انسان محتاج ہوتے ہیں۔ آپ نہیں کریں گے تو کوئی اور آجائے گا۔ دین کا کام ہوتا رہے گا۔ اس کا جیسے دل زخمی ہو گیا تھا مگر مسکرانے کا دل چاہ رہا تھا۔ پھر اسکرین فولڈ کر کے وہ اٹھا تو مونچو کے رونے کی آواز آئی۔ وہ چونک کر مڑا اور مستطیل کچن سے باہر آیا۔
باہر بوڑھا روپا سنگھی ' کیش کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اپنے موبائل پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ایڈوانس کی رقم ابھی تک اسے موصول نہیں ہوئی تھی۔ وہ ناخوش اور بے چین لگ رہا تھا۔ نگاہ اٹھا کر سعدی کو دیکھا جو باہر آرہا تھا ' جہاں کامنی کھڑی غصے سے مونچو کو جھڑک رہی تھی اور وہ مٹھی سے آنسو پونچھتا ' ہچکیاں بھر رہا تھا۔ ساتھ ہی دو خوب صورت کانچ کے پیالے نیچے چکنا چور ہوئے بکھرے تھے۔ کامنی غصے سے اسے سنہالی میں یقیناً ' کچھ ایسا کہہ رہی تھی جو ندرت برتن ٹوٹنے پہ اسے کہا کرتی تھیں۔
"کیا ہوا؟" سعدی رسان سے پوچھتا آگے آیا۔ کامنی خفگی سے اس کی طرف مڑی۔
"یہ لڑکا کبھی دیکھ کر نہیں چلتا۔ میرے نئے پیالے توڑ دیے۔" وہ صدمے میں تھی۔
"پیالے مونچو سے زیادہ قیمتی تو نہیں تھے ' کامنی۔" وہ نرمی سے کہتا آگے آیا اور پنجوں کے بل مونچو کے سامنے بیٹھا ' اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ بوڑھا روپا سنگھی آگے ہو کر دیکھنے لگا۔ کچھ تشویش ' کچھ اچنبھے سے۔
"صرف ان دو پیالوں کے لیے تم اتنے پیارے

مونچو کو ڈانٹ رہی ہو؟" مونچو اب اپنے ہاتھ چھڑاتا' سر جھکائے زور زور سے سسکنے لگا تھا' مگر سعدی نے اس کے ہاتھ نہیں چھوڑے۔

"کیا تھا جو یہ دیکھ کر چل لیتا۔"

"کامنی!" اس نے نظریں اٹھا کر سنہالی عورت کو دیکھا۔ "یہ برتن اسی وقت' اسی لمحے ٹوٹنے ہی تھے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ میری قسمت تھی کہ..."

"نہیں' یہ ان برتنوں کی "عمر" تھی جو ختم ہو گئی تھی۔" پھر مونچو کی طرف مڑا۔ "ہر چیز کی عمر ہوتی ہے' جب وہ عمر ختم ہو جاتی ہے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ سو برتن ٹوٹنے کا غم نہیں کرتے مونچو۔ یقین کرو اگر تم سے نہ ٹوٹتا یہ پیالہ تو تمہاری اس چڑیل جیسی ماں سے ٹوٹ جاتا۔"

مونچو آنسوؤں کے درمیان ہنس پڑا۔ روپا سنگھی بھی آگے ہو کر یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ کامنی کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ مسکرا دی۔ تب سعدی کھڑا ہوا۔ مونچو ننھی ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتا باہر کو بھاگ گیا تب وہ کامنی سے بولا۔

"میرا بھی باپ نہیں تھا۔ ہم بغیر باپ کے بڑے ہوئے تھے۔ بن باپ کے بچے کو سب کے سامنے نہ ڈانٹا کرو۔ وہ دلاسے کے لیے کس کس کے پاس جائے گا؟ اپنے بچوں کو شروع سے ہی اتنا تنہا نہیں کرنا چاہیے!"

وہ نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ روپا سنگھا کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹکنے لگا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر کتنی ہی دیر بعد وہ کچن میں آیا۔

"سنو!" سعدی دوبارہ لیپ ٹاپ کھول کر اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا' جب مضطرب اور بے چین سا روپاق سنگھی اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ "تم چلے جاؤ" سعدی نے گہرا سانس لیا۔ "سر! میں بہت جلد چلا جاؤں گا۔ آپ لوگوں کے لیے مسئلہ نہیں..."

"میں نے پوسٹر والے نمبر پر کال کر دی تھی۔ وہ جلد آجائیں گے۔ انہوں نے میری کولیشن بھی ٹریس کر لی ہوگی۔ پیسے نہیں بھیجیں گے وہ۔ تم۔ تم بھاگ جاؤ۔" وہ آنسو ضبط کیے جلدی جلدی بول رہا تھا۔ سعدی یوسف کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

زمین پیروں سے کتنی بار دن میں نکلتی ہے
میں ایسے حادثوں پہ دل مگر چھوٹا نہیں کرتا

قصر کاردار کے لاؤنج میں **علیشا** اپنا ٹرالی بیگ خود گھسیٹتی خاموشی سے میری کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔ ڈائننگ ہال میں سربراہی کرسی پہ بیٹھی' جوس کے گھونٹ بھرتی جواہرات نے ایک نظر اسے دیکھا' اور پھر سر جھٹک کر مصروف ہو گئی۔ احمر اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھا اسے ایک پریزنٹیشن دکھا رہا تھا۔ **علیشا** کو دیکھ کر اس نے ہولے سے سرگوشی کی۔

"اس لڑکی کو یہاں کیوں رہنے دیا آپ نے؟"

"تاکہ میرے دشمن اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ اس وقت اس کو اپنی نگرانی میں رکھنا ضروری ہے۔" احمر سر ہلا کر رہ گیا۔

اسی لمحے لاؤنج کا مرکزی دروازہ کھلا اور ہاشم نمودار ہوا۔ آستین کہنیوں تک موڑے' گریبان کا ایک بٹن کھلا تھا' کوٹ بازو پہ ڈالا ہوا تھا' چہرے پہ قدرے نقاہت تھی۔ ملازم ساتھ آرہے تھے' اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو گویا واپس پلٹنے کو کہا۔ چند قدم آگے آیا تو جواہرات تیزی سے ڈائننگ ہال سے ادھر آتی دکھائی دی۔ چہرے پہ تشویش تھی۔ احمر وہیں بیٹھا رہا۔

"ہاشم! تمہیں ابھی اسپتال میں رہنا چاہیے تھا۔ تم نے منع کر دیا ورنہ میں آجاتی۔" اس نے ہاشم کا بازو تھامنا چاہا مگر اس نے سختی سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور ایک برہم نظر اس پہ ڈالی۔ "میرے کاروبار کو اتنا بڑا دھچکا دینے کے بعد مجھ سے مخاطب بھی کیسے ہو سکتی ہیں آپ۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔"

جواہرات نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ آنکھوں میں خفگی اتری۔ "یہ ہم سب کا کاروبار ہے۔"

"نہیں ہے یہ ہم سب کا کاروبار۔" وہ غرایا تھا۔

جب میرے باپ کو اپنی سیاست اور آپ کو اپنے بیوٹی ٹریٹمنٹس سے فرصت نہیں تھی تو میں تھا جو اپنا خون جلا کر اس کاروبار کو پھیلا رہا تھا۔ یہ سب۔۔۔ میرا کمایا ہوا ہے۔" سینے پہ انگلی سے دستک دے کر تختی سے بولا تھا۔ "میں نہ ہوں تو آپ دونوں سڑک پہ آجائیں۔ مگر آپ۔۔۔ آپ نے میرا سوچے بغیر صرف اس بے غیرت آدمی کے لیے غلط لوگوں سے دشمنی مول لی۔ اس وقت میں آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"اوہ ڈونٹ یو ڈیئر!" وہ سرخ چہرے کے ساتھ غرائی تھی۔ "تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ میں کس کرب سے گزر رہی ہوں۔ تم دونوں کے لیے۔۔۔ تم دونوں کے لیے کیا کیا کر چکی ہوں میں، تم احساس بھی نہیں کر سکتے۔"

"واٹ ایور!" وہ ہوا میں ہاتھ کو جھٹک کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جواہرات پیر پٹختی واپس مڑ گئی۔ احمر نے سر جھکا لیا۔ اس نے ساری باتیں سن لی تھیں۔

نوشیرواں اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑا تیار ہو رہا تھا جب ہاشم اس کے دروازے کے باہر رکا۔ شیرو نے ذرا کی ذرا اسے دیکھا، پھر برش اٹھا کر بال سنوارنے لگا۔ ماتھے پہ خوامخواہ کے بل بھی ڈال لیے۔

"میں رات ہسپتال میں تھا۔" وہ سرد لہجے میں گویا ہوا مگر اس میں بھی آنچ تھی۔ شیرو کا برش کرتا ہاتھ رکا، پھر دوبارہ چلنے لگا۔

"معلوم ہے۔ جب آپ کی سیکرٹری نے بتایا کہ آپ کو ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے تو جانتا تھا میں، یہ بھی کوئی نیا جھوٹ ہو گا اور وہ کیا نکلا؟ صرف anxiety attack آپ لوگ تو بیماری میں بھی اپنا "ٹچ" نہیں چھوڑتے۔" تلخی سے وہ بولا تھا۔ "جب مجھے پٹوایا تھا اس لڑکے سے تو میں بھی ہسپتال داخل رہا تھا۔ آپ مجھے تب دیکھنے آئے ہوتے تو میں بھی کل آجاتا شاید۔"

"وہ میرے پیچھے نہیں آئے گا۔ کبھی بھی نہیں۔ میں نے اسے روح پہ زخم دیے تھے۔ اس کے اپنوں کو قتل کروایا تھا، مگر وہ میرے پیچھے نہیں آئے گا۔" اس کی بات کا اثر لیے بغیر ہاشم سپاٹ لہجے میں بولا تھا۔ شیرو بے اختیار گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"وہ۔۔۔ نوشیرواں۔۔۔ تمہارے پیچھے آئے گا۔"

نوشیرواں کا خون اس کی رگوں میں جم گیا۔ وہ یک ٹک ہاشم کو دیکھے گیا۔

"اور اب تم جتنا پچھتا لو۔۔۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم پچھتاتے ہو۔۔۔ مگر اب اس کا فائدہ نہیں ہے۔ وہ ایک دن تمہارے پیچھے آئے گا۔ وہ تمہیں گھسیٹے گا۔۔۔ یا انتقام کے لیے یا انصاف کے لیے اور اس دن نوشیرواں۔" انگلی اٹھا کر اس نے تنبیہہ کی۔ "اس دن تمہیں میری قدر ہو گی۔ اس دن تم جانو گے کہ جب میں کہتا ہوں، ہاشم سنبھال لے گا تو ہاشم کیسے سنبھالتا ہے اور اس دن تم چاہو گے کہ میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں اور میں۔" وہ سانس لینے کو رکا۔ نوشیرواں کا بھی سانس رکا۔ اسے لگا اب ہاشم کبھی اس کا ساتھ نہیں دے گا۔

"اور میں اس دن تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔ کیونکہ میں تمہارا بھائی ہوں۔"

وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا، اور نوشیرواں پہ کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا تھا۔ وہ زرد چہرے کے ساتھ ساکت و جامد کھڑا رہ گیا۔



بہت ہوشیار ہوں، اپنی لڑائی آپ لڑتا ہوں
میں دل کی بات مگر دیوار پہ لکھا نہیں کرتا

وہ کافی شاپ کے اوپر شفیع احمر کے لیے مختص کمرے میں روبا سنگھی کے سامنے کھڑا تھا اور بے بسی بھرے غصے سے کہہ رہا تھا۔ "اگر مجھ سے اتنی شکایت تھی تو مجھے کہا ہوتا، میں چلا جاتا۔ مگر ان لوگوں کو بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر انہوں نے مجھے جان سے مار دیا تو میرا خون آپ کی گردن پہ ہو گا۔"

"تم ہو کون جس پہ میں اعتبار کرتا؟ اس پوسٹر کے مطابق تم تامل جاسوس ہو۔ یہ میرا فرض تھا، ایک فوجی

ہونے کے ناتے کہ میں تمہاری رپورٹ کرتا۔" وہ کچھ پشیمان، کچھ بپھرا ہوا تھا۔

"بس کرو مسٹر روپا سنگھی۔" سعدی نے اکتا کر دونوں ہاتھ اٹھائے۔ "تم نے یہ صرف انعام کی رقم کے لیے کیا ہے۔" بوڑھا مزید طیش کے عالم میں کچھ اور بھی کہتا مگر دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور کامنی استفہامیہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھتی اندر داخل ہوئی۔

"باہر کوئی تم سے ملنے آیا ہے شفیع۔ وہ تمہاری تصویر دکھا کر پوچھ رہا ہے تمہارا۔" پھر باپ کو دیکھا۔ "آپ کیوں لڑ رہے ہیں اس سے؟"

سعدی کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ "پلیز اس کو میرا نہ بتانا۔ وہ مجھے ڈھونڈنے آنے والوں میں سے ہے۔"

کامنی مطمئن نہیں تھی مگر وہ واپس نیچے اتر گئی۔ کافی شاپ کے ہال میں آئی تو دیکھا' وہ کاؤنٹر کی ساتھ والی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ سیاہ رنگت' حبشی صورت اور سفید چمکتے دانت۔

"جی؟" وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"میں اس نئے لڑکے سے ملنا چاہتا ہوں جو سنا ہے جادوئی کرتب دکھاتا ہے۔"

"ہاں وہ بہت امیزنگ ہے۔ آپ اس سے مل کر بہت محظوظ ہوں گے۔ ابھی وہ باہر گیا ہے' گراکری شاپ تک۔ یہ تین بلاک چھوڑ کر۔ جیسے ہی آتا ہے میں آپ کو ملواتی ہوں۔ کچھ آرڈر کریں گے آپ؟" وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

"نہیں۔" فصیح کھڑا ہو گیا۔ "کس شاپ تک گیا ہے وہ؟ پتا سمجھا دیں گی آپ مجھے؟" اس کو پتا سمجھا کر وہاں سے بھیج کر کامنی اوپر آئی تو وہ دونوں ابھی تک لڑ رہے تھے۔ سعدی کا بیگ اس کے کندھے پہ تھا۔

"وہ چلا گیا ہے۔ اب مجھے بتاؤ' یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں۔" روپا سنگھی ذہنی تناؤ اور مایوسی سے بپھر کر بولا۔ "یہ لڑکا فراڈ ہے۔ تامل جاسوس ہے۔ کولمبو میں اس کی تصویر کے most wanted پوسٹر لگے ہیں۔ یہ ہمیں بھی دھوکا دے رہا تھا۔"

کامنی نے نا سمجھی سے سعدی کو دیکھا۔ وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔

"نہیں پاپا! اس کی گرل فرینڈ کی فیملی امیر ہے' تو وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں اور....."

"کوئی لڑکی نہیں ہے کامنی! اس کی کوئی لو اسٹوری نہیں ہے۔ یہ دہشت گرد ہے۔"

"میں دہشت گرد نہیں ہوں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"مگر تم ایک قاتل ہو۔ میرے ایسوسی ایٹ کو زہریلے چین سے ہلاک کر کے بھاگنے والے قاتل ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں' سعدی یوسف؟"

بوٹ کی ٹھوکر سے دروازہ کھول کر..... فصیح کا سیاہ چہرہ چوکھٹ میں نمودار ہوا۔ کامنی ایک دم ڈر کر پیچھے ہٹی۔ روپا سنگھی کا رنگ اڑ گیا۔ سعدی نے پتھرائے ہوئے سنجیدہ چہرے کے ساتھ ایک دم پستول نکال کر اس پہ تان لیا۔

"کیا اس نے آپ لوگوں کو اپنا صحیح نام بھی نہیں بتایا؟" فصیح نے چوکھٹ میں کھڑے ہو کر مسکرا کر پوچھا تھا۔ کامنی نے ایک نظر سعدی پہ ڈالی۔ اس نظر میں سب کچھ تھا۔ صدمہ' بے اعتباری' یقین ٹوٹنے کا دکھ۔ مگر سعدی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پستول تانے' نظریں فصیح پہ گاڑے ہوئے تھا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ فصیح' ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔"

"نہیں' تم اگلے ہی لمحے پستول نیچے کر دو گے جب تم یہ دیکھو گے۔" یہ کہتے ہی فصیح' جو چوکھٹ سے لگ کر کھڑا تھا' ذرا بائیں طرف کو ہوا اور..... اپنے دائیں ہاتھ سے کسی کو کھینچ کر اپنی ٹانگ کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ ڈرا سہما سا مونچو جس کے منہ پہ ڈکٹ ٹیپ بندھی تھی اور ہاتھ بھی کمر پہ ٹیپ سے بندھے تھے۔ آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکل کر گال پہ لڑھک رہے تھے۔ کامنی کی بے اختیار چیخ نکلی تھی۔

روپا سنگھی بھی چلایا تھا۔ "یہ بچہ ہے' اس کو چھوڑ دو

"یہ میرا نواسا ہے۔ تمہیں خبر دینے والا میں تھا۔"
فصیح نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے پستول بچے کے سر پہ لگا رکھا تھا۔ سعدی نے ایک لفظ کہے بنا پستول زمین پہ ڈال دیا۔
"بچے کو چھوڑ دو۔"
"پہلے تم یہ پہنو۔" اس نے ہتھکڑی کے دو باہم جڑے کڑے میز پہ ڈالے۔ ادھر روپا سکھی مسلسل اسے بچے کو چھوڑنے کا کہہ رہا تھا۔ کامنی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکل کر چہرے پہ لڑھکتے گئے۔ وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔
"اوکے! سعدی چند قدم آگے آیا' کامنی کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ "تمہارے بچے کو کچھ نہیں ہو گا۔" مگر اس نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تو اس نے خاموشی سے ہتھکڑی اٹھائی' اور اپنے ہاتھ کو پیچھے کو باندھ کر ہتھکڑی پہن کر کلک کی آواز سے بند کر دی۔
"اب میرے آگے چلو۔" فصیح نے کہتے ہوئے اپنا کوٹ اتارا' اور سعدی کے کندھوں پہ ڈال دیا۔ اب اسے دیکھنے پہ یہ پتا نہیں لگ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہیں۔
فصیح بچے کو اپنے ساتھ گھسیٹے' سعدی کو آگے ہنکاتے' سیڑھیاں اتر کر دکان کی پچھلی سمت سے باہر نکلا۔ بچے کو اس نے سیڑھیوں کی ابتدا پہ چھوڑ دیا اور خود سعدی کے پیچھے چلتے ہوئے اسے مسلسل "سیدھا چلو' اب دائیں مڑو۔" کہتا آگے بڑھتا گیا۔ سعدی کندھوں پہ لمبا کوٹ ڈالے' سنجیدہ چہرے کے ساتھ چلتا گیا۔
صبح کے وقت گلیوں میں رش تھا۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ہر شخص اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ کسی دوسرے کی فکر سے بے پروا۔ ایسے میں وہ خاموشی سے فصیح کے آگے چلتا جا رہا تھا۔ وہ بھاگتا تو فصیح سائلنسر لگے پستول سے اسے گولی مار دیتا' وہ جانتا تھا۔
ایک جگہ سڑک کنارے چلتے چلتے فصیح نے اسے پہاڑی سے اتر جانے کی ہدایت دی۔
"تم مجھے کسی ویران جگہ پہ لے جانا چاہتے ہو تاکہ مجھے مار سکو' اوکے۔" وہ سر کو خم دیتا' جو گر زڈھلان پہ رکھتا نیچے اترنے لگا۔
"بکواس نہیں کرو۔ چپ چاپ اترو۔" وہ گرج کر بولا۔
"سزائے موت کے مجرم سے بھی اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ مجھ سے نہیں پوچھو گے؟ میں جانتا ہوں' ابھی واپس جا کر تم کامنی کے خاندان کو بھی مار دو گے۔"
"اس کا انتظام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔" سعدی چونکا مگر فصیح نے پیچھے سے پستول کا ٹھوکا دیا تو وہ آگے چلنے لگا۔
وہ دونوں چلتے چلتے ایک پہاڑی گھاٹی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چائے کے باغات کی سوندھی مہک یہاں بھی محسوس ہوتی تھی۔ اوپر آسمان پہ مطلع صاف تھا۔ مگر دھوپ نہیں تھی۔ سورج کسی اوٹ میں تھا۔ اس پہاڑی گھاٹی میں ایک جگہ فصیح نے اسے رک جانے کو کہا۔
"یہاں گھٹنوں کے بل بیٹھو۔"
"تاکہ تم میری گردن اتار سکو۔ ٹھیک ہے!" وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھ گیا۔ کندھوں پہ کوٹ تھا' ہاتھ پیچھے بندھے تھے۔ گردن موڑ کر اس نے فصیح کو دیکھا تو چہرے پہ سکون تھا۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مگر کامنی کے خاندان کے لیے کیا انتظام کیا ہے تم نے؟ بتا دو!"
فصیح اب پستول اس پہ تانے' اس کی پیشانی کا نشانہ لیے سامنے آکھڑا ہوا۔ "وہ میرا اور تمہارا چہرہ دیکھ چکے ہیں۔ اس کافی شاپ کے ہر شخص کی موت کے ذمہ دار تم ہو۔"
"کیا کیا ہے تم نے؟" سعدی کا دل زور سے دھڑکا۔ "کیا تم نے ان کی شاپ میں کوئی بم وغیرہ فٹ کیا ہے؟"
"میں اتنے پیچیدہ چکروں میں نہیں پڑا کرتا۔ کچن میں داخل ہو کر میں نے ابلتے دودھ کے دیگچے میں دو

گھونٹ جتنا بے ذائقہ زہر ملایا تھا۔" پھر اس نے جیسے سوچنے کی اداکاری کی۔ "اسی دودھ سے ابھی سب کی کافی بنے گی، چائے بنے گی، بچہ بھی وہی دودھ پیئے گا نا۔ بیچ بیچ بے چارے۔"

سعدی نے لب بھینچ لیے۔ "دیکھو! مجھے مارنا ہے تو مار دو تم مجھے مگر مجھے ایک دفعہ ان کو کال کر کے بتانے دو کہ دودھ زہریلا ہے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا نہ کرو۔"

"سوری... یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ اب بھی پستول اس پہ تان کر ایک آنکھ بند کیے نشانہ لیے ہوئے تھا۔ "اگر کسی صورت میں انہوں نے دودھ ضائع کر دیا تب بھی میں جا کر ایک ایک کو حادثاتی موت کا نشانہ دوں گا کیونکہ وہ سب میرا چہرہ دیکھ چکے ہیں۔"

سعدی نے سر جھکایا اور گہرا سانس لیا "یعنی فصیح، مجھے تمہیں روکنے کا مستقل انتظام کرنا ہو گا؟"

"تم مجھے باتوں میں الجھانا چاہتے ہو؟" اس نے پستول سعدی کی پیشانی پہ رکھی۔ ٹھنڈی نال اس کی جلد سے جیسے ہی ٹکرائی، اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔

"کلمہ پڑھ لو۔" فصیح نے غرا کر کہا۔

سعدی نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "تم بھی!" اور اگلے ہی لمحے سعدی نے کوٹ سے ہاتھ نکال کر اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر مروڑا... اور تیزی سے اٹھ کر فصیح کو گردن سے دبوچ لیا تھا۔

فصیح تڑاتڑ ٹریگر دباتا گیا۔ گولیاں سامنے فضا میں گم ہوتی گئیں مگر سعدی اس کی پشت پہ آ کھڑا ہوا تھا اور اپنے بازو کے شکنجے میں اس کی گردن کس لی تھی۔ فصیح اس کے بازوؤں کے نرغے میں پھڑپھڑاتا، مسلسل زور لگاتا، پستول کا رخ پیچھے کو موڑنے لگا، مگر اس سے پہلے کہ وہ پیچھے کی طرف گولی چلا سکتا، سعدی یوسف نے اپنی آنکھیں بند کر کے، زور سے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔

فصیح کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا۔ زندگی کی ڈور بھی ٹوٹ گئی۔ اس نے ہچکی کی سی صورت آخری سانس لی۔ اور پھر... گردن ڈھلک گئی۔

سعدی نے اپنے بازو ہٹا دیے۔ فصیح کا مردہ جسم زمین پہ گر گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں کوئی تاثر نہ تھا۔ تاثر تو سعدی کی آنکھوں میں بھی نہ تھا۔ وہ سرد سپاٹ چہرے کے ساتھ پیر کی ٹھوکر سے اس کی لاش کو لڑھکاتا گیا یہاں تک کہ لاش پہاڑی کے کنارے پر آرکی۔ سعدی نے ایک اور ٹھوکر ماری، اور لاش لڑھک کر خاردار جھاڑیوں بھری ڈھلان سے نیچے گرتی چلی گئی۔ دور نیچے... اندھی کھائی میں۔

اس نے فصیح کا کوٹ بھی اچھال کر نیچے پھینکا، پھر اس کا موبائل اٹھا کر جیب میں ڈالا۔ اور دونوں ہاتھ جھاڑتا وہ اوپر ڈھلان پہ چڑھنے لگا۔ چہرہ سنجیدہ تھا۔ بے تاثر اور سرد... دل کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔

معرکے کی اس جگہ پہ کھلی ہوئی ہتھکڑی اور اس کے لاک میں پھنسی سیاہ بوبی پن زمین پہ گری ہوئی تھی۔ یہ کامنی کی ہیئرپن تھی جو اس نے جاتے سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے وقت اتاری تھی۔ اور اس کو سارا راستہ کوٹ کے اندر چھپے ہاتھوں کی ہتھکڑی میں گھساتے وقت اس کے ذہن میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ "لاک کی چھ پنیں... ون، ٹو، تھری، فور، فائیو... سکس اور کلک۔"



یارب یہ کس نے ٹکڑے کیے روز حشر کے
مجھ کو تو گام گام پہ محشر بپا ملا

سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے میں نا شتے کی خوشبو پھیلی تھی۔ زمر تیار ہو کر کمرے سے باہر نکل رہی تھی، اور دوسرے ہاتھ سے گیلے گھنگھریالے بال کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی، جب ندرت نے اسے پکارا۔ وہ ہاتھ میں کفگیر لیے سامنے کھڑی تھیں۔ قدرے متفکر، قدرے متحیر۔

"مجھے علیشا کا فون آیا تھا۔ وہ جو حنین کی امریکی

سہیلی ہے۔" اور یہ تو طے تھا کہ یوسفز اب باتیں نہیں چھپائیں گے' سو وہ اسے تفصیل سے بتا رہی تھیں۔ وہ قدرے حیرت سے سنتی گئی۔

"آپ اسے کہیے گا وہ کی چین سعدی کے ساتھ کھو گیا تھا۔ باقی معاملہ میں دیکھ لوں گی۔" اس کا فون بجنے لگا تو وہ اسے کان سے لگاتی اسی رفتار سے بولتی آگے آئی۔

"جی' میں کل آ نہیں سکی' ایک عزیز کی عیادت کے لیے چلی گئی تھی' تو پھر آج۔۔۔" رک کر اس نے کچھ سنا۔ پہلے آنکھوں میں حیرت ابھری' پھر شاک۔

"کیا مطلب انہوں نے ڈیل سائن کرلی؟ وہ میرے کلائنٹس تھے۔ ان کو کیسے پتا تھا کہ میں نہیں آؤں گی؟ اوہ۔۔۔" اور احساس انکشاف جیسا تھا۔ اس نے کراہ کر آنکھیں بند کیں۔ "میں سمجھ گئی۔ انہیں ہاشم کاردار نے کہا ہو گا کہ زمر یوسف کو میں نے بے کار ڈاکومنٹس لکھوانے اپنے پاس روک رکھا ہے سو تم لوگ اس کے کلائنٹس کو خراب کردو۔ واؤ۔ اس آدمی کا دماغ ہسپتال کے بیڈ پہ بھی ۔۔۔ تخریب کاری سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا' اور میں اس کی تیمارداری کررہی تھی۔" فون بند کر کے وہ خود کو کوس رہی تھی۔ چہرہ غصے میں سرخ ہو رہا تھا۔

سامنے بیٹھی چائے کے مگ سے گھونٹ بھرتی حنین نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ "اور آپ نے ہاشم سے انسانی ہمدردی کے تحت اتنا اچھا موقع گنوا دیا اس کی فائلز کاپی کرنے کا۔" زمر چند لمحے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی' پھر تیزی سے اندر گئی اور واپس آئی تو حنہ کی فلیش ڈرائیو اس کے سامنے پٹخی۔

"میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اگر میں اس وقت ہاشم کی فائلز کاپی کرتی تو مجھ میں اور اس میں کیا فرق ہوتا؟ اور یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا تمہیں اتنی چال باز لگتی ہوں کہ وہ زمین پہ گرا کراہ رہا ہو گا اور مجھے فائلز کی فکر ہو گی۔"

"تو؟" حنین نے کندھے جھٹکے۔

"تو یہ کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں نے فائلز کاپی نہیں کیں' میں نے تو صرف ایک سوال پوچھا تھا۔" حنین نے بے اختیار مگ والا ہاتھ نیچے کیا۔ وہ ششدر رہ گئی تھی۔ زمر دونوں ہاتھ میز پہ رکھ کر اس کی طرف جھکی۔ "اور جواب یہ ہے کہ میں اتنی ہی چال باز ہوں' اور اگر اب میرے اور اس کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے تو نہ سہی! مگر۔۔۔ ہاشم کی ساری فائلز اس میں ہیں۔"

حنین نے بے یقینی سے فلیش کو دیکھا اور پھر اسے۔

"اس کا لیپ ٹاپ آن تھا' پاس ورڈ کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کے آفس میں کوئی سی سی ٹی وی بھی نہیں ہے جو کوئی مجھے اس ساری افراتفری میں یہ کرتے دیکھ سکتا۔ ساری فائلز بھی رات کو کھول دیکھ چکی ہوں۔ وارث غازی والی فائلز وہ کب کی ڈیلیٹ کر چکا ہے مگر۔۔۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔۔۔ سینکڑوں ڈاکومنٹس ہیں اس میں جو ہمارے کام آسکتے ہیں۔ انسانی ہمدردی ایک طرف حنین' میں۔۔۔ اتنی جلدی سب بھلانے والی نہیں ہوں۔" اور میز پہ ہاتھ مارا تھا۔

حسینہ نے ناشتہ بناتے مڑ کر اسے دیکھا۔ (یہ غصہ ہو رہی ہے اور آگے سے حنین باجی خوش ہو رہی ہے۔ پاغل ہیں دونوں!)

حنین فرط مسرت سے اٹھی اور زمر کے دونوں ہاتھ تھام کر دبائے۔ "آپ' آپ میری ملکہ ہیں۔" اور جھپٹ کر وہ فلیش اٹھا کر اندر بھاگی۔ زمر کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے' مسکرا کر سر جھٹکتی وہ پرس اٹھائے' بال ٹھیک کرتی' بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

حنین اگلے دو گھنٹے ان فائلز میں محو ہو کر بیٹھی رہی۔ لاؤنج کے صوفے پہ نیم دراز' (حسینہ سے بنوائے) آلو کے چپس کھاتی' وہ صفحات پہ صفحات آگے کرتی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ تبھی گھنٹی بجی۔

اس وقت گھر پہ ابا اور حنین کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

سیم اسکول، ندرت ریسٹورانٹ، زمر کورٹ۔ ملازم اپنے کوارٹر میں۔ وہ بادل نخواستہ اٹھی اور باہر آئی۔ پورچ سے ہی اسے گیٹ کے باہر کھڑا احمر نظر آگیا تھا۔
وہ چہرے پہ نخوت لائے، چند قدم آگے آئی۔
"آ۔۔۔ السلام علیکم۔۔۔ پھپھو گھر پہ نہیں ہیں۔"
وہ اس کی طرف گھوما۔ گیٹ چھوٹا تھا۔ کندھوں سے اوپر وہ دکھائی دیتا تھا۔ ذرا سا مسکرایا۔ "میں آپ سے بات کرنے آیا تھا۔"
"جی!" وہ سنجیدگی سے اسے دیکھتی تھوڑا مزید آگے چل کر آئی، پھر رک گئی۔ گیٹ درمیان میں حائل تھا۔
"وہ کیا ہے مس یوسف کہ کچھ دن سے کوئی مسلسل ہمارے یعنی کاردار کے سسٹم میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا، یا پھر مجھے کہنا چاہیے، کر رہی تھی، (حنین کی رنگت سفید پڑی) تو میں نے سوچا کہ بنفس نفیس جا کر آپ کو۔۔۔ حنین یوسف آپ کو ایک مہذب اور شائستہ سی وارننگ دے دوں کہ ایسی بچکانہ حرکتیں نہ کیا کریں۔ ہمارے سسٹم کی حفاظتی دیواروں کو آپ نہیں توڑ سکتیں، لیکن اگر آپ نے دوبارہ کوئی ایسی حرکت کی تو میں مجبور ہو جاؤں گا، آپ کے بارے میں آپ کے گھر والوں کو بتانے پہ۔"
حنین بالکل شل سی ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔
"کیا آپ کی امی جانتی ہیں؟ اور آپ کے دادا؟ کہ آپ کی زندگی ایک جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آپ کا بورڈ میں ٹاپ کرنا بھی تو ایک جھوٹ تھا نا۔ آپ نے او سی پی کو بلیک میل کیا تھا، میرے پاس آپ کی اور او سی پی کی بیٹی کے پیغامات کے پرنٹ آؤٹ پڑے ہیں۔ تو اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے جھوٹ سے پردہ نہ اٹھاؤں تو آئندہ میری ورک پلیس پہ مسئلے نہ کھڑے کیے جائیں۔ سنا آپ نے؟"
وہ رسان مگر تلخی سے کہہ کر اپنے گریبان میں اٹکے مہنگے گلاسز نکال کر، آنکھوں پہ لگا کر کار کی چابی کے ریموٹ کا بٹن دباتا مڑ گیا۔ حنین کے حلق میں بہت سے آنسو پھنسے تھے مگر آنکھیں خشک تھیں۔۔۔ وہ یک ٹک، ساکت پتھر بنی وہیں کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

محسن ہمیں یہ سوچ کے کرنی پڑی پہل
شاید وہ شخص آج بھی قید انا میں ہو

فوڈلی ایور آفٹر کی بالائی منزل کے خالی ہال میں دھوپ اونچی کھڑکیوں سے چھن کر اندر گر رہی تھی۔ کونے والی میز پہ زمر بیٹھی لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کرتی وقفے وقفے سے گردن کو دائیں بائیں حرکت دیتی۔ تھکاوٹ سے پٹھے گویا اکڑنے لگے تھے۔ تب ہی انٹرکام بجا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "جی؟"
"مسز زمر!" نیچے ریسیپشن والی لڑکی تھی۔ "ایک کلائنٹ ہیں آپ کے لیے۔" وہ ذرا رکی۔ "کہہ رہے ہیں کہ بیوی سے جھگڑا ہوا ہے، لیگل ایڈوائس لینی ہے۔"
"میں فیملی کورٹ میں پیش نہیں ہوتی۔" وہ بے زاری سے بولی، پھر سر جھٹکا۔ "اچھا بھیج دو۔" اور نظریں کی بورڈ پہ جھکائے ٹائپ کرنے لگی۔
چند ثانیے بعد مدھم آہٹ سے دروازہ کھلا۔ زمر نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کی انگلیاں ساکت ہوئیں۔ وہ اس کا پرفیوم پہچانتی تھی۔ اس سے سر اٹھایا نہیں گیا۔ وہ قدم بہ قدم چلتا قریب آتا گیا۔ زمر کی جھکی آنکھیں جھکی رہیں، البتہ چہرے پہ بہت سے رنگ آکر غائب ہوئے۔ دل زور سے دھڑکا۔ وہ میز کے پاس آرکا۔
"فیملی کورٹ میں پیش ہوں یا نہ ہوں، کسی بھی وقت فیملی کورٹ ضرور لگا لیتی ہیں آپ۔ جج، جیوری اور جلاد بھی خود ہی بن جاتی ہیں۔" میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکا تو اس نے پلکیں اٹھائیں۔ نظریں ملیں۔ وہ ویسا ہی تھا۔ ویسے ہی بال، وہی گرے سویٹر، وہی مسکراتی سنہری آنکھیں۔ البتہ اس کو دیکھنا۔۔۔ اتنے دن بعد۔۔۔ کتنا اچھا لگا تھا۔ لمحے بھر کو وہ بھول گئی کہ ان کی آخری لڑائی کس بات پہ ہوئی تھی۔ بدقت اس نے چہرے پہ چھائی سنجیدگی برقرار رکھی۔
"ادھر بیٹھ جاؤں یا یہ کرسی بھی آپ کی طرح کاٹتی

ہے؟" اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"بیٹھیے۔" وہ رکھائی سے کہہ کر اسکرین کو دیکھنے لگی۔ کون سا لفظ لکھنا تھا' کون سا مٹانا تھا' اب کہاں یاد تھا؟

وہ سامنے کرسی پہ بیٹھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور ٹیک لگا کر دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔ زمر کو یاد آ ہی گیا کہ وہ کیوں ناراض تھی؟

"اکیلے ہی واپس آ گئے؟ اپنی دوسری بیوی کو ساتھ نہیں لائے۔"

"تیسری!" اس نے تصحیح کی۔

"اوہ ہاں' تیسری!" وہ ضبط سے بولی۔ "میں بھول گئی تھی کہ تمہیں شادیاں کرنے اور بیویوں کو مارنے کا کتنا شوق ہے۔"

"شوق کا پھر کوئی مول تو نہیں ہوتا نا۔" (وہ اندر تک جل گئی۔)

فارس سنجیدہ ہوا' اور خفگی سے اسے دیکھا۔ "ایسا لگتا ہوں میں تمہیں کہ اسے یہاں لے آؤں گا؟"

زمر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کا مان بھرا انداز۔۔۔ دل چاہا ناراضی ختم کر دے۔

"کیوں لاؤں گا اسے میں یہاں؟ تیسری بیوی کو تو الگ گھر لے کر دینا چاہیے نا۔"

چلو جی! اس کا سارا موڈ غارت ہو گیا۔ زور سے لیپ ٹاپ پرے کیا اور اس کو غصے سے دیکھا۔ "یہاں کیوں آئے ہو؟"

"یہ دیکھنے کہ تمہیں واقعی پروا نہیں ہے کیا؟" وہ بالکل سنجیدہ تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"تم اس کے اپارٹمنٹ میں تھے۔ اس کے ساتھ۔" اس کی آواز کانپی۔

"اتنے دن میں' اتنا تو سوچ بچار کر کے ہی آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس نے وہ الفاظ آپ کو سنانے کے لیے جان بوجھ کر کہے تھے۔"

وہ لمحے بھر کو رکا۔ زمر اسی طرح اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھے گئی۔

"تم اس بات پہ ناراض نہیں ہو زمر! بلکہ اس لیے ہو کہ میں نے تم سے سچائی چھپائی۔"

"ہاں میں اسی لیے ناراض ہوں۔" اس نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔ "تم نے مجھ سے ہمیشہ جھوٹ بولا جبکہ میں نے تمہیں ہمیشہ سچ بتایا۔"

"ہاں! مگر جب تمہیں ہاشم کی حقیقت پتا چلی تو تم نے مجھے نہیں بتائی۔"

"میں تمہارے لیے فکرمند تھی' تمہارا بچاؤ کر رہی تھی۔"

"میں بھی یہی کر رہا تھا۔"

"تم انتہائی دو نمبر انسان ہو' اور نہ صرف دو نمبر بلکہ۔۔"

"سوری۔ آئندہ ہمیشہ سچ بولوں گا۔" اس نے چھ لفظوں میں سارا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ اب وہ کیسے اس سے اس بات پہ لڑے' جس پہ وہ ناراض تھی ہی نہیں؟ چند لمحے کے لیے بالکل چپ ہو گئی۔

"اوکے' آئندہ سچ بولنا مجھ سے۔ بھلے کسی کے بھی اپارٹمنٹ میں کسی کے بھی ساتھ ہو' سچ سچ بتا دینا۔" پھر سے رکھائی سے بول کر کی بورڈ پہ کچھ ٹائپ کرنے لگی۔

وہ بے اختیار ہنس دیا۔ "جب تم جلتی ہو نا' تو سارے کمرے میں دھواں بھر جاتا ہے۔ مت جلا کرو اس سے۔ تم میری محبت ہو۔ مانا کہ وہ تم سے زیادہ خوب صورت' زیادہ پیاری' زیادہ سلجھی ہوئی' شائستہ اور نرم مزاج کی ہے' مگر تم۔۔۔"

بس بہت ہو گیا تھا۔ زمر نے جھٹکے سے لیپ ٹاپ کی اسکرین بند کی۔

"ہاں میں جلتی ہوں۔ سنا تم نے۔" وہ غرائی تھی۔ "میں جلتی ہوں اور اگر آئندہ تم مجھے اس کے بیس فٹ قریب بھی نظر آئے تو میں تمہارے ساتھ اتنے بے رحمانہ انداز میں پیش آؤں گی کہ۔۔۔"

"جو آٹھ سال کرتی رہی ہو' رحم تو وہ بھی نہیں تھا۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔ زمر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

چند گہرے سانس لیے۔

"خیر اگر تم نے کوئی اور بات نہیں کرنی تو تم جا سکتے ہو۔" وہ روکھے روٹھے انداز میں کہہ کر کام کرنے لگی۔

"میں سعدی سے ملا تھا۔"

زمر نے اتنی تیزی سے گردن اٹھائی کہ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی۔ آنکھوں میں بے یقینی سی بے یقینی در آئی تھی۔ "کب؟ کہاں؟ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

وہ ایک دم اٹھی اور گھوم کر اس کے ساتھ والی کرسی پہ آبیٹھی۔ بے چین، بے قرار سی۔

"وہ کچھ دن تک آجائے گا۔ وہ ٹھیک تھا۔ ڈونٹ وری۔" وہ نرمی سے کہنے لگا مگر وہ اب اس طرح پرسکون نہیں رہ سکتی تھی۔

"پلیز مجھے بتاؤ۔ تم اس سے کیسے ملے؟ کہاں ملے؟ وہ کیسا ہے؟" اس کی آنکھیں نم تھیں اور اس نے بے اختیار فارس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ بے تابی سی بے تابی تھی۔

"یہ دیکھو۔" اس نے نرمی سے ایک ہاتھ چھڑایا اور سیل فون نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میں نے تمہارے لیے اس کی ایک تصویر لی تھی۔ ورنہ میں تو ہوں ہی جھوٹا۔ تم کہاں مانتیں کہ میں اس سے ملا تھا۔"

زمر نے بے تابی سے فون پکڑا۔ اسکرین پہ وہ دونوں نظر آرہے تھے۔ رات کا وقت، ریسٹورنٹ کا منظر۔ اور وہ کھانا کھا رہے تھے۔

"اس کے بال دیکھو۔ اس نے کٹوا دیے اور..."

"سعدی کے منہ پہ چوٹ کیسی ہے؟" وہ تصویر زوم کرکے ایک دم بولی تھی۔ سعدی کے ہونٹوں کا زخم اور گال کی سوجن صاف نظر آرہی تھی۔ فارس غازی کی بولتی بند ہوئی۔ بے اختیار سر کھجایا۔

"آ... یہ چوٹ؟" اس نے تھوک نگلا۔ "شاید کسی نے مارا تھا اسے۔" (اب کسی کی تفصیل میں وہ نہیں جا سکتا تھا۔)

"کس نے؟" وہ غصے سے بولی تھی۔ اسکرین پہ انگلی پھیرتی، تصویر کو چھو کر محسوس کرتی، وہ بہت مضطرب نظر آنے لگی تھی۔

"پتا نہیں۔ اس نے... بتایا نہیں۔" فارس نے بات بدلنی چاہی۔ "تم نے اس کے بال دیکھے؟ بالکل..."

"اللہ غارت کرے ایسے لوگوں کو۔ ہاتھ کیوں نہیں ٹوٹ جاتے ان کے۔ قہر نازل ہو ان پہ اللہ کا..." وہ بولتی جارہی تھی اور فارس نے بہت بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ "اچھا ٹھیک ہے، بس کرو۔"

"نہیں، کس نے حق دیا ہے ان لوگوں کو کہ وہ اس کے ساتھ یہ سب کریں۔ وہ کتنی مشکل میں ہوگا۔ وہ کتنا پریشان ہوگا۔ پلیز اسے واپس لے آؤ۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اتنے ماہ بعد... سعدی کی تصویر دیکھنا... جذبات ابل رہے تھے۔ نم آنکھوں سے اس نے فارس کو دیکھا۔ "وہ تم سے ملا تو کیسا تھا؟ تم اس سے کیسے ملے؟ تم نے اسے گلے لگایا؟ اسے پیار کیا؟"

اور فارس غازی نے ایک نظر میز پہ ڈالی جہاں خونخوار نوکیلی نوک والے قلم رکھے تھے۔ ایک تیز دھار پیپر نائف بھی پڑی تھی۔ اور چند بھاری، وزنی پیپر ویٹ بھی جو کسی بھی انسان کو قتل کرنے کے لیے کافی تھے۔

اس نے گہری سانس لی اور جبراً مسکرایا۔

"میں... میں اس سے بہت اچھے سے ملا۔ ایک ریسٹورنٹ کا پتا دیا تھا اسے۔ وہ وہاں آگیا، میں اس سے گلے ملا، اس کا ماتھا چوما، اسے تسلی دی کہ اب وہ میرے ساتھ ہے، اس کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ اس کے زخم... منہ والے زخم کے لیے اسے آئس پیک لا کر دیا اور..." وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ (بیڑہ غرق ہو سچائی کا) اور زمر بہت ممنونیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کتنے اچھے، لونگ، کیئرنگ ہو تم۔ سوری، میں تم سے اتنے دن ناراض رہی۔ میرا کیا ہے۔ میں تو ایک زمانے میں سمجھا کرتی تھی کہ تمہیں لوگوں کو مارنے پیٹنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ کتنی غلط تھی میں تمہارے بارے میں۔"

اور فارس جبراً" مسکرا کر کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔



کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا!

اس سکس اسٹار ہوٹل کے ہال کی گول میزیں مہمانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ پہلی صف میں ایک طرف کیمرہ مین اور رپورٹرز کی واضح اکثریت کھڑی نظر آتی تھی جو دھڑا دھڑ ڈائس پہ کھڑے شخص کی تصاویر اتار رہے تھے، ویڈیو بنا رہے تھے۔ اور ایش گرے سوٹ میں ملبوس وہ وجیہہ سا ہاشم کاردار تھا۔ ڈائس پہ نصب آدھ درجن مائیکس میں بول رہا تھا اور سب دم سادھے اسے سن رہے تھے۔

"مجھے آج اس فورم پہ کھڑے ہو کر چند دن قبل ہونے والے اپنے سب سے بڑے پلانٹ کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے کسی بھی قسم کا افسوس نہیں ہو رہا۔"

فضاؤں میں کوئی اداس سا نغمہ بج رہا تھا۔ ہولے ہولے۔ دھیرے دھیرے۔ ایک سکوت سا تھا۔ جیسے ہر کوئی انتظار میں ہو۔ "افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ اگر میں اس انگزائٹی اٹیک سے مر بھی جاتا، گو کہ میں بہت ڈھیٹ ہوں، (ہال میں قہقہہ بلند ہوا) تو میں اس پچھتاوے کو لے کر دنیا سے جاتا کہ میں لوگوں کی خیر کے لیے جتنا کر سکتا تھا، اتنا نہیں کر سکا۔"

کولمبو کے ساحل سے دور ایک لانچ سمندر کے نیلے پانی پہ تیر رہی تھی۔ اس کے اندرونی کیبن میں کرنل خاور بیٹھا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی، آنکھوں پہ عینک تھی، اور وہ بار بار گھڑی دیکھتا تھا۔ سعدی یوسف کی تلاش ترک کر کے وہ اپنے مالک کو مناتے واپس جا رہا تھا۔

"اور میرے ان سب دوستوں، وفادار ساتھیوں کا شکریہ جنہوں نے مجھے احساس دلایا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب میں اپنی زندگی لوگوں کی بھلائی کے لیے وقف کر دوں۔"

کینڈی میں اس کافی شاپ کے کچن میں کھڑے، سعدی یوسف کا چھوٹا بھدا سا موبائل بجا تھا۔ اس نے پیغام پڑھا اور چپ چاپ باہر نکل آیا۔ چند گلیاں پیدل چلتا گیا، یہاں تک کہ سڑک کنارے نصب ایک کوڑے دان کے پاس رکا۔ احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا پھر ڈھکن کھولا۔ چند بدبودار شاپر ہٹائے تو اسے وہ نظر آ گیا۔ سیاہ پلاسٹک ریپر میں لپٹا پیکٹ۔ اس نے اسے نکال کر کھولا۔ اندر سبز پاسپورٹ تھا اور اس پہ اسی کی تصویر لگی تھی۔ چھوٹے بال، داڑھی، سبز آنکھوں کے ساتھ۔ وہ ہلکا سا مسکرایا اور اسے جیب میں ڈال لیا۔

"کیونکہ جب تک انسان اپنی ذات سے باہر نکل کر دوسروں کی بھلائی کے لیے نہیں سوچتا، وہ مکر کرتا ہے، سازشیں کرتا ہے، جھوٹ بولتا رہتا ہے اور ایسے لوگ تو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔"

حنین بالکل نارمل سی، پتھرائے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنے کمرے میں کھڑی تھی۔ پرنٹر نے زوں زوں کی آواز کے ساتھ ایک کاغذ باہر اگلا، جسے اس نے اٹھا کر سیدھا کیا۔ اس پہ احمر کی تصویر بنی تھی۔ اس نے وہ کاغذ لے جا کر دیوار پہ لگی کاردارز کی مختلف تصاویر کے ساتھ چپکا دیا۔ اور سیاہ مارکر سے اس کے اوپر سوالیہ نشان لگا دیا۔

کون ہے احمر شفیع؟

"اور میں یہ جان گیا ہوں کہ ایک بہتر انسان بننے کے لیے انسان کو اپنے بارے میں سوچنا بند کر کے دوسروں کو ترجیح دینی ہوتی ہے۔"

فارس بینک کے کیش کاؤنٹر پہ کھڑا چیک بک پہ کچھ لکھ کر دستخط کر رہا تھا۔ پھر اس نے چیک کھڑکی کے اندر بڑھا دیا۔ اب اندر بیٹھی لڑکی اسے نوٹوں کی گڈیاں تھما رہی تھی۔

"میں یہ بھی جان گیا ہوں کہ انسان چیریٹی اپنے گھر سے شروع کرتا ہے ورنہ وہ چیریٹی کا حق — ادا نہیں کر سکتا۔"

سعدی اپنے اوپری چھوٹے کمرے میں کھڑا ایک

میں سامان ڈال رہا تھا۔ نوٹوں کی ایک گڈی اس نے تکیے کے اندر چھوڑ دی تھی۔ باہر کامنی ہاتھ باندھے کھڑی' غصے اور صدمے سے اس کے دروازے کو بار بار دیکھتی تھی۔ پھر کبھی چلا کر کہتی۔ "یہ مجھ سے سچ بھی بول سکتا تھا۔ میں آئندہ کبھی انسانوں کا اعتبار نہیں کروں گی۔"

"مگر اس ملک کے سارے مسائل لاکھوں اور کروڑوں کی چیریٹی دے دینے سے حل نہیں ہو سکتے۔ اس ملک کے مسئلے تب حل ہوں گے جب ہم لوگوں کو انصاف فراہم کریں گے۔ انصاف کا مطلب ہوتا ہے فوری انصاف کیونکہ

delayed is Justice denied!"

Justice" (انصاف میں تاخیر انصاف ۔۔۔ کی موت ہے۔")

زمر ریسٹورنٹ کی بالائی منزل والے ہال میں بیٹھی پرنٹر سے نکلتے کاغذوں کو مختلف فائلز میں لگا رہی تھی۔ اس کے بال جوڑے میں بندھے تھے اور آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ فائلز پہ فائلز تیار کر رہی تھی۔ ثبوت در ثبوت۔ ہاشم کاردار اور اس کے قرابت داروں کی کمزوریاں بلیک میلنگ کا مواد۔ زبردست۔

"اور اگر مجھ جیسے وکلا انصاف کی فراہمی کے لیے واقعتاً" کوششیں نہیں کریں گے' تو معاشرے کے ناسور بڑھتے جائیں گے۔"

احمر شفیع قصر کاردار کے کنٹرول روم میں بیٹھا' کی بورڈ پہ کھٹاکھٹ ٹائپ کرتا' بار بار نفی میں سر ہلاتا' افسوس سا چہرے پہ در آتا جسے وہ جھٹک کر کام کرنے میں لگ جاتا۔

"اگر آج ہم جیسے لوگ اپنا پیسہ اور اپنی طاقت استعمال نہیں کریں گے تو ہماری نسلیں تباہ ہو جائیں گی۔"

علیشا ٹارچ لیے انیکسی کی بیسمنٹ میں موجود تھی اور مسلسل تیزی سے ہاتھ چلاتی سامان الٹ پلٹ کرتی کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

"پور پلانٹ کا نقصان کوئی نقصان نہیں ہے۔ اس تخریب کاری کی میں مذمت کرتا ہوں اور اس کا بدلہ میں اس طرح سے لوں گا کہ جو لوگ اس قسم کی وارداتیں کرتے ہیں' ہم ان دہشت گردوں کے بچوں کو تعلیم دیں گے۔ یہی ان کی سب سے بڑی شکست ہے۔"

فیونا اپنے باتھ روم میں کھڑی اپنے بٹوے میں موجود رقم گن رہی تھی۔ آنکھوں میں حسرت بھرے آنسو تھے۔ باہر میری برآمدے میں کھڑی ملازموں پہ حکم چلا رہی تھی۔

"میں اپنے تمام دشمنوں کو معاف کر کے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

جواہرات سیلون نما کلینک کی آرام دہ چیئر پہ بیٹھی تھی اور چند ورکرز اسے کاسمیٹک سرجری کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ وہ مسلسل آئینے میں اپنی ناک کو مختلف زاویوں سے دیکھ رہی تھی۔

"زندگی نے جو مجھے ایک دوسرا موقع دیا ہے' میں اسے ایک بہتر انسان کے طور پہ گزارنا چاہتا ہوں۔ میں اچھے کام کر کے فخر سے اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔"

فارس ایک اسٹوریج لاکر کے اندر کھڑا تھا۔ لوہے کا اوپر سے نیچے گرنے والا دروازہ اس نے گرا رکھا تھا' اور وہ مختلف شیلف اور خانوں میں سے سیاہ چمکتا اسلحہ نکال نکال کر بیگ میں بھرتا جا رہا تھا۔ دوسرے بیگ میں چند دوسری اشیاء رکھی تھیں۔ وہ تیاری کر رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد جب میری بیٹی میرا نام لے' میرا بھائی میرا ذکر کرے تو وہ مجھے صرف ایک فلینتھراپسٹ کے طور پہ نہ جانیں بلکہ انصاف کے لیے جدوجہد کرنے والے ایک فرض شناس شہری کے طور پہ یاد کریں۔"

نوشیرواں اپنے کمرے میں اندھیرا کیے بیٹھا' کریڈٹ کارڈ سے سفید دانے دار شے کو زور زور سے پیس رہا تھا۔ چہرے پہ مردنی اور آنکھوں میں گہرا

احساس جرم چھایا تھا۔ بار بار ان میں نمی در آتی جسے وہ کف سے رگڑ کر صاف کر لیتا۔

"لیکن..." کیمروں اور فلیش لائٹس کی چکا چوند روشنی میں ہاشم کاردار کہہ رہا تھا۔ "ہم زندگی میں آگے بڑھتے ہوئے پیچھے رہ جانے والوں کو بھول جاتے ہیں مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میرا دوست میرا رشتہ دار... ایک پیارا نوجوان سعدی یوسف جو آٹھ ماہ پہلے ہم سے بچھڑ گیا... آج میں اس کے اور اس جیسے لاپتا افراد کے لیے "سعدی یوسف فاؤنڈیشن" بنانے کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ فاؤنڈیشن سعدی یوسف جیسے لاپتا افراد کے کیسز پھر سے کھلوائے گی اور ان کے خاندان کے لیے انصاف کی فراہمی کو یقینی بنائے گی۔ اس میں ملک کے نامور اور ماہر وکلاء کا پینل ہوگا جو اس بات کو یقینی بنائے گا کہ..."

وہ کہہ رہا تھا۔ کیمرے کھٹا کھٹ کلک کلک کر رہے تھے۔ لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کر اس ذہین اور شاندار، ہمدرد اور رحم دل شخص کے لیے تالیاں بجا رہے تھے جو موت کے قریب جا کر واپس آیا تھا اور لوگوں کے لیے مزید بھلائی کے کام کرنا چاہتا تھا۔ بے داغ دامن اور سفید کالر والا شخص ابھی تک بول رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

میرے خدا مجھے طارق کا حوصلہ ہو عطا

ضرورت آن پڑی کشتیاں جلانے کی

ہاشم کاردار کے آفس کی ساری بتیاں جلی ہوئی تھیں، اور وہ پاور سیٹ پہ ٹیک لگائے بیٹھا، مسکرا کر فون پہ کہہ رہا تھا۔

"تھینک یو۔ جی ایسا ہی ہے۔ گالف پہ ملتے ہیں پھر۔" اس نے ریسیور کریڈل پہ رکھا۔ سامنے کھڑے رئیس نے چند کاغذ اس کے سامنے رکھے۔ ہاشم نے پین ہولڈر سے قلم نکالا اور عینک ناک پہ لگاتے، کاغذات پہ مطلوبہ جگہوں پہ دستخط کرنے لگا۔ دفعتاً ٹھہر کر اس نے موبائل اٹھایا اور نمبر ملا کر اسپیکر کھول دیا۔

"جی کاردار صاحب۔ کیسے ہیں آپ؟"

ہاشم کاغذات کا سرسری معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہوں ادریس! تم سناؤ، فارس ٹھیک کام کر رہا ہے۔"

"جی۔ آج کل چھٹی پہ گھر گیا ہے۔ پورا ہفتہ اچھا کام کیا۔ چھٹی وغیرہ بھی کرتا تھا۔ شام میں کبھی نکلا تو نکلا ورنہ ادھر ہی کام کرتا تھا، یہیں رہتا تھا اور..."

ادریس رپورٹ دے رہا تھا۔ وہ سنتا گیا۔ کاغذ مکمل ہو گئے تو اس نے کال کاٹ دی اور عینک اتار کر پرے رکھی۔

"یہ لے جاؤ اور یوں کرو، آج شام کے لیے..." کچھ بولتے بولتے ہاشم ٹھہرا۔ ابرو پر سوچ انداز میں اکٹھے ہوئے۔

"یہیں رہتا تھا؟" اس نے غائب دماغی سے دہرایا۔

"جی سر؟" رئیس نے ناسمجھی سے پوچھا۔ ہاشم ایک دم کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا۔

"ادریس نے کہا وہ یہیں رہتا ہے۔ یعنی کہ کمپنی کے کوارٹرز میں۔ مگر..." وہ چونک گیا تھا۔ "پچھلے سال ایک اسکینڈل کے بعد ان کی کمپنی نے بہت سخت اصول بنائے تھے۔ اکیلے مردوں کو کوارٹر نہیں ملتا۔ صرف ان کو ملتا ہے۔ جن کے بیوی بچے ساتھ ہوں۔"

"آپ نے بھی سفارش نہیں کی تو ادریس نے غازی کو کوارٹر میں کیوں رہنے دیا؟" رئیس بھی الجھا۔

ہاشم کاردار نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"وہ کوارٹر میں نہیں رہ رہا۔ کوئی بھی بغیر فیملی کے ادھر نہیں رہ سکتا۔ ادریس جھوٹ بول رہا ہے۔" اور کہتے کہتے وہ خود بھی چونکا۔ "تمہارے پاس ایک گھنٹہ ہے رئیس! مجھے پتا کر کے بتاؤ کہ فارس غازی کراچی گیا بھی تھا یا نہیں اور اگر وہ نہیں گیا تھا تو وہ کہاں تھا؟"

وہ سخت لہجے میں بولا تھا اور رئیس بھی چوکنا سا، الٹے سر کھتا، باہر کو بھاگا تھا۔ ایک گھنٹہ... صرف ایک گھنٹہ تھا... حقیقت کو عیاں کرنے کے لیے...

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کائنات غزل

سانسوں کے بکھرتے تار

ناولٹ



اسپتال کے یخ بستہ ماحول میں وہ آئی سی یو کے باہر شیشے سے ناک لگائے مشینوں میں جکڑے وجود کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنا آپ مجرم لگنے لگا تھا۔

مشینوں میں جکڑا وجود نہ جانے کب سے غافل تھا' مگر اب بند پلکوں میں ہوتی لرزش اشارہ کر رہی تھی کہ اس کی غفلت کا اختتام ہو رہا ہے۔ آکسیجن ماسک میں جکڑے اس کے چہرے کو اضطرابی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ ولید کی طرف پلٹا۔

"اسے ہوش آ رہا ہے ولید...." اس کا انداز سرگوشی کا سا تھا۔ ولید جو دونوں ہاتھوں سے سر تھامے چیئر پہ بیٹھا تھا' یک دم کھڑا ہوا اور شیشے کے پاس آن رکا۔ وہ دائیں بائیں سر پٹخ رہی تھی۔ نرس نے اسے ایک بار پھر انجکشن لگا دیا' کچھ ہی دیر میں وہ پرسکون ہو چکی تھی۔

"او کے۔ تم جاؤ سمعان! تائی امی انتظار کر رہی ہوں گی تمہارا.... اور ویسے بھی جب راستے بدل لیتے ہیں تو پلٹ کر نہیں دیکھا کرتے...." ولید نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم.... تم تو جانتے ہو ولید! پھر بھی ایسا کہہ رہے ہو۔" اس نے سرخ آنکھوں سے تڑپ کر ولید کو دیکھا۔

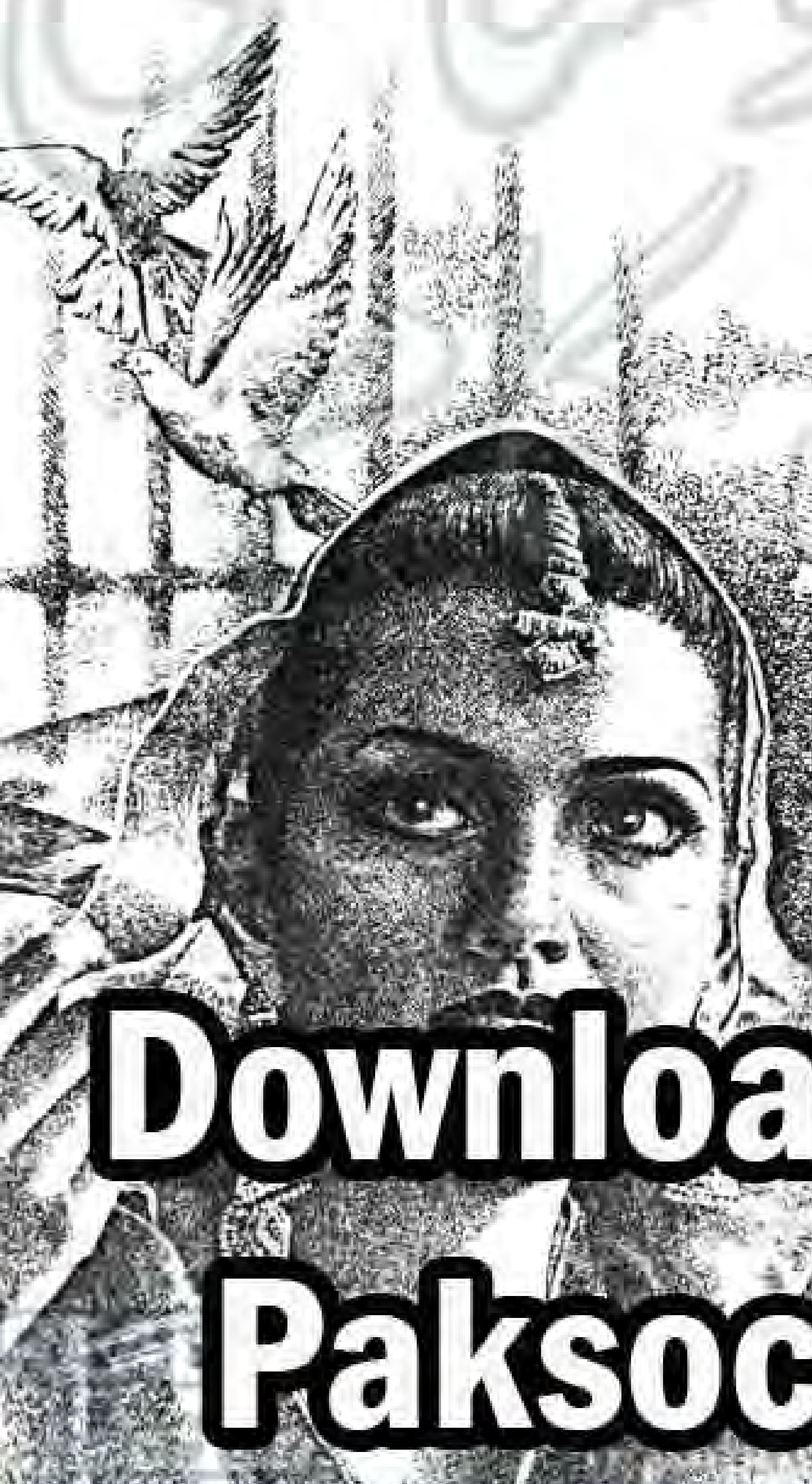
"ہاں....!" ولید نے گہری سانس لی۔ "اسی میں تمہاری بھلائی ہے اور لاروش کی بھی.... یوں سمجھ لو ہم سب کی بھلائی ہے۔" ولید نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور دھیمے سے مسکرایا۔ سمعان کچھ دیر تو اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتا کاریڈور پار کر گیا۔ ولید گہرا سانس لے کے پہلی والی پوزیشن میں سیٹ پہ بیٹھ گیا۔



"کیسی کنڈیشن ہے بھائی اب لاروش کی....؟" افزا جو ولید کے لیے گھر سے کھانا لائی تھی' پوچھنے لگی۔

"ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں' ایک دو دن میں روم میں شفٹ کر دیں گے' لیکن زخموں کی وجہ سے ابھی بے ہوش ہی رکھا ہوا ہے اسے۔"

"اوہ.... آپ نے کھانا کھایا بھائی....؟"



ولید نے نفی میں سرہلایا۔

"مجھے معلوم تھا اسی لیے میں کباب فرائی کر کے لے آئی۔ کچھ اپنا بھی خیال کرلیں بھائی! صبح کا ناشتا کیا ہوا ہے اور اب شام کے چار بج رہے ہیں' آپ اپنا خیال نہیں رکھیں گے تو لاروش کا کیسے رکھیں گے۔۔۔؟" افزا نے ناراضی سے کہتے ہوئے ٹفن کھولا۔

"اوکے ڈولی۔۔۔ اب رکھوں گا۔۔۔ اب جلدی سے کھانا شروع کرو' خوشبو سے چوہے دوڑنے لگے ہیں پیٹ میں۔۔۔"

"بھائی! دنیا کتنی ظالم ہوتی ہے نا۔۔۔؟" اس کی آواز پہ ولید نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' وہ کسی غیر مرئی نقطے پہ نظر رکھے کہہ رہی تھی۔

"کیا ہوا اب۔۔۔؟" اس نے ہاتھ روک کر سوال کیا۔

"بڑی تائی اسلام آباد جا رہی ہیں۔"

"یہ تو اور اچھی بات ہے' کچھ دن وہ لاروش کے سامنے نہ ہی آئیں تو اچھا ہے۔"

"نہیں بھائی! وہ کسی اور مقصد سے جا رہی ہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"وہ خود تو کسی کو کچھ نہیں بتا رہیں' لیکن آپ کو معلوم ہے نا' سنعیہ کی ہر جگہ شو مارنے کی عادت۔۔۔ اسی کے ذریعے پتا چلا ہے کہ وہ۔۔۔ سمعان بھائی کی منگنی کر کے آئیں گی اپنی بہن کی بیٹی انزلہ سے۔۔۔"

"اوہ۔۔۔!" ولید کا دل یک دم ہی کھانے سے اچاٹ ہو گیا۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ افزا کے آنسو بہہ نکلے۔

"بھائی! ابھی تو اس کے زخم خشک بھی نہیں ہوئے' اتنے بھی نہیں کہ مرہم ہی لگا دیا جائے اور بڑی تائی۔۔۔" وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے سسک پڑی۔

"چپ ہو جاؤ گڑیا۔۔۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ لاروش تو معصوم ہے' یہ سب اللہ کی طرف سے اس کے لیے امتحان ہے۔ آزمائش ہے' لیکن ان کو اپنے اس گناہ کی سزا اس دنیا میں ہی ملے گی۔" ولید نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔



"بانو! آج کیا تاریخ ہے؟" لاروش کے سوال پہ بانو نے اسے تڑپ کر دیکھا اور ہدایت کے مطابق کہہ دیا۔

"سترہ۔"

"ابھی تین دن ہیں نا بانو۔۔۔" اس نے دھیرے سے اپنا جلا ہوا ہاتھ اٹھایا' تین انگلیاں بری طرح جھلس چکی تھیں۔

"اگر ان تین انگلیوں کو چھوڑ کر مہندی لگے گی تو بری تو نہیں لگے گی۔۔۔؟" اسے مہندی کی فکر تھی' یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کی زندگی کا کتنا بڑا نقصان ہو چکا ہے۔

"نہیں چھوٹی گڑیا۔۔۔ آپ کے ہاتھ پہ کچھ بھی برا نہیں لگے گا۔ بس اللہ پاک آپ کو جلد صحت یاب کر دے۔"

"بانو۔۔۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے میری گردن پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔۔۔ دیکھنا ذرا۔۔۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ بانو جو آنسو چھپانے کی غرض سے اپنا چہرہ موڑے ٹیبل پہ چیزیں سیٹ کرنے لگی تھی' یک دم ہی پلٹی۔ "ہاتھ نہ لگانا چھوٹی گڑیا' زخم چھل جائے گا۔ ہلکی سی چھینٹیں آ گئی تھیں یہاں بھی۔۔۔ میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔"

"ولید بابا۔۔۔ آپ اندر چلے جائیں' کب تک منہ چھپا کر بیٹھیں گے۔ حالات کا سامنا کریں۔ ابھی آپ اندر جائیں میں ڈاکٹر کو بلانے جا رہی ہوں' انجکشن کا اثر ختم ہو رہا ہے۔" وہ جلدی جلدی تاکید کرتی آگے بڑھ گئیں' ولید کو ناچار اٹھنا پڑا۔

"ولید بھائی۔۔۔ آپ کہاں تھے۔۔۔ دیکھیں میرا ہاتھ جل گیا تھا۔۔۔ میں۔۔۔ میں آپ کے لیے چائے بنانے کچن میں گئی تھی نا۔۔۔ تو اس کے بعد۔۔۔" وہ کہتے کہتے تھک گئی تھی شاید۔۔۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ نرس نے ڈرپ میں انجکشن ڈال دیا تھا۔

"ولید بھائی... سمعان..." وہ سسک پڑی۔

"ارے میری پیاری گڑیا... تم... مایوں میں ہو ابھی' سمعان روز آتا ہے' ہم اسے اندر روم میں نہیں آنے دیتے۔ تمہارے سسرال والوں سے سخت پردہ کرایا ہوا ہے اور تم چاہ رہی ہو سمعان سے ملنا تو لو بلا لیتا ہوں اسے۔ سر کے بل چلتا ہوا آجائے گا۔" ولید نے کہنے کے ساتھ ہی موبائل نکالا۔

"نہیں ولید بھائی رہنے دیں... مجھے نیند آرہی ہے۔" اسے شرم آرہی تھی یا نہیں جو بھی تھا۔ ولید کے لیے غنیمت تھا۔ اس نے بات ہی ایسی کہی تھی کہ وہ خود سے سمعان کا نام نہ لے اب۔ اس کی آنکھ کھلی تو کوئی دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہا تھا۔

"آپ..." وہ اس لمس سے انجان تو نہ تھی... دو سال... ان کی آغوش میں گزارے تھے۔ اسے ان میں اپنا عکس نظر آیا... کیسے نہ پہچانتی وہ انہیں... انہوں نے جھک کر اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا اس کو اپنی پیشانی پہ نمی محسوس ہوئی۔

"کیسے ہوا یہ بانو... بولو... تم تو کہتی تھیں کہ سب بہت خیال رکھتے ہیں اور اتنا لیٹ انفارم کیا تم نے... میں لے جاؤں گی اب اپنی بچی کو..." وہ کہہ کر دوبارہ لاروش کی جانب پلٹیں۔

"تم... تم اپنی ماں کے ساتھ چلو گی نا... وشی..." بہت آس سے وہ اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کہاں چلی گئی تھیں ہمیں چھوڑ کر ماما..." وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"میرا بچہ' تمہاری ماں مجبور تھی... خدارا مجھ سے کوئی سوال جواب مت کرنا' لیکن اللہ گواہ ہے ان سولہ سالوں میں کسی بھی دن میں تم سے غافل نہ تھی۔ ہر ہر لمحہ تمہارے لیے دعا کرتی۔ تمہارے رزلٹ پر' ہر کامیابی پر خوش ہوتی۔ ہر سال تمہاری سالگرہ کا کیک کاٹتی۔ تمہارے لیے ہر عمر کے گفٹ لیتی۔ مجھے تمہارے نکاح کی بھی خبر تھی' مگر میں سمعان سے..." اس کی حالت کے پیش نظر خاموش ہو گئیں۔

وہ دکھی نظروں سے اپنی بے بس ماں کو تک رہی تھی۔ پاپا نے کبھی اس کا دل ماں کی طرف سے خراب نہیں کیا تھا۔ انہوں نے یہی بتایا کہ کوئی بہت بڑی مجبوری تھی جس کی وجہ سے وہ چلی گئیں... کہاں... یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔

"بولو... اب میرے ساتھ چلو گی نا..."

"ماما! میری شادی ہو رہی ہے... بٹ میں بعد میں آپ کے پاس ضرور آؤں گی۔" اس کی بات سن کے ان کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ وہ کیسے اسے بتاتیں کہ اس کی شادی کی تاریخ کو گزرے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور جس گھر میں اسے جانا تھا' اس گھر کے مکین اسے رد... کر کے کسی اور کو لینے جا پہنچے تھے۔ وہ کیسے بتاتیں کہ اس کا اور ان کا نصیب ایک جیسا تھا۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھ رہی تھیں۔ دو قدم آگے بڑھ کر ایک بار پھر اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور تیزی سے دروازہ کھول کر نکلنا چاہا کہ اندر آتے وہاب صاحب سے ٹکرا گئیں۔

سولہ سال بعد... وہ جیسے انہیں دیکھ کر پتھر کے ہو گئے۔ وہ آج بھی ویسی ہی تھیں' بے پناہ حسن کی مالک...

پتھرا تو وہ بھی گئی تھیں۔ اس لمحے کا تو انہوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ کیسے سامنا کریں گی' لیکن انہیں جب وہ آخری منظر یاد آیا تو ایک جھٹکے سے عبدالوہاب صاحب کا گریبان تھام لیا۔

"کیا حشر کیا ہے آپ نے میری بچی کا... جواب دیں وہاب صاحب..."

ان کی نظر پیچھے کھڑی عشرت بیگم پر پڑی۔ وہ انہیں چھوڑ کے آگے بڑھیں۔

"اور آپ... بڑے زعم میں رکھا تھا آپ نے وشی کو... کون سے ناکردہ گناہوں کی سزا دے رہی ہیں آپ ہم ماں بیٹی کو... نہ میں گھر سے بھاگ کے آئی تھی نہ میری بیٹی نے ورغلایا آپ کے پوتے کو... بہت عزت اور مان سے مانگا تھا آپ نے مجھے اپنی بہن سے...

میری بیٹی کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔" ان کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے ادا ہو رہے تھے۔

عشرت بیگم جو انہیں دیکھ کر سُن رہ گئی تھیں۔ ہوش میں آئیں تو گرج کے بولیں۔

"اے بی بی! سولہ سال سے پال رہے تھے ہم اسے، جب تو تم نے پلٹ کے خبر نہ لی۔۔۔ آج چھوٹی سی چوٹ لگی تو پہنچ گئیں ڈرامے کرنے، اگر اتنی ہی پروا تھی تو نہ جاتیں منہ کالا کرنے۔۔۔"

"اماں بی پلیز۔۔۔!" وہاب صاحب نے ان کا کندھا دبایا۔

"اے میاں! خاموش رہو تم۔۔۔ جب کوئی رشتہ ہی نہیں رہا تم سے اس کا تو کاہے کو طرف داری کر رہے ہو۔۔۔؟"

"آپ۔۔۔ نہیں بدلیں۔" وہ زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ بولیں اور تیزی سے کاریڈور پار کر گئیں۔

"سروش۔۔۔" ان کے آگے بڑھتے ہی وہاب صاحب کو جیسے کسی نے جھنجھوڑا، وہ ان کے پیچھے تقریباً" دوڑے ہی تھے، لیکن وہ ب تک گاڑی اسٹارٹ کر کے جا چکی تھیں۔ عشرت بیگم ناک پہ ہاتھ رکھے بیٹے کی دیوانگی کو تک رہی تھیں، جو چھوڑی ہوئی بیوی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

"تو آپ میں کچھ بدلاؤ آ ہی گیا وہاب صاحب۔۔۔" ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو انہیں ڈرائیو کرنے میں پریشان کر رہے تھے۔

"کاش یہ دو لفظ۔ "اماں بی پلیز۔۔۔" جو آج کہے تھے سولہ سال پہلے کہتے تو یہ ویران زندگی میرا نصیب نہ ہوتی۔"

ان کی دوست کا گھر آ چکا تھا جہاں وہ کچھ دن کے لیے ٹھہری تھیں ڈرائیو وے پہ آ کے انہوں نے گاڑی روکی اور اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔ کوئی چھوٹا دکھ تو نہیں تھا ان کا۔۔۔ وہی دکھ ان کی اولاد کا نصیب بنا تھا۔ بڑی بھابھی نے لاروش کے چہرے اور جسم کے جل جانے کو جواز بنا کے شادی سے انکار کر دیا تھا۔

"آہ۔۔۔ میری بچی۔۔۔" ان کی سسکی نکلی۔

"اب، اب میں لے آؤں گی اسے۔۔۔ ان ظالم لوگوں میں نہیں چھوڑوں گی۔" دل میں پکا عہد کرتے ہوئے انہوں نے چابی نکالی اور باہر نکل آئیں۔

"کیا کہہ کر گئی ہے یہ عورت تمہیں۔۔۔؟" عشرت بیگم آگے بڑھیں اور اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

لاروش سوتی بن گئی، اس میں سوال جواب کی ہمت نہ تھی، لیکن وہ ان کی باہر کی گئی گفتگو سن چکی تھی۔ اسے لگ رہا تھا، اسے کوئی آرے سے چیر رہا ہے۔ کچھ نہیں، بہت کچھ غلط ہو چکا ہے۔ شاید **سمعان۔۔۔ سمعان** بھی اسے چھوڑ کے جا چکا ہے۔۔۔ آہ۔۔۔ اس سے آگے اس سے سوچا نہ گیا۔

"اماں بی۔۔۔ وہ آئی تھیں تو چھوٹی گڑیا سو رہی تھیں۔ وہ بس کچھ دیر انہیں دیکھتی رہیں پھر چلی گئیں۔" بانو اس کی مدد کو آگے بڑھی۔

"ہوں۔۔۔" انہوں نے ہنکارا بھرا۔ "آئندہ وہ عورت آئے تو اسے اندر مت گھسنے دینا۔" وہ کہتے ہوئے کاؤچ پہ بیٹھ گئیں۔ پھر کچھ خیال آنے پہ بولیں۔ "اس سے پہلے بھی آئی تھی وہ۔۔۔؟"

"نہیں اماں بی۔۔۔" بانو نے مؤدب انداز میں کہا۔

وہاب صاحب اندر داخل ہوئے۔۔۔ ان کا انداز کسی ہارے ہوئے جواری کا سا تھا۔ ان کا ملال کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔ سولہ سال بعد ملی اور ایک بار پھر کھو دیا۔

"اماں بی۔۔۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے، میں ٹیکسی سے گھر جا رہا ہوں۔ آپ ڈرائیور کے ساتھ آ جائیے گا۔" وہ چند لمحے بیٹھے پھر یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہوں۔۔۔ ہوں۔۔۔" وہ شاید کچھ پڑھ رہی تھیں۔ لاروش پہ پھونک ماری پھر کہنے لگیں۔ "ٹھہرو، میں بھی ساتھ ہی چلتی ہوں۔ خدیجہ آ رہی ہے شام میں، منور بھی ساتھ ہو گا۔ کھانا بنوانا ہو گا مجھے۔۔۔"

"چلیے۔۔۔" عشرت بیگم کے باہر نکلنے کے بعد انہوں نے بانو کو چند ہدایات دیں اور کمرے سے باہر نکل گئے۔



"ولید بھائی... مجھے سچ بتائیں... سمعان نے شادی سے انکار کر دیا نا...؟" شام میں ولید نفیسہ بیگم کے ساتھ آیا تھا وہ اور افزا جب ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی گئیں تو وہ ولید کے آگے بکھر گئی۔ ولید نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"مت روؤ، تمہاری کنڈیشن ایسی نہیں ہے۔ ہم ہیں نا تمام معاملات سنبھالنے کے لیے...."

"ولید بھائی! ماما آئی تھیں آج۔ میری ماں... کیا کیا تھا ان لوگوں نے میری ماں کے ساتھ بتائیں...؟" ولید اس کی بات سن کے گنگ رہ گیا۔

"چھوٹی چچی آئی تھیں... کیا... کیا کہہ گئی ہیں وہ... دوبارہ آئیں گی...؟" اس کی آنکھوں میں نازک سی مہربان چچی کا سراپا گھوم گیا۔ کتنا ٹوٹ گئے تھے چاچو ان کے چلے جانے کے بعد... وہ محض دس برس کا تھا جب اسکول سے گھر آتے ہوئے اس نے چچی کو روڈ پر اجڑی حالت میں دیکھا تھا اور ان کا گرتا پلو تھاما تھا۔

"کہاں جا رہی ہیں چچی آپ...؟" انہوں نے ویران نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ اسے خوف آنے لگا ان کی حالت سے... انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئیں۔ وہ انہیں دور تک جاتا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے چاچو کو چھپ چھپ کے روتے دیکھا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ انہیں گھر سے نکالا گیا تھا یا وہ خود چلی گئی تھیں، لیکن اس نے ایک مرتبہ چچی کے ذکر پہ اماں بی کو کہتے سنا تھا۔

"خس کم جہاں پاک...."

اماں بی ایسا کیوں چاہتی تھیں، اس کے ننھے ذہن کو یہ بھی خبر نہ تھی۔ وہاب چاچو سے وہ ویسے بھی قریب تھا۔ اس واقعے کے بعد مزید قریب ہو گیا اور ان کی چھوٹی سی گڑیا کا مزید خیال رکھنے لگا۔ چاچو آفس جاتے تو اسے اپنے ساتھ اپنے پورشن میں لے آتا۔ کہیں جانا ہوتا تو افزا اور راحد کی ذمہ داری لگا کے جاتا کہ کوئی اسے تنگ نہ کرے۔ یوں ہی اس کا خیال رکھتے رکھتے وقت گزرتا چلا گیا۔ سمعان بڑے تایا کی پہلی نمبر کی اولاد تھا، وہ بھی اس کا بہت خیال رکھتا، لیکن عمر گزرنے کے ساتھ اس کا خیال رکھنے کا انداز بدل گیا۔ لاروش اس سے شرمائی شرمائی رہتی۔ سمعان کے چھوٹے بھائی کامران، غفران... نہ جانے کیوں اس سے خار کھائے رہتے۔ شاید وہ دونوں بڑی تائی سے زیادہ اٹیچڈ تھے اور سمعان، نفیسہ بیگم کے زیر پرورش رہا۔

لاروش تھرڈ ایئر میں تھی جب اس کے کلاس فیلو کا اس کے لیے رشتہ آیا۔ سمعان کو جیسے ہی خبر ہوئی وہ اماں بی کے پاس اپنا مدعا لے کر پہنچا۔ اماں بی کو کیا اعتراض ہونا تھا۔ انہوں نے رات ہی کو میٹنگ بٹھائی اور اگلے چاند کی پہلی تاریخ کو نکاح کا عندیہ دے دیا۔ ثروت بیگم (بڑی تائی) پہ یہ خبر بجلی کی بن کر گری، لیکن وہ ساس اور شوہر کے آگے بولنے کی ہمت نہ رکھتی تھیں۔ رخصتی لاروش کے امتحان کے بعد طے ہونا قرار پائی... ساتھ ہی افزا اور غفران کے بارے میں بھی فیصلہ سنا دیا۔

"ولید بھائی...." اس نے اپنا ڈرپ والا ہاتھ ولید کے ہاتھ پہ رکھا تو ولید چونک گیا۔

"وہ کہہ کے گئی ہیں، مجھے ساتھ لے جائیں گی، میں ان کے ساتھ چلی جاؤں...؟ کس قدر معصومیت سے سوال کر رہی تھی وہ۔

"وہ کب آنے کا کہہ کے گئی ہیں وشی...؟" ولید کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"پتا نہیں ولید بھائی! وہ کہہ کے گئی ہیں تو ضرور آئیں گی۔ مجھے یقین ہے۔" اس نے کہہ کر آنکھیں موند لیں۔



ولید نے نہ جانے اماں بی کو کیا کہہ کر سمجھایا۔ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر وہ اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ صرف ولید ہی اس سے رابطے میں تھا۔

خود لاروش نے بھی کسی سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہاب صاحب سے بھی۔

وہ گم صم اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ سروش نے جب یہ گھر خریدا تھا جب ہی ایک کمرہ لاروش کے لیے

سجایا تھا۔ آج وہ اسے اس کمرے میں دیکھ کے بے تحاشا خوش تھیں، لیکن لاروش بہت کم بولتی بس سوچوں میں گم رہتی۔ وہ اپنے ہاتھ سے اسے سوپ پلاتیں۔ خوشی سے ان کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ وہ اس سے اس کے بچپن کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتیں۔ ولید اور سمعان کی باتیں بتاتیں۔۔۔ تھوڑی دیر کو وہ بہل جاتی پھر وہی کیفیت۔۔۔ انہوں نے اسے سرجری کرانے پر بھی زور دیا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔

"آفس نہیں گئیں ماما۔۔۔؟" بے وقت کچن سے کھٹو پٹر کی آواز آئی تو وہ کچن میں چلی آئی۔ اسے خود سے کمرے سے باہر آتے دیکھ کر وہ خوش ہو گئیں۔

"ولید آرہا ہے۔۔۔ فون کر کے چھٹی کی اطلاع دے دی میں نے۔" انہوں نے جوس کا گلاس اسے پکڑایا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئیں۔ گھونٹ گھونٹ جوس پیتے ہوئے وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے لگی۔

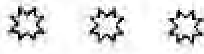
جب زخم اپنوں سے ملتے ہیں۔ تو پناہ غیروں میں ڈھونڈی جاتی ہے۔ لیکن وہ تو اس کی ماں تھیں۔۔۔ ایسی بے بس ماں جو اولاد کو سینے سے لگانے کے لیے سولہ سال سے تڑپ رہی تھیں۔ شروع میں اس کا کھنچا کھنچا رویہ دیکھ کر وہ ٹوٹ گئی تھیں۔ انہوں نے پچھلی رات کو اسے اپنے زندگی کے ہر باب سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ جو تھوڑی بہت اسے بدگمانی تھی' وہ بالکل ختم ہو چکی تھی۔ لیکن ان لوگوں کا سامنا کیسے کرتی جنہوں نے اس پر ظلم کیا تھا۔

ولید تو اس کا اپنا بھائی تھا۔ دودھ شریک بھائی اور ان کے جانے بعد روتی بلکتی لاروش کو تائی نے سینے سے لگا لیا تھا اور اس کی ہر چیز کا خیال رکھا تھا۔ بڑی اماں کے سمعان اور اس کی شادی کے فیصلے سے سروش مطمئن ہو گئی تھیں۔ سمعان بہت ہی سلجھا ہوا تھا۔ لیکن وہ اندر سے عبدالوہاب کی طرح بدھو ہو گا' اس کا تو تصور بھی نہ تھا۔ سمعان کی نظروں میں شروع ہی سے لاروش کے لیے پسندیدگی تھی۔ کس مقام پر لا کر چھوڑ دیا تھا اس نے۔۔۔

سروش بیگم نے اس کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھی تو وہ حال کی دنیا میں لوٹ آئی۔ اپنے چہرے کو چھوا۔ تو وہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"سوری ماما! میں ناشتہ نہیں کر سکوں گی۔" ایک بار پھر وہ اپنے خول میں سمٹ گئی اور اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سروش اس کی کیفیت کو سمجھ سکتی تھیں' اسی لیے خاموشی سے ٹھنڈا سانس لے کر رہ گئیں۔



اسحاق صاحب کی تین اولادیں تھیں' مہتاب' شہاب' اور عبدالوہاب' اوپر تلے اولاد نرینہ ہونے کی وجہ سے عشرت بیگم کی گردن میں سریا فٹ ہو گیا تھا۔

اسحاق صاحب دیکھنے میں جتنے شیر نظر آتے' اتنے ہی عشرت بیگم سے دبتے تھے۔ عشرت بیگم کے آگے ان کی ایک نہ چلتی۔ اور جب وہ جلال میں ہوتیں تو وہ کونے میں دبک جاتے۔ یوں اسحاق صاحب کی بزدلی کی وجہ سے عشرت بیگم کے مزاج کو تقویت ملتی گئی۔ یہ خامی مہتاب اور عبدالوہاب میں بھی آگئی تھی' شہاب تو پھر بھی ماں سے اپنی بات منوا لیتے لیکن مہتاب اور عبدالوہاب دونوں کی بولتی ماں کے سامنے بند ہو جاتی۔

شہاب کے لیے انہوں نے اسحاق صاحب کی بھتیجی پسند کی اور عبدالوہاب کے لیے اپنی بیوہ بہن کی بیٹی لے آئیں لیکن وہ سروش کے حسن سے خائف تھیں۔ انہیں لگتا جیسے سروش اپنے حسن کے ذریعے ان کے فرماں بردار بیٹے کو قابو کر لیں گی' اسی خوف کے پیش نظر وہ بیٹے کو آفس سے آتے ہی اپنے کمرے میں بلاتیں اور سروش کے خلاف ان کے دل میں خوب زہر بھرتیں۔ وہ ماں کے پاؤں دباتے رہتے اور سر جھکائے بیوی کے ناکردہ جرائم سنتے رہتے۔

کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں جاتے تو وہ سروش کو اپنے کمرے میں بلا لیتیں' کبھی ان سے اپنی الماری صاف کرانی ہوتی کبھی کوئی اور کام جب کوئی کام نہ ہوتا تو اپنی ٹانگوں پر مالش ہی کروالتیں۔ جب وہ فارغ ہو کر

کمرے میں آتیں تو وہاب صاحب سو چکے ہوتے۔ وہ ان پر ایک شکوہ بھری نظر ڈال کر خاموشی سے دوسری جانب لیٹ جاتیں۔

ایک روز اچانک ان کا شہر کے بہترین کالج سے لیکچرار کے لیے اپائنٹمنٹ لیٹر آگیا۔ نہ جانے کب کا اپلائی کیا ہوا تھا۔ جاب کرنا شادی سے پہلے ان کی مجبوری تھی۔ شاید جب ہی کا انہوں نے اپلائی کیا ہوا تھا۔ اب ان کی خوشی کے پیش نظر عبدالوہاب صاحب نے اجازت دے دی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی ماں سے وہ باتیں سنیں کہ انہوں نے آئندہ اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کے لیے کان پکڑ لیے۔ سروش کا میکہ مضبوط نہ تھا سو انہیں بھی ماں جی کی ہر بات پر سر خم کرنا تھا۔ جب شوہر ہی کچھ کرنے کے قابل نہ ہو تو وہ کیا کرتیں۔ لاروش کی ضرورت کی دس چیزیں ہوتیں' وہ عبدالوہاب صاحب سے کہتیں' اماں بی کی اجازت ملتی تو آتیں' ورنہ ان چیزوں کو فضول خرچی کا نام دے دیا جاتا۔ وہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتیں۔

وہ دن بھی بہت عام سا تھا۔ اماں بی اپنے کسی رشتہ دار کے گھر عیادت کو دوسرے شہر گئی ہوتی تھیں۔ سروش کی قریبی دوست کی منگنی تھی۔ عبدالوہاب صاحب سے اجازت مل گئی تھی' اماں بی گھر میں تھیں نہیں۔ انہوں نے غنیمت جانا۔ لاروش کو نفیسہ بیگم کے حوالے کر کے منگنی میں چلی گئیں انہیں خبر ہوتی کہ ان کے جانے کا اتنا بھیانک انجام ہو گا تو وہ اس چند پل کے آزادی کے سانس لینے کو قفس نما آشیانے پر ترجیح نہ دیتیں۔ عبدالوہاب صاحب بھی بیوی کی خوشی کو محسوس کر رہے تھے۔ انہیں شہلا کے گھر چھوڑ آئے۔ واپسی میں اس نے خود ڈراپ کرنے کا کہہ دیا تھا۔

فنکشن کو انہوں نے بہت انجوائے کیا۔ شہلا اپنے بھائی کے ساتھ انہیں چھوڑنے کے لیے گاڑی میں بیٹھنے لگی تھی کہ ہائی ہیل کی وجہ سے اس کا پاؤں مڑا اور موچ آگئی۔ تکلیف کے آثار اس کے چہرے سے واضح تھے۔ وہ پھر بھی چلنے کے لیے تیار تھی۔

انہوں نے اسے منع کر دیا۔ چونکہ شاکر سے ان کی سلام دعا تھی۔ سو وہ اس کے ساتھ اکیلی ہی چل پڑیں پھر بھی احتیاطاً" پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔ گاڑی کچھ دیر چلی مین روڈ پر آکر گاڑی سلو ہو گئی وہ آگے جا کر گاڑی سائیڈ پر لگا کر اپنے سائیڈ کا دروازہ کھول کر اترا۔ ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔" اس نے گاڑی کے پچھلی کھڑکی میں سر ڈال کر کہا۔

"اب کیا ہو گا شاکر...؟"

اسپیئر وہیل نہیں ہے کوئی...؟"

وہ پریشانی سے گھبرا کر بولیں اور خود بھی باہر نکل آئیں۔

وہی لمحہ تھا جب عشرت بیگم کی گاڑی ان کے قریب سے گزری۔ رات کے اس پہر ایک مرد کے ساتھ سروش بجی سنوری کھڑی تھیں۔ بات کچھ بھی ہو' انہیں موقع مل گیا تھا۔ گھر پہنچ کر جب انہیں سروش کا منگنی میں جانے کا پتا چلا تو وہ خاموش رہیں۔ اسی طرح جیسے طوفان آنے سے پہلے سناٹا ہوتا ہے۔

"اسپیئر وہیل بھی نہیں ہے اور فی الحال کوئی کیب بھی نظر نہیں آرہی جو آپ کو چھوڑ آؤں۔" وہ دور سنسان سڑک کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولا۔

"پھر... پھر اب کیا کریں...؟"

رات گہری ہو رہی تھی۔ کبھی کوئی گاڑی تیزی سے ان کے پاس سے گزر جاتی۔

"واپس پیدل گھر چلتے ہیں۔ آپ رات یہیں ٹھہر جائیے۔ صبح میں ڈراپ کر دوں گا کسی نہ کسی طرح کر۔"

"اوکے۔" اس کے علاوہ کوئی حل بھی نہ تھا۔ وہ واپس شہلا کے گھر آگئیں۔ موبائل کی ضرورت انہیں کبھی تھی نہیں' عبدالوہاب صاحب کو لینڈ لائن سے کال ملائی لیکن ان کے موبائل کی شاید بیٹری لو تھی۔ موبائل بند جا رہا تھا۔

ساری رات ان کی آنکھوں میں کٹی۔ صبح کچھ دیر کے لیے آنکھ لگی۔ لیکن فکر سے پھر کچھ ہی دیر میں اٹھ گئیں۔ شہلا کی ماما نے اصرار کر کے ناشتے پر روک

لیا۔ انہوں نے جب تک ناشتہ کیا عشا کر گاڑی ٹھیک کرا کے آچکا تھا۔ وہ گھر پہنچیں تو رات سے رکا ہوا طوفان ان کا منتظر تھا۔

"وہیں ٹھہر جاؤ سروش بیگم.... اس کے گھر کے دروازے بند ہو گئے ہیں تم پر۔ جاؤ واپس لوٹ جاؤ.... میرے پاک باز بیٹے کی آنکھوں میں دھول جھونکتے، میرے بیٹے کی عزت کو روڈ پر رولتے کچھ تو حیا کر لیتیں۔"

انہوں نے جیسے ہی لاؤنج میں قدم رکھا۔ اماں بی کی دھاڑ نے دروازے پر ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔

"اماں بی! میں۔"

"مت نام لو میرا اپنے ناپاک منہ سے...." انہوں نے آس بھری نظروں سے وہاب صاحب کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے کارپٹ کو گھور رہے تھے۔ جیسے اماں بی نے ان کے منہ پر ٹیپ لگا دی ہو۔

"جاؤ جہاں منہ کالا کر کے آئی ہو وہیں لوٹ جاؤ۔"

چند قدم آگے ہی لاروش اپنے کھلونوں میں مگن تھی۔ وہ آگے بڑھیں۔ لاروش کے سینے سے لگا کر دروازے کی طرف پلٹیں۔ عشرت بیگم تیزی سے آگے بڑھیں لاروش کو ان سے جھپٹ لیا۔

"ہاتھ نہ لگانا اسے۔"

اماں بی کے جھپٹنے پہ انہوں نے تڑپ کے شوہر کو دیکھا۔ وہ بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ نظریں ملنے پر نظر چرا گئے۔

"نکل جاؤ یہاں سے اپنا ناپاک وجود لے کر۔ میں اپنے پاک باز بیٹے کی شادی فرزانہ سے کروں گی۔"

"اوہ...." انہیں خیال آیا یہ تو سوچی سمجھی سازش ہے۔ فرزانہ ان کے پڑوس میں رہتی تھی سانولی سی۔ اس کے سلیقے کی تعریفیں اس کے کھانوں کی تعریفیں وہ عبدالوہاب کے سامنے کرتی تھیں وہ بنا جواز تو نہ تھیں۔ جب اپنا سکہ ہی کھوٹا ہو تو کسی سے کیا گلہ۔

وہ الٹے قدموں گھر سے نکل آئیں۔ کس طرح وہ اپنی ماں کے گھر پہنچیں یہ الگ قصہ۔ ان کے لوٹتے قدموں نے یہ الفاظ بھی سنے تھے۔

"کاغذ مل جائیں گے تمہیں۔" اور وہ لرز گئی تھیں۔

سروش کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔ وہ ایک بزدل مرد کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ لاروش کی جدائی نے انہیں پتھر کر دیا۔ انہوں نے وہ شہر ہی بدل لیا۔ لاہور جانے سے پہلے انہیں ان کی وفادار ملازمہ بانو ملی جس نے بتایا کہ وہاب صاحب نے کاغذات بنوا لیے ہیں۔ انہوں نے لاروش کی خیر خبر کے لیے بانو کو اپنا نمبر دے دیا تھا۔

لاہور میں ان کی ایک دوست کی پھپھی رہتی تھیں اکیلی، کافی عرصہ یہ لوگ ان کے گھر رہے۔ وہیں انہوں نے لیکچرار شپ کے لیے اپلائی کیا۔ اس وقت انہیں سب سے زیادہ ضرورت اپنے ٹھکانے کی تھی۔ ان کے پاس کچھ جمع شدہ رقم تھی۔ سروش کی ماں نے اپنا سارا زیور بیچا، کچھ سروش نے بیچا۔ اور ایک چھوٹا سا مگر خوب صورت گھر لینے میں کامیاب ہو گئیں۔ گھر لینے کے سال بعد ہی ماں کا انتقال ہو گیا۔ پھر وہ تھیں اور ان کی تنہائیاں....



دروازے پر بیل ہوئی، وہ تیزی سے کمرے کے دروازے تک آئی۔ اس کا دل خود بھی ولید سے ملنے کو بے چین تھا۔ دروازہ جوں ہی کھلا سامنے ہی ہنستی مسکراتی افزا کھڑی تھی اس کے پیچھے احد اور پھر ولید۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اسے لگا جیسے اس کے اندر کسی نے توانائی بھر دی ہو۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی لیکن سب سے آخر میں آتے وہاب صاحب کے وجود نے اسے قدم روکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چند لمحے ہونٹ کاٹتی رہی پھر مڑ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

سروش بیگم افزا اور ولید وغیرہ سے حال چال پوچھنے میں مصروف وہاب صاحب کو دیکھ ہی نہ سکیں۔ وہ کچن سے جوس کی ٹرے اٹھائے اندر آرہی تھیں تب ان پر نظر پڑی۔ ٹرے بے جان ہاتھوں سے چھوٹنے کو تھی

کہ ولید نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے ٹرے لی اور ٹیبل پر رکھ دی۔ ان کے ہاتھ پہلو میں گر گئے۔

وہ ایک ٹک انہیں دیکھے گئیں۔ وہ دروازے سے لگے کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔

وہاب صاحب کی سالگرہ پر وہ ان کے لیے نیوی بلیو سوٹ لائی تھیں۔ اس وقت انہوں نے 'بہت ڈھیلا ہے' کہہ کر اندر وئی خانے میں ڈال دیا تھا آج وہی سوٹ ان کی سوبر سی شخصیت پر بہت جچ رہا تھا۔ ان کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی تھی۔ بمشکل خود پہ قابو پاتے صرف ایکسکیوزمی ہی کہہ سکیں اور پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"واہ جی!۔ میزبان کمروں میں بند اور مہمان۔"

"ایسا تو ہونا ہی تھا بھائی۔۔۔" احد کے کہنے پر افزا جوس گلاسوں میں نکالتے ہوئے بولی۔

"چچی۔۔۔!" کچھ دیر بعد ولید ان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

"آجاؤ۔ ولید۔"

وہ بیڈ پر دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھی تھیں۔

"چچی ہم اتنے دور سے آئے ہیں اور آپ اندر چلی آئیں۔۔۔؟ آئیں نا باہر بیٹھیں پلیز۔۔۔" اس کے اصرار پر انہوں نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

"تمہاری اماں بی نے "ان" کے یہاں آنے پر پابندی نہیں لگائی۔۔۔؟" ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولیں۔۔۔

معاملہ پیاری بہو کا نہیں پوتی کا ہے۔۔۔ نا۔۔۔"

"آپ کو کیا خبر چچی۔۔۔ چاچو کئی سالوں سے آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اور آج۔۔۔ وہ لاروش کے لیے نہیں آئے۔ بلکہ آپ کے لیے آئے ہیں۔ اماں بی کو تو خبر بھی نہیں ان کے یہاں آنے کی۔۔۔ چاچو دو دن پہلے ہی لاہور کے لیے بائی ایئر نکل گئے تھے۔ اسلام آباد کا کہہ کر بزنس کے سلسلے میں کیونکہ اماں بی کو یہی علم ہے کہ چاچو آپ کو پیپر زدے چکے ہیں۔ میرے ساتھ احد اور افزاء بائی روڈ آئے ہیں۔" وہ ایک سانس میں کہتا چلا گیا۔

"وہ آپ سے معافی مانگنے آئے ہیں چچی! آپ معاف کر دیں گی نا انہیں۔۔؟ میں گواہ ہوں ان کی بے چینیوں کا۔۔۔ رت جگوں کا۔۔۔" وہ ان کے گھٹنے تھام کر کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

"مجھ سے ایسا کوئی وعدہ نہ ولید! جو میں پورا نہ کر سکوں پلیز۔" کہتے ہوئے انہوں نے نظر اٹھائی۔ دروازے کے بیچوں بیچ کسی فریم کی مانند وہاب صاحب کھڑے تھے۔

ان کے دیکھنے پر ولید نے بھی پلٹ کر دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ "جتنی سفارش میں کر سکتا تھا چاچو میں نے کی۔۔۔ باقی آپ خود مسئلہ حل کریں۔" ولید انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ اور کمرے سے نکل گیا۔ اب وہ لاروش کے دروازے پہ کھڑا تھا۔

"وشی۔۔۔ وشی دروازہ کھولو۔ بہت اچھا طریقہ ہے یہ، اتنے دور سے ہم تم سے ملنے آئے ہیں۔"

ولید کی آواز پہ اس نے دروازہ کھول دیا۔

نم آنکھیں، بکھرے بال' نائٹ سوٹ پنک اینڈ وائٹ شرٹ ٹراؤزر میں۔ دوپٹہ کاندھے پر جھول رہا تھا۔

ولید بھائی وہ کیوں آئے ہیں۔؟ ان سے کہیں چلے جائیں واپس۔۔۔"

ولید کو راستہ دیتی اس کے پیچھے آئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ افزا اور احد بھی اندر آ گئے۔

واؤ۔۔۔ نائس بے بی روم۔۔۔" افزا اندر قدم رکھتے ہی چاروں طرف کا جائزہ لینے لگی۔ گلابی پردے' گلابی فرنیچر دیواروں پر خوب صورت پینٹ' بیڈ کے سامنے دیوار پہ انتہائی خوبناک سینری بنی تھی۔ اڑتے اڑتے بادل طلوع ہوتے سورج کی پہلی کرن۔ دور سمندر کی لہریں۔

بہت ہی خوب صورت ڈیکوریٹڈ روم تھا ایک سائیڈ پر شلف بنا تھا۔ اس میں بے شمار گفٹ آئٹمز تھے ہر عمر کے بچے کے۔۔۔ کارڈز لگے تھے۔

"کتنی خوش نصیب ہو تم وشی۔۔۔" وہ اس سے جا کر لپٹ گئی۔ "تمہاری مما کتنا پیار کرتی ہیں تم سے۔۔۔ ایک ہماری مما ہیں۔۔۔ ایک چیز بھی لیتی ہوں تو سو بار منتیں کرنی پڑتی ہیں۔۔۔"

"تمہارے نزدیک خوش نصیبی چیزوں پر محیط ہے تو واقعی میں بہت خوش نصیب ہوں۔۔۔" وہ افسردہ سی مسکراہٹ سے بولی۔ افزا پلٹ کر ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگی۔

"بس کر جاؤ ندیدی۔۔۔ کسی چیز پر نظر لگ گئی نا تمہاری۔۔۔ وہیں ٹوٹ کر گر جائے گی۔" احد نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"تم اپنے منہ پر ٹیپ نہیں لگا سکتے۔۔۔ کسی کے گھر آئے ہو' کچھ تو خیال کر لو۔۔۔" اس نے بنا پلٹے احد کو گھر کا۔

"وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں' کسی کے گھر آئی ہو۔ کچھ تو خیال کر لو ندیدہ پن گھر چھوڑ کر آنا تھا نا۔۔۔" احد نے بھی دوبدو جواب دیا۔

"بھائی! دیکھ رہے ہیں آپ۔۔۔؟" افزا ٹھنکی۔

"احد' افزا بیٹھ جاؤ اچھے بچوں کی طرح۔" ولید نے۔۔۔ دونوں کو کہا۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ بناتے بیٹھ گئے۔

"تم لے لو افزا اگر تمہیں کچھ اچھا لگ رہا ہے تو۔۔۔"

"ارے نہیں یار۔ تمہاری مما تمہارے لیے اتنے پیار سے لائی ہیں۔ افزا تمیز کے دائرے میں آچکی تھی۔

"بھائی! آپ نے کہا تھا باہر سے کھانا نہیں کھانا ہم نے۔ چچی نے ہمارے لیے کھانا بنا کر رکھا ہے۔ بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔" احد کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی۔

"اوہ۔۔۔ ماما کہاں ہیں میں دیکھتی ہوں۔۔۔" لاروش کھڑی ہوئی تو ولید نے اس کا ہاتھ کھینچ کر واپس بٹھا دیا۔

"چچی اپنے کمرے میں ہیں اور چاچو بھی۔ تمہاری انٹری اس وقت وہاں نا مناسب ہو گی یقیناً" وہاں کوئی ٹریجک سین چل رہا ہو گا۔"

"اوہ۔۔۔" وہ واپس وہیں ڈھیلی ہو کر بیٹھ گئی۔

"وشی آپی کو بہلانا چاہیے تھا کام نہ کرنے کا۔۔۔ ولید بھائی نے کمرے میں جانے سے منع کیا ہے' کچن میں نہیں۔۔۔" وہ جب موڈ میں ہوتا تو اسے وشی آپی کہہ کر پکارتا۔

"اس کی طبیعت خراب ہے احد۔۔۔" افزا پاؤں جھلا کے بولی۔

"اس کی طبیعت خراب ہے' تمہاری تو نہیں۔۔۔ جاؤ کچن میں اور کھانا لگاؤ۔" "اب بھوک نا قابل برداشت ہو رہی ہے۔" ولید نے اس کے سر پہ چپت لگاتے ہوئے کہا۔ اسے ناچار اٹھنا پڑا۔ احد بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑا کہ افزا کے بنا اسے بھی چین کہاں تھا۔

وہاب صاحب کھانا کھا کر آئے تھے۔ انہیں وہ پہلے ہی بتا چکے تھے سو ان لوگوں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

کھانا خوش گوار ماحول میں کھایا گیا۔ احد اور افزا کی نوک جھونک نے لاروش کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ ان لوگوں نے **سمعان** کے ذکر کو مناسب نہ سمجھا جبکہ لاروش **سمعان** کے کسی جملے' کسی پیغام کی منتظر رہی۔

"او کے بھئی میں کچھ دیر ریسٹ کرنا چاہوں گا۔ لاروش صاحبہ مجھے کمرہ بتا دیجئے۔" ولید چائے پی کر کھڑا ہو گیا تو لاروش اسے ساتھ والے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ احد نے بھی اس کی تقلید کی۔ افزا لاروش کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی۔

"اماں بی نے آنے کیسے دیا تم لوگوں کو۔؟" بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے افزا سے پوچھا۔

"محترمہ! صرف دو دن کی اجازت ملی ہے۔ ویسے ایک بات بتاؤں بڑی تائی کی حرکتوں اور تمہارے جانے نے بڑی اماں کو توڑ دیا ہے' کافی چینج آگیا ہے ان میں۔۔۔ ہر ایک کے معاملے میں بولنا بھی کم کر دیا ہے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

"پھر۔۔۔ تم لوگ اتوار کو واپس چلے جاؤ گے۔۔؟" لاروش کے چہرے پر افسردگی پھیل گئی تھی۔

"ہاں... میں تو کہتی ہوں تم بھی ہمارے ساتھ واپس چلو۔ بائی ایر جائیں گے' ولید بھائی گاڑی یہیں چھوڑ کر جائیں گے۔ چاچو کو کچھ کام ہے یہاں۔"

"پاپا کیوں آئے ہیں افزا..."

"حد کرتی ہو وشی... یہ بھی کوئی پوچھنے کا سوال ہے۔ ظاہر ہے ان کی اتنے سالوں کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔ وہ لمحہ نہیں بھولتے وہ' جب انہیں چچی کو روک لینا تھا۔"

"تمہیں کیسے خبر ان سب باتوں کی..." اس نے چونک کر پوچھا۔

"ولید بھائی نے راستے میں سب بتادیا ہے۔ یقین کرو' یہ لمحے بھر کی چوک تھی۔ انہوں نے چچی کو اور تمہاری نانی کو کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا... انہوں نے کراچی میں ایک الگ فلیٹ بھی لے لیا تھا خاموشی سے' بڑی اماں کو جس کی آج تک خبر بھی نہ ہوئی۔"

"لمحہ بھر نہ کہو افزا... تقریباً" ایک ہفتہ لگا تھا میری ماں اور نانی کو شہر بدلنے میں... آہ! کاش مجھے خبر ہوتی۔ میری ماں کیسی بے بسی کی زندگی گزار رہی ہے۔ کتنی تنہائی کی... میں تو سمجھتی افزا کہ میری ماما نے پسند کی شادی کرلی ہوگی۔ جب ہی پاپا..." اس کے آنسو بہہ نکلے۔

"پریشان نہ ہو وشی! اب چاچو آگئے ہیں نا... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" افزا اس کا چہرہ تھام کر بولی۔

"کیا خاک ٹھیک ہو گا... ؟ اماں بی کے غلام ہیں سارے کے سارے۔ تم دیکھنا اب میں نے کیا سوچا ہے۔ میں اور ماما' پاپا اور **سمعان** کو عدالت کے چکر لگوائیں گے۔ ان کو بتائیں گے مرد بزدل ہیں یہاں کے... ان کو عورت کی مضبوطی دکھائیں گے۔ تمہیں یاد ہے وہ ناول نفیسہ سعید کا جو ہم نے مل کر پڑھا تھا ساڈا چڑیاں دا... اس میں بھی تو **سمعان** تھا۔ نا... اور سبزہ کیسی بہادر تھی۔ میری ماں کی جوانی ان لوگوں نے برباد کردی۔ میں خلع کا کیس کروں گی ان پر۔"

"تم... تم پاگل ہو گئی ہو۔ وشی... ؟" افزا اس کی باتیں سن کر دنگ رہ گئی۔ کتنا عناد پال لیا تھا اس نے چاچو کے خلاف۔

☼ ☼ ☼

رات کے کھانے پر جب وہاب صاحب ٹیبل پر آکر بیٹھے تو لاروش تیزی سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی' وہاب صاحب حیران و پریشان اپنی لاڈلی کو دیکھتے رہے۔

ولید جو نیند لے کر فریش بیٹھا تھا۔ چچی اور چاچو کے انداز کو نوٹ کر رہا تھا۔ معاملہ کافی حد تک سلجھا ہوا لگتا تھا۔ لیکن لاروش کا یوں کھانا چھوڑ جانا... سب نے کھانا خاموشی سے کھایا۔ کھانا کھا کر وہاب صاحب کمرے میں چلے گئے' سروش کچن میں تھی' لاؤنج میں ولید' احد اور افزا بیٹھے تھے۔

افزا' ولید کو لاروش سے ہونے والی گفتگو سنا رہی تھی کہ کراہنے کی آواز پر مڑ کر دیکھا۔ وہاب صاحب دل پر ہاتھ رکھ کر نیچے کی طرف جھک رہے تھے۔

"چاچو... چاچو..." ولید' احد' افزا تینوں تیزی سے لپکے۔ سروش بھی فوراً" باہر آئیں۔ انہیں پانی پلایا۔ اب وہ صوفے پر بیٹھے دل کو مسل رہے تھے۔ مسلسل گہرے سانس لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

"چاچو! خود کو سنبھالیں پلیز۔ احد تم گاڑی نکالو۔" ولید نے وہاب صاحب کا ٹھنڈا ہاتھ پکڑا پھر احد کو چابی پکڑائی۔ افزا' ولید اور مہوش کے سہارے سے وہ گاڑی تک آئے۔ ولید احد کو ہٹا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ سروش سے راستے پوچھتا جلد سے جلد اسپتال پہنچے۔ احد ان کے ساتھ تھا۔ افزا گھر پہ ہی رک گئی تھی۔ لیکن لاروش کو بتانے سے اس نے منع کر دیا تھا۔

"معمولی انجائنا کا اٹیک ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چکنائی سے پرہیز کریں۔ ٹینشن کو قریب نہ آنے دیں۔ مارننگ واک کریں۔ دوا پابندی سے لیجیے گا۔" ڈاکٹر نے پیشہ وارانہ انداز میں کہتے ہوئے نسخہ پکڑا دیا۔

"کچھ دیر یہیں ٹھہر جائیں۔ ڈرپ میں انجکشن لگیں گے ڈرپ مکمل ہو جائے تو گھر لے جاسکتے ہیں۔"

لاروش جو کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ وہاب صاحب کو اس طرح لے کر جاتے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ فوراً" کمرے سے باہر دوڑی۔ سامنے ہی افزا کھڑی تھی۔

افزا کیا ہوا ہے پاپا کو... "اس نے تقریباً" اسے جھنجھوڑ ہی دیا۔

"بی ریلیکس وشی۔ تھوڑا پین ہوا ہے۔ لیفٹ سائیڈ پر۔ وہ تو نہیں جا رہے تھے۔ ولید بھائی زبردستی لے کر گئے ہیں۔ ابھی آجائیں گے تھوڑی دیر میں۔" افزا نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"اگر پاپا کو کچھ ہوا نا۔ میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گی افزا۔" وہ اس کے گلے لگ گئی۔

"کچھ بھی نہیں ہو گا تم پریشان نہ ہو بالکل۔ کھانا زیادہ کچھ نہیں ہوا... وہ تو ولید بھائی نے کہا' چیک اپ کرالیں تو اچھی بات ہے..." وہ اسے تھپکتے ہوئے بولی۔ صوفے پہ بٹھا کر پانی کا گلاس پکڑایا۔

"تم کال کرو ولید بھائی کو پلیز... کہ ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں۔"

"اوہو وہ ابھی راستے میں ہوں گے کیا ہو گیا وشی' بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔"

"پاپا... میرے پاپا..." وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ افزا گہری سانس لے کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور دل میں ... خیریت ... کی دعا کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد ولید کا خود ہی افزا کے سیل پر فون آگیا کہ ڈرپ لگوا کر آ رہے ہیں۔ جب تک یہ لوگ آئے نہیں لاروش وہاں سے ہلی بھی نہیں۔

"پاپا..." جیسے ہی وہاب صاحب نے اندر قدم رکھا' وہ دوڑتی ہوئی ان کے سینے سے جا لگی۔

"کیوں پریشان کر رہی ہو چاچو کو وشی۔؟" ولید نے اسے الگ کیا۔ "اندر تو جانے دو چاچو کو۔"

"اوہ سوری..." وہ آنسو پونچھتی الگ ہوئی۔

"مجھے خبر ہوتی میری گڑیا میری طبیعت خراب ہونے سے مانے گی تو میں پہلے ہی طبیعت خراب کر لیتا۔" وہاب صاحب اس کا سر تھپکتے ہوئے آہستگی سے بولے۔

"پاپا... پلیز..." لاروش نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کراچی اطلاع کی...؟" احد نے سوال کیا۔

"نہیں' وہاں کسی کو کچھ نہیں بتانا..." یک دم ہی وہاب صاحب بول اٹھے۔

"کوئی نہیں بتا رہا چاچو! آپ ریلیکس ہو کر لیٹ جائیں۔ ہمیں آپ کی پول تھوڑی کھولنی ہے۔"

ولید نے آنکھ مارتے ہوئے ماحول کو خوش گوار بنانے کی کوشش کی۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی جبکہ سروش ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے ان کے لیے سوپ بنانے چل دیں اور ان کا اس طرح اداس ہونا وہاب صاحب نے محسوس کر لیا۔ ان کے فیصلے میں پختگی آگئی۔

"ولید' احد اور افزا اتوار کو بائی ایر چلے گئے۔ گاڑی وہیں چھوڑ دی۔ پیر کی صبح وہاب صاحب ضروری کام کا کہہ کر نکلے تو شام ڈھلے ہی لوٹے۔ اور جو انہوں نے فیصلہ سنایا تو سروش حیران رہ گئیں۔

"پاپا... میں اتنی ہمت..." لاروش کے خوشی کے مارے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"ہمت تو میرا بچہ احساس ہوتے ہی آگئی تھی۔ لیکن تمہاری ماں نے مہلت ہی نہ دی تھی۔ فوری طور پر ایک فلیٹ کراچی میں ہی لے لیا تھا میں نے۔"

"گڈ پاپا..." وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کہ بیٹھ گئی۔

"لیکن میری بیٹی میری بات مانے گی اب...؟"

"کبھی کوئی بات ہے پاپا جو میں نے آپ کی نہیں مانی...؟" وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

"گھر سیٹ ہونے کے بعد آپ پلاسٹک سرجری کے لیے چلیں گے ہمارے ساتھ۔" وہ چند پل انہیں دیکھتی رہی۔ وہ تکلیف دہ لمحے ذہن میں اسکرین کی طرح چلنے لگے۔

"ہمارے ساتھ... کا مطلب ہے... قبول ہے سر۔" وہ معصومیت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولی تو وہاب

صاحب اور سروش دونوں کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔



گھر سیٹ ہوتے ہی وہ لاروش کو پلاسٹک سرجری کے لیے لندن لے گئے۔ اماں بی کو آج تک انہوں نے سروش کے ساتھ رہنے کا نہیں بتایا تھا۔ وہ یہی سمجھتی تھیں کہ وہاب صاحب سروش کو طلاق کے پیپرز بھجوا چکے ہیں۔

ابھی چند دن ہی گزرے تھے انہیں واپس پاکستان آئے ہوئے کہ بڑی تائی منعہ اور غفران کے ساتھ ان کے گھر آگئیں۔ جہاں سروش بیگم ان کو دیکھ کر حیران رہ گئیں وہیں لاروش بھی حیران پریشان کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ ان کے آنے کے چند گھنٹے بعد سارا ماجرا کھل گیا تھا۔ سمعان کا زبردست ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ جس میں اس کی ٹانگیں اور ایک بازو بری طرح متاثر ہوا تھا۔ ان کی بھانجی جو پہلے سمعان کی دیوانی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اس نے شادی سے انکار کردیا تھا۔ وہ لاروش کو لینے آئی تھیں۔ سمعان کسی سے نہیں سنبھل رہا تھا۔ ان کے آنے سے لاروش کے زخم ادھڑ گئے۔

تین دن..... محض تین دن ہی تو تھے اس کی شادی میں... وہ کتنی خوش تھی۔ ڈھولک رکھی جاچکی تھی۔ وہ پیلا جوڑا پہنے پورے گھر میں افزا اور احد کے ساتھ دوڑیں لگاتی تو اماں بی کی گھرکیوں سے بھی نہ رکتی۔ اس کی شادی کی تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے ہی اسے مایوں بٹھادیا گیا تھا۔ گوکہ اس کا نکاح ہوچکا تھا۔ لیکن اماں بی کا آرڈر کہ سمعان سے مکمل پردہ کرایا ہے۔ وہ خود بھی سمعان سے شرمائی شرمائی پھر رہی تھی لیکن اس کی شوخ نظریں کہیں نہ کہیں اسے دیکھ لیتی تھیں۔ شادی کی تیاریوں اور اپنی ہی شادی میں افزا کے ساتھ لڈی ڈال کر وہ تھک چکی تھی' اس دن بھی اسے بخار ہوگیا تھا۔ شام میں طبیعت کچھ سنبھلی تو سب نے اس کے کمرے میں ڈیرہ ڈال لیا۔

سمعان کسی کام سے افزا کو بلانے وہاں آیا تو اسے نہ جانے کیا شرارت سوجھی اندر آکے لاروش کے بالکل برابر میں بیٹھ گیا۔ اور سیلفی لینے لگا۔ لاروش کو گھبراتا دیکھ کر ولید نے اسے اپنے لیے چائے بنانے بھیج دیا۔ کچھ ہی لمحوں میں پورا گھر لاروش کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ ملازمہ نے سب کے لیے نگٹس بنانے کو آئل کڑھائی میں ڈال کر گرم کرنے رکھا تھا چائے بناتے ہوئے اسے یک دم چکر آیا اس نے کچھ پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا' کڑھائی میں اس کی تین انگلیاں چلی گئیں اور کڑھائی نیچے گرتے ہوئے کافی سارا تیل اس پر گرا گئی۔ چند لمحے چیخ کر وہ ہوش و خروش سے بے گانہ ہوگئی۔

ڈاکٹرز کا کہنا تھا بیٹا مسئلہ صرف بخار کا نہیں بلکہ کیفیت نروس بریک ڈاؤن کی تھی۔ بہت زیادہ ذہنی دباؤ اور مسلسل سوچوں کی وجہ سے کنڈیشن بنی تھی۔ وہ سوچیں سوائے "ماں" کے بعد کیا ہوسکتی تھیں کہ ہر لڑکی کو اس وقت ماں کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑی تائی جو نکاح سے اب تک کسی بہانے کی تلاش میں تھیں انہیں اس کے جلے جسم کی صورت میں انکار کا بہانہ مل گیا۔ سمعان صرف خاموش تھا۔ وہ رشتہ ختم کرنے کے قطعی حق میں نہ تھا' لیکن ماں کو انکار کرنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ وہ بھی خاموشی سے اپنی بھانجی کی انگلی میں سمعان کے نام کی انگوٹھی ڈال آئیں۔ وہ خاموش تماشائی بنا تھا۔ اور اب اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ جب سمعان کسی سے نہیں سنبھلا تو وہ بنفس نفیس یہاں موجود تھیں۔

لاروش ان کی ہمت پر حیرت زدہ تھی۔ انہیں ذرا خیال نہ آیا کس طرح چلی آئیں۔ نہ جانے دنیا میں کیسے لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کے جذبات کو پاؤں تلے روندتے ہوئے سوچنے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔ بڑی تائی مایوس لوٹ گئیں۔ دو دن بعد افزا کی ویڈیو کال نے اسے بے کل کردیا۔ بات کرتے کرتے اس نے فون سمعان کے آگے کردیا۔ یہ وہ سمعان تو نہ تھا۔ وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔

وہ بھی خاموش تھا۔ ماتھے پر بکھرے بال، چہرے پر جابجا زخم۔۔۔ تکیوں کے سہارے بیٹھا ہوا سرخ آنکھوں اور بہتے آنسوؤں سے اسے دیکھتا۔۔۔ یہ وہ سمعان تو نہ تھا۔ اسے لگا جیسے آنسوؤں کا گولا اس کے گلے میں پھنس گیا ہو۔ ہر شے سے بے نیاز ہو کر اس ظالم کو تک رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے ذہن نے کام کرنا شروع کیا۔

"بزدل مرد۔" پہلا لفظ اس کے دماغ میں یہی آیا۔ جو شاید اس کے لبوں کی جنبش سے بھی ادا ہوا۔ سمعان نے محسوس کرلیا۔۔۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا اس نے زوردار انداز میں موبائل دیوار پہ دے مارا۔ چھناکے سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر گیا۔

"کیا ہوا وشی۔۔۔" سروش جو اس کے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھیں آواز پر دروازہ کھول کر اندر آگئیں۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا میری جان۔۔۔" وہ اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولیں اور اس کا چہرہ اٹھایا۔ وہ ان سے لپٹ گئی۔

"ماما۔۔۔ ماما۔۔۔" وہ بچوں کی طرح سسک سسک کے رو رہی تھی۔ "آپ جیسا حوصلہ کہاں سے لاؤں۔۔۔ یہ روح کو چھید دینے والی اذیتیں۔" وہ جانتی تھیں۔۔۔ اس درد سے آشنا تھیں۔ اس کی انا کو شدید ٹھیس پہنچی تھی۔ ایک طرف اس کی انا دوسری طرف سمعان۔۔۔

دوسری صبح ولید چلا آیا۔

"اب ہر کوئی مجھے سمجھانے آئے گا۔۔۔؟" جب ولید نے اسے سمجھانا چاہا تو وہ تپ ہی گئی۔ "اپنے اچھے برے کی تمیز ہے مجھے ولی بھائی۔۔۔ بہت جلد آپ کے کزن کو نوٹس مل جائے گا۔ خلع کا۔۔۔"

باہر سے اندر کی جانب آتے وہاب صاحب یک دم اس کی بات سن کر لڑکھڑا گئے۔ ولید نے لب بھینچ لیے۔ وہاب صاحب چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اس تک آئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ساتھ بیٹھے اور گویا ہوئے۔

"میرا بچہ، یہ زندگی بہت مختصر ہے اور بہت قیمتی ہے۔ چند لوگوں کی کم ظرفی اور بزدلی کی وجہ سے اسے ضائع مت کرو۔ اگر تمہاری ماں نے میری بزدلی کی وجہ سے سولہ سال تپتے صحرا میں گزارے ہیں تو میں نے بھی پل پل جدائی کی اذیت کو محسوس کیا ہے۔ باہر سے انسان خود کو کتنا بھی مضبوط ظاہر کرے، اندر محبت پنجے گاڑے بیٹھی رہتی ہے۔ تمہارا یہ عمل ساری زندگی تم دونوں کے لیے نارسائی کا دکھ لائے گا۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ اپنی انا سے منہ موڑ کر دونوں ایک ہو جاؤ۔ اب جبکہ تمہاری تائی خود تم سے معافی کی طلب گار ہیں تو بیٹا۔۔۔ تمہارے باپ کی بھی یہی خواہش ہے کہ اپنا ظرف اپنی ماں جیسا رکھ کر انہیں معاف کر دو۔ اللہ بھی معاف کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتیں کہ تم اللہ کی پسندیدہ بن جاؤ۔" وہ اس کا سر تھپتھپاتے صوفے پر سے اٹھے اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"میں ایک شرط پہ چلوں گی۔۔۔؟" ولید نے جو وہاب صاحب کے اٹھ جانے کے بعد اس کی خاموشی پر اسے جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز پہ سکون کا سانس لیا۔

"بولو۔۔۔"

"اماں بی بابا کو قبول کریں گی تو میں راضی ہوں۔" اب وہ ولید کو جانچتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ولید انکار کر دے گا۔

"اماں بی تو کب سے اپنی بہو اور پوتی سے معافی مانگنے کے لیے بے چین ہیں لیکن پوتی کی الٹی کھوپڑی قابو میں ہی نہیں آرہی تھی۔" وہ اس کے برابر آ بیٹھا اور اس کا ماتھا کھٹکھٹا کر بولا۔

"یہاں سے واپسی پر ہی میں نے اماں بی کو تمام کارگزاری سنا دی تھی۔ وہ بہت شرمندہ ہیں چاچو سے، چچی سے، تم سے۔۔۔ کیا تم گوارا کرو گی کہ اماں بی تم سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگیں۔۔۔؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں ولید بھائی۔" وہ یک دم تڑپ کر بولی۔

"تو پھر ٹھیک ہے، جلدی سے تیاری کرو۔ میں سیٹیں بک کراتا ہوں۔" وہ اس کی ناک کھینچتا ہوا اٹھ

کھڑا ہوا۔



پر زور انداز میں ان کا استقبال ہوا۔ کوئی ہنس رہا تھا کوئی رو رہا تھا۔ کوئی معافی مانگ رہا تھا۔ احد تو باقاعدہ بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ شور اتنا تھا کہ کسی کو کسی کی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ سب ایک دوسرے سے معافیاں مانگ رہے تھے۔ غفران' سمعان کی وہیل چیئر بھی وہیں لے آیا۔ اماں بی بار بار سروش سے معافی مانگ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ چومتیں۔ اپنے ساتھ لگاتیں۔ پے در پے پوتی اور پوتے کے ساتھ ہونے والے حادثے نے ان کے زعم کو ختم کر ڈالا تھا۔ کافی دیر بعد جب سب اپنی اپنی کہہ سن چکے تو کان — پڑی آواز سنائی دینے لگی۔ اسے غنیمت جان کر ولید نے بھوک کا نعرہ لگایا تو خواتین کو ہوش آیا۔

کھانے سے فارغ ہو کے چائے کا دور چلا۔ سب بڑے تو کمروں میں چلے گئے۔ ینگ پارٹی وہیں موجود رہی۔ جب سب کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو اپنے اپنے کمروں کی جانب روانہ ہوئے۔ لاروش اپنے کمرے تک پہنچی ہی تھی کہ بڑی تائی نہ جانے کہاں سے اچانک اس کے سامنے آگئیں۔ معافی کے لیے دونوں ہاتھ باندھے۔

"میں تمہارے پاؤں پڑنے کے لیے تیار ہوں لاروش... میرے بچے کو نظر انداز مت کرو۔" وہ یک دم جھکیں۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ تائی...؟" اس نے انہیں کندھوں سے تھاما۔

"بس... تم نے ایک بار بھی اس کی خیریت نہ پوچھی۔ وہ آس لیے تمہیں دیکھتا ہی رہا۔ تمہاری رخصتی کی تاریخ جا چکی ہے لاروش... یوں سمجھو رخصتی بھی ہو گئی۔ میں نے تمہارے ماں باپ سے اجازت لے لی ہے۔" وہ اسے بازوؤں کے گھیرے میں لیے سمعان کے کمرے تک آگئیں۔ اس کے ماتھے پہ بوسہ دے کر پلٹ گئیں۔

وہ تذبذب کا شکار تھی چند لمحے گزرنے کے بعد وہ ہچکچاتی لاک گھما کر اندر داخل ہوئی۔ وہ بازو آنکھوں پہ رکھے ہوئے تھا۔ کمرے میں نائٹ بلب کی روشنی تھی پلٹ کر اس نے دروازہ لاک کیا اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں چھت کی طرف گئیں۔ وہاں بہت خوب صورتی سے شیٹس لگی تھیں' اسے یاد تھا شادی کی تاریخ سے پندرہ دن پہلے ہی غفران' کامران' احد' ولید بھائی اور خود سمعان کمرے کو سجانے کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ کس روپ میں آنا تھا اسے... اس کی نگاہ اپنے سادہ سے حلیے پہ گئی اور جب ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ پر پلاستر والے دولہا پر نظر پڑی تو اس کے چہرے پہ یک دم ہی مسکراہٹ آگئی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"وہاں کیوں کھڑی ہو...؟" بہت آہستہ سے بولا۔

وہ جھجکتی ہوئی اس کے قریب آگئی اور پائنتی پہ

بیٹھ گئی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔
"لیٹے رہیں..." وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔
"تو پھر یہاں آؤ اتنے دور سے کیسے بات کروں...؟" وہ لاچار شکل بنا کر بولا تو وہ اٹھ کر بیڈ کے دوسرے حصے پہ آبیٹھی۔
"کیسے معافی مانگوں تم سے... میرے تو ہاتھ بھی نہیں جڑ سکتے...؟"
"کون کہہ رہا ہے' معافی مانگیں۔ مت مانگیں..." وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔
"اس کا مطلب ہے تم نے معاف کر دیا مجھے۔" وہ اپنے ہاتھ کو اس کے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے بولا۔
"کر دیا..." وہی لٹھ مار انداز۔
"اگر کر دیا ہے تو تم یہ جتانا چاہ رہی ہو کہ تم اپنے معذور' بے بس اور لاچار شوہر کے سامنے بیٹھی ہو جس کے قریب بیٹھ کر بات سننا بھی تمہیں گوارا نہیں ہے۔" وہ انتہائی مسکینیت طاری کرتے ہوئے بولا۔ لاروش کی ہنسی نکل گئی' وہ تھوڑا اس کے قریب کھسک آئی۔
"ہاں... اب ٹھیک ہے' مجھ سے بدگمان تھیں تم...؟" وہ اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے بولا۔ وہ بولی کچھ نہیں' صرف شکوہ کناں نظروں سے دیکھتی رہی۔
"تمہیں معلوم ہے' میں نے بھی چاچو کی طرح ایک فلیٹ بک کرالیا تھا۔ میں تمہارے پاس خود آنا چاہتا تھا' لیکن ولید نے مجھے روک دیا کہ جب فلیٹ مکمل ملکیت میں آجائے پھر جانا جس دن فلیٹ کی چابی میرے ہاتھ آئی اسی شام میرا یہ حال ہو گیا۔ یہ اللہ کی طرف سے بدلا تھا... تمہاری آہوں کا صلہ تھا... سب کے دل بدل گئے۔"
"یار' لیکن ایک بات ہے' میں تو چلو ٹنڈا منڈا پڑا ہوں۔ تمہیں تو دلہن بن کر آنا چاہیے تھا یہاں... آہ..." سمعان نے بات کرتے کرتے کروٹ بدلنی چاہی تو اس کی چیخ نکل گئی۔
"دیکھو میں نے حجام کو گھر بلوا کر بہترین اسٹائل بنوایا ہے اور آپس کی بات ہے ایک دو کریمیں لگا کہ اس نے فیس پالش بھی کر دی۔ یار! اتنے دن سے ٹھیک سے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ بس اسی لیے میں نے سوچا ٹنڈا منڈا تو پڑا ہوں اگر شکل بھی اچھی نہ رہی تو لڑکی کہیں ریجیکٹ ہی نہ کر دے۔" وہ خوش تھا۔ بہت خوش اسے پاس دیکھ کر اوٹ پٹانگ ادھر ادھر کی ہانک رہا تھا۔
"واقعی؟" لاروش نے غور کیا اس دن کی بہ نسبت آج کافی بہتر اور فریش لگ رہا تھا۔
"تم... تم کچھ نہیں بول رہیں وشی... تم بھی تو کچھ کہونا... مجھے باتیں سناؤ... برا بھلا کہو... کچھ تو کہو' مگر خاموش نہ رہو۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔
"کیا کہوں...؟" اس کے ہاتھ میں اپنے دبے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولی۔
"کچھ بھی... کوئی اقرار... کوئی اظہار... کچھ تو کہو..." اس نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ سمعان نے بے چین نظروں سے اسے دیکھا۔ لاروش نے یک دم اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ سمعان نے پرسکون ہو کر گہری سانس لی۔
وہ ماضی کے تلخ رویوں اور باتوں کو دہرا کر اپنے حال کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔
"کچھ بھی نہیں کہو گی۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولا۔ گو کہ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہی تھی' لیکن سمعان منتظر تھا۔
"اوہ..."
"جو بات ہم کہہ نہیں سکتے' وہ ہم فرض کرتے ہیں۔
چلو ہم فرض کرتے ہیں' ہمیں تم سے محبت ہے۔"
وہ کہنی کے بل اونچی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے اظہار سے سمعان کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے۔ لاروش کے لفظوں نے اسے سرشار کر دیا تھا۔ اسے لگا جیسے سانسوں کے بکھرے تار یک دم مل کر گنگنا اٹھے ہوں۔



میڈم آپ کے لائف پارٹنر ایک پہیے والی گاڑی چلاتے ہوں گے۔" ثمرہ نے اس کا ہاتھ تھام کر بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا مطلب؟ ایک پہیے والی گاڑی؟ ایک پہیے والی کون سی گاڑی ہوتی ہے۔" بہت سی سوالیہ آوازیں ابھری تھیں۔

"ویسے آپ لوگوں کو ہنٹ دے رہی ہوں' وہ گاڑی ہاسٹل میں بھی موجود ہے۔"

"ہاسٹل میں؟" سب نے سوالیہ انداز میں حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"مگر ہم میں سے تو کسی کے پاس گاڑی ہے ہی

ہتم تو بڑی اچھی پہیلیاں تخلیق کر سکتی ہو۔" سب نے کم و بیش ملی جلی رائے کا اظہار کیا تھا۔ اور وردہ کو یوں لگا جیسے ستائش کے چہرے پر کوئی سایہ سا لہرا گیا ہو۔

"کمرے میں چلیں ستائش۔" طالبات کے کمرے میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہوئے وردہ کو کافی وقت گزرنے کا احساس ہوا تھا۔

"لائٹ بند کر دینا۔" منہ دھو کر نائٹ کریم کا مساج کرتے ہوئے اس نے ستائش کی آواز سنی جو کروٹ بدل کر لیٹ چکی تھی۔

"او کے گڈ نائٹ۔" اس نے لائٹ بند کر کے نائٹ بلب آن کیا اور ہاتھوں پر مساج کرتے ہوئے وردہ اپنے

عتیقہ ملک

گلدان میں رنگ سجے رکھیں

نہیں' گاڑی کیا ہم تو رکشا بھی افورڈ نہیں کر سکتے' ورنہ چاچے خیر دین کے رکشے پر بازار کیوں جاتے۔" مینا نے بہت تیر مارا تھا کہہ کر۔

"شکر ہے مینا! آج تم نے بھی کوئی ڈھنگ کی بات کی' ویسے ثمرہ! یہ بتاؤ وہ گاڑی کہاں کھڑی ہے۔" نگہت نے مینا کو داد دے کر ثمرہ سے پوچھا تھا۔

"یہ جو ہاسٹل کے پچھلے حصے میں کنسٹرکشن ہو رہی ہے' وہیں کہیں پڑی ہوگی۔"

"پڑی ہو گی یا کھڑی ہو گی۔" کہتے ہوئے وردہ کو جیسے یک دم کوئی خیال آیا۔

"اوہ مائی گاڈ ثمرہ کی بچی! تم ریڑھی کی بات کر رہی ہو؟"

"واؤ! ہمارا اس طرف خیال کیوں نہیں گیا۔ بھئی

بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب ایک نامانوس سی آہٹ پر اس کی آنکھ کھلی اور اس کی نگاہ ستائش کے خالی بیڈ پر گئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اٹھتے ہوئے اس کی نگاہ فرش پر پڑی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"ستائش' ستائش۔" آوازیں دیتے ہوئے پہلے تو وہ لپک کر اس کے پاس گئی اور تیزی سے ٹیبل پر پڑا موبائل اٹھا کر ڈاکٹر اسد کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"اسد بھائی۔۔۔ اسد بھائی۔۔۔ پلیز ہیلپ می' میری روم میٹ ٹیچر ہے نا ستائش۔۔۔"

☆ ☆ ☆

"ملک صباحت' ستائش کہہ رہی ہے کہ وہ وہاں



ہاسٹل میں رہ لے گی۔ اس نے خود کالج فون کرکے بات کی ہے وہاں بہت اچھا ہاسٹل ہے۔"

"زینت بیگم! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ آخر ہمیں کیا کمی ہے۔ جو ستائش اب نوکری کے لیے باہر خوار ہو گی؟"

"بات کمی کی نہیں ہے ملک! ستائش گھر سے باہر نکلے گی لوگوں میں اٹھے بیٹھے گی تو اس کا دل بہل جائے گا۔"

"مجھے تو تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔" ملک خدا بخش تذبذب کا شکار تھے۔

"میں خود ستائش کو اس قدر دور نہیں بھیجنا چاہتی' مگر اس کی بہت خواہش ہے اور میرا دل چاہتا ہے ملک صاحب! کہ میں اس کے نصیب کو نہیں بدل سکتی' مگر اس کی ان چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا خیال تو رکھ سکتی ہوں نا۔" ملک خدا بخش خاموش ہو گئے تھے۔ زینت بیگم کی بات سن کر۔

"خیر' تم ستائش کو بلاؤ' میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔" جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر چند ثانیے سوچنے کے بعد انہوں نے کہا تھا۔

"رکھی.... او رکھی! ذرا ستائش کو تو بلا لاؤ۔"

"جی بابا جان! آپ نے بلایا ہے؟" تھوڑی ہی دیر میں ستائش ان کے سامنے تھی۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں بیٹا! چوکیرہ اس قدر دور ہے۔ تم وہاں کس طرح پڑھانے جا سکتی ہو۔ چلو شہر میں تمہاری نوکری لگتی تو وہاں تم آسانی سے رہ سکتی تھیں۔ اب کیا مجبوری ہے یوں دور جانے کی؟"

"بابا! بھلے مجبوری نہیں ہے' مگر میں مصروف رہنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے مت روکیں۔" اس نے اس قدر لجاجت سے کہا کہ ملک خدا بخش خاموش ہو کر رہ گئے تھے۔

"ذرا پرنسپل کو فون تو ملاؤ' میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔"

"وردہ' وردہ!" اسد بھائی لاؤنج سے اسے آوازیں لگا رہے تھے اور وہ کچن میں چائے کا پانی چولہے پر چڑھائے ہنوز خاموش کھڑی تھی۔

"ارے بھائی میں تمہیں اتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں اور تم ہو کہ جواب ہی نہیں دے رہیں' وردہ!" اسد بھائی نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تھا۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک پلیزنٹ سرپرائز ہے سوچ لو۔ یوں ناراض ہو کر گھاٹے میں رہو گی۔" انہوں نے اسے لالچ دیا تو بے اختیار ہی اس کے جارحانہ تاثرات میں تبدیلی آئی اور وہ متجسس نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"اب پوچھ بھی چکو یا خود ہی ڈھیٹ بن کر بتا دوں۔" انہوں نے جھنجلا کر کہا تو بے ساختہ ہی وردہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"خود ہی ڈھیٹ بن کر بتا دیں۔" اس نے بڑے آرام سے ان کی بات دہرائی تھی۔

"بوجھو تو جانیں۔" انہوں نے ایک لفافہ اس کے سامنے لہرایا تھا جسے وردہ نے اچکنا چاہا' مگر اسد بھائی کے ہاتھ اوپر کرنے پر اس کی یہ کوشش ناکام ہو گئی تھی۔

"کیا ہے بھائی جان' بتا بھی دیں نا۔" اب کی بار وردہ کی جھنجلاہٹ فطری تھی۔

"تمہارا اپائنمنٹ لیٹر گورنمنٹ ڈگری کالج برائے چوکیرہ۔" انہوں نے مزید تنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے لفافہ اس کے ہاتھ میں پکڑایا تھا اور وردہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خوشی سے بھنگڑا ڈالے۔ اس کا لیکچرر شپ کا خواب پورا ہو رہا تھا اس کے اپنے شہر میں.... وہ یہ خبر لوا کو سنانے کے لیے بھاگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہاسٹل!" اس نے اسد کی بات کو حیرت سے دہرایا تھا۔ "میں کیوں رہوں گی ہاسٹل میں' آدھے گھنٹے کا تو راستہ ہے۔" اگلے روز جب اسد نے اس کے ہاسٹل میں رہنے کی بات کی تو وہ حق دق رہ گئی تھی۔

"دیکھو وردہ! تم میری وجہ سے پریشان رہتی ہو۔

کبھی نائٹ ڈیوٹی‘ کبھی ایمرجنسی کی پریشانی‘ پھر دیکھو بوا بھی تمہاری وجہ سے پابند ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان کا نواسا بیمار ہوا تو وہ اسے دیکھنے تک نہ جا سکیں تمہیں جس طرح گھر کا چکر لگاتا ہوں اسی طرح روزانہ ہاسٹل کا بھی....“

”تو یوں کہیں نا آپ لوگ میری وجہ سے اپنی من پسند زندگی گزارنے سے محروم ہو رہے ہیں اور میرا ناقابل برداشت بوجھ آپ لوگوں نے اب تک اٹھا رکھا تھا اب اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔

اسد اور وردہ دو ہی بہن بھائی تھے۔ والدہ کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا۔ چند سال قبل جب اسد ہاؤس جاب کر رہا تھا‘ والد بھی چل بسے۔ وردہ تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی اور اس کی وجہ سے اسد نے باہر جانے کا پروگرام بھی منسوخ کر دیا تھا۔ اس نے والد کے چھوڑے ہوئے کاروبار کو بیچ کر ایک جدید اسپتال کی بنیاد رکھی جو اس کی انتھک محنت اور توجہ کی بدولت اس علاقے کا بہترین اسپتال مانا جاتا تھا۔ اگرچہ اس نے وردہ کو کبھی بھی والدین کی کمی محسوس نہ ہونے دی‘ مگر میڈیکل کے شعبے سے منسلک ہونے اور اسپتال کے سربراہ کی حیثیت سے اس کا کام اس قدر وقت مانگتا تھا کہ وردہ اور بوا کو اس سے گھر پر وقت نہ دینے کی ہمیشہ شکایت رہتی تھی۔ کبھی کبھار تو وہ کئی دن چکر نہ لگا پاتا تھا۔ بوا گاؤں جانے کے لیے پر تول رہی تھیں ان کا اصرار تھا اسد شادی کر لے تو یہ گھر آباد ہو جائے‘ مگر اسد نے شادی کا فیصلہ کرنے کے بجائے وردہ کے ہاسٹل جانے کا شوشا چھوڑ دیا تھا جس پر وردہ اس سے سخت ناراض تھی۔



”ادارے کی مہربانی سے ہمیں چار مزید لیکچررز مہیا کیے جائیں گے شکر ہے ایکسٹرا پیریڈ سے میری جان تو چھوٹی۔“ مسز مصطفیٰ نے بہ آواز بلند شکریہ ادا کیا تھا۔

”ابھی مکمل تسلی نہیں ہے مسز مصطفیٰ! کہ آپ کی جان چھوٹی یا نہیں۔ کیونکہ یہ تو ان خواتین کے جوائن کرنے کے بعد ہی کنفرم ہو گا کہ آپ کی جان چھوٹ گئی ہے۔“ مس لاریب نے موبائل پر نیٹ سرچ کرتے ہوئے ان کی خوشی کے گراف کو نیچے کرنا چاہا تھا۔

”بری بات منہ سے نہیں نکالتے۔“ انہوں نے منہ بنا کر لاریب کو ٹوکا تھا۔

”جی ہاں‘ بے خبری بھی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ سوشیالوجی کی جس لیکچرر کو اپائنٹ کیا گیا تھا وہ کل جوائن کرنے آئی تھیں اور جب انہیں پتا چلا کہ کالج کا کوئی اپنا ہاسٹل نہیں ہے تو وہ جوائن کیے بنا ہی چلی گئیں واپس۔“

”اوہ نو۔“ مسز مصطفیٰ نے کڑوا سا منہ بنایا تھا ایک روز پہلے وہ چھٹی پر تھیں اور اس صورت حال سے بے خبر ہی تھیں۔

”میتھ کی جو لیکچرار اپائنٹ ہوئی تھیں انہوں نے اپنے ہوم اسٹیشن پر اپلائی کیا تھا‘ مگر قرعہ فال یہاں نکلا انہوں نے پرنسپل آفس فون کر کے انفارمیشن لیں اور جب انہیں پتا چلا کہ کالج میں داخل ہونے کے لیے سیڑھیاں چڑھنا پڑیں گی اور کلاس روم میں جانا بھی سیڑھیاں چڑھے بغیر ممکن نہیں تو انہوں نے جوائن کرنے سے ہی معذرت کر لی‘ ویسے بھی وہ بڑی ویل آف فیملی سے بی لانگ کرنے والی خاتون تھیں بس

معذوری کی وجہ سے جاب کرنا چاہ رہی تھیں کہ کل کلاں کو بھائیوں اور بھابھیوں کا دست نگر نہ ہونا پڑے اور اردو کی سیٹ پر......

"بس بس آگے کچھ مت بتانا۔" مسز مصطفیٰ نے مصنوعی گھبراہٹ سے مس لاریب کو ٹوکا تھا۔ اسٹاف کی تقرری کالج ممبران کے درمیان ڈسکس ہو رہی تھی' دور دراز شہروں سے آنے والی لیکچررز جلدی جلدی تبادلے کروالیتیں لہٰذا مقامی اسٹاف کو ہی ایکسٹرا کلاسز لینا پڑتی تھیں۔

"نہیں نہیں میں آپ کو ایک اچھی بات بتا رہی ہوں۔"

"یہ ہماری پولیٹکل سائنس کی ٹیچر ہیں اور انہوں نے جوائن کرکے ہاسٹل میں پڑاؤ ڈال لیا ہے۔" مس لاریب نے وردہ کی طرف اشارہ کیا تھا جن سے مسز مصطفیٰ آتے ہی مل چکی تھیں۔

"یہ بھی اڑ جانے والی چڑیا لگتی ہیں۔" مسز مصطفیٰ نے اس کا جائزہ لے کر کچھ مایوسی سے کہا تھا۔

"امپاسبل۔" مسز علوی نے مسکرا کر ان کے خیال کو رد کر دیا تھا۔

"ان کا ہوم اسٹیشن یہی ہے۔"

"اوئے تو میرے پیارے بچے پہلے آپ کہاں تھے۔ کب ماسٹرز کیا ہے۔" مسز مصطفیٰ کے چہرے پر رونق آگئی۔ جواباً وردہ مسکرا کر ان کی بات کا جواب دینے لگی۔

باتوں باتوں میں مسز علوی نے اردو ٹیچر کے بارے میں استفسار کیا تو سب کی توجہ اس طرف مڑ گئی۔ سب کا متفقہ خیال تھا کہ چونکہ اس کا تعلق کسی بڑے گھرانے سے ہے لہٰذا وہ بھی اس قدر دور اور کم سہولیات والے کالج میں جوائن نہیں کرے گی۔ وردہ کے لیے چونکہ سارا ماحول ہی نیا تھا لہٰذا ایک نئی آنے والی ٹیچر سے اسے ہرگز کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بے دھیانی میں ان کی بات چیت سنتی رہی اور جب وہ کلاس میں جانے کے لیے اٹھ رہی تھی ایک خوب صورت چہرہ اسٹاف روم میں داخل ہوا تھا۔

"السلام علیکم میں ستائش ہوں' میرا ایز اے اردو لیکچرر اپائنٹ منٹ ہوا ہے۔" وردہ نے چونک کر نظریں اٹھائی تھیں۔

"ارے ستائش تم؟" بے اختیار ہی وہ اٹھ کر گرم جوشی سے اس کی طرف مڑی تھی۔

"وردہ' واؤ تم بھی ادھر۔" جوابی خیر مقدم پر تمام اسٹاف نے کچھ حیران نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

"نیک شگون ہے۔" مسز علوی نے رائے دی تھی۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں کتنی خوش ہوں۔" وردہ نے کہا تھا۔

"اور میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں یہاں دیکھ کر میں کتنی خوش ہوں۔" جواباً ستائش نے کہا تھا۔

"میں تو بھائی سے لڑ جھگڑ کر آئی تھی کہ چند دن میں گھر واپس شفٹ ہو جاؤں گی' مگر تمہارے آنے سے لگ رہا ہے کہ بھائی کا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔"

"میں نے تو خیر اپنی خواہش اور ضد پر جوائن کرنے کا فیصلہ کیا تھا' مگر پھر بھی ٹینشن تو تھی کہ اجنبی لوگوں اور ماحول میں ایڈجسٹ کیسے کروں گی' مگر تمہیں دیکھ کر ساری اجنبیت اور ٹینشن دور ہو گئی۔" جواباً ستائش کے خیالات بھی اس سے ملتے جلتے تھے۔

"ویسے ہم دونوں کتنے سیلفش ہیں اپنا اپنا ہی سوچ رہے ہیں۔" وردہ نے کہا تو دونوں ہی ہنس پڑیں۔

"نہیں' میں تو سوچ رہی ہوں کہ میری تو خیر ہے جیسے تیسے گزارا ہو جاتا۔ اگر میں نہ آتی تو یہ لڑکی' میڈم وردہ میرے بغیر کیسے رہتی۔" ستائش نے شرارتی انداز میں کہا تھا۔

"گریٹ تھینکس' گریٹ تھینکس۔" وردہ کورنش بجالائی۔

"میڈم آپ کی چائے یہیں لے آؤں یا آپ لوگ ڈائننگ روم میں آئیں گے۔" ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

"آئی تھنک چائے ہم بچوں کے ساتھ ہی جا کر پیتے ہیں۔" ستائش نے کہا تو وردہ نے بھی سر ہلایا تھا۔

"چلو آج ہاسٹل کے سارے اسٹوڈنٹس سے بھی تعارف ہوجائے۔" وردہ نے تائید کی تھی۔
وہ دونوں ایک دوسرے کی کمپنی میں خوش تھیں، مگر آنے والے دنوں میں طالبات کے ساتھ بھی اپنائیت بھرا ماحول بن گیا تو اس کا سہرا بھی خاصی حد تک ستائش کی اچھی اور دوستانہ فطرت کے سر تھا۔ طالبات کا کوئی بھی مسئلہ ہو یا کوئی بھی پریشانی ہوتی وہ حل کرنے کے لیے موجود ہوتی۔
"میڈم ہم آپ لوگوں کے لیے ویلکم پارٹی ارینج کررہے ہیں۔" اس دن کچھ طالبات ان کے کمرے میں موجود تھیں۔
"بچو! آپ لوگ بھی تو نئے آئے ہیں، ہم نے تو ایسا کوئی تکلف نہیں کیا پھر آپ یہ تکلف کرکے ہمیں کیوں پرایا کررہے ہیں۔" وردہ نے ان کی خواہش کو گویا رد کرنے کی کوشش کی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ طالبات پر کوئی بوجھ ہو۔
"میڈم! آپ نے ہمیں ویلکم پارٹی نہیں دی تو یہ آپ کی غلطی ہے، ہم ایسی غلطی نہیں کرنے والے۔"
"اور ہم کون سا سرینا میں پارٹی دینے جارہے ہیں۔ ہال کی چارپائیوں کو کونے میں لگا کر درمیان میں ہاسٹل کا بدرنگا پرانا کارپٹ بچھائیں گے اور تھوڑی سی رونق لگالیں گے۔" ایک اور طالبہ نے پورا پروگرام واضح کیا تھا۔
"اچھا ٹھیک ہے پھر ریفریشمنٹ ہماری طرف سے ہوگا اور رونق آپ لوگ لگائیں گے۔" ستائش نے درمیانی راستہ اختیار کیا تھا۔
"میڈم یہ تو غلط بات ہے۔"
"غلط بات..... ہم تمہارے ٹیچرز ہیں اور تم ہماری بات کو غلط کہہ رہی ہو گستاخ لڑکی..... تمہاری جرأت کیسے ہوئی ہمیں غلط کہنے کی۔" وردہ نے مسکراہٹ دبا کر اسے گھورا تو اسما بھاگ کر دروازے کے پیچھے ہوگئی۔
"نہیں میڈم! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اگلے پل دروازے کے پیچھے سے منمناتی آواز آئی تو سب زور سے ہنس پڑی تھیں۔
طالبات نے واقعی اچھی خاصی رونق لگائی تھی۔ شادی کی مختلف رسومات پر مبنی ایک شو پیش کیا گیا تھا۔ سیکنڈ ایر کی طالبہ بلی کا چند دن پہلے نکاح ہوا تھا۔ نکاح کے خوب صورت جوڑے میں ملبوس بلی دلہن بنی اعتماد سے کرسی پر براجمان تھی اور سبز جوڑوں میں ملبوس ہم جولیاں اس کے ارد گرد گول دائرے میں بھنگڑا ڈال رہی تھیں۔
فنکشن کے اختتام پر جب وہ سب آبیٹھیں تو یونہی ہنسی ہنسی میں ہاتھ دیکھنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اور ایک طالبہ نے ستائش کا ہاتھ دیکھ کر مذاق کے طور پر پہیلی بجھوا ڈالی تھی۔ واپس کمرے میں آکر لیٹنے کے بعد وردہ نہیں جانتی تھی کہ ستائش سوئی نہیں تھی، وہ پوری آنکھیں کھولے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی اور جس دن کی شام کا آغاز انتہائی خوش گوار انداز میں ہوا تھا اس کا اختتام اس قدر صدماتی ہوگا، وردہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ہاسٹل پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ستائش کو ہوش آگیا تھا، مگر ڈاکٹر نے اسے نیند کی گولی دے دی تھی۔
"پریشان مت ہو وردہ! تمہاری دوست بالکل ٹھیک ہے۔" اسد نے اسے تسلی دی۔
"میں نے ڈاکٹر افتخار کو کال کیا ہے، وہ آتے ہیں تو ان کے ساتھ ڈسکس کرکے ہم اس کے لیے میڈیسن ایڈوائز کرتے ہیں۔" تھوڑی دیر بعد اس کی طبیعت سنبھلی تو اس نے وردہ سے کہا۔
"میں نے فون کرکے گاڑی منگوائی ہے، میں گھر جانا چاہتی ہوں، تم اسٹاف سے کہہ دینا۔ مجھے فوڈ پوائزننگ ہوگئی ہے۔"
اور چند گھنٹوں بعد وہ ڈسچارج ہوکر گھر چلی گئی تھی اور وردہ کے لیے بہت سے سوالیہ نشان چھوڑ گئی تھی۔



سورج کی کرنیں مشرق کی طرف سے اپنی چھب دکھلا رہی تھیں۔ ایک طرف تو ان کی روشنی پام،

سفیدے اور ٹاہلی کے درختوں سے چھن چھن کر ماحول میں پیلا پن بکھیر رہی تھی۔ وہیں پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں ماحول میں خوش گوار سا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں ایسے میں ٹریک پر دوڑتے کیپٹن شہریار اور کیپٹن ظل حسن اس خوب صورت ماحول کو انجوائے کرتے ہلکی پھلکی ایکسرسائز کر رہے تھے۔

"ڈو یو نو شہریار۔ یو این او مشن ہیٹی کے لیے ہماری یونٹ کا چانس بن رہا ہے۔"

"کس نے کہا؟" شہریار نے پھولی سانسوں کے ساتھ سوال کیا۔

"فی الحال تو میجر اسامہ سے ہی پتا چلا ہے۔"

"یار! یہ میجر اسامہ تو ہر روز خواب میں یو این او مشن لوبل کر کے اٹھتے ہیں ان کی ہوائی پر مت جاؤ۔" کیپٹن شہریار نے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

"نہیں بھئی اس کے فادر میجر جنرل قیصر احمد آج کل ڈائریکٹوریٹ میں ہیں لہٰذا اس کی بات کو حتمی سمجھو۔"

"چلیں واپس؟" کیپٹن شہریار نے اس کی بات پر مزید تبصرہ کیے بغیر پوچھا تھا۔

"بس دو چکر اور...." کیپٹن ظل حسن نے ٹریک پر واپسی کا چکر کاٹا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں آفیسرز میس کی طرف بڑھ گئے تھے۔ کیپٹن ایاز نے واش روم میں گھستے ہوئے اردلی کو ناشتا لانے کا کہہ دیا جبکہ کیپٹن شہریار نے خاصی بوکھلاہٹ میں شیو بنانا شروع کی کیونکہ پریڈ تک پہنچنے کے لیے اسے ناشتا کرنے سے قبل نہانا بھی تھا۔ اس دوران بیڈ پر پڑا موبائل گنگنایا تو اسے سخت کوفت ہوئی تھی۔



"ملکھی! پراٹھے کے لیے پیڑے بنا دو۔ ہوا اٹھے گی تو میں ناشتا اس کے ساتھ ہی کروں گی۔" شہناز بیگم نے چائے کا گھونٹ بھر کر۔۔۔ اخبار کھولتے ہوئے ملازمہ کو ہدایت کی۔

"جی ملکانی جی۔" ملازمہ تابعداری سے کہہ کر پلٹ گئی۔

"السلام علیکم اماں جان!" تب ہی ملک عبدالاحد اور عائلہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔ بھئی آج تو تم نے کمال کر دیا کہ صبح سویرے عبدالاحد کو جگا دیا اور مزید کمال یہ کہ اسے ڈائننگ ٹیبل پر بھی لے آئیں۔" شہناز بیگم نے مسکراتے ہوئے خوش گوار انداز اختیار کیا تھا۔

"کہاں اماں جان' یہ میرا کمال کہاں؟ یہ کمال تو تایا جان کی متوقع ڈانٹ کا ہے۔ آج انہوں نے الیکشن کمپین کے لیے تایا جان کے ساتھ جانا ہے تو اس لیے وقت پر اٹھ گئے ہیں۔"

"اچھا....! الیکشن کمپین شروع ہو گئی؟" انہوں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"جی اماں جان.... ابھی کافی ماہ پڑے ہیں الیکشن میں' مگر تایا جان کے سر پر تو وقت سے پہلے ہی الیکشن کا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔" عبدالاحد نے لاپروائی سے بتایا تھا۔

"چلو پھر آپ لوگ بھی سیریس ہو جاؤ۔" وہ دوبارہ سے اخبار پر نظر دوڑا رہی تھیں۔

"سیریس کہاں اماں جان۔۔۔ خواہ مخواہ ہنسنا مسکرانا پڑتا ہے آج کل۔۔۔ گاڑی روک روک کر گلے ملنا پڑتا ہے تایا جان کی ہدایت پر۔۔۔" عبدالاحد نے ہنستے ہوئے بتایا تھا۔



"مسئلہ تو یہ ہے بابا کہ ہم تو علاقے کے لوگوں کو وقت دیتے ہیں اور یہ لوگ تو صرف الیکشن لڑنے کے لیے آتے ہیں۔ جیتیں یا ہاریں اگلے دن واپس چلے جاتے ہیں۔ جیت جائیں تو اسلام آباد کا رخ کرتے ہیں ہار جائیں تو لندن چلے جاتے ہیں۔"

"ملک جی! بات تو آپ کی درست ہے کہ آپ ہمیں وقت دیتے ہیں' لیکن ابھی تک ہمارے مسائل جوں کے توں ہیں۔ اب یہی دیکھیں کہ کب سے ہم

مطالبہ کررہے ہیں کہ ہمارے علاقے میں لڑکیوں کا ایک اسکول بنے مگر۔۔۔"

"بابا! ہم کیا کریں؟ مسائل تو ہم تب حل کریں گے جب اپوزیشن ہمیں کچھ کرنے دے۔ ہمارے ہر منصوبے کی راہ میں تو یہ روڑے اٹکا دیتے ہیں۔ خود تو یہ کچھ کرتے نہیں ہیں۔ آپ لوگوں کو یاد ہے' پچھلی بار جب چوہدری کا منڈا اسمبلی میں تھا تو آپ لوگ اسلام آباد گئے تھے اس کے پاس اسکول کا مطالبہ لے کر۔۔۔ مگر ہوا کیا؟ یہاں بیٹھے اس کے باپ کو پتا چلا کہ عوام کی طرف سے اسکول منظور ہونے کا مطالبہ کیا گیا ہے تو کہنے لگا کہ میں اس منڈے سے پوچھتا ہوں کہ اسکول منظور ہونے کی تک کیا بنتی ہے۔ اب کڑیاں پڑھنے لگیں تو ہمارے اپلے کون تھاپے گا۔" ملک خدا بخش الیکشن آفس میں معززین علاقہ سے بات کررہے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں صرف الیکشن کے دنوں میں معززین کا درجہ حاصل ہوا تھا۔

"ملک جی۔۔۔ ملک جی۔۔۔" دور سے فیتو قصائی بھاگتا ہوا آیا۔

"ہاں بھائی فیتو! کیا بات ہے' خیریت تو ہے؟" ملک جی پوری توجہ سے پوچھ رہے تھے۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے ملک جی' گڈے کا ابا فوت ہوگیا ہے۔"

"اللہ اس پر رحمت کرے۔" ملک خدا بخش نے سوالیہ نظروں سے منشی کی طرف دیکھا تھا۔ ملک خدا بخش کا ڈیرہ ہی الیکشن آفس تھا جہاں جہاں دور دور تک لہلہاتی فصلیں اور کھیت نظر آرہے تھے۔

"ملک جی' یہ بھینسیں چرانے والے کامے کی بات کررہا ہے۔

تو ہم کیا کریں' جاکر کفن دفن کا بندوبست کر۔۔۔" منہ چڑھا منشی انہیں بتاکر فیتو کی کلاس لینے لگا تھا۔

"منشی۔۔۔" ملک خدا بخش نے تنبیہی انداز میں ٹوکا تھا۔

"تم خود جاکر مسجد میں اعلان کراؤ' مرنے والے کے گھر بوری گندم اور کچھ چائے پانی کا سامان بھجوا دو اور

ہاں کفن دفن کا خرچا بھی دے دینا۔"

"تایا جان آپ شہر جانے کے لیے کس وقت نکلیں گے؟" عبدالاحد کو یاد آیا تو وہ پوچھنے لگا تھا۔

"شہر جانا تو بڑا ضروری تھا' مگر ایک تو ان کمی کمین لوگوں کو مرنا بھی الیکشن کے دنوں میں یاد آتا ہے۔ ہمارا ووٹ الگ ضائع کرتے ہیں اور ہماری روٹین الگ خراب ہوتی ہے۔" ملک خدا بخش کی جھنجلاہٹ بھی رعونت بھری تھی' ملک عبدالاحد نے کسی قدر تاسف سے تایا کو دیکھا تھا۔ وہ ابراڈ سے پڑھ کر آنے والا روشن خیال لڑکا تھا' جو کسی بھی فرد کو دولت اور طاقت کے ترازو میں تولنے کے بجائے انسانیت کی نظر سے دیکھنا زیادہ ضروری خیال کرتا تھا۔

"تایا جان آپ بے فکر ہو کر شہر جائیں' ہم لوگ.....

"کیسے بے فکر ہو کر شہر جاؤں' اب اس کے جنازے میں شرکت کرنا بھی تو ضروری ہے.... ذرا صنوبر کو تو بلاؤ...." ملک خدا بخش نوکر سے مخاطب تھے۔

"آج تو سینٹر مرتضیٰ سے میٹنگ تھی۔ کچھ ضروری معاملات طے کرنا تھے اور پھر ستائش کو ہاسٹل سے بھی لے کر آنا تھا۔"

"تایا آج شہریار ویک اینڈ گزارنے آرہا ہے تو میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ ستائش کو بھی لیتا آئے۔" عبدالاحد نے ان کی ایک پریشانی دور کرنا چاہی۔

"اچھا اگر شہریار آرہا ہے تو اسے کہہ دو ذرا جلدی نکل آئے اور ستائش کو لے آئے' مگر دھیان سے' لاپروا سا لڑکا ہے' کہیں دیر سویر نہ کرتا پھرے۔" ملک خدا بخش رات کے وقت خواتین کے ساتھ سفر کرنے کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور بات جب ان کی لاڈلی بیٹی کی ہوتی تو اور بھی احتیاط کرتے تھے' یہی وجہ تھی کہ ڈرائیور کو بھیجنے کے بجائے خود اسے لے کر آتے' مگر آج تو مجبوری تھی سو یہ کام شہریار کے ذمے ڈال دیا تھا۔ اور جب شام کو جب گڈے کے ابا کا جنازہ اٹھا تو کندھا دینے والوں میں ملک خدا بخش سب سے آگے تھے جوں ہی جنازہ کچے گھر سے نکل کر گلی میں پہنچا ملک خدا بخش کا پاؤں یک دم گلی کے کیچڑ میں دھنس گیا۔ جلدی سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر ان سے جنازے کا کندھا لیا اور وہیں پر رک کر لوٹا بھر پانی لا کر ملک خدا بخش کا پاؤں دھلوایا گیا۔ ساتھ ہی علاقے کے غریب لوگوں کے دل ملک خدا بخش کی اس اپنائیت پر اش اش کر اٹھے تھے۔ البتہ ان سادہ لوح لوگوں نے یہ ہرگز نہ سوچا کہ یہ شخص جو ان کے ووٹوں سے منتخب ہو کر پانچ مرتبہ اسمبلی کا رکن رہ چکا ہے' اس نے یہ گلیاں پکی کیوں نہ کروائی تھیں۔



"نہیں نہیں شیری! پلیز' یہ ہوائی میرے کسی دشمن نے اڑائی ہے۔ مجھے ہرگز گاؤں نہیں جانا' بالکل نہیں جانا۔" ستائش نے شہریار کے فون کرنے پر دہائی دے ڈالی۔

"یار میں تو خود سوچ رہا ہوں' تایا جان کو میرے کسی دشمن نے بتایا کہ میں آج ویک اینڈ آرہا ہوں اور انہوں نے اپنی شہزادی کا بوجھ بھی میرے نازک کندھوں پر ڈال دیا۔ مانا کہ یہ بوجھ مستقبل میں' مجھے ہی اٹھانا ہے' مگر ابھی سے میں کس گناہ کی سزا بھگتوں؟ آخر مجھے بتاؤ تو سہی ستائش؟" وہ انتہائی معصومیت سے ستائش سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے کسی اور کا ذکر ہو۔ وہ ہمیشہ اس سے چار ہاتھ آگے ہوتا تھا تو اب کیوں پیچھے رہتا۔

"شیری' کمینے انسان! دفع ہو جاؤ۔ میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ' مجھے کہیں نہیں جانا۔" ستائش حد درجہ بھنا کر فون بند کر گئی اور وہ موبائل کو دیکھتے ہوئے کھل کر مسکرایا تھا۔ اور گنگناتے ہوئے گاڑی کی چابی اٹھائی' اسے گاؤں جاتے ہوئے ستائش کو ساتھ لے کر جانا تھا۔



"یہ پھول تمہارے نام۔" گلاب کے پودے کے پاس سیڑھیوں پر وہ عظمی اور شائنہ کے ساتھ بیٹھی

دھوپ کے مزے لے رہی تھی۔ جب شائنہ نے گلاب کی شاخ پر لگے گلابی پھول کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"واقعی؟" وردہ بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔ آج اکنامکس ٹیچر چھٹی پر تھیں۔ لہٰذا ہوم اکنامکس گروپ فارغ تھا۔
"پھر میں توڑ لوں؟" اس نے اجازت چاہی۔
"خبردار! خبردار' جو تم نے اسے توڑنے کا نام بھی لیا۔ میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گی۔" شائنہ نے بعجلت اسے دھمکی دے ڈالی تھی۔
"اچھا ہاتھ لگا کر دیکھ لوں۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔
"ہرگز نہیں' صرف دیکھنے کی اجازت ہے۔" تب ہی فلک سامنے سے خاصے گرم جوش انداز میں انہیں اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ کالج سے واپس آرہی تھی۔
ایک اسپیشل بات بتاؤں' لگتا ہے باہر ہمارے جیجا جی آئے ہیں۔"
"کون؟" وہ تینوں چونکی تھیں۔
"ستائش کے فیانسی! یار باہر ایک بندہ آرمی یونیفارم میں آیا ہے۔ اس کے کندھے پر چمکتے اسٹار بھی لگے ہیں اور۔"
"ارے واقعی شہریار بھائی ہوں گے۔" وہ چاروں بھاگی تھیں۔
"ستائش بیٹا! یہ آپ کے بھائی ہیں؟ آپ کو لینے آئے ہیں۔" ستائش وارڈن کے آفس میں داخل ہوئی تو انہوں نے اس کے سلام کا جواب دے کر سوالیہ انداز میں بتایا۔
"جی میم۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"ٹھیک ہے۔ آپ ان کے ساتھ جا سکتی ہیں۔" وارڈن نے اجازت دی۔
"بھائی! آپ بیٹھیں میں بیگ لے کر آتی ہوں۔" ستائش نے خاصے شریر انداز میں کہا تھا۔
"ہاں ضرور۔" شہریار نے دانت پیس کر جواب دیا تھا۔
"آپ کی پوسٹنگ کہاں ہے؟"
"جی میم! یہیں پر پوسٹڈ ہوں۔" ستائش بیگ لے کر واپس لوٹی تو وہ وارڈن سے محو گفتگو تھا۔
"چلیں بھائی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"یہ تم بھائی کسے کہہ رہی تھیں۔" گاڑی اسٹارٹ کرنے سے قبل وہ پوچھ رہا تھا۔
"تمہیں کہہ رہی تھی اور وہاں کون تھا جسے کہتی۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔ "کیوں؟ تمہیں برا لگا۔ اگر تمہیں برا لگا ہو تو تم بھی مجھے بہن کہہ کر بدلہ لے سکتے ہو۔" اس نے انتہائی معصومانہ پیش کش کی۔
"بہن کہتی ہے میری جوتی۔" اس نے زور سے پاؤں گاڑی کے فرش پر مارا تھا۔
"بلکہ میرا یہ بوٹ۔" شاید زوردار آواز نے ہی اسے اپنے جملے کی تصحیح کرنے پر مجبور کیا تھا۔
"مجھے تو یقین نہیں آتا کہ تمہارا بوٹ مجھے بہن کہہ سکتا ہے۔" ستائش کو اس کے جلے بھنے انداز پر ہنسی آگئی۔
"تمہارے سر پر پڑے گا نا' تو تمہیں خود بخود یقین آجائے گا۔"
"میں آرمی چیف کو خط لکھوں گی کہ آپ کے سولجر کا بوٹ دشمن کے سر پر پڑنے کے بجائے ایک خوب صورت لڑکی کے سر پر پڑ رہا ہے۔"
"وہ تمہارے ماموں کا پتر ہے جسے تم خط لکھو گی۔ حد ادب گستاخ لڑکی! تم اپنے ہونے والے مجازی خدا کے سامنے ایک غیر مرد سے راہ و رسم بڑھانے کا ارادہ ظاہر کر رہی ہو۔"
"کیا بونگیاں مار رہے ہو شیری۔ میں آرمی چیف کی بات کر رہی ہوں۔ تم ایک غیر مرد کو بیچ میں کہاں لے آئے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اوائل خزاں کے دن تھے۔ درختوں کی شاخیں

برہنہ ٹہنیوں کے ساتھ بدلتے موسم کی گواہ بنی ہوئی تھیں۔ وسیع و عریض رقبے پر پھیلی مونگ پھلی کی فصل اٹھائی جاچکی تھی۔ بعد میں بچے کچے دانے بھی چن لیے جاتے جو اتنی تعداد میں ہوتے کہ دنوں میں بوریاں بھرلی جاتیں اور چنائی کا یہ کام کمین لڑکیوں بالیوں کے ذریعے ہوتا تھا جو صبح صبح ہی یہاں کا رخ کرتیں۔ اس وقت بھی سب ایک سرے سے شروع ہوکر تیزی سے مونگ پھلی کے دانے چنتی آگے بڑھتی چلی جارہی تھیں جب زہرہ کو زور سے مونگ پھلی کا دانہ آکر لگا تھا۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا قریب ہی نیم دراز اکبر نے مسکرا کر دیکھا۔ زہرہ نے رخ موڑ کر دوبارہ مونگ پھلی چننا شروع کردی تھی۔

اکبر، منشی فضل کا بھائی تھا جو مونگ پھلی اکٹھی ہونے کے بعد اس کا بٹوارہ کرتا تھا۔ چنی ہوئی مونگ پھلی کا ایک حصہ وہ چننے والی کو دیتا اور دو حصے خود رکھ لیتا جو ملک کے گودام میں چلے جاتے تھے۔ ایک کھڑ کھڑاتا ہوا دانہ دوبارہ آکر زہرہ کے سر پر لگا تھا۔ زہرہ نے اٹھ کر اپنی جگہ بدلی اور دوسرے سرے پر ماسی رانو کے قریب جاکر موم پھلی چننے لگی تھی۔ ماسی رانو بھی بے شک کمہاروں کی عورت تھی لیکن اس جیسی دبنگ عورت کے سامنے اکبر بھی شرافت کے چولے میں رہنے پر مجبور ہوجاتا تھا ورنہ تو اس کی حرکتیں آپے سے باہر کردینے والی تھیں۔ خاص طور پر پچھلے چند ماہ سے زہرہ اس کے نشانے پر تھی۔ وہ حتی الامکان اپنا آپ بچانے کی کوشش کرتی مگر وہ تھا کہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ کبھی آتے جاتے راستہ روک کر کھڑا ہوجاتا تو کبھی اشارے بازیاں کرتا۔



"جی چھوٹی ملکانی جی کا حویلی سے فون ہے۔" ملازمہ نے کارڈلیس بیڈ پر لیٹی زینت بیگم کو لا تھمایا۔

"السلام علیکم بھاجائی بیگم۔" دوسری طرف ملک موسی کی بیگم شہناز تھیں۔

"وعلیکم السلام جگ جگ جیو۔ شہناز! سب خیریت ہے' بچے ٹھیک ہیں؟" خوش دلی سے سلام کا جواب دے کر وہ خیریت دریافت کررہی تھیں۔

"بس خیریت ہے بھرجائی! آپ سنائیں لالہ کیسے ہیں۔ ستائش بچی کا کیا حال ہے۔"

"اللہ کا کرم ہے سب پر۔ آپ حویلی کا چکر لگائیں نا' اتنے دن ہوگئے' میرا بھی آنا ہی نہیں ہوا۔"

"آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی بھرجائی بیگم! آج ہم لوگ آپ کی طرف آنے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے' بس آپ کو ایک اطلاع دینی ہے۔ شہریار کا یونٹ مشن پر جارہا ہے تو' میں آج ایک خاص مقصد کے لیے آنا چاہ رہی ہوں۔" شہناز بیگم نے لگے ہاتھوں اپنی خواہش کا اظہار بھی کر ڈالا اور پیشگی اطلاع بھی کردی کہ وہ ان کی آمد کے مقصد سے باخبر ہوجائیں۔

"ضرور آؤ تمہارا اپنا گھر ہے۔ باقی بات تو اپنے لالہ سے کرنا' آج کل وہ مصروف بھی بہت ہیں۔"

"بھرجائی یہ مصروفیات تو ہمیشہ سے چلتی آئی ہیں۔ اب ہم ان کاموں کے لیے بچوں کی خوشیاں تو نہیں روک سکتے نا۔" شہناز نے ان کے عذر کو رد کردیا تھا۔

اور شام کو وہ اپنی بہو عائلہ' بیٹے' عبدالاحد اور شوہر ملک موسی کے ہمراہ ملک خدا بخش کی حویلی چلی آئی تھیں۔ جہاں زینت بیگم نے کھانے کا پر تکلف اہتمام کیا تھا۔

"بھرجائی! لالہ کا انتظار کرلیتے ہیں۔ ابھی کون سا اتنی دیر ہوگئی ہے۔" جب زینب بیگم نے انہیں کھانے کی میز پر آنے کے لیے کہا تو ملک موسی نے لیت و لعل سے کام لیا۔

"بھاجی! آپ کے لالہ کا فون آیا ہے کہ انہیں دیر ہوجائے گی' کھانے پر ان کا انتظار نہ کریں۔" زینت بیگم نے ملک خدا بخش کے فون کی بابت بتایا۔ کھانے کے دوران سب کی گفتگو کا مرکز یہی رہا کہ شہریار کے جانے سے قبل اس کے سہرے کے پھول کھلنے چاہئیں' زینت بیگم ہنوز انکار یا اقرار کی پوزیشن میں نہ تھیں۔ کیونکہ گھر کے اہم فیصلوں میں ملک خدا بخش

کی رائے کے آگے کسی کی نہیں چلتی تھی۔

"یہ جو آپ کا دیور ہے 'میرا ازلی دشمن ہے۔ ہر وہ کام کرتا ہے جو میرے خلاف ہو۔ اب یہی دیکھ لیں' میری ایجوکیشن کے پیچھے پڑ گیا ہے۔" ستائش گلنار چہرے کے ساتھ 'عائلہ کے ساتھ الجھ رہی تھی۔

"جناب یہ میرے دیور کا نہیں میرا فیصلہ ہے۔"

"بھابھی آپ! آپ ایسا کیسے سوچ سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں سوچ سکتی 'تین سال سے بے زبان ساسو ماں کو بھگت رہی ہوں۔ اب مجھے دیورانی چاہیے جس سے میں لڑ سکوں۔"

سب بے حد خوش تھے مگر ملک خدا بخش جو خاصی دیر سے واپس آئے تھے اور باقی لوگ ان کے انتظار میں چائے کے دو دور چلا چکے تھے ان کی خوشی پر ملک خدا بخش نے بیک جنبش قلم پھیر دیا تھا۔

موسی میری سمجھ میں نہیں آرہا' تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ جب عین الیکشن سر پر کھڑے ہیں۔ تم کوئی اور پروگرام بنائے بیٹھے ہو؟"

"لالہ' آپ کی بات اپنی جگہ صحیح ہے مگر شہریار کا یونٹ یو ایس او مشن پر جا رہا ہے تو اس کی واپسی تک۔"

"شہریار مشن سے واپس آئے گا تو سب کچھ خیر خیریت سے ہو جائے گا اس وقت تم حلقے کے مسائل پر توجہ دو۔ یہ جو صدارتی آرڈیننس کے تحت بی۔ اے کی ڈگری رکن اسمبلی کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے' اس نے میری راتوں کی نیندیں اڑا دی ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فی الحال عبدالاحد کو اس سیٹ پر الیکشن لڑنا چاہیے۔" ملک خدا بخش نے غیر متوقع بات کہہ کر گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ اب تینوں مردوں کے درمیان سیاست زیر بحث تھی للہذا خواتین بے دلی سے اٹھ گئیں۔

"اللہ کرے تایا جان اسمبلی میں قدم رکھیں اور وہ تڑاخ سے ٹوٹ جائے۔" عبدالاحد کی زبانی کیپٹن شہریار نے جب یہ سنا تو گویا ہاتھ اٹھا کر بددعا دے ڈالی۔

"زہرہ۔ زہرہ۔"

"جی بی بی جی۔" لحاف تہہ کر کے پیٹی میں رکھتی زہرہ عائلہ بی بی کی آواز پر فوراً" کام ادھورا چھوڑ کر باہر نکل آئی تھی۔

"مجھے بالوں میں تیل کی مالش کروانی ہے۔ کیا کر رہی ہو؟" عائلہ پوچھ رہی تھی۔

"وہ جی 'ملکانی جی نے لحاف پیٹی میں رکھنے کو کہے تھے۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔ اس کے بعد تو فارغ ہو نا؟"

"جی بی بی فارغ ہوں۔ آپ کے بالوں میں تیل لگا دیتی ہوں۔"

"بی بی جی۔" پندرہ منٹ بعد ہی زہرہ 'عائلہ کے کمرے میں سرسوں کے تیل کی بوتل لیے کھڑی تھی۔

"چلو باہر دھوپ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" عائلہ ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ دونوں باہر حویلی کے وسیع و عریض صحن میں چلی آئی تھیں۔

"اور سناؤ زہرہ... تمہارے بابا کا کیا حال ہے؟"

"بس بی بی! گزارہ چل رہا ہے۔ روکھی سوکھی تین آویاں اس دفعہ بھی نکالی ہیں۔ گھر میں بیٹھ کر کچھ نہ کچھ کام کر لیتے ہیں۔ میں بھی برابر مدد کرتی رہتی ہوں۔ البتہ گاؤں میں گھر گھر جا کر برتن دینے کا کام میں نے خود ہی سنبھال لیا ہے۔ کہ کہیں گر گرا نہ جائیں' یہ سوچ کر ڈر لگتا ہے مجھے' اس ڈر سے باہر نہیں بھیجتی۔"

عائلہ نے یہ جواب سن کر اس کم عمر سی لڑکی کے جذبے اور حوصلے کو دل ہی دل میں سراہا تھا۔

"بی بی آپ میکے نہیں گئیں۔" زہرہ اکثر اس کے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی' سو اس کے حال احوال سے واقف تھی۔ عائلہ جہلم کے ایک سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی' اس کا باپ بریگیڈیئر ریٹائرڈ تھا۔ اس نے جیسی آزاد زندگی گزاری تھی' وہاں گاؤں کے ماحول میں گھٹن محسوس کرتی۔ اور مہینے بھر میں ہی میکے کا چکر لگانے کو تیار ہو جاتی۔

"نہیں زہرہ! ڈیڑھ ماہ ہونے کو ہے ابھی نہیں

جا سکی، عبدالاحد الیکشن کے ہنگاموں میں مصروف ہوگئے ہیں۔ بس انہیں فرصت ملے تو۔"

زہرہ کے ہاتھوں کے ساتھ زبان بھی سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ تب ہی منشی فضل کا چھوٹا بھائی اکبر کندھے پر تھیلا اٹھا کر گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا اور روش پر چلتا ہوا حویلی کے اندر جانے لگا تھا۔ شاید وہ کچھ سامان دینے آیا تھا۔

"بی بی! آپ سے ایک بات کہوں، پتا نہیں یہ بات آپ سے کہنے کی ہے یا نہیں، مگر میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ سے کہوں۔"

"ارے نہیں بھئی جھجکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو بھی بات ہے کھل کر کہو۔" عائلہ نے حوصلہ دیا تھا۔

"بی بی جی' یہ جو لڑکا ہے نا اکبر' یہ ادھر چھوکریوں کو بڑا تنگ کرتا ہے۔" اس نے اپنا نام لیے بغیر کہا تھا۔

"کون لڑکا؟" عائلہ کو سر پر زہرہ کے چلتے ہاتھ اتنا آرام دے رہے تھے کہ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں سو آنکھیں کھولے بغیر پوچھ رہی تھیں۔

"یہ منشی فضل کا بھائی ہے' جو ابھی اندر گیا ہے۔"

"کدھر اندر گیا ہے؟" عائلہ نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور تب ہی اکبر باہر نکلا تھا۔

"کبھی کبھی مونگ پھلی اکٹھے کرتے ہوئے یہ ہاتھ بھی پکڑ لیتا ہے۔"

"ارے... کیوں ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ آنے دو عبدالاحد کو میں ان سے بات کرتی ہوں۔" عائلہ نے غصے سے دور جاتے اکبر کو دیکھا تھا اور اکبر جس نے صرف ایک دفعہ اس طرف دیکھا تھا اسے یقین سا ہوا جیسے عائلہ بی بی اور زہرہ اس کے متعلق بات کر رہی ہوں' نہ صرف یہ بلکہ اسے لگا تھا جیسے زہرہ عائلہ بی بی کو اس کی غلط حرکتوں کے بارے میں بتا رہی ہے۔



"سردیوں کی ساتھ ساتھ فضا سے ... خنکی بھی رخصت ہو چکی تھی۔ اچانک مشرق کی طرف سے گھٹا اٹھی اور آسمان آناً" فاناً" کالے بادلوں سے بھر گیا مگر بجائے بارش کے تند و تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے اور انہوں نے بادلوں اور زمین کے درمیان گرد کی ایک چادر تان دی تھی۔ موسم کی تندی سے بے نیاز ستائش بوجھل دل کے ساتھ جھولے پر بیٹھی تھی۔ نئے طرز تعمیر کی شاہکار دونوں حویلیاں شان سے سر اٹھائے ایک وسیع و عریض قطعے پر ایستادہ تھیں۔ دونوں کے اردگرد بلند و بالا چار دیواری مگر دونوں حویلیوں کے بیچ کوئی دیوار نہ تھی۔ البتہ گیٹ الگ الگ تھے۔ سبز سبز مخملی گھاس پر بنی روش کے درمیان انواع و اقسام کے خوب صورت پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ستائش بے مقصد سوچوں میں گم تھی۔ اگرچہ وہ خود بھی تعلیم مکمل کرنے کی خواہش مند تھی۔ مگر نہ جانے کیوں بابا جان کا انکار اسے بے چین کر گیا تھا۔ جدائیوں کے موسم کی دستک یوں ہی دل کو دھڑکا لگا دیتی ہے۔ سست روی سے جھولتے ہوئے جھولے پر ایک پاؤں آن جما' اور حرکت کرتا جھولا رک گیا تھا۔

ستائش نے نگاہ اٹھائی شہریار تھا جو انتہائی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ستائش!" اس کی پکار میں کچھ ایسا تھا جو ستائش کا دل دھڑکا گیا تھا۔

"ہوں!"

"یہ تایا جان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔" وہ خاموش رہی۔

میں پوچھ رہا ہوں تایا جان میری خوشیوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔"

"شہری' میرے بابا کو کچھ مت کہنا۔" اس کے انداز پر ستائش کھل کر مسکرائی اور خواہ مخواہ اس پر رعب جھاڑنے کی کوشش کی۔

"میرے بابا نے آخر کیا کہا ہے؟"

"میں جانے سے پہلے تمہارے سارے اختیارات اپنے نام کروانا چاہتا ہوں اور وہ رکاوٹ بن کر کھڑے ہوگئے ہیں۔"

"شہری' یہ آرمی نہیں ہے' جہاں ایک آفیسر جائے

سے پہلے اپنے اختیارات دوسرے آفیسر کو دے کر جاتا ہے۔" شہریار اس بات پر ستائش کا سر پھاڑ دیتا تو کم تھا مگر وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

ستائش۔ "اس نے جذبوں سے پر حدت الفاظ میں اسے پکارا تھا۔" پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے میں واپس آؤں گا۔ تو سب کچھ ایسا نہیں ہوگا' میں جانے سے پہلے تمہارے سارے حقوق اپنے نام کروانا چاہتا ہوں۔ میں اس یقین کے ساتھ جانا چاہتا ہوں کہ تم میری بن کر میرا انتظار کر رہی ہو۔" ستائش کو لگا وہ اس کے جذبوں کو آواز دے رہا تھا مگر وہ خاموش رہی کہ صنف نازک کی خاموشی ہی اس کا اقرار ہوتی ہے۔



"ستائش بی بی۔ بڑے ملک جی کا فون ہے۔ ملکانی جی تو ملک حق داد کی حویلی گئی ہیں' آپ بات کرلیں۔" ملازمہ نے اس کے کمرے کا دروازہ بجایا اور اندر آتے ہوئے کارڈلیس اسے لا تھمایا۔

"السلام علیکم بابا جان!" وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

"وعلیکم السلام بیٹا! میرا دوست ہے نا ملک فراست' وہ بھرجائی کے ساتھ ہمارے علاقے میں آرہا ہے' میں نے اسے اپنے ہاں بھی آنے کی دعوت دے ڈالی ہے۔ تم اپنی اماں کو بھی بلالو اور شام کے کھانے چائے کا انتظام بھی کروادو۔"

"جی بابا جان' آپ بے فکر رہیں' سب ہو جائے گا۔" اس نے انہیں تسلی دے کر فون بند کیا اور کچھ سوچ کر ماموں حق داد کی حویلی کا نمبر ملایا تھا اماں کو اطلاع دینے کے لیے۔

"ارے واہ بھائی جان! اپنی گڑیا تو ماشاء اللہ اتنی بڑی ہو گئی اور بہت پیاری بھی۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ کیوں بھرجائی! اتنی چھوٹی سی تھی جب آپ لوگ اسے لے کر ہمارے ہاں آئے تھے۔" ملک فراست کی بیگم بہت اپنائیت سے ستائش سے مل رہی تھیں۔ بیگم خدا بخش مسکرادیں۔ بہت خوش گوار ماحول میں چائے پر بات چیت ہو رہی تھی۔

"ویسے مجھے تو یقین تھا میرا یار اس مرتبہ بھی بازی جیتے گا۔ ایم این اے کی سیٹ تو اسی کی ہے اس مرتبہ وزارت کا بھی حق دار ٹھہرے گا مگر۔" ملک فراست نے تاسف کا اظہار کر کے بات ادھوری چھوڑی۔

"عبدالاحد بھی گھر کا لڑکا ہے۔ چھوٹے بھائی کا بڑا بیٹا ہے۔ بس کیا کریں نظام میں تبدیلیاں تو آتی رہتی ہیں۔ خیر علاقے کا کام تو خود دیکھ رہا ہوں گا۔"

"ہاں یہ بھی درست ہے۔" ملک فراست نے تائید کی تھی۔

"ملک صاحب! مجھے تو ستائش بہت پسند آئی' کیوں نہ اپنے فراز کے لیے بات چلائیں۔" واپسی پر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ملک فراست کی بیگم نے خاصے جوش و خروش سے کہا۔

"آئیڈیا تو برا نہیں ہے بیگم' مگر خدا بخش کی بیٹی اس کے بھتیجے سے منسوب ہے۔" ملک فراست نے یک دم ان کی خوشی کا چراغ بجھا ڈالا تھا۔



یہ برچھیاں والا کا علاقہ اور وہاں کے تمام کھیت ملک موسیٰ اور ملک خدا بخش کے تھے۔ میدان میں کیسوں کا جم غفیر مستعدی سے کام میں مصروف تھا۔ ایک طرف ٹریکٹر اور ٹرالی کے ذریعے گندم میدان میں اکٹھی کی جارہی تھی۔ دوسری طرف کٹائی بھی جاری تھی۔

آج سب میں خاصا جوش و خروش نظر آرہا تھا۔ عورتیں کہیں پانی کے گھڑے لاتی دکھائی دیتیں تو کہیں پرات میں دانے اکھٹے کرتے ہوئے اپنے آنچل درست کرتیں' اور یوں ترپال پر گندم کا ڈھیر بڑھتا جارہا تھا تھریشر کے ایک طرف بھوسہ نکل کر ایک ڈھیر کی شکل میں جمع ہو رہا تھا۔ دانے اٹھانے والوں میں زہرہ بھی تھی۔ اور منشی فضل کا چھوٹا بھائی اکبر بھی موجود تھا جس کی ہوس ناک نظر بار بار زہرہ کا جائزہ لیتی تو وہ بے اختیار ہی اپنی اوڑھنی درست کرتی' اگرچہ اکبر اس سارے کام کی نگرانی کے لیے موجود تھا پھر وہ اٹھ کر گندم کی بوریاں لانے لگا تھا اور جب وہ خالی ہاتھ ہو بوری رکھ کر واپس

دو منفرد لڑکیوں کی کہانی جن کا محبوب ایک مگر انداز محبت مختلف تھا

من پیاسا۔۔۔من کی پیاس ایک ایسی تڑپ ہے جو رب کی عنایت ہی سے بجھ سکتی ہے۔ یہ پیاس انسان کو کہاں کہاں لئے پھرتی ہے، کیسے بے قرار رکھتی ہے، کیسے بھٹکاتی ہے اور کیسے نشانِ منزل دکھا کر اس کی آس بڑھا دیتی ہے۔ "من پیاسا" دل کی اسی پیاس کی داستان ہے۔ اس ڈرامہ سیریل کی کہانی چار اہم کرداروں آرب، نوین، ذیشان شاہ اور سمیرا کے گرد گھومتی ہے۔ آرب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، آرٹ اور لٹریچر کا دلدادہ شخص ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک فری لانس جرنلسٹ ہے جو انقلابی سوچ رکھتا ہے۔ وہ معاشرے کو کرپٹ عناصر سے پاک کر کے جلد از جلد سسٹم کو بدلنا چاہتا ہے۔ وہ ایک جرات مند انسان ہے اور اپنے مشن کے راستے میں آنے والے تمام خطرات سے نمٹنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ آرب انسانی حقوق بالخصوص خواتین کے حقوق کا علم بردار ہے وہ ایک دن پانی سے محروم غریب مظاہرین کا احتجاج دیکھتا ہے جہاں ٹھیلے پر پیاس سے جاں بلب تین بچے پڑے ہیں۔ یہ منظر آرب کے ذہن و دل میں طوفان برپا کر دیتا ہے اور اس دن سے وہ واٹر مافیا کے خلاف جنگ کو اپنا مشن بنا لیتا ہے۔ نوین ایک پڑھی لکھی نرم مزاج اور شائستہ لڑکی ہے۔ وہ ایک خوبصورت شاعرہ ہے جو ابتداء میں فطرت حسن، محبت اور انسانی عظمت پر دلکش شعر کہتی ہے مگر بدلتے حالات کے ساتھ اس کی شاعری میں تلخ حقائق کی کڑواہٹ گھل جاتی ہے۔ آرب کے برعکس وہ سسٹم کی تبدیلی کے لیے انقلاب کی نہیں بلکہ ارتقاء کی قائل ہے۔ وہ جنگ سے زیادہ محبت سے ذہن بدلنے پر یقین رکھتی ہے۔ نوین اور آرب ایک اتفاقیہ ملاقات کے بعد ایک دوسرے کے قریب آنے لگتے ہیں۔ دونوں کی دلچسپ نوک جھونک اور گرما گرم بحث مباحثہ دوستی سے محبت میں بدل جاتا ہے۔ نوین کو فکر لگ جاتی ہے کہ آرب جن کرپٹ لوگوں کو بے نقاب کر رہا ہے کہیں وہ اس کی جان کے درپے نہ ہو جائیں۔ وہ آرب کو کبھی پیار اور کبھی دلیل سے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اتنا کھل کر اور اتنا آگے آ کر یہ جنگ نہ لڑو مگر آرب کے لیے اب پیچھے ہٹنا ممکن نہیں ہے۔ آرب نوین کو اپنانا چاہتا ہے مگر یہ بھی جانتا ہے کہ اس نے قانون شکنوں اور بدعنوانوں سے لڑنے کا جو راستہ چنا ہے وہ خطرات سے بھرا ہے۔ آرب نوین کی زندگی کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اچانک حالات ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ نوین آرب سے بدگمان ہو جاتی ہے اور والدین کی جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو کر ایک نہایت با اثر اور دولت مند شخص ذیشان شاہ سے شادی کے لیے حامی بھر لیتی ہے۔ ذیشان شاہ طاقت اور دولت کے بل پر ہر وہ چیز حاصل کرنے کا قائل ہے جو اُسے پسند آ جائے۔ اُس کا ارادہ شادی کے بعد نوین کو محض "ٹرافی وائف" بنا کر رکھنا ہے۔ ذیشان شاہ کئی جرائم میں ملوث ہے وہ بظاہر ایک شاندار پرسنالٹی کا مالک مگر درحقیقت ایک سفاک انسان ہے جو عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے۔ آرب کی کزن سمیرا اس ڈرامے کا ایک اور اہم کردار ہے جو باہر سے پڑھ کر آئی ہے۔ وہ نہایت پُراعتماد، بہادر اور بلند حوصلہ لڑکی ہے۔ وہ ایک نیوز چینل کی اینکر پرسن ہے۔ اس کے اور آرب کے درمیان بہت دوستی اور بے تکلفی ہے۔ وہ یک طرفہ طور پر آرب کے عشق میں مبتلا ہے اور قدم بہ قدم آرب کے مشن میں اس کے ساتھ کھڑی ہے۔ سمیرا کو یقین ہے کہ وہ ایک دن آرب کی محبت جیت لے گی مگر آرب کا رویہ کبھی کبھی اُسے الجھن میں ڈال دیتا ہے اور وہ ڈبل مائنڈڈ ہو جاتی ہے۔ سمیرا کی شوخ و شنگ دوست انیزہ جو سمیرا کی طرح (سمیرا عالیہ) اس کو اکساتی ہے کہ آخر وہ ایک دن کھل کر آرب سے اس کے دل کی بات کیوں نہیں پوچھ لیتی۔ سمیرا اپنی سالگرہ کے دن آرب سے اظہار محبت کرنے ہی والی ہوتی ہے کہ اچانک اس کے گھر پر فائرنگ شروع ہو جاتی ہے اور دونوں بمشکل جان بچا پاتے ہیں۔ آرب کی والدہ کا اصرار ہے کہ وہ اپنی لاڈلی بھتیجی سمیرا سے شادی کر لے کیونکہ وہ ہر اعتبار سے ایک بہترین شریک حیات ثابت ہوگی اور اُسے بہت خوش رکھے گی۔ آرب مختلف حیلوں اور بہانوں سے ماں کو ٹالتا رہتا ہے اور اچانک ایک دن نوین کو ان سے ملوانے کے لیے گھر لے آتا ہے۔ نوین سے ملاقات آرب کی امی کے لیے ایک خوشگوار حیرت ثابت ہوتی ہے۔ یہ ڈرامہ سیریل محبت کے جذباتی ٹرائی اینگل کی خوبصورت تصویر کشی ہے۔ ایک خوبصورت لو اسٹوری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ پانی کی قلت کے اہم ایشو اور اس کی بدانتظامی اور کرپشن کے معاملات کو ڈرامے میں بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامہ سیریل کا کلائمکس بہت چونکا دینے والا ہے۔۔۔ آرب کی دلہن کون بنے گی سمیرا یا نوین؟

مڑنا تو اسے تھریشر کی نالی میں پرات بھرنے کی منتظر زہرہ کے پاس سے گزرنا ہوتا تھا۔ تب ہی وہ بڑے آرام سے سب کی نظر بچا کر ایک ہاتھ ہلکا سا زہرہ کے کندھے پر مارتا۔۔۔ کسی بیلی یار کی طرح۔۔۔ اور زہرہ بے چاری کچھ نہ کہہ سکتی۔ عزت تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اور زہرہ تو لڑکی تھی۔۔۔ جو بولے بھی تو عزت جائے اور چپ رہے بھی تو۔۔۔ چٹیل میدان کی طرف جانے والی چڑھائی چڑھ کر ایک گاڑی نمودار ہوئی اور گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ملک عبدالاحد نے کام کا جائزہ لینے کے لیے بریک لگائی اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس سارے کام پر نظر ڈالی تھی۔ چونکہ تھریشر کی آواز بہت زوردار تھی اور گاڑی کی آواز نہ ہونے کے برابر۔۔۔ لہٰذا سیاہ رنگ کی گاڑی پر کسی کی نظر ابھی تک نہ پڑی تھی۔ اطمینان سے جائزہ لیتے ملک عبدالاحد کی آنکھوں میں یک دم الجھن نمودار ہوئی تھی عائلہ کی کہی ہوئی چند ماہ پہلے کی ایک چھوٹی سی شکایت نے اس کے ذہن کے دریچے پر دستک دے ڈالی تھی۔ اور بغور اس منظر کو دیکھا تھا۔ اگلے لمحے وہ آنکھوں میں طیش لیے گاڑی سے اتر کر تھریشر کی طرف بڑھا تھا۔ اور اکبر کے پاس پہنچا تھا۔

"سلام ملک جی۔۔۔"

"وعلیکم السلام" اکبر کے سلام کا جواب دے کر ملک عبدالاحد نے اسے بری طرح پیٹنا شروع کر دیا تھا۔



"معاف کر دیں ملک جی۔" "بے غیرت انسان تمہاری جرأت کیسے ہوئی ہماری زمین پر کھڑے ہو کر ایسی حرکتیں کرنے کی۔" ملک عبدالاحد اسے مار رہا تھا۔ اکبر کے جسم پر جا بجا نشان بن رہے تھے

"معاف کر دیں جی غلطی ہو گئی آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" وہ مسلسل معافیاں مانگ رہا تھا۔

"آئندہ تو ایسا تب ہو گا جب تم یہاں نظر آؤ گے، آئندہ اگر ہماری زمین پر تمہاری شکل بھی نظر آئی تو اپنی شکل پہچاننے کے قابل نہیں رہو گے۔" ملک عبدالاحد اسے وارننگ دیتے ہوئے واپس اپنی گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔ تھریشر کا پیٹ خالی ہو کر گھرر گھرر کی آوازیں نکال رہا تھا۔ کیونکہ اس سارے تماشے کے دوران جس کا ہاتھ جہاں تھا، وہیں رکا رہا تھا۔ ہدایت اللہ ملک نے عبدالاحد کی گاڑی اوجھل ہونے کے بعد تھریشر بند کیا اور سب اکبر کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔

"کیا ہوا اکبر؟ ملک احد نے تجھے اتنا کیوں مارا ہے، آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔" سب سے پہلے کراہتے ہوئے اکبر کو تورے مصلی نے سنبھالتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"ملک عبدالاحد تو بڑا اچھا بندہ ہے۔ سب کے ساتھ اتنے اچھے انداز میں بات کرتا ہے آج تک کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔۔۔ اور پھر آج۔"

"لگتا ہے ملک عبدالاحد کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اسمبلی میں پہنچنے والا ہے نا بہت وڈا ہو گیا ہے نا اس لیے۔" فیتو قصائی نے رائے دی تھی۔

"اوئے وڈا تو پہلے بھی تھا، ملک موسیٰ کا بیٹا جو ہے مگر آج تو اس نے حد ہی کر دی بغیر کسی وجہ کے۔" سب کافی دیر تک تبصرہ کرتے رہے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اکبر کے ساتھ ملک عبدالاحد نے یہ سلوک کیوں کیا ہے۔۔۔ سوائے اکبر کے۔ جو جانتا تھا کہ ملک عبدالاحد کی اس پر نظر پڑ گئی تھی جب وہ زہرہ کے کندھے پر ہاتھ مار کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اور زہرہ دوسرا فرد تھی جو صورت حال کو کچھ نہ کچھ سمجھ سکتی تھی مگر ساتھ ہی حیران بھی تھی۔ کیا واقعی ملک عبدالاحد نے منشی فضل کے بھائی کو اس کی وجہ سے بری طرح پیٹا ہے۔ وہ بار بار خود سے سوال کر رہی تھی۔



اس کے دل پر عجیب سا بوجھ دھرا تھا اور وہ انتہائی بے دلی اور بے دھیانی کے ساتھ چینل بدل رہی تھی۔

اچانک ریموٹ پر حرکت کرتی اس کی انگلیاں تھم گئیں۔ سرکاری چینل کی نیوز کاسٹر کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

"یونائیٹڈ نیشنل فورسز کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے پاک فوج کا ایک دستہ ہیٹی روانہ ہو گیا۔ میجر جنرل مدثر علی خان نے دستے کو لاہور ایئرپورٹ پر الوداع کیا' کیمرے کی آنکھ' دستے کے جہاز میں سوار ہونے سے قبل ایئرپورٹ کے مناظر دکھا رہی تھی۔

اور ستائش کے دل پر دھرا بوجھ سوا ہو گیا وہ ٹی وی بند کر کے باہر بالکونی میں چلی آئی تھی۔ ڈھلتی شام کے سائے دور تک پھیل رہے تھے۔ دونوں حویلیوں کے سامنے سے گزرنے والی سڑک عبور کر کے چند اشانلش طرز تعمیر پر مشتمل کمروں کے آگے برآمدہ اور پھر چار دیواری کے آگے کھلا صحن تھا' جہاں اس وقت بھی چند گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ یہ عمارت آج کل مرکزی الیکشن آفس کا کام دے رہی تھی برآمدے کے آگے چند رنگ دار چارپائیاں اور گاؤ تکیوں پر علاقے کے زمیندار براجمان تھے اور یہ آنا جانا ہر وقت لگا رہتا تھا۔

اگلے دو ماہ میں یہ سب سرگرمیاں جیسے ماند پڑ گئیں۔ سب کچھ جیسے پرسکون سا ہو گیا تھا۔ ملک عبدالاحد ایک کانٹے دار مقابلہ جیت کر اسمبلی میں ایم این اے کی حیثیت سے پہنچ چکا تھا۔



زہرہ نے مٹی کے برتن بورے کے اندر ڈال کر گدھی کے اوپر لادے اور ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر جھانکا۔

"اچھا بابا! میں جا رہی ہوں' پریشان نہ ہونا۔ دھمیالوں کے گھروں میں گھڑے پہنچا کر جلدی واپس آجاؤں گی۔" اور دھمیالوں کے محلے جانے کے لیے کھیت کنارے گدھی کو ہانکتی وہ جوں ہی درختوں کے جھنڈ سے سڑک کے دوسری طرف کچے راستے پر مڑی' اچانک سامنے سے اکبر آتا دکھائی دیا۔ زہرہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک خباثت بھری مسکراہٹ آگئی تھی۔

"کیا کہنے زہرہ تمہارے تو تو' عائلہ بی بی کی بڑی سکھی سہیلی ہے نا' اور تو نے ان سے کہہ کر میری ملک عبدالاحد سے شکایت لگائی تھی نا۔"

"دیکھ اکبر' اگر تو نے اپنی غلط حرکتیں بند نہ کیں تو اس سے بھی برا حشر ہو گا جو سب کے سامنے ملک عبدالاحد نے تیرا کیا تھا۔"

"کون سی غلط حرکتیں؟" اکبر نے ابرو چڑھا کر پوچھا تھا۔

"یہی جو تو دوسروں کی عزت پر بری نظر رکھتا ہے نا' کسی دن۔۔۔"

"اچھا!! تو کمہاروں کی بھی عزت ہوتی ہے۔ میں بھی تو دیکھوں ذرا کہاں ہے تیری عزت اور تو بھی عائلہ بی بی کو آواز دے کر دیکھ لے وہ تجھے۔ اکبر کی غلط حرکتوں سے کس طرح بچا سکتی ہیں۔" اکبر درشتی سے کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اگلے پل اس کی اوڑھنی ہواؤں کی زد پر تھی۔ ساتھ ہی زہرہ کی بے ساختہ چیخیں فضا کا سینہ چیر رہی تھیں۔ سب سے پہلے تو پگڈنڈی پر بھینسوں کا ریوڑ ہانکتا ہوا بھٹی چونکا تھا۔ اور جو منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا' وہ اس دھرتی کے کسی بھی شخص کے لیے ناقابل قبول تھا۔

"رک اوئے تیری تو۔۔۔" دور سے ہی آواز لگا کر وہ اس کی طرف دوڑا۔

سڑک پر جاتی ایک گاڑی جو سواریاں لانے لے جانے کا کام کرتی تھی۔ اس میں بیٹھا رمضان بھی بریک لگا کر اس طرف بھاگا تھا۔ دور دو افراد بیلچے اٹھائے کھیتوں میں پانی لگانے جا رہے تھے' چیخوں کی آواز سن کر بلا تردد اس طرف کو بھاگے تھے۔ اور اتنے سارے افراد کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اکبر ان سے بھی زیادہ تیزی سے بھاگا تھا۔ رمضان کے پاس چادر تھی' اس نے تیزی سے زہرہ کی طرف پھینکی اور اکبر کے پیچھے بھاگتے افراد کے ساتھ ہو لیا۔

اکبر نے بھاگ کر چھلانگ لگائی اور تیزی سے تیرتا ہوا دوسرے کنارے پر جا پہنچا تھا اور جب کنارے پر

پہنچ کر اکبر نے مڑ کر دیکھا تو وہ تعداد میں ایک نہ دو پورے پانچ تھے اور تیرتے ہوئے نالے کے درمیان پہنچ چکے تھے وہ پھر بھاگ کھڑا ہوا پہلے سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ' اکبر کے سامنے ایک کوٹھڑا تھا ایسے کوٹھڑے کہیں کہیں کھیتوں میں کام کے دوران بارش یا دھوپ سے بچاؤ کے لیے یا کبھی کبھار راکھی کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ وہ جلدی سے کوٹھڑے کے اندر گھسا اور اندر سے کنڈی لگالی تھی۔

اگلے ہی لمحے ان سب نے کچے کوٹھڑے کے دروازے کو اس مضبوطی سے مل کر جھٹکا دیا کہ دروازہ چوکھٹ سمیت اندر کی طرف گرا تھا اور پھر اکبر اسی طرح بے بس تھا جس طرح زہرہ تھوڑی دیر پہلے بے بس تھی۔ اکبر اسی طرح ان کے رحم و کرم پر تھا جس طرح زہرہ اس کے رحم و کرم پر تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہائے ربا میں لٹ گیا۔ ہائے ربا میں مرگیا۔" منشی فضل دہائی دیتا پہنچا تھا۔

"کیا ہوا فضل! خیر تو ہے؟" فضل برسہا برس سے ملک خدا بخش کے ساتھ کام کرتا چلا آرہا تھا ایسے میں ملک خدا بخش کا اس کی دہائی پر متوجہ ہونا تو بنتا تھا۔

"خیر کہاں ہے ملک جی' کمہاروں کی لڑکی نے مجھ پر آفت ڈھادی۔ میں مرگیا میں لٹ گیا' دو ٹکے کی لڑکی نے پورے پنڈ کے جوانوں کو بھی اپنے پیچھے لگالیا ہے ملک جی۔"

"منشی کیا بات ہے؟ صاف صاف بات کرو؟"

"کیا صاف بات کروں ملک جی! بات ہی اتنی گندی ہے۔ تو صاف کیسے کرسکتا ہوں موجو کمہار کی لڑکی ہے نا جو گھر گھر جاکر گھڑے بیچتی ہے۔ اس نے پنڈ کے منڈوں کو پیچھے لگا کر میرے بھائی اکبر کو موت کے منہ میں پہنچادیا ہے۔"

"مگر منشی! وہ یہ کیوں اور کیسے کرسکتی ہے۔"

"ملک جی وہ اکبر کو اپنے راستے پر لانا چاہتی تھی' مگر وہ تو شریف منڈا ہے راستہ بدل کر چلا تو اس نے اس کا وہ حشر کروایا کہ شریف لوگ بھی پناہ مانگیں۔"

"تمہارا بھائی ہے کہاں؟"

"گڈی میں ڈال کر تھانے بھیجا ہے جی۔ اس کا تو انجر پنجر اکھاڑ پھینکا ہے ظالموں نے۔۔۔"

"تو یوں کہو نا منشی۔ تھانے فون کرنا ہے' لو بھئی ذرا فون ملاؤ تھانے دار کا۔" ملک خدا بخش نے پیچھے کھڑے گارڈ کو اشارہ کیا تھا۔

"میں تھانے دار کو فون کردیتا ہوں جن لوگوں کا نام ایف آئی آر میں درج کروانا ہے تم خود جاکر بتادینا۔"

"ملک جی نمبر بزی آرہا ہے۔" گارڈ نے اطلاع دیتے ہوئے دوبارہ ڈائل کیا تھا۔

"اکبر زیادہ زخمی تو نہیں ہوا؟" ملک خدا بخش نے روئے سخن منشی کی طرف موڑا تھا۔

"زخمی۔۔۔" منشی نے زخمی نظروں سے ملک خدا بخش کو دیکھا تھا۔

"ملک جی آپ زخمی ہونے کا پوچھ رہے ہیں اس کے تو دونوں بازو بھی لٹک گئے ہیں۔"

منشی نے انتہائی رقت آمیز انداز میں بتایا تو پیچھے کھڑے گارڈ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔

"ایس ایچ او صاحب؟" گارڈ نے کنفرم کیا۔ "جی ملک جی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" گارڈ نے موبائل ملک خدا بخش کی طرف بڑھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اگر میں گیس کے لیے گرانٹ منظور کر بھی لوں تو سروے میں ہی اتنی کم آبادی کے لیے گیس کی فراہمی کا منصوبہ ریجیکٹ کردیا جائے گا۔ کئی ادارے اس بات کو چیک کرتے ہیں۔" ملک عبدالاحد ایم این اے آفس میں علاقے کے کچھ لوگوں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا جب ایک مختصر سے وقفے میں دوسری مرتبہ اس کا موبائل گنگنایا اور عائلہ کا نمبر چمکا تھا۔

"خیریت؟" اس نے دل میں سوچا ابھی گھنٹہ پہلے تو عائلہ نے فون کرکے کتنی دیر اس کا سر کھایا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر معذرت کرتے ہوئے

لیس کا بٹن دبا دیا تھا۔

"احد کچھ سنا آپ نے۔" دوسری طرف عائلہ نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا تھا۔

"میں تو سب سے ہی سن رہا ہوں اب تم کس بات کا ذکر کر رہی ہو۔"

"وہ لڑکی تھی نا زہرہ' ہماری حویلی میں کام کے لیے آتی رہتی تھی۔"

"کون زہرہ بھئی؟"

"احد وہی جس نے ایک کامے کی شکایت لگائی تھی اور آپ نے تھریشر پر کام کرتے ہوئے اس کی پٹائی بھی کی تھی۔"

"ہاں ہاں یاد آگیا۔"

"اچھا بھلا ایک سیریس واقعہ ہو گیا ہے وہ بے چاری کہیں برتن دینے جا رہی تھی تو راستے میں اکیلا پا کر اس لڑکے نے بے چاری کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے اردگرد سے گزرتے لوگ متوجہ ہوئے اور انہوں نے اس لڑکے کو للکار کر اس کی عزت بچائی اور موقع پر موجود لوگوں نے اس کی ٹھکائی بھی کر دی' مگر اب ان کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے' پلیز احد آپ کچھ کریں' انہوں نے کوئی رشتہ داری نہ ہوتے ہوئے اس کی عزت بچائی اور کتنی غلط بات ہے کہ ان کو اس نیکی کی سزا مل رہی ہے۔"

"اچھا تم فون بند کرو میں ڈی پی او سے بات کرتا ہوں۔ ذرا ڈی پی او سے بات کراؤ۔" ملک عبدالاحد نے فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر پی اے کو ہدایت کی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ کل کا چھوکرا خود کو سمجھ کیا رہا ہے آخر' لاؤ میری بات کراؤ میں بھی تو پوچھوں یہ اسلام آباد میں بیٹھ کر یہاں کے کاموں میں کیوں ٹانگ اڑا رہا ہے۔"

"یہ لیں جی ان کے موبائل پر بیل جا رہی ہے۔" ان کے گارڈ نے فوراً" کال ملا دی تھی۔

"السلام علیکم تایا جان! کیا حال ہیں؟"

"میرے حال کو چھوڑو' یہ بتاؤ تمہارے ہوش تو ٹھکانے ہیں تم نے ڈی پی او سے بات کر کے وہ بندے کیوں چھڑوا دیے ۔۔۔ جنہیں میں نے گرفتار کرایا تھا۔"

"تایا جان' انہوں نے ہمارے علاقے کی ایک لڑکی کی عزت بچائی تھی اور۔۔۔"

"مجھے زیادہ خبریں دینے کی ضرورت نہیں' میں علاقے میں موجود ہوں اور یہاں پر کیا ہو رہا ہے اس سب سے اچھی طرح باخبر ہوں' تمہیں ان سب معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں' جو ہم مناسب سمجھتے ہیں ہمیں کرنے دو۔" ملک خدا بخش نے رعونت سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"تایا جان کیا آپ یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ جس کے ساتھ ظلم ہوا اس کا ساتھ دینے کے بجائے ظالم کے ساتھ کھڑے ہو جائیں۔ صرف اس لیے کہ وہ آپ کے منشی کا بھائی ہے۔" ملک عبدالاحد نے ظلم کے خلاف آواز کیا اٹھائی گویا ملک خدا بخش کے غضب کو آواز دے ڈالی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اس بات کا علم ہے کہ ان کی گرفتاری کا آرڈر ہم نے اس ایچ او کو دیا ہے اور اس کے باوجود تم نے انہیں رہا کرا دیا۔" اب تک وہ سمجھ رہے تھے کہ ملک عبدالاحد نے ڈی پی او سے لاعلمی میں بات کی ہے یک دم ان کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ ملک عبدالاحد نے اس بات کی تردید کی کوشش نہیں کی۔

"کیا تم بھول گئے ہو کہ جس سیٹ پر تم اس وقت اسمبلی میں بیٹھے ہو وہ ہم نے تمہیں عنایت کی ہے؟" وہ چنگھاڑ کر پوچھ رہے تھے۔

"تایا جان آپ بھی یہ بھول رہے ہیں کہ یہ سیٹ ہمیں ان غریبوں کے ووٹوں سے ملی ہے اور ان کے ووٹوں سے یہ سیٹ حاصل کر کے کم از کم ہمیں ان مظلوموں کی آہیں اور بددعائیں نہیں لینی چاہئیں۔"

اسی شام دفعہ 354A کے تحت پرچہ درج کر کے سول اسپتال میں زیر علاج اکبر کو پولیس نے

ہتھکڑی لگادی گویا وہ زیر حراست تھا اور ملک خدا بخش کی انا پر شدید چوٹ پڑی تھی پہلی بار ان کے سامنے کسی نے سر اٹھانے کی جرات کی تھی ان کے طرز سیاست کو رد کیا تھا اور یہ ان کی حاکمانہ طبیعت قطعاً" برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ انتہائی غصے کی کیفیت میں گویا کف اڑا رہے تھے اور اسی جوش غضب میں انہوں نے وہ غلطی کر ڈالی جو شاید وہ کبھی نہ کرتے اگر حالات نارمل ہوتے تو۔۔۔ شاید مخالفین کو اس اختلاف کی سن گن ملی تھی جب ہی معاملہ یہ صورت حال اختیار کر گیا تھا۔

"ناظرین یہ واقعہ جنوبی پنجاب کے علاقے میں پیش آیا ہے۔ ہمارے چینل کو ملنے والی اطلاعات کے مطابق ملزمان کو کچھ با اثر افراد کی پشت پناہی حاصل ہے۔ صورت حال جاننے کے لیے ہمارے نمائندے نے علاقائی سیاست میں گہرا اثر و رسوخ رکھنے والے سابق رکن اسمبلی ملک خدا بخش سے رابطہ کیا ہے۔ آئیے آپ کو اس معاملے میں ملک خدا بخش کا موقف سنواتے ہیں۔"

"پولیس نے ملی بھگت کر کے ایک جھوٹا پرچہ بنایا ہے یہ محض خاندانی دشمنی کا شاخسانہ ہے اور کچھ نہیں۔۔۔" ملک فراست نے چینل بدلا تھا جہاں کی نیوز کاسٹر اسی معاملے پر ایک اور پہلو سے اظہار خیال کر رہی تھی۔

"تعلیم انسان کو زندگی گزارنے کا بہترین شعور عطا کرتی ہے اور پڑھے لکھے افراد ہی ہمیشہ حق اور سچ کا ساتھ دیتے ہیں۔ ناظرین یہاں پر دیکھیں کہ ملک عبدالاحد جو راجن پور کے ایک علاقے سے منتخب ہو کر حال ہی میں اسمبلی میں پہنچے ہیں ایک ویل ایجوکیٹڈ اور روشن خیال سے سیاست دان کے طور پر ابھرے ہیں۔ آئیے آپ کو ملک احد کے نقطہ نظر سے آگاہ کرتے ہیں۔ ہم کسی کو بھی چار دیواری کے تقدس کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دیں گے میں نے اس سلسلے میں ڈی پی او صاحب سے بات کی ہے ملزم کو فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا ہے اور ان شاء اللہ اس کے خلاف سخت قانونی کارروائی عمل میں لائی جائے گی میں نے ذاتی طور پر خود جا کر متاثرہ خاندان کو ہر طرح کے انصاف اور تعاون کی یقین دہانی کرائی ہے۔" ملک عبدالاحد کہہ رہا تھا۔

آنے والے چند گھنٹوں میں میڈیا نے ملک خدا بخش کے لتے لینے شروع کر دیے تھے اور یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ ملزم کو اس گھناؤنے فعل کے پیچھے با اثر شخصیت ملک خدا بخش کی ہی تھی۔ ملک فراست کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دے۔

ملک فراست تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ اسے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا اس قدر نادر موقع بھی مل سکتا ہے وہ سوچ جو ملک خدا بخش کو اپنی سیٹ پر بھتیجے کو کھڑا کرنے کے اعلان پر ذہن میں آئی تھی۔ وہ تیسری مرتبہ اپنے علاقے سے ایم پی اے کا الیکشن ہار چکا تھا اور اگر ستائش اس کی بہو بنتی تو آئندہ الیکشن میں ملک فراز ملک عبدالاحد کی جگہ ممبر قومی اسمبلی ہوتا۔



"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے یار کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا ہو سکتا ہے۔ آج کل خون اس قدر سفید ہو گیا ہے کہ لوگ کسی کی قربانی اور بھلائی کا یوں صلہ دیتے ہیں۔" ملک فراست نے ملک خدا بخش کو فون کر کے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

"سوچ تو میں بھی نہیں سکتا تھا میرا ہی بھتیجا یوں میری مٹی پلید کر دے گا۔" ملک خدا بخش بے یقین تھا۔

"واقعی اس نے تمہاری مٹی پلید کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تم ایک بزرگ سیاست دان ہو۔ اس علاقے کی سیاست میں جو مقام تمہارا ہے وہ کسی اور سیاست دان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کی وجہ سے جس طرح میڈیا پر تمہاری پگڑی اچھالی جا رہی ہے۔ توبہ توبہ۔"

"غلطی میری اپنی ہے فراست۔"

"تمہاری غلطی نہیں ہے خدا بخش! ہر انسان خونی رشتوں کی بھلائی چاہتا ہے اور انہیں فوقیت دیتا ہے اب کوئی آستین کا سانپ ثابت ہوا تو اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ کل کے چھوکرے نے تمہیں سیاست سے آؤٹ کر کے کونے میں لگا دیا ہے۔ تمہارے بیان کے بعد اس نے بیان دے کر حد درجہ کمینگی اور گھٹیا پن کا مظاہرہ کیا ہے۔" حالانکہ ملک عبدالاحد نے لاعلمی میں کسی اور چینل کو بیان دیا تھا۔ ملک فراست نے پورا زور اس بات پر لگا دیا کہ اس نے جان بوجھ کر ملک خدا بخش کا موقف سننے کے بعد مخالفانہ بیان دیا تھا۔ وہ دراصل ملک خدا بخش کو بھڑکا رہا تھا اور اپنی اس کوشش میں خاصا کامیاب بھی تھا۔

☆ ☆ ☆

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" کیپٹن شہریار نے حویلی فون کیا تھا جو کہ سوئے اتفاق ستائش نے اٹھایا تھا۔ وہ دونوں انتہائی سنجیدگی سے اس معاملے پر اظہار خیال کر رہے تھے۔

"مجھے بھی نہیں پتا کہ یہ سب کیسے ہو گیا، مگر بابا جان بہت غصے میں ہیں۔ وہ آپ لوگوں سے ہر رشتہ ختم کرنے کا فیصلہ کیے بیٹھے تھے۔"

"رشتے کیسے ختم کر سکتے ہیں تایا جان۔ آج تک انہوں نے ہم بھائیوں کو ہی نہیں بلکہ بابا جان کو بھی اپنے بچوں کی طرح ٹریٹ کیا ہے اور ہم بھی ان کے ہر فیصلے پر سر جھکاتے چلے آئے ہیں حتیٰ کہ بابا جان بھی ان کے حکم سے روگردانی کی جرات نہیں کرتے۔ اگر کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے تو اسے دور کیا جا سکتا ہے۔"

آج ہی اس کی عائلہ بھابھی سے بات ہوئی تھی جنہوں نے اسے اس معاملے کے بارے میں بتایا تھا، مگر اب ستائش نے اسے کھل کر صورت حال سے باخبر کر کے حد درجہ پریشان کر ڈالا تھا۔ یک دم کسی نے ستائش کے ہاتھ سے ریسیور چھینا اور ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔

"منع کیا تھا میں نے کہ مجھے اپنے بھائی کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا پھر تم کیوں بات کر رہی ہو؟" ملک خدا بخش نے چیخ کر کہا تو زینت بیگم جہاں تیزی سے لاؤنج میں داخل ہوئیں وہیں حویلی کے ملازم بھی آگے ہو گئے تھے۔

"آپ غصہ نہ کریں ملک صاحب میں اسے سمجھاؤں گی۔" زینت بیگم نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔



"بات صرف اتنی سی ہے کہ تم نے ہمیں ملک خدا بخش کے شیڈول سے آگاہ کرنا ہے وہ کب اور کہاں جاتا ہے، ہمیں صرف ایک ہفتے کی رپورٹ چاہیے۔"

"مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر اس ایک ہفتے کی رپورٹ کے بدلے تم اچھی خاصی رقم کیوں دے رہے ہو؟" ملک خدا بخش کے خاندانی ملازم امداد حسین کی آنکھوں میں حد درجہ حیرت تھی۔

"تم آم کھاؤ، پیڑ مت گنو۔"

"اگر پتا چل گیا کہ کس کے کہنے پر میں نے یہ کام کیا ہے، تو بات بھلے کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو ملک خدا بخش مجھے گاؤں بدر کر دے گا۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو، ملک خدا بخش کو کون بتائے گا، میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تو کیا تم بتاؤ گے؟"

"نہیں نہیں میں بھلا کیوں بتاؤں گا؟" امداد حسین نے جلدی سے کہا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہارے اوپر بیٹی کی شادی پر لیا گیا قرض ابھی تک ہے، اب تم بآسانی اس سے چھٹکارا پا سکتے ہو۔" امداد حسین سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے تم نہیں چاہتے تو نہ سہی میں یہ رقم واپس لے لیتا ہوں۔" اس نے میز پر رکھی رقم اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔

"نہیں نہیں ٹھیک ہے یہ میرے لیے کوئی اتنا بڑا کام نہیں ہے اور میں کون سا ملک خدا بخش کی حویلی

میں ڈاکا ڈال رہا ہوں جو پکڑا جاؤں گا۔" امداد حسین نے جلدی سے اقرار کرتے ہوئے اسے روک دیا تھا۔



"حالات اس حد تک خراب ہو سکتے ہیں میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔" شہناز بیگم نے تاسف سے کہا تھا۔

"یہ سب تمہارے لاڈلے کا ہی کیا دھرا ہے اب بھگتو۔" ملک موسیٰ نے اخبار لپیٹ کر رکھتے ہوئے برہمی سے کہا تھا۔

"تایا جان جس دقیانوسی طرز سیاست کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس دور میں اس کو لے کر چلنا مشکل ہے۔" ملک عبدالاحد نے چائے کا کپ میز پر پٹخا تھا۔

"مشکل ہو یا آسان مگر یہ کوئی طریقہ نہیں تھا میں ساری زندگی بھی لالہ سے بغاوت کیے رکھتا تو یہ نہ کرپاتا جو تم نے محض ایک ہفتے میں کر دکھایا ہے۔" ملک موسیٰ بیٹے کو جس قدر لعنت ملامت کرسکتے تھے کررہے تھے۔

"آخر میں آپ لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا۔ ٹھیک ہے میں مظلوم کی مدد کرنے کے حق میں تھا مگر جہاں تک میڈیا....."

"ہمیں یقین ہے بیٹے! اب جو ہونا تھا ہو چکا اس سب پر ڈسکشن کرنا بے کار ہے۔" شہناز بیگم نے فوراً ملک عبدالاحد کو ٹوک دیا تھا۔

آج اتوار تھا ملک عبدالاحد اور ملک موسیٰ گاؤں آئے ہوئے تھے اور حویلی کے ڈائننگ روم میں ناشتے کی میز پر اس معاملے کو سلجھانے کا سرا تلاش کررہے تھے۔

"آئی تھنک ہم سب چل کر تایا جان سے بات کرتے ہیں۔"

"اتنی دفعہ تو میں لالہ کو فون کرچکا ہوں مگر وہ کال اٹینڈ نہیں کررہے۔" ملک موسیٰ نے بے چارگی سے کہا تھا۔

"کال کرنے کی بات اور ہے مگر اب ہم ان کے سامنے جائیں گے تو کیا وہ ہم سے منہ موڑ لیں گے۔" شہناز بیگم نے امید بھرے انداز میں کہا تھا۔

"اور عبدالاحد بیٹا آپ کو تو اپنے تایا جان سے معذرت کرنی ہوگی۔" انہوں نے روئے سخن عبدالاحد کی طرف موڑا تھا۔

"جی اماں جان۔" اس نے تابعداری سے سرہلایا تھا۔



"ٹھیک ہے تم اپنے بندے تیار رکھنا کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے موروں کی پہاڑیاں اس کام کے لیے بہترین جگہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ تم اپنی جیپ پیچھے کچی سڑک پر رکھنا اور فوراً خوشاب کی طرف رفوچکر ہوجانا۔"

"سارا بندوبست کرلیا ہے ملک صاحب! آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔"

"اور ہاں خیال رکھنا کوئی بندہ پھڑکا نہ دینا۔ بس ملک خدا بخش کو معمولی زخم آنے چاہئیں تاکہ اسے لگے کہ صرف اسے نشانہ بنایا گیا ہے۔" ملک فراست بار بار بے چینی سے اسے سمجھا رہا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ ملک موسیٰ کی فیملی اور ملک خدا بخش کا آمنا سامنا ہوتا اور ان کی غلط فہمیوں کی دیوار گرتی شہر سے گاؤں آتے ہوئے ملک خدا بخش کی گاڑی پر شدید فائرنگ ہوئی تھی اور انہیں زخمی حالت میں اسپتال منتقل کردیا گیا تھا۔ ملک موسیٰ اور ملک عبدالاحد فوراً اسپتال پہنچے مگر خدا بخش نے ان سے ملنے سے انکار کردیا تھا۔

"آپ ایک دفعہ موسیٰ بھائی سے تو مل لیں ملک صاحب۔" زینت بیگم نے منت سماجت کی مگر ملک خدا بخش کا انکار ایک چٹان تھا جسے سرکانے میں وہ ناکام رہی تھیں۔

"ملک یار! تمہاری گاڑی کی حالت دیکھ کر تو میں شاک میں آگیا ہوں۔ وہ تو ماہر ڈرائیور تھا۔

جس نے اتنی شدید فائرنگ میں گاڑی بھگالی ورنہ جس طرح گاڑی کو چھلنی کیا گیا ہے۔" ملک فراست واقعی شاک کی حالت میں کہہ رہا تھا۔

"سچ کہتے ہو فراست! اگر ملزمان فاصلے پر نہ ہوتے اور گاڑی کی رفتار تیز نہ ہوتی تو جو گاڑی کا حشر ہوا ہے وہ میرا ہوتا تھا۔"

"تم نے ایف آئی آر کس کے خلاف درج کرائی ہے۔"

"نامعلوم ملزمان کے علاوہ کس کے خلاف درج کرا سکتا ہوں۔" ملک فراست نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا تھا۔

"ان کا خون سفید ہو گیا ہے' مگر اب میں مزید اپنا تماشا نہیں بنوانا چاہتا۔" ملک خدا بخش کے کہنے پر' ملک فراست کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تمہارے بھائی کے خاندان کو تم سے دشمنی کس بات کی ہے۔ اپنی سیٹ بھی ان کے حوالے کر دی ہے۔ بیٹی کا رشتہ بھی تم نے بھتیجے کو دے رکھا ہے' ظاہر سی بات ہے جو کچھ تمہارا ہے تمہاری بیٹی کا ہی تو ہے' تمام تر زمین جائیداد بھی کل کلاں کو ان کی ہو جائے گی پھر انہوں نے تمہیں راستے سے ہٹانے کے لیے ایسا کیوں کیا؟"

"اب کچھ بھی ان کا نہیں ہو گا فراست' میں جو کچھ انہیں دے چکا ہوں انہیں اسی پر اکتفا کرنا ہو گا نہ میں انہیں بیٹی کا رشتہ دوں گا اور نہ ہی انہیں میری زمین جائیداد ملے گی۔" ملک خدا بخش نے اپنے فیصلوں میں کبھی کسی کو شریک نہیں کیا تھا دوسروں کو ان کے فیصلے ہمیشہ تسلیم کرنا ہوتے تھے۔



جانے لگے تیرے شہر سے تو تجھے الوداع بھی نہ کہہ سکے

تیری سادگی اتنی حسین تھی کہ تجھے بے وفا بھی نہ کہہ سکے

خوشی ملی ہنس نہ سکے غم ملا رو نہ سکے

اک تجھے ہی دل دیا ہے کسی کو بتا نہ سکے

زندگی کے یہی دستور ہیں جسے چاہا اسے پا نہ سکے

اور جسے پایا اسے چاہ نہ سکے

ملک فراست کے اکلوتے بیٹے ملک فراز کی شادی یوں ہوئی تھی کہ دیکھنے والے مدتوں یاد رکھیں۔ ڈھولک کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکاریں حویلی کے دالان سے دلہن کے کمرے تک آرہی تھیں اسے کمرے میں لے جانے سے پہلے طرح طرح کی رسمیں کی گئی تھیں۔

پھر اسے حجلۂ عروسی تک لایا گیا تھا' مگر یہاں بھی کچھ رسمیں تھیں جن کی ادائی کے بعد اس نے کمرے میں قدم رکھا تھا اس کی نظر سجی ہوئی سیج پر پڑی تھی۔ گردش ماہ و سال رک گئی اور پھر اتنی دیر سے گول گول گھومتی زمین اس کے قدموں تلے سرک گئی تھی' وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔



"ناؤشی ازفائن۔" ڈاکٹر کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی جو اس کے ہاتھ پر لگی ڈرپ اتار رہا تھا۔

"کوئی ٹینشن کی بات نہیں بس بی پی لو ہو گیا تھا ڈائیٹ کا خیال رکھیں تو دوبارہ ایسی کنڈیشن نہیں ہو گی۔" ڈاکٹر نہ جانے کس سے بات کرتا ہوا باہر جا رہا تھا اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"آر یو اوکے؟" قدموں کی چاپ اس کے بیڈ کے قریب رکی تو اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولی تھیں' گندمی چہرے پر سیاہ گھنی مونچھوں کے ساتھ سیاہ روشن آنکھیں اس پر جمائے دراز قد کے ساتھ ملک فراز اس سے پوچھ رہا تھا۔ اگر جو شہریار اس کے دل کے سنگھاسن پر براجمان نہ ہوتا تو اس شخص پر ایک نظر ڈال کر ہی وہ اپنی خوش نصیبی پر رشک کرتی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ کیسا فیل کر رہی ہیں آپ؟" وہ انتہائی شائستگی سے اس کے پاس کھڑا پوچھ رہا تھا اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"آپ چینج کر لیں میں ملازمہ کو بھیجتا ہوں آپ کی

ہیلپ کروے گی۔" وہ اسے کہہ کر باہر چلا گیا تھا۔

دوسرے دن جب وہ کمرے میں بیڈ کے ایک کونے میں یونہی گم صم سی بیٹھی تھی وہ اس کے پاس آن بیٹھا تھا۔ ستائش نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور دوبارہ سے جھکالی تھیں۔ وہ اس وقت اس حالت میں نہیں تھی کہ کوئی تکلفات نبھانے کی کوشش کرتی یا اپنے تاثرات دوسروں سے مخفی رکھ پاتی، مگر یہاں اس کی کیفیت پر کوئی غور کرنے والا نہ تھا کہ دلہن بہرکیف خاموش ہی ہوتی ہے اور ایک روز قبل اس کی طبیعت خرابی کو بابل دیس سے جدائی کی ٹینشن پر محمول کرلیا گیا تھا۔ اگر کوئی اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا تو وہ ملک فراز ہی تھا۔

"ستائش! مجھے معلوم ہے کہ آپ اپنے کزن سے انگیجڈ تھیں، میں آپ کے سارے فیملی کلیشز سے واقف ہوں۔ آپ ذہنی طور پر اس صورت حال کو قبول نہیں کرپارہیں، میں کسی فلم کے ہیروں کی طرح بلند بانگ دعوے تو نہیں کرتا، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ میری طرف سے بے فکر رہیں، میں اس تبدیلی سے ایڈجسٹ کرنے کے لیے آپ کو وقت دوں گا۔ ہم قسمت سے لڑ نہیں سکتے، ہمیں ہر حال میں اس کے لکھے کو قبول کرنا ہوتا ہے اور وقت گزرے گا تو آپ کو یقین آجائے گا کہ اگر تقدیر نے آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا تو برا بھی نہیں کیا، آپ مجھے پہلی نظر میں بہت اچھی لگی ہیں اور میں ہمیشہ آپ کا خیال رکھوں گا۔ آپ کے احساسات اور جذبات کی پروا کروں گا۔ فی الحال اتنا خیال رکھیں کہ اس کمرے سے باہر کسی کو احساس نہ ہو کہ ہمارے درمیان کیا چل رہا ہے۔ ہم نئی زندگی کی ابتدا تب ہی کریں گے جب آپ پوری رضامندی اور دل کے ساتھ میری بنیں گی۔"

"نئی زندگی کی ابتدا تو ہوچکی اگر یہ زندگی ہے تو؟"
ستائش کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔



تیز بارش ہورہی تھی۔ ملک فراست کسی کام سے دوسرے شہر میں تھا جب اس نے ملک فراز کو فون کیا تھا۔ "فراز ذرا زمینوں کا جائزہ لے کر آؤ مزارعے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور پانی کا بہاؤ کھیت برابر کرجاتا ہے جب تک ان کے سر پر خود موجود نہ ہوں گے وہ بند توڑنے میں لاپروائی کا مظاہرہ کریں گے اور لاکھوں کا نقصان ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہے بابا جان! میں خود جاکر دیکھتا ہوں۔"

ملک فراز نے گاڑی نکال کر ڈیرے کا رخ کیا تھا۔ اس کی گاڑی گیلی سڑک پر پھسلتی جارہی تھی۔ اردگرد کے کھیت پانی سے بھرے تھے۔ کہیں کہیں فصلیں بھی پانی میں ڈوب گئی تھیں۔ جہاں ان کی زمینیں شروع ہوتی تھیں وہاں پر ابتدا میں خربوزے اور تربوز کے کھیت تھے۔ جہاں پھل سمیت بیلیں پانی میں ڈوب گئی تھیں، مزارعوں کے لڑکے پانی میں غوطے لگا کر خربوزے نکالتے اور پھر اونچی جگہوں پر بیٹھ کر کھاتے، ملک فراز کو بھی انہوں نے تربوز نکال کر پیش کیے تھے۔

ان کے بیشتر کھیت بھی پانی سے بھرے تھے اور جب بھی کسی چھوٹے کھیت کی منڈیر ٹوٹتی پانی پھنکارتا ہوا بڑے کھیت کے پانی میں شامل ہوتا۔ برکاں والی کی طرف بارش کا اندھیرا نظر آرہا تھا۔ ساون کی بارش ایسی ہی تو ہوتی ہے، کہیں برستی ہے تو کہیں دھوپ نکل آتی ہے۔ یک دم ڈیرے کے سامنے وسیع و عریض کھیت میں پانی کا ریلا داخل ہوتا نظر آیا تھا۔

"سب کو بلاؤ اس کا بند توڑ دیں تاکہ منڈیر کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔" مزارعوں نے بھاگم بھاگ اس بند کو توڑا تو پھنکارتا ہوا پانی آگے گہرائی میں گرنے لگا تھا۔ وہ خود سب لوگ پیچھے ہٹ کر ٹیلے پر کھڑے ہوگئے تھے بند کا کٹاؤ گہرا ہوتا جارہا تھا اور اردگرد لگے درخت بھی چند لمحے جھوم جھوم کر اپنے پاؤں زمین پر جمانے کی کوشش کرتے اور اگلے پل پانی کے ریلے میں بہہ جاتے۔ ایسا ہی وہ بھی ایک درخت تھا جس کے اوپر چڑیا کا گھونسلا تھا، چرند پرند جلدی خطرے کو بھانپ لیتے ہیں۔ شاید اسی لیے چڑیا چوں چوں کرتی اس درخت پر چکر لگاتی جس کی شاخ پر بنے گھونسلے میں اس کے

نوزائیدہ بچے موجود تھے۔

"ارے بھئی اس گھونسلے کو اٹھا لینا چاہیے۔" ملک فراز کے ذہن میں اچانک خیال آیا تھا۔

"ملک جی اس درخت پر چڑھنا خطرے والی بات ہوگی۔" کسی مزارعے نے رائے دی تھی۔

"کوئی خطرے والی بات نہیں ہے بھئی۔ پانی تھوڑا بہت اس طرف ٹکرا کر گزر رہا ہے۔" وہ نفی کرتا ہوا آگے بڑھا اور پھلاہی کی شاخ پر پاؤں جما کر اوپر بنے گھونسلے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

تب ہی کٹاؤ گہرا ہوا اور پانی کا ایک عفریت پھلاہی کو اپنے ساتھ بہا لے گیا دیکھنے والی آنکھوں نے بس ملک فراز کی ایک جھلک پانی کے ریلے میں دیکھی تھی اور وہ جھلک بھی نیچے گرتے گہرے پانی میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔



اس کا کمرہ اس جدید طرز کی بنی کوٹھی میں دوسری منزل پر تھا' وہ کمرے میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئی تو ٹیرس پر چلی آئی تھی۔ گہرے بادلوں کی گھٹا آسمان پر تنی تھی کہیں کہیں بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی بادلوں کے سنگ تھی۔ بارش ایک بار پھر برسنے کو تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اگر فراز جیسے شخص کا ساتھ نہ ہوتا تو کیا وہ یوں عزت کے ساتھ رہ رہی ہوتی۔ اس علاقے کے روایتی مرد کب یہ برداشت کرسکتے ہیں کہ کوئی بھی لڑکی ان کی عزت بن کر اپنے محبوب کو دل میں بسائے رکھے' مگر وہ ملک فراز تھا اس کے دل میں ستائش کے لیے بہت وسعت تھی اور اس وسعت کی ستائش کے دل میں بہت قدر تھی۔ تب ہی تو وہ کبھی ماضی میں گم ہو جاتی اور کبھی فراز کے رویے کو سوچتی جو آج بھی اسے بتا کر گیا تھا کہ وہ ڈیرے پر جا رہا ہے چند گھنٹوں تک واپس آجائے گا۔ نیچے فون کی گھنٹی بجی اور پھر تیز تیز باتوں کی آوازیں جیسے کوئی ہلچل سی مچ گئی ہو۔ یک دم رونے کی آواز پر ستائش کا دل سہم گیا تھا تب ہی ملازمہ دوڑتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"دلہن بی بی.... وہ ملک جی.... چھوٹے ملک جی...."

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم!" وہ فریش ہو کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور خاصی گرم جوشی سے ڈاکٹر افتخار کو سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیا حال ہیں ہماری استانی کے۔" ڈاکٹر افتخار نے بھی خاصی گرم جوشی سے سلام کا جواب دیا تھا۔

"افتخار بھائی۔" وردہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائی تھیں۔ "میں آپ کو استانی نظر آتی ہوں۔"

"کیوں مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی کیا؟ مجھے تو اسد نے ہی بتایا ہے کہ اب تم ب سے بکری ک سے کتا پڑھاتی ہو۔"

"افتخار بھائی آپ...." اس نے دانت پیسے تھے۔

"کیوں؟ اچھا غلطی ہو گئی مجھ سے 'ک سے کتاب ہوتا ہے۔" انہوں نے معصومیت کے ساتھ تصحیح کی تھی۔

"افتخار بھائی میں کالج میں لیکچرار ہوں۔" اب کے اس نے انتہائی عاجزی سے بتایا تھا۔

"یقین تو نہیں آتا تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں' لو چائے پیو۔" انہوں نے چائے کا کپ اس کی طرف یوں بڑھایا گویا وہ ان کے گھر مہمان ہو۔

"نہیں تھینک یو' آپ پئیں بلکہ یہ کیک بھی لیں نا۔" اس نے کیک ان کی طرف بڑھایا تھا۔

"تمہاری ستائش بی بی پھر تو بیمار شیمار نہیں ہوئیں۔" انہوں نے کیک پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں بھائی اللہ کا شکر ہے اب تو وہ فٹ فاٹ ہے۔"

"فٹ فاٹ تو خیر وہ نہیں ہے' مگر اسے جو دورہ پڑتا ہے اس میں کبھی کبھار وقفہ آسکتا ہے' ہو سکتا ہے

یہاں آکر وہ بہت مصروف ہو گئی ہو اس لیے کیپ آلیا ہے۔"

"یعنی آپ مطمئن نہیں ہیں۔" وردہ پریشان ہوئی۔

"ظاہری سی بات ہے یار ہم کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں اس کا رویہ اتنا نان کو آپریٹو ہے' تیسرا اسیشن ہونے کے باوجود ہم کچھ ڈائگنوز نہیں کر سکے۔" اب کی بار اسد نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"اس قسم کے پیشنٹ کے لیے کتھارسس بہت ضروری ہوتا ہے اور اس کتھارسس میں ہی ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ اس کے لیے کیا تجویز کیا جائے۔"

"یہ تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا باپ لینڈ لارڈ ہے' اچھی ویل آف فیملی سے بی لانگ کرتی ہے' مگر اس کی شادی' منگنی اور محبت وغیرہ کی تفصیل ہمیں تم بتاؤ گی؟"



کچھ تو ہوا بھی سرد تھی کچھ تھا تیرا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی
بات وہ آدھی رات کی رات وہ پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا اس پہ تیرا جمال بھی
سب سے نظر بچا کے وہ مجھ کو ایسے دیکھتا
ایک دفعہ تو رک گئی گردش ماہ و سال بھی
میری طلب تھا ایک شخص وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرا بھول گیا سوال بھی

ملک فراز کو سپرد خاک ہوئے چار سال بیت چکے تھے۔ شہریار کو اس کے اجڑ کر آنے کی اطلاع ڈیڑھ سال بعد ملی تھی' اگرچہ اس کا یونٹ مشن سے واپس آچکا تھا' مگر اس نے گاؤں کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا وہ تو شہناز بیگم بیمار ہوئیں تو انہوں نے واسطے دے کر اسے گاؤں آنے پر مجبور کیا تھا' مگر اب بھی وہ بہت کم چکر لگاتا تھا۔

ان گزرے چار سالوں میں ملک موسیٰ نے ملک خدا بخش کو منانے کے لیے کیا نہیں کیا تھا' مگر ان کی تمام تاویلیں' دلیلیں اور معذرتیں ملک خدا بخش کے دل پر کوئی اثر نہ چھوڑ سکی تھیں۔ ملک فراست کی حویلی سے واپس آنے کے بعد وقت گزاری کے لیے تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا' اب وہ ماسٹر کر چکی تھی' یوں ہی زندگی گزر رہی تھی۔ وہ صبح کی نماز پڑھ کر تلاوت کرنے کے بعد صحن میں چلی آئی تھی۔ جب ملک خدا بخش نے کھڑکی کے پردے اٹھا کر باہر کا جائزہ لیا اور ان کی نظر جھولے پر بیٹھی ستائش پر پڑی تھی۔ وہ اسے دیکھتے چلے گئے تھے۔

ان کی لاڈلی بیٹی نے ان سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا تھا ان کے فیصلے سے سرتابی نہیں کی تھی' ان کے دل کا درد بڑھنے لگا' اس دھند بھرے موسم کی ٹھنڈک سے بے نیاز جھولے پر بیٹھے کسی اور نے بھی اپنے کمرے کے ٹیرس پر کھڑے کتنی دیر اسے دیکھا تھا' دونوں حویلیوں کے درمیان کب کی دیوار اٹھ چکی تھی۔ وہ اپنے گیٹ سے نکل کر ملک خدا بخش کی حویلی میں داخل ہوا تھا۔ اسے کبھی ان دیواروں کی پروا نہیں رہی تھی۔ اگر ستائش اس کا ساتھ دیتی تو۔۔۔ اور کئی سال پہلے کی طرح آج بھی اس نے پاؤں رکھ کر جھولے کی حرکت کو روک دیا تھا۔ ملک خدا بخش نے میجر شہریار کو اندر آتے اور پھر ستائش کے پاس رکتے دیکھا تھا۔ انہوں نے کھڑکی کا شیشہ ہٹایا۔

"ستائش! تم کبھی تایا جان سے پوچھو گی نہیں کہ انہوں نے تمہیں کس جرم کی سزا دی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے دوٹوک جواب دیا تھا۔

"اچھا یہ تو پوچھ سکتی ہو کہ وہ تمہاری خوشیوں کے دشمن کیوں بنے ہیں؟"

"نہیں۔"

"چلو یہ تو پوچھ لو کہ مجھ سے کس بات کی دشمنی ہے؟" وہ خاموش رہی۔ پتا نہیں ملک خدا بخش کے دل میں کیا خیال آیا کہ وہ باہر چلے آئے تھے۔ مرکزی دروازے سے باہر نکلتے ان کا ٹکراؤ ستائش سے ہوا جو کچھ کہے بغیر ان کے پاس سے ہو کر اندر چلی گئی اور شہریار۔۔۔ بھی جھولے پر پاؤں رکھے ستائش کو اندر جاتا دیکھ رہا تھا۔

"شہریار اندر آجاؤ۔" ملک خدا بخش مختصراً" کہہ کر پلٹے تھے۔

٭ ٭ ٭

ڈاکٹرز کے پینل کی رپورٹ کے مطابق اس شخص کے دماغ پر چوٹ لگی جس کی وجہ سے یادداشت متاثر ہوگئی۔ اس لیے اس کو اپنے ماضی کے متعلق کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں ڈاکٹر صاحب! کتنے عرصے میں اس کی یادداشت کے لوٹ آنے کا امکان ہے۔"

"دیکھیں جس طرح شروع میں یہ شخص ہماری ہر بات کے جواب میں خاموش رہتا تھا پھر اس نے اٹک اٹک کر بولنا شروع کیا' وہ بھی دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی یعنی جو بات اس کے سامنے دہرائی گئی وہ اسے یاد آگئی اس طرح اگر اس کے ماضی کا کچھ حصہ دہرایا جائے تو اسے سب کچھ یاد آنے کا امکان ہے۔"

"ماضی تو تب دہرایا جاسکتا ہے اگر ہمیں اس کے ماضی کا کچھ پتا ہو۔"

"میرا خیال ہے اعزاز صاحب! اگر آپ اس کے متعلق اخبار میں اشتہار دے دیں۔" ڈاکٹر صاحب نے رائے دی تھی۔

"واقعی یہ بات تو میرے ذہن میں ہی نہیں آئی کیا پتا ۔کوئی اس کی تصویر دیکھ کر پہچان لے' ویسے کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اسی علاقے کے نیوز پیپر میں اشتہار دوں جہاں سے یہ ہمیں ملا تھا۔"

"نہیں' آئی تھنک نیشنل نیوز پیپر میں بہتر رہے گا۔" ڈاکٹر صاحب نے رائے دی تھی۔

اعزاز اور مون دونوں اپنے دوست نعیم کے فارم ہاؤس سے واپس آرہے تھے' جب ان کی گاڑی سے وہ شخص اچانک آن ٹکرایا تھا۔ اگر اعزاز بروقت بریک نہ لگاتا تو وہ شخص گاڑی کے نیچے کچلا جاچکا ہوتا۔

ان دونوں نے تیزی سے اتر کر اس شخص کو اٹھایا جو زخمی ہوکر بے ہوش ہوچکا تھا۔ دونوں اسے لے کر قریبی اسپتال پہنچے تھے جہاں ابتدائی طبی امداد کے بعد وہ ہوش میں آگیا تھا' مگر اس کا کچھ اتا پتا نہ تھا کہ اسے کہاں چھوڑا جائے' وہ خود تو گویا کسی معصوم بچے کی طرح سے تھا۔ خاصی سوچ بچار کے بعد اعزاز اسے گھر لے آیا تھا۔ اب وہ سائیکاٹرسٹ کے پاس زیر علاج تھا' مگر اس کا ماضی سوالیہ نشان تھا۔

٭ ٭ ٭

وہ بگھی میں سوار تھا جس کو سفید رنگ کے دو گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ اس کے دوست اور کزنز سفید کرتوں پر پیلے دوپٹے لیے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ مہندی کا فنکشن مشترکہ طور پر ملک خدا بخش کی حویلی میں رکھا گیا تھا۔ جہاں صحن میں اسٹیج بنا کر ڈھولکی رکھی گئی تھی۔

سنبھالی آویں لانگراں واپلہ، ہولا نگراں واپلہ
ماہیا وے ماہیا سنبھالی آویں لانگراں واپلہ ہو لانگراں واپلہ
آڑو وں دا بوٹا اساں پانی پایا پایا لیا
آڑو کھا گئے لوکی اساں ویلا جھڑ جالیا
لانگراں واپلہ، ہولا نگراں واپلہ

بگھی اسٹیج کے پاس رکی تو وہ اتر کر اسٹیج پر لگے جھولے میں ستائش کے پہلو میں جا بیٹھا تھا۔

ڈھولک بجے گی ساری رات مہندی لگے گی ساری رات
جا کر تم ساجن کے پاس بھول نہ جانا یہ دن رات

سکھیوں نے کے بدل کر کوئی اور گیت شروع کیا تھا عبدالاحد' عائلہ' شہناز بیگم کے ساتھ ستائش کی ننھیالی خواتین اسٹیج پر آگئی تھیں۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی لگا کر نوٹ وارے گئے' اب شہریار کے ہاتھ پر مہندی لگنے کی رسم کا آغاز ہو رہا تھا' جب اس کے موبائل پر گھنٹی بجی تھی۔ اس نے سیل نکال کر نمبر دیکھا اور قدرے تیزی سے اسٹیج سے اتر کر ایک طرف جا کر بات کررہا تھا۔ کال ختم کرکے وہ اسٹیج کے قریب آیا اور اوپر آنے کے بجائے اس نے عبدالاحد کو نیچے آنے کا اشارہ کیا تھا۔

"کیا بات ہے شیری، کس کی کال تھی تم اتنے سیریس کیوں ہوگئے؟" عبدالاحد نے اس کے قریب آکر دریافت کیا تھا۔

"یونٹ سے کال تھی ایک اہم آپریشن کے لیے یونٹ فوری طور پر آپریشنل ایریا کی طرف موو کررہی ہے۔ مجھے فوراً جانا ہے۔"

"لیکن شیری یوں تو۔۔۔"

"اوہ بھائی جان! پلیز لمبی چوڑی باتوں کا وقت نہیں ہے آپ ذرا سچویشن سنبھالیں میں نکلتا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

نیوز پیپر کے اشتہار سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو مون نے ایک روز اسے ساری صورت حال بتادی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید اضطراب اور بے چینی تھی۔ اگلے کئی ہفتوں تک وہ اسی بے چینی کا شکار رہا تھا۔ دنیا میں سب کے رشتے ہوتے ہیں اس کے رشتے کہاں تھے۔ وہ ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کرتا، مگر اس کا ذہن سادہ سلیٹ تھا اس پر جو لکھا گیا تھا وہ مٹ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ نکاح کی رسم آج ہی ہوگی۔" ملک خدا بخش کو چوہدری رحمت اللہ کا فون آیا تھا وہ ان کی تسلی کرا رہے تھے۔

"میری بریگیڈیر صاحب سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے یقین دہانی کرائی ہے کہ شہریار کو دو دن کے لیے چھٹی پر بھیجا جائے گا۔" مہندی کے دو دن بعد نکاح اور رخصتی کی تقریب تھی چونکہ کارڈ پہلے ہی بٹ چکے تھے لہٰذا ملک موسیٰ اور ملک خدا بخش کی سرتوڑ کوشش کے بعد امکان پیدا ہوا تھا کہ میجر شہریار دو دن کی چھٹی کے بعد گاؤں پہنچ جائے گا۔ تھوڑی ہی دیر میں سب کے پاس فون کالز کا گویا تانتا بندھ گیا تھا۔

"پتا نہیں لوگوں کو کیا ہوگیا ہے جب ہم نے تقریب کینسل کرنے کی اطلاع نہیں دی تو سب بار بار کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

وہ اپنے کمرے میں بے دلی سے چینل سرچ کررہی تھی جب اس کی انگلیاں ریموٹ پر تھم سی گئیں۔ کافی دیر کے بعد ملازمہ کمرے میں آئی اور ستائش کو دیکھ کر بدحواس ہو کر پلٹی تھی۔

"ملکانی جی! ملکانی جی! ستائش بی بی بے ہوش ہوگئی ہیں۔" سب اس کے اردگرد اکٹھے ہوچکے تھے۔ ملک موسیٰ اس وقت قریبی گاؤں گئے تھے اور کسی ضروری کام سے واپس آرہے تھے ان کے نمبر پر چوہدری انور بھٹی کی دوسری مرتبہ کال آئی تھی اور جو خبر اس نے سنائی اس نے یک دم ملک موسیٰ کے حواس مختل کردیے تھے۔ انہوں نے گاڑی سڑک کنارے روک کر سیٹ سے ٹیک لگائی تھی عین اسی وقت مقامی تھانے کی گاڑی حویلی کے پھاٹک پر رکی ایس ایچ او نے ملک موسیٰ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور ملک عبدالاحد کے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے پر اٹھ کھڑا تھا۔

"ہمیں کال موصول ہوئی ہے کہ میجر شہریار شیران شاہ میں دہشت گردوں کے حملہ میں شہید ہوگئے ہیں۔" اور تھوڑی دیر پہلے ستائش کی اچانک بے ہوشی کا سبب ٹی وی پر چلنے والی خبر تھی۔ شیران شاہ میں دہشت گردوں کے حملے میں جوابی کارروائی کرتے ہوئے سیکورٹی فورسز کے سات اہلکار شہید۔ شہید ہونے والے افراد میں آپریشن پارٹی کے کمانڈر میجر شہریار بھی شامل ہیں۔ اور تب عبدالاحد کو پتا چلا تھوڑی دیر پہلے بار بار موصول ہونے والی کالز کا سبب ٹی وی پر چلنے والی خبر ہی تھی، یہ الگ بات کہ کوئی انہیں بتانے کی ہمت نہیں کررہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وردہ! چچی میری شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔ مجھے ان سب رشتوں سے وحشت ہوتی ہے جنہیں میں تکلیف پہنچانے کی ذمہ دار ہوں۔ چچا جان بھلے کچھ نہیں کہتے، مگر دل سے تو وہ مجھے اپنے بیٹے کو کھونے کا ذمہ دار سمجھتے ہوں گے۔"

"ہماری خاندانی ملازمہ صفیہ ہے نا اس کی بیٹی کبھی کبھار کام میں ماں کا ہاتھ بٹانے حویلی آجاتی تھی ایک

دن میں نے کسی کام سے کمرے میں بلایا اس کی ماں نے اس کا حویلی آنا بند کردیا کیونکہ چند ماہ بعد اس کی شادی ہونے والی ہے۔

اور میں نے خود صفیہ کو دوسری ملازمہ سے بات کرتے سنا کہ میرا سایہ ہے۔ اس کی بیٹی پر بھاری پڑ سکتا ہے۔ میں ان رشتوں سے ان لوگوں سے دور بھاگنا چاہتی ہوں جو جانتے ہیں کہ میں سبز قدم ہوں۔ میرا وجود میرے قریبی رشتوں کے لیے نحوست کا باعث ہے۔ اور اگر کوئی مجھے دیکھے ملک خدا بخش کی بیٹی کو یہاں جاب کرتے ہوئے تو اسے یقین نہ آئے یقین تو مجھے خود بھی نہیں آتا میں ملک خدا بخش کی بیٹی اس پسماندہ علاقے میں آکر جاب کے لیے خوار ہو رہی ہوں۔ میں یہاں کیوں آئی ہوں؟ میری خود سمجھ میں نہیں آتا اور جب سوچنے بیٹھوں تو یہ سوال بھی مجھے اذیت دینے لگتا ہے کس سائیکاٹرسٹ کو بتاؤں؟ کیا کوئی سائیکاٹرسٹ میرے وجود سے نحوست کے سائے دور کر سکتا ہے میری قسمت بدل سکتا ہے۔"

"یہ سب فضول باتیں ہیں ستائش! رب نے ضرور تمہاری قسمت میں خوشیاں لکھی ہوں گی اور تب تم یقین بھی نہیں کرو گی کہ تم ایسا سوچتی تھیں۔ کوئی سائیکاٹرسٹ تمہاری قسمت نہیں بدل سکتا مگر.... رب تو بدل سکتا ہے نا۔"



"میں ڈیڑھ گھنٹے تک تمہیں پک کرلوں گا۔ امید ہے اتنی دیر تک تم فارغ ہو جاؤ گے۔" اعزاز نے اسے اسپتال کے گیٹ پر اتارتے ہوئے کہا تھا۔

"ڈونٹ وری یار! تم بے فکر ہو جاؤ میں واپسی کے لیے کوئی کنوینس لے لوں گا۔" اس نے مسکرا کر کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترا تھا۔ اعزاز نے اسے سڑک کراس کرتے ہوئے بغور دیکھا تھا خوب صورت نقوش سے سجے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی خوب جچ رہی تھی۔ اپنی نشست و برخاست سے وہ کسی اچھے خاندان کا فرد لگتا تھا۔ جب وہ اعزاز کی گاڑی کے سامنے آیا تو گویا اس کے سر اور چہرے پر جھاڑ جھنکاڑ تھا اعزاز نے ہی اسے سیلون لے جا کر اس کی حالت بدلی تھی۔ وہ اسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو اس نے سر جھٹک کر گاڑی آگے بڑھائی تھی۔ ریسپشن پر اپائنٹمنٹ چیک کرنے کے لیے وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا جب ایک خاتون نیچے اترتے ہوئے ٹکراتے بچیں وہ تیزی سے ایک طرف ہوا تھا اور اس کے ذہن میں کوئی شناساسی الجھن در آئی تھی۔

اپائنٹمنٹ چیک کرانے کے بعد وہ نیچے ویٹنگ روم میں آکر بیٹھا تھا۔ چند اور لوگ بھی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے اس نے نہ چاہتے ہوئے اس طرف نظر اٹھائی جہاں وہ کسی کے ساتھ فون پر بات کر رہی تھی۔

"عائلہ بھابھی ان شاء اللہ ویک اینڈ پر آنے کا ارادہ تو ہے" "آپ سنائیں احد بھائی کیسے ہیں اور چچی ٹھیک ہیں۔" یک دم اس کے ذہن میں تصویروں کا کوئی ہجوم

ابھرا تھا وہ بے ساختہ اٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔
"ایکسکیوزمی" آواز پر ستائش نے جھٹکے سے نظریں اٹھائیں اور اس کی آنکھیں گویا حیرت سے پھٹ گئی تھیں کلین شیو چہرے پر اب داڑھی تھی مگر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ وہ شہریار تھا۔
"آپ... آپ کون؟" اس نے رک رک کر پوچھا تھا۔
"شیری... شیریار۔"



"السلام علیکم!" اس نے خوشی سے بھرپور آواز میں سلام کیا تھا۔
"آج صبح صبح یہ منحوس آواز سننے کو مل گئی۔" شہناز بیگم بڑبڑائیں تو عائلہ اور عبدالاحد نے تاسف سے انہیں دیکھا تھا۔
"چچی جان دیکھیں تو سہی کون آیا ہے۔" ستائش نے ان کی ناگواری کو قطعی نظرانداز کر کے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

انہوں نے اس کے بازو ہٹا کر پلٹ کر دیکھا اور گویا سکتے میں آگئیں۔ آپریشن کے دوران جب وہ نفری کم پڑجانے پر پوزیشن بدل کر فائرنگ کر رہا تھا تو ایک دستی بم اس کے پاس پھٹا تھا' وہ زخمی حالت میں پہاڑی سے نیچے لڑھک گیا تھا۔ اور دہشت گرد اسے اٹھا کر لے گئے تھے اسے مسنگ بی لیوڈ ڈیڈ قرار دیا گیا۔ وہاں وہ کتنا عرصہ رہا اسے یاد نہیں تھا۔
ایک روز جب اچانک سیکورٹی فورسز کے حملے کی اطلاع ملی تو دہشت گردوں نے ایمرجنسی میں ٹھکانہ تبدیل کیا تھا ایسے میں میجر شہریار ان سے بچھڑ کر یہاں آن پہنچا تھا۔ اور ستائش جو سوال کرتی تھی کہ ملک خدا بخش کی بیٹی ہو کر وہ اس پسماندہ ادارے میں جاب کے لیے کیوں خوار ہو رہی تھی؟ اسے اپنے سوال کا جواب شہریار کی صورت مل گیا تھا۔



وہ شہریار کے کمرے میں پھولوں کی سیج پر بیٹھی تھی جب شہریار کمرے میں آیا تھا۔ سلام کرتا ہوا وہ اس کے مقابل آن بیٹھا تھا۔ چند لمحے گزرے تو اس نے نظریں اٹھائیں وہ بہت دلچسپ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"کیا ہے، شیری! کیوں لوز کریکٹر لوگوں کی طرح مجھے گھور کر دیکھ رہے ہو؟" ستائش کو احساس ہوا اسے آج بھی شہریار سے نہیں دبنا چاہیے 'سوانی جون میں لوٹ آئی تھی۔ شہریار نے اس کے سوال پر محظوظ ہو کر مخملی ڈبیا جیب سے نکال کر چین اس کے سامنے کی تھی' ستائش نے چین اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھی تھی۔
"لاؤ میں پہنا دوں۔"
"کیوں میرے ہاتھ کوئی ٹوٹے ہوئے ہیں میں خود بھی پہن سکتی ہوں۔" ستائش نے مسکراہٹ دبا کر پوچھا تھا۔
"یار تم نئی دلہن ہو اور ہم دلہن سے کوئی کام نہیں کرواتے۔" وہ اسے چین پہناتے ہوئے وضاحت کر رہا تھا۔
"مجھے ایک بات یاد آئی میں نے تمہاری تعریف تو کی ہی نہیں۔"
"اتنی دیر نہیں ہوئی اب بھی کر سکتے ہو۔" ستائش نے کسی ملکہ کی طرح بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔ شہریار نے بھرپور نظر اس پر ڈالی اس کے چہرے پر حد درجہ شرارت تھی۔
"کھنڈرات بتاتے ہیں کہ عمارت کبھی شاندار تھی۔" برجستہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ ستائش نے ناراض ہونا چاہا مگر بے ساختہ اسے ہنسی آگئی تھی۔ اب خوشیوں کی رت اور ملن کے موسم تھے۔



ہم نشیں آؤ چلیں

ہم نشیں آؤ چلیں
ہو رہی ہے گہری شام
اور دل ناشاد میں
جاگ اُٹھے ہیں وہ زخم
جن سے رستا ہے لہو
ہم نشیں آؤ چلیں
اس بھری دُنیا سے دُور
اپنی وحشت کو سمیٹے
اس بھری خلقت سے دُور
ہم نشیں یہ زندگی بھی بوجھ ہے
ہم اسے مل کر اُٹھا سکتے نہیں
یہ سفر بھی ایک ایسا راز ہے
جو کسی کو ہم بتا سکتے نہیں
ہم نشیں چلتے رہیں چلتے رہیں
اس کنارے زندگی کی شام ہے
گر کوئی آواز ہم کو روک لے
سُن کے اس آواز کو چلتے رہیں
میں نے اپنے درد کو سمجھا نہیں
تم نے اپنی بے بسی کو پالیا
ہم نشیں آؤ چلیں

طاہر مسعود

مہکتے، میٹھے، مستانے زمانے
کب آئیں گے وہ من مانے زمانے

جو میرے کنج دل میں گونجتے ہیں
نہیں دیکھے وہ دُنیا نے زمانے

تری پلکوں کی جنبش سے جو ٹپکا
اسی اک پل کے افسانے، زمانے

تری سانسوں کی سوغاتیں، بہاریں
تری نظروں کے نذرانے، زمانے

کبھی تو میری دُنیا سے بھی گزرو
لیے آنکھوں میں ان جانے زمانے

انہی کی زندگی جو چل پڑے ہیں
تری موجوں سے ٹکراتے، زمانے!

میں نکر رازِ ہستی کا پرستار
مری تسبیح کے دانے، زمانے

مجید امجد

ہم زباں میرے تھے ان کے دل مگر اچھے نہ تھے
منزلیں اچھی تھیں، میرے ہم سفر اچھے نہ تھے

جو خبر پہنچی یہاں تک، اصل صورت میں نہ تھی
تھی خبر اچھی مگر اہلِ خبر اچھے نہ تھے

بستیوں کی زندگی میں بے زری کا ظلم تھا
لوگ اچھے تھے وہاں کے، اہلِ زر اچھے نہ تھے

ہم کو خوباں میں نظر آتی تھیں کتنی خوبیاں
جس قدر اچھے لگے تھے، اس قدر اچھے نہ تھے

اس لیے آئی نہیں گھر میں محبت کی ہوا
اس محبت کی ہوا کے منتظر اچھے نہ تھے

اک خیالِ خام ہی مرشد تھا ان کا منیر
یعنی اپنے شہر میں اہلِ نظر اچھے نہ تھے

منیر نیازی

میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سرِ آئینہ مرا عکس ہے پسِ آئینہ کوئی اور ہے

میں کسی کے دستِ طلب میں ہوں تو کسی کے حرفِ دعا میں ہوں
میں نصیب ہوں کسی اور کا مجھے مانگتا کوئی اور ہے

عجب اعتبار و بے اعتباری کے درمیان ہے زندگی
میں قریب ہوں کسی اور کے مجھے جانتا کوئی اور ہے

مری روشنی ترے خدوخال سے مختلف تو نہیں مگر
تو قریب آ تجھے دیکھ لوں تو وہی ہے یا کوئی اور ہے

تجھے دشمنوں کی خبر نہ تھی مجھے دوستوں کا پتا نہیں
تری داستاں کوئی اور تھی مرا واقعہ کوئی اور ہے

کبھی لوٹ آئیں تو پوچھنا نہیں دیکھنا انہیں غور سے
جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

جو مری ریاضتِ نیم شب کو سلیم صبح نہ مل سکی
تو پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ یہاں خدا کوئی اور ہے

سلیم کوثر

شگفتہ جاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں پھر توبہ کرو (تو پھر بھی اللہ تمہاری توبہ) قبول فرمائے گا۔

فائدہ:۔
جب بھی احساس ہو، توبہ کر لینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنے زیادہ گناہ ہو گئے ہیں، وہ معاف نہیں ہوں گے۔ البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو، صرف زبان سے نہ ہو۔

لفظ باتیں کریں،

- اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کبھی کسی سے توقع مت رکھو، کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔
- اپنی خوشی کو دوسروں کی خوشی پر مقدم سمجھنا اور دوسروں کے جذبات سے بالکل بے پروا ہو جانا خود غرضی کی مکمل تشریح ہے۔
- جس کا آغاز نہ ہو، اس کا انجام نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ ہر آغاز سے پہلے ہے اور ہر انجام کے بعد۔
- عبادت اس مقام پر نہیں پہنچا سکتی جہاں غریب کی مدد و خدمت پہنچاتی ہے۔
- اگر کیفیت اور یکسوئی نہ بھی میسر ہو تو نماز ادا کرنی چاہیے نماز فرض ہے، کیفیت فرض نہیں۔
- اپنا کام اچھے طریقے سے نبھاتے جاؤ، رب تعالیٰ تمہاری بہتری اور خوشی کے راستے بتلائے گا۔ کامل یقین کے ساتھ دوسروں سے بھلائی اور حسن اخلاق سے پیش آؤ۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

حج،

ہاجرہ کا گھر یہاں تھا۔ اور اُن کی قبر خانہ کعبہ کے تیسرے ستون کے قریب بتائی جاتی ہے۔ کیسا اعزاز ہے کہ کوئی بھی... کوئی پیغمبر بھی یہاں دفن نہیں ہو سکا اور

ایک سیاہ فام کنیز وہاں دفن ہے... اللہ کے گھر کے پڑوس میں ہے۔ اللہ کی ہمسائی ہے اور وہ اس کا ہمسایہ ہے... یہ کیسا مقام ہے۔ ایک سیاہ فام افریقن کنیز اور دنیا کی ماؤں میں سب سے ممتاز ماں کی قبر اس کا ایک حصہ ہے۔ ہاجرہ نہ ہوتی تو مکہ نہ ہوتا۔ نہ زم زم کا چشمہ پھوٹتا۔

(منزل کعبے شریف۔ مستنصر حسین تارڑ)
لاریب، ماہ زیب۔ چونیاں

ناممکن،

ایک دانا سے کسی نے پوچھا۔
"ہم ایسا کیا کریں کہ سب کی نظروں میں اچھے بن جائیں؟"
دانا نے جواب دیا "اس دنیا میں اگر کوئی فرشتہ بھی بن جائے تب بھی اسے برا کہنے والے موجود ہوتے ہیں۔"

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

جمہوریت،

میری قوم ایک عرصے سے مغرب کی غلام تھی۔ افلاس ہماری کاشت تھی۔ جہالت کے انبار تھے۔ پھر میں نے ان جاہلوں کو پڑھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے علم کو جھٹلا دیا۔ میں نے ان کے ووٹ کا حق ہمیشہ کے لیے ان سے چھین لیا اور صرف علم والوں کو اختیار دے دیا۔

چنانچہ اسی کیمسٹری جمہوریت سے چین میں انقلاب برپا ہوا۔
آپ کی تو الہامی کتاب کہتی ہے کہ جاننے والے اور نہ جاننے والے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ پھر آپ کے آئین میں جاہلوں کو اس فیصلے کا حق کیوں دیا ہوا ہے؟"

(ماؤزے تنگ۔ ہمکلامی)

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

خطرناک غلطیاں،

- اس نیت سے گناہ کرنا کہ صرف دو چار مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔
- اپنا راز کسی کو بتا کر پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔
- آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزمانا۔
- اپنے کو سب سے زیادہ لائق اور عقل مند تصور کرنا۔
- ہر ایک شیریں زبان کو دوست سمجھ لینا۔
- جو کام خود نہ کر سکے دوسرے کے لیے ناممکن خیال کرنا۔
- بے کاری میں آئندہ کے لیے خیالی پلاؤ پکانا اور خوش رہنا۔
- اپنے والدین کی خدمت نہ کرنا اور اولاد سے اس کی توقع رکھنا۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

تکبر کا علاج،

"اگر تم اپنے تکبر کو توڑنا چاہتے ہو تو کسی غریب اور مفلس کو سلام کرو اور پوری توجہ کے ساتھ اس سے مصافحہ کرو۔"

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

صدف،

- وکیل ہی وہ لوگ ہیں جنہیں قانون سے لاعلمی کی سزا نہیں ملتی۔ (جرمی)

- کامیابی کا سب سے بڑا راز ہر حالت کے لیے تیار رہنا ہے۔ (ہنری فورڈ)
- کامیابی کا راز تو میں نہیں بتا سکتا لیکن ناکامی کا راز ضرور بتا سکتا ہوں اور وہ ہے ہر کسی کو خوش کرنے کی کوشش۔

(ہربرٹ سوپ)

- بڑھاپا ایک بری عادت کی مانند ہے جس کے لیے مصروف شخص کے پاس وقت نہیں۔

(موریس)

حور بن زینب۔ کہروڑ پکا

کون کم بخت،

میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی نوعیت جاننے کے لیے ان کے ایک بزرگ نے بیوی سے پوچھا۔
"آخر تمہیں اپنے خاوند سے کیا شکایت ہے؟"
"یہ بات بات پر گالیاں دیتے ہیں اور کنجوس اتنے ہیں کہ گزارا کرنا بہت مشکل ہے۔"
بیوی نے شکایت کی تو خاوند تلملا کر بولا۔
"کون کم بخت اس بدذات، کمینی اور گھٹیا عورت کو گالیاں دیتا ہے۔ بکواس کرتی ہے۔ سارے پیسے اس کو دیتا ہوں خواہ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو۔"

عائشہ۔ گوجرہ

تعریف،

اپنے حسن کی تعریف سنتے ہی عورت کا دل پہلی گواہی یہی دے گا کہ آدمی بے شک بے ہودہ ہے لیکن جوہری کی نظر رکھتا ہے، کتنا صحیح ہے اور نگاہوں کا بڑا سچا ہے۔

(شوکت تھانوی)

حرا قریشی۔ ملتان



خالدہ جیلانی



عظمیٰ شفیق ـــــــــ جڑانوالہ

نیند کا ہلکا گلابی خمار آنکھوں میں تھا
یوں لگا جیسے وہ شب کو دیر تک سویا نہیں
جرم آدم نے کیا اور نسلِ آدم کو سزا
کاٹتا ہوں زندگی بھر میں نے جو بویا نہیں

سلمیٰ زبیر ـــــــــ لاہور

غیر ممکن ہے کہ حالات کی گتھی سلجھے
اہلِ دانش نے بہت سوچ کے الجھائی ہے

سجیلہ ظفر ـــــــــ جڑانوالہ

کتنے برسوں کا سفر خاک ہوا محسن
اس نے جب پوچھا جناب کیسے آنا ہوا

شگفتہ یونس ـــــــــ راولپنڈی

وہ جن کو زندگی سے بہت پیار تھا سلیم
وہ لوگ زندگی کی حراست میں مر گئے

گیلانی سسٹرز ـــــــــ کہروڑ پکا

گلاب ہاتھ میں آنکھوں میں ستارہ ہو
کوئی وجود محبت کا استعارہ ہو
قصور ہو تو ہمارے حساب میں لکھ جائے
محبتوں میں جو احسان ہو تمہارا ہو

حورین زینب ـــــــــ کہروڑ پکا

آؤ عدم ان سندر مورتوں سے پیار کریں
اجلے اجلے دھوکے کھاتے اک زمانہ بیت گیا

گڑیا شاہ ـــــــــ کہروڑ پکا

مجھے دور لے جانے والوں نے یہ نہ سوچا
میں چھوڑ دوں گا یہ راستہ بھی، وہ راستہ بھی

سیدہ نسبت زہرا ـــــــــ کہروڑ پکا

کبھی آس کبھی پاس کبھی جدائی دے کر
مرحلے وار اس نے بکھیرا مجھ کو

مدیحہ نورین مہک ـــــــــ برنالی

تیری بے وفائیوں پر، تیری کج ادائیوں پر
کبھی سر جھکا کے روئے، کبھی منہ چھپا کے روئے

ثنا عبدالقیوم ـــــــــ بنکہ چیمہ

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

شاکرہ خاتون ـــــــــ کراچی

خود کو میرے دل میں ہی چھوڑ گئے
تمہیں تو ٹھیک سے بچھڑنا بھی نہیں آتا

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــــ گجرات

اس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

ساجدہ افتخار ـــــــــ کراچی

تمنا دید کی موسیٰ کرے اور طور جل جائے
عجب دستورِ الفت ہے کرے کوئی بھرے کوئی

اقصیٰ قریشی ـــــــــ ڈی آئی خان

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایتِ زمانہ

فرحین ظفر، سیمی ظفر ـــــــــ کراچی

لاعلم تھے لاعلم رہتے تو ہی اچھا تھا!
انہیں ہم سے محبت نہیں حقیقت جان لی ہے

حرا قریشی ـــــــــ ملتان

تیرے اور میرے مزاج
جیسے الفاظ اور متضاد





شائستہ اکبر کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر افتخار عارف کی یہ غزل میری خالہ کے نام۔

سرِ بام ہجر دیا بجھا تو خبر ہوئی
سرِ شام کوئی جدا ہوا تو خبر ہوئی

مرا خوش خرام، بلا کا تیز خرام تھا
مری زندگی سے چلا گیا تو خبر ہوئی

کوئی بات بن کے بگڑ گئی تو پتا چلا
مرے بے وفا نے کرم کیا تو خبر ہوئی

مرے ہم سفر کے سفر کی سمت ہی اور تھی
کہیں راستہ گم ہوا تو خبر ہوئی

مرے قصہ گو نے کہاں کہاں سے بڑھائی بات
مجھے داستاں کا سرا ملا تو خبر ہوئی

سیدہ ثوبا سجاد کی ڈائری سے

محسن نقوی کی نظم "مجھے اس سے محبت ہے" اپنی تمام قارئین بہنوں کے لیے۔

مجھے اس سے محبت ہے
کہ اس نے وہم میں الجھی فاختاؤں کو
چمکتے آسمانوں کی بشارت دی
کبھی دھرتی کی شریانوں میں بہتے خون کو تازہ حرارت دی

مجھے اس سے محبت ہے
کہ اس نے دار کے ماتھے پہ زخمی انگلیوں سے زندگی کا نام لکھ کر

اپنے "ہونے" کا بھرم رکھا
کہ اس نے عہد کے سارے اندھیرے چیر کر
سچ کے سویرے میں قدم رکھا

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

تنہائی بھی ایک عذاب سے کم نہیں۔ بعض دفعہ انسان دنیا کے میلے میں بھی تنہا رہ جاتا ہے اور یہ تنہائی کتنے مفہوم رکھتی ہے۔ یہ شاعر نے بڑی خوبصورتی سے اپنے لفظوں میں بیان کیا۔ میری دوست سینعہ بیگ کے نام۔

تنہائی کا گہرا دکھ تھا
میں دریا دریا رویا تھا

ایک ہی لہر نہ سنبھلی ورنہ
میں طوفان سے کھیلا تھا

سوکھ گئی جب سکھ کی ڈالی
تنہائی کا پھول کھلا تھا

تنہائی میں یادِ خدا تھی
تنہائی میں خوفِ خدا تھا

تنہائی کا تنہا سایا
میرے ساتھ لگا تھا

تنہائی محراب عبادت
تنہائی منبر کا دیا تھا

تنہائی میرے پائے شکستہ
تنہائی میرا دستِ دعا تھا

وہ جنت میرے دل میں چھپی تھی
میں جس کو باہر ڈھونڈ رہا تھا

تنہائی میرے دل کی جنت
میں تنہا ہوں، میں تنہا تھا

اقرأ صادق کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے نام۔

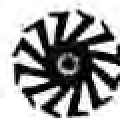
آنکھ رونے کی شدت سے لال تھوڑی ہے
ملال ہے مگر اتنا ملال تھوڑی ہے

بس اپنے واسطے فکر مند ہیں لوگ
یہاں کسی کو کسی کا خیال تھوڑی ہے

پروں کو کاٹ دیا اڑان سے پہلے
یہ خوفِ ہجر ہے شوقِ وصال تھوڑی ہے

مزا تو جب ہے ہار کے بھی ہنستے رہو
ہمیشہ جیت جانا کمال تھوڑی ہے

لگانا پڑتی ہے ڈبکی ابھرنے سے پہلے
غروب ہونے کا مطلب زوال تھوڑی ہے



قارئین جو چھوٹے شہروں اور گاؤں سے خط لکھتی ہیں۔ ہمیں اندازہ ہے انہیں خط پوسٹ کرانے کے لیے کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ بلوچستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہمارے پرچے پڑھے جاتے ہیں اور وہاں کی لڑکیاں ہمارے پرچے پڑھ کر ہمیں خط بھی لکھتی ہیں۔
شازیہ 'نازیہ' ثمینہ اور عظمیٰ کو ہمارا اسلام پہنچا دیں۔

مسز فرحانہ طاہر۔۔۔ اسلام آباد

نمل میں مجھے فارس اور زمر کی نوک جھونک بہت اچھی لگتی ہے خاص طور پر جب فارس نے زمر کا شکریہ ادا کیا تھا۔ (میرے لیے لڑنے کا شکریہ) ان دونوں کے اس طرح کے رومینٹک سین تھوڑے اور ہونے چاہئیں اور وہ سین جب زمر فارس کو کہتی ہے کہ مجھے "آپ" کہو اور فارس کہتا ہے "جیسے تمہاری مرضی" اس کا ہر کردار پرفیکٹ ہے۔ "دشت جنوں" عام کہانیوں سے ہٹ کر بہت زبردست ہے۔ عنیزہ سید کا تو نام ہی کافی ہے۔ اچھی کہانی تھی مگر اس اسٹوری میں جو ایک بات مجھے اچھی نہیں لگی وہ یہ ہے کہ کسی نے بھی رشتوں کو ان کے احترام اور تقدس میں بھائی' آپی' باجی' آنٹی کچھ بھی کہنے کا تکلف نہیں کیا۔ ڈائریکٹ ناموں سے پکارا ہے (امریکن اسٹائل میں) "یاد ہے تیرے سنگ" اتنی خاص نہیں لگی۔

"دھنک کے رنگ" مزہ آیا پڑھنے میں 'اچھی شغلی (مزاحیہ) کہانی تھی خاص طور پر "میرے ابو" کے اوپر جو مضمون لکھا ہوا تھا میں تو پڑھ کر بہت ہنسی۔ افسانے سارے "نارمل" ہی تھے بشریٰ احمد کا "نند بھاوج" اچھا تھا۔

میں نے خط لکھنے کا سوچا ہوا تھا اس لیے جلدی جلدی دن رات ایک کر کے نیند کی قربانی دے کر حتیٰ کہ ایک مہندی کا فنکشن بھی مس کیا ہے۔ کمرے کی صفائی نہیں کی 'رات کو اپنے "ان" کو چائے بنا کر نہیں دی۔ اتنی قربانیوں کے بعد کم از کم میں آپ سے اتنی توقع تو رکھ سکتی ہوں کہ میرا خط شائع ہو جائے۔ کہانیوں میں وہ پہلے جیسا مزہ بھی نہیں رہا' اب تو ساری مصنفین ایسا لگتا ہے' ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے چکر میں زیادہ سے زیادہ فلسفہ اور مشکل الفاظ کا چناؤ کرتی ہیں اپنی معلومات کو شو





خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

عظمیٰ زہرہ۔۔۔ اوستہ محمد

آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں نے پہلی بار خواتین ڈائجسٹ میں خط لکھا اور آپ نے پہلی ہی بار کوڑے دان میں پھینک دیا۔ عمیرہ احمد کا "آب حیات" اور نمرہ احمد کا "نمل" یہ ایسے ناول ہیں کہ بندہ پڑھنے کے بعد پریشان سا ہو جاتا ہے کہ آب حیات فرسٹ تھا یا نمل۔
ہم صوبہ بلوچستان کے ایک نامعلوم چھوٹے سے گاؤں (محمد مراد زہری) میں رہتے ہیں جہاں گیس ناپید ہے لیکن ہر ماہ باقاعدگی سے سب کے رسالے پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے کہ (ہمیں تم سے پیار ہے) اور ہاں آپ ہمارے خط شائع کریں یا نہ کریں ہم ہر ماہ خط لکھتے رہیں گے۔

ج : پیاری عظمیٰ! آپ کا خط ہمیں ملتا تو شائع کرتے نا۔۔۔ یقین کریں ہمیں آپ کا خط نہیں ملا' خوامخواہ بدگمان نہ ہوا کریں۔ ہمیں اپنی قارئین بہت عزیز ہیں' خاص طور پر وہ

کرنے کے لیے۔ پہلے سیدھے سادے الفاظ اور سیدھے سادے بیان میں کہانی لکھی جاتی تھی' جس کو پڑھنے کے لیے زیادہ دماغ نہیں کھپانا پڑتا تھا۔

ج : فرحانہ! آپ کا آٹھ صفحات پر مشتمل خط پڑھا۔ اتنی طویل مدت کے بعد آپ نے یاد کیا' بہت اچھا لگا اور ہمیں خط لکھنے کے لیے آپ نے اتنی قربانیاں دیں۔ مہندی کا فنکشن اٹینڈ نہیں کیا (خوامخواہ کا شور شرابا) کمرے کی صفائی نہیں کی (کوئی بات نہیں.... ایک دن نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے) لیکن میاں صاحب کو چائے بنا کر نہیں دی یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔

خیر ہم آپ کی تمام قربانیوں کی دل سے قدر کرتے ہیں مگر آئندہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر آرام و سکون سے ہمیں خط لکھیں۔ شائع نہ بھی ہوا تو پڑھیں گے تو ضرور اور یہ تو آپ نے صحیح لکھا کہ مصنفین آج کل بہت گنجلک انداز بیاں اختیار کر چکی ہیں مگر قارئین بھی تو کچھ مشکل پسند ہو گئے ہیں۔ سادہ سی کہانی انہیں پسند ہی نہیں آتی۔ اور ہمیں بھی جو خط لکھتے ہیں اس میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشکل الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ وہ خط کے بجائے قصہ چہار درویش لگنے لگتا ہے۔ پتا نہیں خود نمائی اور قابلیت جھاڑنے کا یہ سلسلہ کہاں جا کر تھمے گا۔

عائشہ رباب.... کراچی

سرورق پسند آیا "کرن کرن روشنی" بہت اچھی لگی۔

ہمارے نام میں ربقہ حسین کا بھرپور تنقیدی خط پڑھ کر سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آگے کچھ پڑھوں بھی یا نہیں۔ سائرہ عدنان کا خط بہت دلچسپ تھا۔ ماہا دارثی سے ملاقات میں نیچے کی سطریں غائب تھیں۔ پڑھنے میں بہت دشواری ہوئی۔ میری ڈائری سے کچھ پسند نہیں آیا۔ "دل کشادہ رکھتے ہیں"۔ بہت افسوس ہوا میرے جوابات شائع نہیں ہوئے۔ باقی سب کے جوابات اچھے لگے۔ عمیر جیسوال سے ملاقات اچھی رہی' سارے ہی جوابات بہت ہی تفصیل سے دیے ہیں۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ اعجاز کا رنگ' بشریٰ احمد واقعی اچھی رائٹر ہیں۔ اللہ انہیں مزید کامیابیاں دے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ آب حیات حمین کے بزنس نے تو چکرا کر رکھ دیا۔ واقعی حمین سالار کا ہی بیٹا ہے۔ دشت جنوں کی قسط بہت ہی مختصر تھی۔ بس وسامہ کی کہانی باقی کچھ نہیں۔ گیت' پری اور تم بہت اچھی کہانی تھی۔ امائزہ سے اتنی سمجھ داری کی توقع نہیں تھی۔ سلجوق کا کردار اچھا لگا۔ نمل میں اس بار تو نمرہ احمد نے ناراض کر دیا۔ اتنے کم صفحات سے تشفی نہیں ہوتی۔ دھنک کے رنگ عفت سحر اب تو رویحا کی پریشانیاں ختم کر دیں۔ ازمیرٹ کو ایک اچھے سے منگیتر میں بدل دیں۔ بہاریں تیرے سنگ' روایتی سی لیکن انٹرسٹنگ کہانی تھی۔ کوئی رنگ بھر مثبت پہلو کو اجاگر کرتی کہانی اچھی لگی۔ وہ اور یہ زبردستی کی کہانی تھی۔ حنین کا کردار بہت اچھا لگا۔ ابابیل نہیں آئیں گے۔ سبق آموز کہانی تھی۔ کاشان کا فیصلہ اچھا لگا۔ کنگن اس شمارے کی بہترین کہانی تھی۔ اس قدر مختصر اور جامع محض دو صفحوں میں کس قدر مہارت سے بات مکمل کر لی۔ نند بھاوج بھی اچھی کہانی تھی۔ خبریں ویریں بھی اچھی تھیں۔ آج لنچ میں کیا ہے؟ بہترین تھا آپ کا باورچی خانہ بھی اچھا لگا۔ کھیر ضرور ٹرائی کروں گی۔ ویسے مجھے میٹھا کچھ خاص پسند نہیں ہے۔

ج : پیاری عائشہ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ نمل کی قسط آپ کو مختصر لگی' یہ جان کر تعجب ہوا۔ نمل کی قسط 45 صفحات پر مشتمل تھی۔ اور اس سے زیادہ حیرانی اس بات پر ہوئی کہ آپ کو میٹھا اچھا نہیں لگتا۔ ہم تو میٹھا کھائے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔

صائمہ عمر.... کراچی

پہلا خط مئی کے شمارے 2012ء کو شائع ہوا۔ پہلے خط میں' میں نے صرف اپنا نام "بنت عمر" لکھا تھا اور بقول آپ کے کہ "نام" انسان کی شناخت ہوتی ہے تو آپ کی بات سر آنکھوں پر' ڈائجسٹ دیر سے ملنے کی وجہ سے تبصرہ نہیں کر پاتی۔ آج قلم اٹھایا ہے۔ جس ہستی کے لیے وہ ہماری پیاری عزیز رائٹر سعدیہ عزیز آفریدی ہیں۔ یقین کریں میں ان کی بہت بڑی مداح ہوں (اور مجھ جیسی نجانے کتنی ہوں گی) کیا ہوا؟ کہاں کھو گئیں؟ مصروفیت یا بے رخی' بیگانگی۔ اپنوں کے ساتھ بھی بھلا ایسا کرتے ہیں؟ آپ تو محبتوں کی پیامبر تھیں' محبت کرنا ہم نے آپ سے سیکھا۔ (میں اور میری عزیز از جان سہیلی) عاشی ہم دونوں نے 1999ء سے شعاع' خواتین سے دوستی کی۔ پھر میں یہ امید رکھوں کہ بہت جلد سعدیہ عزیز آفریدی واپس آ

رہی ہیں؟

ج: پیاری صائمہ! سعدیہ عزیز آفریدی تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ یہ آپ نے اچھا کیا کہ اپنا نام لکھا۔ ایک خط کے بعد دوسرا خط لکھنے میں آپ نے تین سال چار ماہ لگائے۔ اب اتنا وقفہ نہ دیجیے گا۔ ہمیں آپ کی آراء کا انتظار رہتا ہے اور آپ کی آراء کی روشنی میں ہم پرچے کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

عظمیٰ شفیق۔۔۔ جڑانوالہ

سب سے پہلے نمل پڑھا جو دل کے قریب تر ہے' ایک دم پرفیکٹ۔ دشت جنوں کو آمنہ ریاض بہت زبردست طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ "دھنک کے رنگ" میں کوئی رنگ نہیں تھا "میری رائے" عتیقہ ایوب کی تحریر ابھی تک کوئی اچھی نہیں لگی۔ بشریٰ احمد کا افسانہ بہترین تھا باقی سارے افسانے بے تاثر سے تھے' کوئی نیاپن نہ تھا۔ عنیزہ سید کی تحریر پڑھنے لائق تھی۔ فرصت سے پڑھی ویل ڈن عنیزہ جی۔

ج: پیاری عظمیٰ! ہم کسی کو ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے بس کبھی کبھی مجبوریاں' غلط فہمیوں کو جنم دے دیتی ہیں۔ ناولٹ اور افسانوں پر آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے اپنی تمام مصنفین تک پہنچا رہے ہیں اب دیکھیں' کہاں تک پہنچے۔

ثنا عابد۔۔۔ قلعہ احمد آباد

اپریل کے شمارے کا انتظار جتنا بے صبری سے ہو رہا تھا۔ اتنا ہی مزہ اس شمارے کو پڑھ کر آیا ہے۔ تھوڑی کمی بس نمرہ احمد کا انٹرویو شامل نہ ہونے پر محسوس ہوئی ہے۔ "ہمارے نام" میں ہر دفعہ قارئین کے خطوط بے حد دلچسپ ہوتے ہیں۔ پر اس دفعہ تو لگا کہ تمام قاری بہنیں ٹھیک ٹھاک فرصت نکال کر لکھنے بیٹھی ہیں۔ جو اپنی کھٹی میٹھی باتوں سے تعریف و تنقید کرکے اس سلسلے کی رونق کو مزید بڑھا دیتی ہیں۔ قارئین کے سروے میں ملائکہ کوثر اور روبینہ شاہد کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ "اعجاز کا رنگ" میں بشریٰ احمد سے ملاقات اچھی رہی اور اس بار افسانہ "سند بھاوج" بھی شاید ان ہی کا شامل تھا نا؟ بہت اچھی تھی۔ ماہا وارثی سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ عمیر جیسوال نے کافی تفصیلی انٹرویو دیا۔ اس بات سے پتا یہ چلا کہ واقعی اپنی امی کو خواتین ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

افسانے پانچوں بہترین تھے۔ سب سے اچھا تو "بنت سحر" کا لگا اچھی طرح معلوم بھی ہو گیا کہ قارئین نے اس دفعہ ایسے ہی نہیں اس سال کی بہترین مصنفین میں سے ایک نام بنت سحر کا چنا' واقعی میں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قرۃ العین خرم کی کہانی' موضوع کے لحاظ سے یہ دونوں ملتی جلتی ہی لگیں۔ "بے بے جی کہا کرتی تھیں کہ سیانے کہتے ہیں جو برتن جتنا شور مچائے وہ اتنا ہی اندر سے خالی ہوتا ہے۔" (قراۃ العین خرم ہاشمی)

کیا واقعی عام انسانوں کی مدد کرنے کو ابابیل آتے ہیں؟ تو میں صرف اتنا کہوں گی کہ شاید۔۔۔ عام انسانوں کی مدد کو ابابیل نہیں آتے۔۔۔ مگر عام انسانوں کا صبر' شکر' یقین ان کے "ابابیل" بن جاتے ہیں۔ کنگن افسانہ بس ٹھیک ہی تھا۔ "گیت' پری اور تم" تو بلاشبہ اس شمارے کی خاص اور بہترین تحریر ثابت ہوئی۔ "دھنک کے رنگ" اور "یاد ہے تیرے سنگ" بھی دونوں ناولٹ بے مثال رہے۔ عمیرہ جی نے اب جو یہ ایک نیا کردار اریک شامل کیا ہے اس وجہ سے اب اور بھی مزہ آئے گا۔ میرا پسندیدہ ترین ناول "نمل" اور ہر شمارے کی جان مجھے یہی لگتا ہے۔ اصل میں نمرہ جی کا نمل میں شاعری کا موزوں استعمال کہانی کو اور بھی دلچسپ اور مجسس بنا دیتا ہے۔

ج: پیاری ثنا! پڑھتے ہوں گے نہیں' ہم واقعی آپ لوگوں کے بیس بیس صفحات پر مشتمل خط لفظ بہ لفظ پڑھتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی کتربیونت نہ کی جائے تو خطوط کے لیے جتنے صفحات مختص ہیں' ان میں غالباً" کسی ایک بہن کا خط ہی جگہ پائے گا۔ آپ کا پچھلا نامہ بھی پڑھ لیا تھا اور اس دفعہ بھی پڑھ لیا ہے۔ شمارے کی پسندیدگی کے لیے آپ کے ممنون ہیں۔

سیدہ لوبا سجاد۔۔۔ کہروڑ پکا

بلا مبالغہ تینوں رسالے بہت اچھے ہیں مگر تینوں (شعاع خواتین اور کرن) کے نام یہ آخری خط اور تحریر ہے کسی سلسلے کے لیے (جی ہاں۔۔۔) لیکن بقول مرزا غالب "میں جا چکا ہوں پھر بھی تیری محفلوں میں ہوں" والا کام ضرور ہوگا میرا بھی۔

حد ہو گئی کہ ہر ماہ باقاعدگی سے ہر سلسلے کے لیے انتخاب بھیجا مگر یہ کیا؟ دوسرا ماہ ہے اپنا خوب صورت نام کہیں نظر نہیں آیا۔ (میرے اندر بھی کچھ کچھ قارئین والی خوش فہمی آ گئی ....) اوکے جی۔ اللہ حافظ تمام قارئین کو بھی اور ادارے کے تمام افراد کو بھی.... (کوئی تو روکو یار....!)

ج : پیاری لوبا! بلامبالغہ آپ کا خط اور بھیجے گئے اشعار تو واقعی بہت اچھے ہوتے ہیں مگر یہ جو آپ نے موجودہ دور کے شاعر کے مصرعے کو غالب سے منتھی کیا ہے نا' کہہ نہیں سکتے کہ کس کی روح زیادہ تڑپے گی۔ اب آپ نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں مگر ہمیں یقین ہے کہ پرانی عادتیں آسانی سے کہاں چھوٹتی ہیں۔ آپ کہیں بھی جائیں۔ لوٹ کر تو یہیں آنا ہے۔ اور کوئی روکے نہ روکے ہم تو ضرور روکیں گے ایک شعر ہماری طرف سے بھی پڑھ لیں۔

یہ جدائیوں کے رستے بڑی دور تک گئے ہیں
جو گیا وہ پھر نہ آیا' میری بات مان جاؤ

سیدہ سعدیہ اشرف.... ملیر کراچی

اپریل کا شمارہ پڑھ کر کچھ تعریفی اور کچھ تنقیدی خط لکھنے کو دل چاہا۔ بھئی سب سے پہلے تو اپنے شمارے سے اشتہارات کے صفحات گھٹائیں۔ ممکن ہو تو سرورق پر ماڈلز کی تصاویر کے بجائے قدرتی مناظر یا ان کے علاوہ کچھ لگائیں۔ جاندار شے کی تصاویر کمرے میں رکھ کے ہم نماز ادا نہیں کرسکتے۔

"نمرہ احمد" بلاشبہ بہت بہترین مصنفہ ہیں اور ہر نکتہ ہی بہترین لکھتی ہیں مگر "شمارہ اپریل' میں محبت کی پانچ اقسام جو انہوں نے بیان کیں اس کی چوتھی قسم سے میں ذرا متفق نہیں۔

ج : سعدیہ! باقی چار قسموں سے تو متفق ہیں یہ بھی کافی ہے۔

رابعہ مصطفیٰ.... جام پور ضلع راجن پور

ٹائٹل ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت تھا۔ خط لکھنے کی بڑی وجہ "نمل" ہے۔ انتہائی بہترین تحریر ہے۔ خواتین کے سارے سلسلے بہت زبردست ہیں۔ شہر آشوب کی آخری قسط پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ میرب کا سائر کے لیے بڑاپن بہت اچھا لگا اور پلیز یہ بھی بتائیں حنین کا ہیرو کون ہے؟

ج : پیاری رابعہ! آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ لیکن صرف دو کہانیوں پر تبصرہ.... خواتین میں دیگر سلسلے وار تحریریں اور ناول افسانے بھی تو ہوتے ہیں۔ آپ نے کسی بھی تحریر کے بارے میں نہیں لکھا۔ چلیں آئندہ ماہ سہی آئندہ ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

حنین کے ہیرو کو پردے میں رہنے دیں ویسے بھی محبت حجاب میں رہے تو زیادہ اچھی لگتی ہے۔

شائستہ سجاد بٹ.... لاہور

"کرن کرن روشنی" نے ہمیشہ کی طرح دل کو روشن کر دیا۔ دل کشادہ رکھتے ہیں اور عمیر جیسوال سے ملاقات اچھی لگی۔ آمنہ ریاض کا دشت جنوں جوں جوں آگے بڑھ رہا ہے توں توں سسپنس بڑھتا جا رہا ہے۔ کیف اور خوش نصیب کی نوک جھونک اچھی لگتی ہے' باقی کردار بھی اپنی جگہ پرفیکٹ ہیں۔ تھینکس آمنہ جی میری اور میری فیملی کی طرف سے بہت بہت شکریہ۔ اتنا اچھا ناول لکھنے پر۔

ناولٹ میں دھنک کے رنگ 'عفت سحر طاہر کا مزاح سے بھرپور تحریر تھی پڑھ کر مزا آیا۔ عتیقہ ایوب کا بہاریں تیرے سنگ زبردست ناول تھا۔ افسانہ قرۃ العین خرم ہاشمی کا کوئی رنگ بھر میرے کوزہ گر 'گاؤں کی الہڑ میار کے ٹاپک پر ہلکی پھلکی تحریر تھی لیکن افسانے کا نام سمجھ سے بالاتر تھا۔ عنیزہ سید کا گیت پری اور تم' زبردست ناول تھا۔ لیکن کردار اتنے زیادہ تھے کہ کہیں کہیں لفظ گڈمڈ ہو جاتے' اب آتے ہیں موسٹ فیورٹ ناول 'نمل' کیا کہنے ہیں نمرہ جی آپ کے ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کر رہی ہیں۔ بنت سحر کی ابابیل نہیں آئیں گے ایک اچھی کاوش تھی۔ بشریٰ احمد کی نند بھاوج ہمارے ہی معاشرے کے اردگرد بیتنے والی کتھا تھی' پڑھ کر اچھا لگا۔ عمیرہ احمد

آپ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ رنگا رنگ پھول لاجواب تھا۔ ان صفحات کی ساری باتیں میں ہر ماہ اپنی ڈائری میں نوٹ کرتی ہوں۔

ج : شائستہ! ہم آپ سے ناراض نہیں ہیں اور نہ ہی کبھی ناراض ہو سکتے ہیں آپ تو 25 سال سے ہمارے پرچوں کی قاری ہیں اور ہم اپنی قارئین کی دل سے قدر کرتے ہیں ناراضی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

کہانیاں ابھی پڑھی نہیں اس لیے جواب دینے سے قاصر ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کی پیاری سی بیٹیوں کو دکھ ہوا جب انہوں نے آپ کے سوال کا جواب نہیں پایا۔ ہماری جانب سے انہیں پیار اور دعائیں۔

ایمن امین..... اسلام آباد

میم کیا میرے خطوط آپ تک نہیں پہنچ رہے؟ یا پھر میری کوئی بات بری لگ گئی آپ کو؟ اجی کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہے..... جبھی تو آپ ہم سے فون پہ بھی بات نہیں کرتیں۔ (1) اگر میرے خطوط آپ تک نہیں پہنچ رہے تو فر تو بس سمجھیں ہمارے ابا حجور کی شامت ہے (2) کوئی بات بری لگ گئی تو کان پکڑ کر اٹھک۔ بیٹھک کرتے ہیں۔ (3) اگر ہمارے خطوط لیٹ موصول ہوتے ہیں تو ہمیں صحیح تاریخ بتادیں۔ ارے منتظر تو ہم اپنی کہانی کے بھی ہیں جس کی باری آگے نہیں دے رہی۔ باری نہ سہی بندہ اتنا تو بتا ہی دیتا ہے قابل اشاعت ہے کہ نہیں ہے، پر نا جی نا اپنے مرے بغیر جنت نہیں ملتی۔ باہوت رولا ہے باہوت رولا، او میں کیا بندے نوں کدی ترس کھاوی لینا چاہی دا.....

ج : پیاری ایمن! فون پر بات نہ کرنے کی وجہ صرف مصروفیت ہے، اسی لیے ہم نے پانچ تاریخ مقرر کی ہے میگزین آنے کے بعد پانچ تاریخ کو تھوڑی سی فراغت ہوتی ہے۔ ابا حجور کی شامت نہ بلائیں۔ ہمیں آپ کے خط موصول ہو گئے تھے۔ تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہ کر سکے اس دفعہ آپ نے ہم پر ترس کھا کر مختصر خط لکھا ہے۔ آپ ہم پر ترس نہ کھائیں۔ کھل کے خط لکھیں اور تمام کہانیوں پر طویل تبصرہ کریں۔ شائع ہوں نہ ہوں، ہم تمام خطوط پوری محبت اور توجہ سے پڑھتے ہیں۔ افسانے کے لیے معذرت۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ محنت کر کے لکھیں۔

اقصیٰ مریم ملغانی، اسوہ مریم ملغانی۔ کاسی اسٹریٹ کوئٹہ

آج بہت خوش ہوں اور خوشیاں سمیٹنے کی جرات کر رہی ہوں کہ آج ہی تو میں نے اسٹڈی ٹیبل خریدی ہے۔ جی ہاں اور ساتھ ساتھ ٹیبل لیمپ بھی خوشی کی ایک اور وجہ امتل آپی سے فون پر بات ہونا بھی ہے..... آپ نے جس طرح سے مجھ سے بات کی، میرا حوصلہ بڑھایا، ہمت بندھائی اس سب نے سرشار کر دیا ہے..... لیکن اپنی کوئی بھی تحریر بھیجنے سے پہلے میں ایک بات شیئر کرنا چاہتی ہوں کہ میرے ابا حضور بہت سخت مزاج ہیں۔ یہ خط بھی ان سے چوری چھپے لکھتی ہوں۔ سوچتی ہوں اگر میری کوئی کہانی میرے اصل نام سے چھپ گئی اور ابا کو خبر ہو گئی تو بہت برا ہو گا۔ میں نے اپنا قلمی نام "انمول ساحل" رکھنا چاہتی ہوں..... آپ سے اور قارئین سے التماس ہے کہ وہ بتائیں، میرا یہ قلمی نام ٹھیک رہے گا نا.....

خواتین ڈائجسٹ آج صبح ہی ملا، اس لیے صرف عنیزہ سید کا ناول اور آب حیات ہی پڑھ پائی۔ اتنا عمدہ ناول لکھنے پر عنیزہ آپی کو ڈھیروں ڈھیر مبارک باد۔ ایک اور بات جو پوچھنا تھی وہ یہ کہ کیا "ایمل رضا" سرائیکی ہیں اگر ہیں تو کہاں سے تعلق ہے۔

ج : پیاری اقصیٰ اور اسوہ! قلمی نام میں انمول تک تو ٹھیک ہے مگر یہ ساحل کی کیا تک ہے، آپ انمول ملغانی نام رکھ سکتی ہیں۔ خیر جناب یہ ہمارا ناقص خیال ہے۔ جس سے آپ کا متفق ہونا ہرگز ضروری نہیں۔ آئندہ پورے شمارے پر آپ کے تبصرے کے منتظر رہیں گے۔
ایمل رضا کا تعلق لاہور سے ہے۔

آسیہ فرید..... ملتان

ڈائجسٹ ملتے ہی بے تابی سے اپنے موسٹ فیورٹ ناول "نمل" کو پڑھا ہمیشہ کی طرح یہ قسط بھی شاندار رہی۔ سیکنڈ موسٹ فیورٹ ناول آب حیات میں ایرک کے عبداللہ بن جانے پر دلی خوشی ہوئی، دشت جنوں بھی انٹرسٹنگ تحریر ہے۔ مکمل ناول عنیزہ جی کا گیت پری اور تم بہت عمدہ تحریر تھی۔ افسانوں میں بنت سحر کا افسانہ بیسٹ لگا اور عفت سحر جی کی ہلکی پھلکی مزاح سے بھرپور تحریر نے موڈ پر خوشگوار اثر ڈالا۔ رویحا جیسا بے وقوف شاید ہی کوئی اور ہو، غرض یہ کہ پورا شمارہ بہترین تھا۔ ٹائٹل بھی اچھا تھا۔

ج : آسیہ جی! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو آباد رکھے۔ آمین۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔۔ کراچی

اپریل کا ٹائٹل دیکھ کر خوشگواریت کا احساس ہوا۔ "آب حیات" کی یہ ایپی سوڈ کچھ خاص پسند نہیں آئی، اسٹوری امامہ اور سالار سے ہٹ کر نئے ٹریک پر آ گئی۔ اسٹوری "دشت جنوں" کی یہ قسط پُرتجسس اور بہت زیادہ ایکسائٹمنٹ سے بھرپور تھی۔ اس تحریر نے شروع سے ہی قارئین کو اپنے حصار میں باندھ رکھا ہے، معاویہ کا کردار بھی پُراسراریت سے بھرپور ہے۔ مائی موسٹ فیورٹ کریکٹر منفرا ہے۔ پلیز منفرا کے کردار کو زیادہ سے زیادہ دکھائیں ناں۔ "دھنک کے رنگ" ہنستی مسکراتی ٹینشن فری اسٹوری دل کو چھوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پینٹنگز والا سین سب سے بیسٹ تھا پُرمزاح تحریر فریش کر گئی۔ "گیت، پری اور تم" ففٹی ففٹی رہا۔ تھیم بالکل پسند نہیں آیا "ہماریں تیرے سنگ" سوفٹ سی لو اسٹوری پسند آئی طرز تحریر بہت اثر انگیز تھی شاہ زر کا کیئرنگ کردار دل کو چھو گیا تھپڑ والا سین تھوڑا آکورڈ تھا اوور آل اسٹوری اچھی لگی۔ "نمل" کے اس ایپی سوڈ نے اچھا خاصا مضطرب کر دیا۔ آبدار کی چیپ حرکت نے زمر کے دل میں فارس کے لیے مس انڈر اسٹینڈنگ کری ایٹ کر دی تھی سچویشن دیکھ کر میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز کے رہ گیا۔ افسانوں میں ٹاپ آف دی لسٹ بنت سحر کا افسانہ "ابابیل نہیں آئیں گے" آؤٹ اسٹینڈنگ تحریر تھی۔ طرز تحریر بہت زیادہ اثر انگیز تھا ڈائیلاگز مسمرائز کر دینے والے تھے تھیم سبق آموز اور متاثر کن تھا۔ "کوئی رنگ بھر" حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئی۔ ٹاپک جان دار تھا پسند آیا۔ کنگن 'نند بھاوج قابل تعریف تحریریں تھیں حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئیں۔

ج: پیاری مسرت! آپ کو اور آپ کی جڑواں بہن صائمہ کو سالگرہ مبارک ہو۔ آپ کو حنا احمد علی کی نظر نہیں لگی بلکہ صفحات محدود ہونے کی بنا پر آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ ہماری تو تمام ہی قارئین بہت صاف دل اور پیار کرنے والی ہیں۔ بس کبھی کبھی کسی کو شامل نہیں کر پاتے تو ہمیں بھی اس کا افسوس ہوتا ہے۔

رفعت جبیں۔۔۔۔ کراچی

اپریل کا شمارہ بہت اچھا لگا "کرن کرن روشنی" ہمیشہ کی طرح چہار سو روشنی بکھیرتی نظر آئی۔ آج کل کے دور میں جہاں "غیبت" بہت کی جاتی ہے یہاں پر رہنمائی کی گئی۔ ناولز میں سب سے پہلے "نمل" کی طرف آتی ہوں ناول کی ہر ہر سطر میں نئے نئے انکشاف، زبردست نمرہ احمد آپ کی بات ہی الگ ہے اور ایک خاص بات جو بتانی تھی وہ یہ کہ شمارہ اپریل کے صفحہ نمبر 170 پر موسیٰ علیہ اسلام کی جگہ موسیٰ رضی اللہ عنہا دو مرتبہ لکھا ہے میری تمام بہنوں سے گزارش ہے کہ وہ اس کی تصحیح کر لیں۔ عنیزہ سید کا "گیت پری اور تم" بہت اچھا تھا "دشت جنوں" سنسنی خیز لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے خوش نصیب اب ضرور کچھ بڑا کرنے والی ہے امید اچھے کی ہے مگر ناول بہت ہٹ ہٹ چل رہا ہے اور میرے کزن کے لیے بالخصوص دعاؤں کی درخواست ہے وہ جلد از جلد صحت یاب ہو جائے۔ آمین۔

ج: رفعت! ہمیں احساس ہے کہ پروف ریڈنگ کی غلطی کی وجہ سے سہواً ایسا ہوا ہے۔ صحابہ کرام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھا جاتا ہے اور پیغمبروں کے ساتھ علیہ السلام لکھا جاتا ہے۔ اس سہو کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی کے طلب گار اور قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کے کزن کو شفائے کلی عطا فرمائے۔ آمین

حیا انور۔۔۔۔ چھوٹا لاہور صوابی

خط لکھنے کی وجہ کوئی ایک نہیں ہے۔ پورا رسالہ کہنی سنی سے لے کر بیوٹی بکس تک شاندار، بس شاعری کچھ خاص نہیں ہوتی۔ بہرحال "کرن کرن روشنی" سے مستفید ہو کر ہم سیدھا نمل کی طرف چھلانگ لگاتے ہیں۔ نمل بلاشبہ ایک زبردست تحریر۔ "دشت جنوں" نے پہلی ہی قسط سے جکڑ لیا ہے اور اب آیوشمتی کبھی کبھی مجھ سے بھی خواب میں ملاقات کر جاتی ہے۔ "گیت، پری اور تم" عنیزہ سید کا اچھا لگا اور عفت سحر نے تو ہنسا ہنسا کے لوٹ لوٹ کر دیا۔ تھینک یو سوچ عفت جی۔

ج: پیاری حیا! آپ کو سالگرہ نمبر پسند آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ مگر یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں جب آیوشمتی خواب میں آپ سے ملاقات کرتی ہے تو وہ ڈر تو نہیں جاتی؟

مرحا گل۔۔۔۔ دارین

خط تو شائع ہو گیا پچھلے مہینے مگر ہمارے دیگر مراسلات کی طرف آپ نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ہوگا (یقیناً)

جب ہی وہ شائع نہیں ہوئے۔ ایک قاری بہن نے ٹھیک کہا کہ ہم آپ کے سوتیلے قارئین ہیں جب ہی تو آپ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہیں۔ چاہے رنگا رنگ پھول ہو' میری بیاض ہو یا خاتون کی ڈائری کچھ "مخصوص و خاص" بہنوں کی اجارہ داری قائم ہوتی ہے۔ پلیز قارئین حق کے خلاف آواز اٹھائیں (جیسے ہم نے اٹھائی) تب ہی بات بنے گی۔

ج : ہماری پیاری سوتیلی قاری! حق کے لیے آواز اٹھانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن آپ نے مختصر سے خط میں دو جگہ لکھا کہ حق کے خلاف آواز اٹھائیں گی۔ مرحبا! اتنی بدگمانی وہ بھی ہم سے.... ؟ ناانصافی اور اقربا پروری کی ہمارے ادارے میں کوئی جگہ نہیں۔ کچھ مخصوص بہنوں کے نام اس لیے نظر آتے ہیں کہ کیونکہ ان کا انتخاب معیاری ہوتا ہے اور وقت پر اور بڑی تعداد میں موصول ہوتا ہے۔ اور یہ جو آپ نے ہماری محبت اور دیانت پر شک کیا ہے نا.... اب ہم اس کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ آپ ہمارا ساتھ دیں گی نا؟

ایشا..... ہارون آباد

سب سے پہلے "نمل" کو پڑھا۔ کیا فارس اور زمر کبھی نارمل لائف بھی گزاریں گے۔ اب کی بار گڑبڑ بدتمیز آپی نے کی۔ واقعی یہ ایک بلا ہی ہے جو فارس کے سر پر سوار ہو گئی ہے۔ اس کے بعد دشت جنوں کو پڑھا اس کی یہ قسط پڑھتے ہوئے دل کو دھڑکا لگا رہا کہ اب کوئی آتما نمودار ہوگی کہ اب کوئی چڑیل آئی باقی تمام رسالہ بہترین تھا۔ عتیقہ ایوب کا ناولٹ "بہاریں تیرے سنگ" خط لکھنے کی واحد وجہ ہے' مجھے لگا انہوں نے میری کہانی لکھ ڈالی ہے۔ سچی میں بھی آزاد کشمیر ٹرپ پر گئی۔ ایڈونچر کے شوق میں اپنے کیمپ سے دور چلی گئی ہوش تب آیا جب میرے سامنے لمبے لمبے سینگوں والی ہرن جیسی بلا آگئی بس پھر میں شروع ہوئی چلانے' ہائے مما اوئی مما۔ فرق یہ فاطمہ کی مدد کرنے ایک ڈاکٹر آیا تھا اور میری مدد کرنے ایک کیپٹن آیا۔ لیکن میری لو اسٹوری چلی ہی نہیں' یہ زندگی ناولوں جیسی کیوں نہیں ہوتی۔ پلیز ایسی کوئی اسٹوری لکھیں جس کا ہیرو آرمی میں ہو۔

ج : پیاری ایشا! سچ بتائیں تو آبدار سے اتنی خفا تو زمر بھی نہ ہوگی جتنی آپ تمام قارئین ہو رہی ہیں۔ اتنی پیاری آبدار کو چڑیل جیسے لقب سے نوازنا ظلم نہیں ہے؟ آپ کی معصوم سی خواہش کے جواب میں ہماری دعا ہے کہ اللہ آپ کو بہت پیارا سا' محبت اور خیال رکھنے والا ہیرو عطا فرمائے لیکن جس طرح آپ سوچ رہی ہیں.... اس طرح حقیقی زندگی میں نہیں ہوتا.... اگر ہوتا بھی ہے تو شاذونادر۔ زندگی ناولوں جیسی نہیں ہوتی کیونکہ زندگی کے اسکرپٹ کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور ناول' کہانیاں انسان کی خواہشات کا پرتو ہوتی ہیں زندگی کہانی نہیں' آزمائش ہے۔

فرزانہ مغل..... واہ کینٹ

دشت جنوں میں آئے کٹ بہت ہی اچھی لگتی ہے اور اس نام کے معنی جان کر بھی خوشی ہوئی۔ "گیت پری اور تم" عنیزہ سید ہی ایسا لکھ سکتی ہیں۔ اتنا خوب صورت سرورق بھی بہت پسند آیا تمام بہنوں نے بنت سحر کی تعریف کی ہے اور میں بھی بنت سحر اور فرزانہ کھرل صاحبہ کی تعریف کروں گی۔ یہ دونوں رائٹر بہترین اضافہ ہیں۔ دھنک کے رنگ کے ساتھ عفت سحر طاہر کو پڑھا اور ہنس ہنس کر آنکھوں میں پانی آگیا۔ میں بہت عرصے بعد کھل کر ہنسی ہوں' بہت شکریہ عفت جی' ثمینہ اکرم کے لیے بہت دعا اور سلام وہ بہت بہادر عورت ہیں۔

شاہانہ بلوچ کا خط پڑھ کر عجیب سا لگا۔ خواتین ڈائجسٹ نے اپنا معیار کھو دیا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ میں بھی 1987ء سے پڑھ رہی ہوں۔ نسیم سحر قریشی' ساجدہ حبیب' خالدہ اسد سب بہت یاد آتی ہیں۔ وقت کے ساتھ سب کچھ بدلتا ہے جیسے اب ہمارے والدین ہمارے درمیان نہیں لیکن بچے ہیں۔ زندگی کا وہ دور اپنی جگہ خوب صورت۔ یہ دور اپنی جگہ خوب صورت' یہی حال خواتین ڈائجسٹ کا بھی ہے۔ ان سے کہنا ہے۔ سحر ساجد کا "ابھی وقت باقی ہے" پڑھیں سائرہ رضا کا "محبت داغ کی صورت" اور "خالی آسمان" پڑھیں اور سمیرا احمید کا "محبت من محرم" پڑھیں پھر معیار کی بات کریں۔

ج : فرزانہ! شاہانہ کو اب خواتین اچھا نہیں لگتا تو یہ ان کی رائے اور پسند ہے اور ہر ایک کو اپنی رائے رکھنے کا اور اس کے اظہار کا حق ہے۔ ہم اپنی تمام قارئین کی رائے کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے ہاں مکمل جمہوریت ہے۔ ہر

شخص کھل کر اپنی رائے دے سکتا ہے۔ آپ کو سالگرہ نمبر اچھا لگا.... بہت شکریہ۔

لائبہ..... میر حضرو

میری بہن سوہنی کی وجہ سے ہی گھر میں شعاع خواتین وغیرہ آتے ہیں' ایکچوئلی میں نے آپ سے اک ریکویسٹ کرنی تھی باقی بھی کئی لڑکیاں کہہ چکی ہیں تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ ڈی جے رضوان علی احمد کا انٹرویو پڑھنا چاہوں گی۔ خواتین میں آپ پلیز شامل دیجیے گا اور آپ نے پوچھا تھا کہ وہ کس چینل پہ ہوتے ہیں تو میں بتانا چاہوں گی کہ وہ ایف ایم 101 اسلام آباد سے شو کرتے ہیں اور پی ٹی وی نیوز اینکر بھی ہیں۔

ج : لائبہ! آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

فوزیہ ثمرٹ ہانیہ عمران آمنہ رئیس..... گجرات

خوشبو کہوں ' بادل کہوں ' یا ہوا کہوں
تیرے ہر ہر سلسلے کو میں باد صبا کہوں

معذرت کے ساتھ سرورق کچھ خاص نہیں تھا۔ "کرن کرن روشنی" پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ کتنے چھوٹے چھوٹے گناہ ہیں جو ہم بے خبری میں ہی کر ڈالتے ہیں۔ حالانکہ ان کے عذاب پہاڑوں کے وزن برابر ہوتے ہیں۔ دل کشادہ رکھتے ہیں.... پڑھ کر اچھا لگا سب کے جوابات بہترین تھے۔ مکمل ناول گیت پری اور تم پڑھا۔ عنیزہ سید نام ہی کافی ہے تحریر کے لیے۔ شروع شروع میں ذہن الجھا۔ گیت کون؟ گیتی آرا کون؟ حال ماضی کو ساتھ ساتھ پڑھتے ہوئے کچھ کنفیوز ہوتی ہوں اینڈ اچھا رہا ہر کردار اپنی اپنی جگہ خوش رہا۔ ناولٹ دھنک کے رنگ سارے اف' عفت سحر نے تو ہنسا ہنسا کے مار ڈالا۔ عفت اپنی ہر تحریر میں اپنی بھانجیوں بہنوں کے نام شامل کرتی ہیں مجھے بہت اچھا لگتا ہے' خاص کر چڑیا کا ذکر۔ کسی ۔ دن چکر لگاؤں گی آپ کے گھر۔ جی جناب مجھے آپ کا گھر معلوم ہے۔

بہاریں تیرے سنگ کچھ خاص نہیں لگا۔ افسانوں میں بنت سحر کا افسانہ اے ون لگا۔ مرد کا اتنا جگرا کہاں ہوتا ہے۔ "کوئی رنگ بھر میرے کوزہ گر" وارث شاہ کی شاعری نے تحریر کو چار چاند لگا دیے۔

کنگن نیر کاشف چھوٹی سی تحریر اور بڑا سبق۔ ناول آب حیات عمیرہ احمد آپ کے قلم کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ سالار تو سالار تھا اس کی اولاد بھی اس سے دو ہاتھ آگے ہے۔

ج : پیاری فوزیہ! آپ ہمارے تینوں پرچوں کی باقاعدہ قاری ہیں اور ہر ماہ تفصیلی تبصرہ کرتی ہیں یہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم ہر ماہ آپ کا تبصرہ شامل نہیں کرپاتے لیکن یہ اطمینان دلا دیں کہ ہر ماہ پوری محبت اور توجہ سے آپ کا تبصرہ پڑھتے ہیں۔
سالگرہ نمبر میں ٹائٹل کے سوا آپ کو تمام کہانیاں پسند آئیں۔ بہت شکریہ۔

سحر فاطمہ ' نور فاطمہ..... چک نمبر 254 گ۔ ب' ٹوبہ ٹیک سنگھ

مجھے یہ خط لکھنے پر نمرہ آپی کے ناول "نمل" نے مجبور کیا' خواتین ڈائجسٹ میں سارے سلسلے ہی بہت اچھے ہیں۔ اتنی اتنی پیاری کہانیاں ہوتی ہیں کہ پڑھ کے دل جھوم اٹھتا ہے۔ ہاشم کو تو پھانسی لگوادیں' اس کی خوب صورتی اور شان شوکت کی وجہ سے اسے معاف مت کر دیجیے گا۔ جواہرات کی تو چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیں۔ بات ختم۔ آب حیات بھی بہت پیاری اسٹوری ہے مجھے حمین اور رئیسہ بہت پسند ہیں۔ ایرک بھی بہت اچھا ہے۔ بے چارہ اتنی سی عمر میں عشق کر بیٹھا (حق ہا)۔

ج : پیاری معصوم سی سحر اور نور! جواہرات کی بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا تو دیں مگر یہ تو بتائیں کہ اس کی بوٹیاں بنائے گا کون.... ہاشم کی خوب صورتی کی وجہ سے کوئی جلاد اسے پھانسی لگانے کے لیے تیار ہی نہیں اور آپ کو پتا ہے کہ ہماری قارئین کی اچھی خاصی تعداد ہاشم سے متاثر ہے۔ اوخدا! آپ ہیں تو معصوم سی قاریہ مگر آپ کے خیالات.... اتنے ظالمانہ۔

کومل فاطمہ..... چک ڈھلو نمبر 1

سب سے پہلے "آب حیات" سالار صاحب کیا کم تھے جو حمین صاحب بھی ان کی لائن پہ چل پڑے.... خیر یہ ننھا سالار ہمیں بہت پسند ہے۔ لیکن "نمرہ آپی" اس دفعہ آپ سے ہم شدید ناراض ہیں.... نا'نا'نا یہ ہر گز نہ

سمجھیے گا کہ ہمیں نمل پسند نہیں آیا.... نمل ہمارا سب سے زیادہ پسندیدہ ناول ہے مگر..... زمر کا فارس سے ناراض ہونا.... بلکہ اس پہ شک کر کے اس طرح ری ایکٹ کرنا۔ کیا ساری لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں.... چاہے وہ زمر جیسی ذہین فطین و قابل وکیل ہی کیوں نہ ہوں۔ "دشت جنوں" آمنہ ریاض بہت سسپنس ہے اس ناول میں.... اور آئے کت، منفرا نام بھی بہت منفرد سے ہیں۔ "بنت سحر" کی تحریر زبردست تحریر تھی.... بنت سحر آپ نے جتنے افسانے لکھے ہیں وہ سب کم از کم میرے لیے بہت اثر انگیز

ہیں۔ اس محفل میں آج میرا ایک سوال یہ ہے کہ کیا اردو لغت میں فاسٹ فوڈز کے یہ جو عجیب و غریب نام ہیں ان کا متبادل کوئی نہیں؟ ابھی اس ماہ کے شعاع میں پہلی ترکیب ہاٹ ڈاگ کی دی گئی ہے۔ اسی طرح اور بہت سے ایسے کھانوں کے نام ہیں.... جو پڑھنے میں کسی کھانے کے کم جانوروں کے نام زیادہ لگتے ہیں۔ اور ہم لوگوں کو اندھی تقلید میں ہر جائز ناجائز کو بھول جانا چاہیے.... یا پھر اردو اور عربی لغت میں الفاظ کی اتنی کمی ہے کہ ہم چند کھانوں کو خوب صورت نام نہیں دے سکتے؟

ج : پیاری کومل فاطمہ! ہر خطے کے رہنے والوں کا رہن سہن، لباس، عادات و رسوم، کھانے اور دیگر معاملات زندگی ایک دوسرے سے قطعاً" مختلف ہوتے ہیں اب اگر انگلستان میں جلیبی فروخت ہوتی ہے تو وہاں اس کا نام تبدیل نہیں ہوتا۔ جلیبی وہاں بھی جلیبی ہی رہے گی بس یہی حال ان کے کھانوں کے ناموں کا ہے۔ ہم بھی انہیں تبدیل نہیں کرتے۔ اس میں تقلید کا عنصر کہاں سے آگیا۔ جیسا دیس اور اس کے لوگ ہیں ویسا ہی ان کا کھانا اور ان کے نام ہیں۔ ہم جس دیس کی ڈشز کی تراکیب آپ لوگوں کے لذت کام و دہن کے لیے پیش کرتے ہیں تو ان کا مروجہ نام ہی استعمال کرتے ہیں۔ آپ کو ان ناموں سے کراہیت محسوس ہوتی ہے تو ضرور آپ ان کا نام بدل دیں بلکہ ہمیں بھی لکھ کر بھیج دیں آخر آپ ایک آزاد ملک کی آزاد شہری ہیں۔

جہاں تک شک کی بات ہے تو محبتوں میں تو یہی ہوتا ہے۔ اس میں پڑھی لکھی اور ان پڑھ ایک ہی صف میں نظر آتی ہیں۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بجھوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ
37-اردو بازار کراچی

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- حمیرا
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ---------- موسیٰ رضا

خبریں وبریں

ڈاکٹر صفیہ سہیل

انکشاف

دودھ کے متعلق دو اہم ایسے طبی جائزے سامنے آئے ہیں جن میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ چکنائی والا دودھ ہی زیادہ صحت بخش ہے۔ (ہمارے بڑے بوڑھے تو ہمیشہ سے یہی کہتے آرہے ہیں۔) پورے وثوق کے ساتھ یہ دعوا کیا جارہا ہے کہ جو لوگ بھرپور چکنائی والے دودھ کی اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ ان کا وزن ان لوگوں کے مقابلے میں کم ہوتا ہے جو چکنائی سے پاک دودھ پیتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو ہول ملک (وہ دودھ جس میں سے مکھن نہ نکالا گیا ہو) پیتے ہیں ان میں ذیابیطس کا مرض چھیالیس فیصد کم ہوجاتا ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جو لوفیٹ ملک استعمال کرتے ہیں۔

سنجے دت کو مسلمان ماں کی سزا

اداکار سنجے دت کو سزا مکمل ہونے پر رہا کردیا گیا ہے لیکن سنجے دت نے جو جیل کاٹی ہے اس نے ان کا حلیہ اس قدر بدل دیا ہے کہ اب شاید ہی فلمی دنیا میں وہ کامیاب ہوسکیں۔ رہائی کے بعد ایک ٹی وی پروگرام میں وہ بے حد کمزور اور بوڑھے نظر آئے۔

1993 کے انڈیا میں بم دھماکوں کا سارا ملبہ اس وقت کی حکومت نے پاکستان کی ایجنسی پر دھر دیا تھا۔ جو افراد ان دھماکوں میں ملوث گرفتار تھے وہ سب مسلمان تھے اور ان میں سے ایک گرفتار شدہ فرد کی تصویر عدالت کو فراہم کی گئی جس میں وہ ایک رائفل سنجے دت کے حوالے کررہا ہے۔ جبکہ بعد میں اس فرد نے خود اقرار کیا کہ وہ بھارتی ایجنسی کا آدمی تھا اور ایک فلم میں سائیڈ رول کررہا تھا۔ جس میں ہیرو سنجے دت تھے۔ ایجنسی نے اس سے فلم کے سیٹ پر کہا کہ کسی طرح تم اس کے ہاتھ میں رائفل تھمادو، ہم تصویر لے لیں گے۔ پھر اس طرح ایک ڈرامائی تصویر کو عدالت میں بطور ثبوت پیش کیا گیا جو بعد میں سزا کا سبب بنی۔

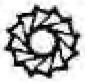
سنجے دت کو یہ سزا صرف اس لیے ملی کہ اس کی ماں فلم اسٹار نرگس مسلمان تھی اور اس نے مرتے ہوئے وصیت کی تھی کہ اس کو جلایا نہ جائے بلکہ دفنایا جائے۔

ناراض

گزشتہ ہفتے کراچی میں ایک فلم کی میوزک لانچنگ اور پریس کانفرنس کے دوران بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہوگئی۔ ہوا کچھ یوں کہ منتظمین نے فلم کا ڈیڑھ منٹ کا ٹریلر دکھایا اور صحافیوں کو سوالات کرنے کی اجازت دے دی کہ وہ فلم کے ہیرو ہیروئن فہد مصطفیٰ اور ایمان علی سے جو چاہے سوال کریں۔ (صحافیوں کو تو اللہ موقع دے) انہوں نے فہد اور ایمان

سے ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ اور وہ کئی طریقوں سے فواد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں ؟ انہیں بولی وڈ فنکاروں سے کم تر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان دنوں بھارتی میڈیا میں یہ خبر گردش کر رہی ہے

کہ "کپور اینڈ سنز" میں فواد کو جو کردار ملا وہ پہلے فرحان اختر' شاہد کپور (فلاپ فلموں والے) اور ادیتیا کپور کو آفر کیا گیا تھا مگر تینوں نے اس کردار کو کرنے سے منع کر دیا تھا کہ یہ کردار ان کے کیریئر کو متاثر کرے گا (اوہ! اس سے پہلے کسی کردار نے ان کے کیریئر کو متاثر نہیں کیا۔) اور ان کے مداح بھی ان کو اس کردار میں پسند نہیں کریں گے۔ (مداحوں نے فواد کو تو بہت پسند کیا ہے اس کردار میں تو آپ۔۔۔؟) کرن جوہر نے بھی فواد خان کو اپنی زیر تکمیل فلم میں مہمان اداکار کے طور پر لیا تھا مگر اب اس فلم میں ان کے کردار کو بڑھا کر مرکزی کر دیا گیا ہے' اس فلم میں فواد کے ساتھ ایشوریا' اور انوشکا شرما بھی ہیں۔ (یعنی لالی وڈ سے صرف فواد ہی بولی وڈ میں اپنے آپ کو منوا سکے)





علی پر تنقیدی سوالات کی بوچھاڑ کر دی' فہد مصطفیٰ تو نہایت تحمل سے تمام سوالات کا جواب دیتے رہے (اپنے پروگرام میں جو لوگوں کی کھنچائی کرتے ہیں وہ کام آگئی ۔ لیکن آخر میں کہہ دیا کہ میں اسی لیے میڈیا کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہوں کہ ہمارے یہاں صحافی صرف تنقیدی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ (فہد! اگر تنقید تعمیری ہو تو آپ کا ہی فائدہ ہے ناں ورنہ جھوٹی تعریف تو۔۔۔؟) ایمان علی سے جب صحافیوں نے ان کے ڈانس کے حوالے سے سوال کیے تو وہ کافی چراغ پا ہوئیں۔ لیکن کہا انہوں نے صرف یہ کہ "آج پتا چلا کہ ہم سے زیادہ صحافی فلم اور ڈانس کی باریکیاں سمجھتے ہیں۔" (ہاہاہا! ایمان! کامیابی کے لیے تنقید کا حوصلہ ضروری ہے اپنے آپ کو بیسٹ سمجھنے سے انجام۔۔۔؟)



کامیابی

فواد خان بولی وڈ میں خانز کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے ہیں۔ ایک کے بعد ایک کامیاب فلم کی وجہ سے بڑے بڑے ایوارڈ ان کو مل رہے ہیں' ان کی کامیابی بولی وڈ کے فنکاروں

بقیہ میر محمد علی

سے کہ وہ کچھ زیادہ ہی نہ موج کرے۔"

"بڑے ہوگئے ہیں... شادی کرلیں... پسند سے کریں گے؟"

"بڑا ہوگیا ہوں... مگر میں سمجھتا ہے کہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا کہ شادی کرلوں... ابھی تھوڑا اور انجوائے کرنا چاہتا ہوں... شادی کے بعد بندہ محدود ہوجاتا ہے۔ اتنا کام بھی نہیں کرسکتا۔ ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں... اور پسند نہ پسند کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ شادی کی طرف میرا رجحان ہی نہیں ہے اور مجھ سے زیادہ پابندیاں برداشت بھی نہیں ہوتیں... اور یہ اللہ کی طرف سے ہی فیصلہ ہوگا کہ کوئی مجھے اچھا لگ جائے..."

"کھانے پینے کا شوق ہے؟... اور خود کو کنگ کرلیتے ہیں؟ کیونکہ آپ گھر سے دور رہتے ہیں؟"

"میں اپنی زندگی بچانے کے لیے بھی کوکنگ نہیں کرسکتا۔ مجھے تو انڈا بوائل کرنا بھی نہیں آتا۔ اور چائے بناتے ہوئے بھی پانچ یا چھ سال ہوگئے ہیں... لیکن اس کے لیے مجھے افسوس بھی ہے اور شرمندہ بھی ہوں کہ یہ ضرور آنا چاہیے... زندگی میں انسان کو سب کچھ آنا چاہیے اور کسی پر انحصار نہیں کرنا چاہیے... اور کھانے پینے کا شوق ہے اور ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو مجھے پسند نہ ہو... ویسے مجھے چٹ پٹی چیزیں یا کھانے زیادہ پسند ہیں، آپ کے کراچی میں پراٹھا رول، چکن چیز رول، ملائی بوٹی، کباب اور باربی کیو میں سب چیزیں اچھی لگتی ہیں... مجھے "دنبے" کا گوشت جو کہ عموماً "لوگوں کو پسند نہیں ہوتا، مجھے بہت پسند ہے... "دنبہ کڑاہی" میں بہت شوق سے کھاتا ہوں... پٹھانوں کے کھانے مجھے بہت پسند ہیں، میٹھا مجھے بہت پسند ہے۔"

"لوگ آسانی سے پہچان لیتے ہیں؟"

"مجھے لوگ آسانی سے نہیں پہچانتے کیونکہ میں زیادہ تر گیٹ اپ میں ہوتا ہوں۔ ہاں کسی کے ساتھ کھڑا ہو کے پانچ دس منٹ بات کرلوں تو پھر وہ بندہ سوچتا ہے کہ اس کو کہاں دیکھا ہے۔ پھر وہ پہچان جاتا ہے۔ ایک دم سے کوئی پہچان جائے ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اور پھر لوگ اتنا پیار دیتے ہیں کہ الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا"

"زندگی میں کس کے احسان مند ہیں؟"

"اپنے والدین کا" اپنے مخلص دوستوں کا اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا احسان مند ہوں کہ جس نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر دیا ہے۔ اور بہت مشکلوں سے بچا کر رکھا ہوا ہے مجھے... جب بھی کوئی مشکل آتی ہے رب سے دعا کرتا ہوں اور وہ مجھے بچالیتا ہے۔ میرے اندر کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"چلتے چلتے کسی کے لیے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"یہ کہنا چاہوں گا کہ جو بچے اور نوجوان یونیورسٹیز یا کالج سے فارغ ہورہے ہیں وہ لوگ اپنے "کردار" کا بہت خیال رکھیں۔ اس پر آنچ نہ آنے دیں... میں نے زندگی میں کبھی بھی کسی برے انسان کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ ذلیل و خوار ہوتا ہے... کچھ لوگ شروع سے ہی ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ اوپر تک (شہرت کی بلندیوں) لے جاکر نیچے پھینکتا ہے... اور برے کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ تو پیغام میرا یہ ہے کہ ایک تو اپنے کردار کی حفاظت کریں اور دوسری بات یہ کہ "نماز" پڑھیں... تو اللہ تعالیٰ آپ کی خود حفاظت کرے گا اور آپ پر آنے والی مشکلیں ٹل جائیں گی... آپ "مٹی" میں ہاتھ ڈالیں گے تو وہ بھی ان شاء اللہ سونا بن جائے گی... باقی زندگی میں اونچ نیچ۔ خوشی غم تو آتے ہی رہتے ہیں۔ اور آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ جب کوئی مجھ سے انٹرویو کی بات کرتا ہے تو مجھے حیرانی ہوتی ہے کیونکہ مجھے میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ میرے نزدیک ایک عام انسان بھی مجھ سے اچھا ہوگا... آپ بے شک ملاقات کرکے دیکھ لیں۔"

"میر محمد علی" کو میں نے جتنا عجز و انکساری میں ڈوبا ہوا دیکھا ہے۔ کسی کو نہیں دیکھا اور شاید وہ اس کا پھل کھا رہا ہے۔ کیونکہ عجز و انکساری اللہ کو بھی بہت پسند ہے۔

آپ کا باورچی خانہ

حنا گل

آکہ تیرے دم سے ہیں "کچن" کی رونقیں۔

آگئے ہیں جی آگئے ہیں' آپ بلائیں ہم نہ آئیں' کیا بات کرو ہو اور ویسے بھی ہم اس نظریے کے قائل ہیں کہ ہر اس بندۂ خدا کو "سلسلہ کچن" میں شرکت کا حق ہے جو "پکانا" نہ سہی "کھانا" ضرور جانتا ہو۔ موخر الذکر میں تو ہم طاق ہیں ہی۔ اول الذکر میں کھلاڑی نہ سہی' اناڑی بھی ہرگز نہیں ہیں۔ یہ الگ بات کہ اس اناڑی پن کے ہاتھوں کچن سے اکثر "دھماکے" سنائی دیتے ہیں۔ جو کبھی تو گلاب جامن پھٹنے کے ہوتے ہیں' تو کبھی امی کے "عزیز از جان" سیٹ کے زمین بوس ہونے کے۔ خیر ایٹم بم کی تیاری بھی تو دھماکوں سے مکمل ہوتی ہے نا۔ یہ تو پھر اپنی منی سی ڈش ہوتی ہے۔ (سو لگے رہو بھائی!) اس سارے میں پس منظر میں موسیقی کے طور پر کچن سلیب پر برابر طبلہ بھی بجتا ہے۔ (جانے کون بجاتا ہے' حیرت ہے۔)

1 کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند' غذائیت یا گھر والوں کی صحت۔

ج ۔ غذا اور غذائیت؟ یہ جڑواں ہیں کیا۔ (آہم) غذا بنے امی کے مشاق ہاتھوں سے تو غذائیت کھنچتی چلی آئے گی اور کبھی جو ہم ترنگ میں آکر اپنی ریسپی بک سے کوئی نئی نویلی ڈش تیار کریں اور سب کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد ایک ایک سے پوچھتے پھریں۔۔۔ "کیسی تھی؟" پتا نہیں چل سکا۔ بھائی کا تبصرہ' ہم صدمے سے چور "نہیں جی؟" ادھر کمال بے نیازی "ہاں جی" لیکن ہم بھی ٹھہرے دھن کے پکے' اگلی ڈش تک تازہ دم ہو کر "کل کی طرح بلند ہیں سب حوصلے میرے۔" گنگناتے ہوئے چٹکیاں بجاتے' بڑی شان سے کچن کا رخ کرتے ہیں۔ (ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار۔۔۔) اتنا بھی اناڑی نہ ۔۔۔ سمجھیے گا۔ اکثر اوقات تجربہ کامیاب ہی رہتا ہے۔

2 ۔ کھانے کا وقت ہے۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں' کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کرکے تواضع کرسکیں۔

ج ۔ مہمان؟ مان نہ مان۔۔۔ ارے نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ آئیے آئیے ضرور آئیے۔ ہم ہیں چشم براہ۔ پھر ہو جب چکن ککڑکوں' تو کاہے کی فکر۔۔۔ سو نعرہ لگایئے مل کر۔۔۔ چکن زندہ باد۔۔۔ امی جان پائندہ باد۔۔۔

3 ۔ کچن خاتون خانہ کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج ۔ کچن کی صفائی؟ مراد اگر کسی ڈش کی تیاری کے بعد صفائی ہو تو کمر کس کہ فوراً" ہی جت جاتے ہیں' کیونکہ ڈش کی تیاری کے بعد تو کچن' کچن کم پانی پت کا میدان زیادہ لگتا ہے۔ لہٰذا دھڑکا رہتا ہے کوئی اللہ کا بندہ جھانک کے دل چھوڑ بیٹھے تو ناحق ستم ہوگا' ہاں تفصیلی صفائی میں موڈ ذرا ستاتا ہے۔ کبھی تو کسلمندی سے بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں اور کسی دن پھر یکبارگی جوش میں آکر الف سے ی بس ہوجائے صفائی اور پھر لش پش کچن کو دیکھ دیکھ گنگناتے ہیں۔ "دیکھا جو چہرا تیرا۔۔۔"

4 ۔ صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں۔ ایسی خصوصی ڈش جو آپ بہت اچھی بناتی ہیں؟

ج ۔ ناشتا؟ سن رکھا ہے کہیں کہ ناشتا بادشاہوں والا کرنا چاہیے۔ پر اللہ لوک ہیں جی! چائے' پراٹھا' آملیٹ سے کام چل جاتا ہے اور نہیں تو حلوہ بھی ملالو۔ فی الحال تو پراٹھے کی ایک ہی قسم پر اکتفا کرلیتے ہیں۔ انتظار میں ہیں کہ کبھی سری لنکا کا جغرافیہ بدل جائے تو شاید ہماری روٹی کا ناک نقشہ بھی سنور جائے۔ خیر قسم قسم کے پراٹھے آپوں آپ بنیں گے۔ (آہو جی) بس

اک ذرا انتظار۔ ویسے امی مکئی کی روٹی بھی بہت عمدہ بناتی ہیں' جی ہاں ناشتے میں' جو بہت ٹیٹی' کراری اور خستہ ہوتی ہے۔ (ترکیبیں پوچھ کے شرمندہ نہ کریں جی! ابھی تو پریکٹیکل میں اونگی بونگی ترکیبیں چلتی رہتی ہیں' کسی دن طاق ہوگئے نا تو وعدہ' بتائیں گے۔)

5 - مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھاتی ہیں؟

ج - باہر کھانا؟ او' کی پچھ لیا اے جی! جب ہو نصیب عروج پر' جیب بھی پھولی پھولی' ساتھ جن بھوتوں کی ٹولی' تے چھڈو جی کی کرنا اے باہر جاکے' ارینج ہوجائے پارٹی' گھر میں ہی فائیو اسٹار کی گارنٹی کے ساتھ' تو بس پھر موجاں ہی موجاں! ویسے اپنے علاقے سے کہیں باہر جانا ہو تو "حسب مزہ" ہوٹلنگ بھی ہوتی رہتی ہے۔

6 - پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

موسم ہو بارش کا' تو یاد تمہاری آتی ہے۔ کس کی؟ ہاں جی پکوڑے۔ گرما گرم پکوڑے' ساتھ میں بھاپ اڑاتی چائے' پھر برستی بارش کی بوچھاڑ ہو اور ابو کے ہاتھ کا حلوہ نہ ہو... ناممکن' تو بس پھر غدر مچا ہی مچا کہ "گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں..." ویسے میں ایک خاص قسم کے اسپیشل پکوڑے بڑی "کامیابی" سے بناتی ہوں' آپ بھی ٹرائی کریں' بارش میں خوب مزہ دیں گے۔

اسپیشل پکوڑے

اجزا :

بیسن	ایک پاؤ
پالک (باریک کٹا ہوا)	آدھی گٹھی
ثابت دھنیا	ایک مٹھی
آلو' پیاز' ٹماٹر' ہری مرچ (باریک کٹے ہوئے)	سب دو عدد
گوشت (ابلا ہوا)	ریشے بنالیں
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

بیسن گھول کر گوشت سمیت تمام اجزا اس میں ملالیں۔ نمک اور سرخ مرچ بھی ڈال دیں۔ اب تیل کو ایک کڑاہی میں گرم کریں۔ گرم ہونے پر پکوڑے ڈالنا شروع کردیں۔ براؤن ہونے تک الٹتے پلٹتے رہیں۔ دونوں طرف سے تل جائیں تو۔ پیپر پر نکال لیں اور مزے اڑائیں۔ (یقین کریں سواد آجائے گا۔)

7 - کوئی ٹپ؟ (خیر نال زبیدہ آپا ابھی زندہ ہیں جی!) چلیں بتاتے ہیں۔

اگر ہاتھ جل جائے یا اس پر بھاپ لگ جائے اور فوری طور پر گھر میں کوئی دوا میسر نہ ہو تو اس کا بہترین حل یہ ہے کہ فوراً" آلو کدوکش کرکے لگالیں' جلن سے افاقہ ہوگا۔



سانحہ ارتحال

ہماری اور قارئین کی پسندیدہ مصنفہ بہن نبیلہ عزیز کی پھوپھی طویل علالت کے بعد انتقال کرگئیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

نبیلہ عزیز نے بہت دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ ان کی خدمت کی۔ وہ ان کی ساس بھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے۔ نبیلہ عزیز اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل سے نوازے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ نبیلہ عزیز کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے بھی مغفرت کی دعا کی درخواست ہے۔

شام کی چائے پر

خالدہ جیلانی

شام کی چائے پر

شام کی چائے پر عموماً" گھر کے تمام افراد موجود ہوتے ہیں دن بھر کے تھکے ہارے لوگ جب شام میں گھر لوٹتے ہیں اور ایسے میں کچھ مہمان بھی آجائیں تو شام کی چائے پر خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ کچھ ایسی مزے دار چیزیں بنائی جائیں جو معمول سے الگ ہوں تاکہ شام کی چائے کی رونق دوبالا ہو جائے۔ اسی خیال کے پیش نظر ہم نے کچھ ترکیبیں منتخب کی ہیں یقیناً" آپ کو بھی پسند آئیں گی۔

پاپاؤ...

ضروری اشیاء :

چکن کا قیمہ	ایک پاؤ
پیاز	تین عدد
لہسن کے جوے	تین عدد
نمک	حسب ذائقہ
کٹی سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
اویسٹر سوس	ایک کھانے کا چمچہ
میدہ	دو کپ
نمک	حسب ذائقہ
چینی	آدھا چائے کا چمچہ
گھی	دو کھانے کے چمچے
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ساس پین میں دو کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر نرم کرلیں کٹا لہسن اور قیمہ ڈال کر ساتھ بھون لیں۔ قیمہ گل جائے تو نمک' سیاہ مرچ' اویسٹر ساس پلیٹ میں نکال کر ٹھنڈا کرلیں۔

میدے میں نمک' چینی اور گھی ملالیں اور پانی سے سخت آٹا گوندھ لیں اور ڈھک کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ روٹی بیل لیں اور چوکور ٹکڑے کاٹ کر ان پر قیمہ رکھیں اور دوسرا ٹکڑا اس پر رکھ کر کنارے دبادیں اور گرم تیل میں تل لیں اور ٹرائنگل کاٹ کر سرونگ ڈش میں رکھیں۔ کیچپ یا چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

آلو' مٹر اور ڈبل روٹی کے سینڈوچ

ضروری اشیاء :

بریڈ سلائس	بیس عدد (گولائی میں کاٹ لیں)

بھرنے کے لیے :

آلو	دو عدد
مٹر	آدھا کپ
ہرا دھنیا	ایک چوتھائی کپ
چاٹ مصالحہ	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک' مرچ کا پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
اچور پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ٹاپنگ کے لیے :

دہی	دو کپ
میٹھی چٹنی	حسب ضرورت
ہرا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ

مسالے کے لیے :

کالا نمک	آدھا چائے کا چمچہ
پسا ہوا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
لال پسی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب :

آلو (ابال کر میش کرلیں) مٹر (ابلے ہوئے) ہرا دھنیا' چاٹ مسالا' ادرک' مرچ کا پیسٹ' پسا ہوا زیرہ' امچور پاؤڈر اور نمک کو اچھی طرح ملا کر ڈبل روٹی کے گول ٹکڑوں سے ذرا چھوٹے کباب بنالیں۔

اب ڈبل روٹی کے ایک گول حصے پر ایک کباب رکھ کر دوسرا حصہ رکھیں۔ اور سینڈوچ کے کنارے پانی سے اچھی طرح چپکادیں۔ تمام سینڈوچ اسی طرح تیار کرلیں۔ اب ان سینڈوچز کو سرونگ پلیٹ میں رکھ دیں۔ اب ان سینڈوچز کے اوپر دہی' میٹھی چٹنی اور ہرا دھنیا ڈال دیں۔ اس کے بعد کالا نمک' زیرہ پسا ہوا اور پسی لال مرچ ایک ساتھ ملا کر چھڑک دیں۔

پوری پراٹھا رول

ضروری اشیاء :

گوشت (بون لیس)	آدھا کلو (نمک ڈال کر ابال کر چل لیں)
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ایک چوتھائی کپ
پسا ہوا ادرک' لہسن	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

پراٹھے کے لیے :

میدہ	ایک کپ
چاول کا آٹا	دو کھانے کے چمچے
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

پین میں تیل گرم کرکے گوشت' کٹی لال مرچ' دہی' پسا ہوا ادرک' لہسن' کٹا ہوا زیرہ اور نمک ڈال کر بھون لیں۔ پانی خشک ہوجائے تو چولہے سے اتارلیں۔

پیالے میں میدہ' چاول کا آٹا' نمک اور کارن فلور ڈال کر ملالیں' پھر حسب ضرورت پانی سے سخت آٹا گوندھ لیں۔ پیڑے بنا کر آدھا گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

کڑاہی میں تیل گرم کریں اور پیڑوں کی پوریاں بنا کر تل لیں۔ سنہری ہوجائیں تو پلیٹ میں نکال کر گوشت کا آمیزہ رکھ کر رول کی شکل میں لپیٹ دیں۔ پلیٹ میں نکال کر کیچپ کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

کلر فل کریمی فروٹ کاک ٹیل

آم	دو عدد
کیلے	چار عدد
گرین اور ریڈ جیلی	ایک' ایک پیکٹ
رنگین سویاں	ایک کپ
فریش کریم	دو پیکٹ

آم چھیل کر اس کے چھوٹے چھوٹے کیوب کاٹ لیں۔ کیلے کے سلائس کاٹ لیں۔ جیلی کو پیکٹ پر دی گئی ہدایت کے مطابق تیار کرکے جمالیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے کیوب کاٹ لیں۔

رنگین سویاں ابال کر چھلنی میں ڈال کر چھان لیں۔ فریش کریم کو اچھی طرح پھینٹ کر فریج میں رکھ کر پہلے سے ٹھنڈا کرلیں۔

سرونگ گلاس یا باؤل میں تھوڑی جیلی ڈال کر اس کے اوپر تھوڑی رنگین سویاں اور گرین جیلی ڈال کر آم اور کیلے ڈال دیں۔ اسی طرح ایک اور تہہ لگا کر اوپر سے فریش کریم ڈال دیں۔ آخر میں آم اور کیلے سے سجالیں۔ فریج میں رکھ کر خوب ٹھنڈا کریں اور مزے سے کھائیں۔

گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے، کئی اتار چڑھاؤ دیکھے، لیکن قافلۂ شوق رکنے نہیں پایا۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا، ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے، ان کی تحریروں میں عہد حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے ساتھ ساتھ شگفتگی، دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے، یہی وجہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔

فطری بات ہے، ہم جن کو پسند کرتے ہیں، جن سے لگاؤ رکھتے ہیں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں، ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں، ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔ اس لیے ہم نے مصنفین کے لیے ایک سروے ترتیب دیا ہے۔ جس کے سوالات یہ ہیں۔

س 1۔ لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت سے منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

س 2۔ آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے؟

س 3۔ آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو؟ اب تک جو لکھا ہے، اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟۔

س 4۔ اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟۔

س 5۔ اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں، مصنفین نے ان کے سوالات کیا جوابات دیے ہیں۔

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

سعدیہ رئیس

سب سے پہلے تو خواتین ڈائجسٹ کو میری طرف سے سالگرہ کی دلی مبارک باد۔ اس سے بڑھ کر خوشی اس بات کی ہے کہ اس خوشی کے موقع پر مجھے بھی شامل کیا گیا۔ سروے کے جوابات حاضر ہیں۔

1 ۔ میری لکھنے کی صلاحیت اور شوق قدرتی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں گاڈ گفٹڈ تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ لکھنے کے ساتھ مجھے پڑھنے کا بھی بے حد جنون تھا۔ میرے ہاتھ جو بھی کتاب لگتی اسے ضرور پڑھتی تھی۔ لکھنے کی تحریک اسکول سے ملی۔ جب اسکول میگزین کے لیے ایک مضمون لکھا اور وہ شائع بھی ہو گیا۔ اس کے بعد وقتاً "فوقتاً" دیگر کوششیں جاری رہیں۔ جس روز میرا پہلا افسانہ "بابل کی چڑیاں" شعاع میں شائع ہوا، اس روز مجھے یقین آگیا کہ ہاں جی میں بھی ایک مصنفہ ہوں۔ نہیں جناب میرے علاوہ کسی بھی بہن بھائی کو لکھنے کا شوق نہیں، بلکہ آج کی نسل تو کتابیں چھوڑ کر کمپیوٹر کی دنیا میں گم ہے۔

2 ۔ گھر میں تو خیر ہے، میرے بچوں کو اس بات کی بہت خوشی ہے کہ ہماری امی لکھتی ہیں اور خاندان بھر

میں خود بخود ہی سب طرف ڈنکا بج گیا' پتا نہیں کیسے۔۔۔ بہر حال مثبت اور منفی دونوں ہی طرح کی رائے میرے کانوں میں پڑتی رہتی ہے' مگر زیادہ تر مثبت اور اچھی رائے ہی ہے۔ خاندان والوں کو اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارے خاندان میں سے بھی کوئی مصنف نکلا۔۔۔ زیادہ تر میری کہانیوں کو پسندیدگی کی سند ہی ملتی ہے اور جو کہانی زیادہ پسند آجاتی ہے اس پر تبصرہ بھی ہوتا ہے۔ کچھ روز پہلے ہی کسی نے تبصرہ کیا کہ آج کل بہت اچھا لکھ رہی ہو۔ کوئی کہتا ہے آخر کہاں سے آجاتی ہیں تمہارے ذہن میں کہانیاں' بس اسی قسم کی بہت سی باتیں۔۔۔

3 ۔ میری کوئی ایسی کہانی۔۔۔؟ سوچنے دیں ذرا۔۔۔ اول تو یہ کہ میں نے اتنا زیادہ نہیں لکھا اور میری نظر میں ایسا کچھ خاص بھی نہیں لکھا' میں اس سے بھی بہتر لکھنا چاہتی ہوں۔ بہت سے ادھورے پلاٹ ذہن میں ہیں' مگر قلم بند نہیں کرپارہی۔ کچھ خیالات تو یوں اچانک وارد ہوتے ہیں کہ جھٹ پٹ کاغذ قلم سنبھال کر فورا" ایک کہانی تیار ہوجاتی ہے۔ اپنی ہر تحریر شائع ہونے کے بعد اور زیادہ اچھی لگتی ہے۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی کچھ نہ کچھ کمی بیشی خود ہی محسوس ہوتی ہے اور کچھ تحریریں ایک دم پرفیکٹ لگتی ہیں۔ مجھے اپنی کہانیوں میں "محبتوں کی امانتیں" اور "آہٹوں کی تلاش میں" بے حد پسند ہیں۔

4 ۔ مجھے زیادہ تر وہ تحریریں پسند آتی ہیں جن میں بے ساختگی' روانی اور سلاست کے ساتھ ادب کی چاشنی بھی ہو۔ پیچیدہ اور الجھی تحریروں میں سپاٹ پن زیادہ ہوتا ہے جو ذہن کو ہلکا پھلکا کرنے کے بجائے مزید بوجھل کردیتا ہے۔ ویسے تو خواتین ڈائجسٹ کی سب ہی مصنفین اچھا لکھتی ہیں' مگر پچھلے دنوں صائمہ اکرم کی دیمک زدہ محبت نے محفل ہی لوٹ لی۔ اس کے علاوہ سمیرا حمید' سائرہ رضا' فرحت اشتیاق اور نایاب جیلانی بہت شان دار لکھتی ہیں کہ کہانی کے سحر میں قاری جکڑ کر رہ جاتا ہے۔

5 ۔ پسندیدہ اقتباس یا شعر۔۔۔ بشریٰ رحمن کے ناول پیار پریم اور پردیس کا اقتباس ہے۔

"آج سیٹرڈے نائٹ تھی۔ نیچے سوئمنگ پول کے نیلے پانیوں پر رنگ برنگے بلب روشن تھے۔ جنونی قسم کی موسیقی کا تیز شور کانوں کے پردے پھاڑے دے رہا تھا اور اس شور میں بس دیوانوں کا ایک غول دھماچوکڑی مچا رہا تھا۔ جیسے جنگل کا زمانہ ہو' کچھ گا رہے ہوں' کچھ ناچ رہے ہوں' کچھ بجا رہے ہوں' کچھ پی رہے ہوں' کچھ پلا رہے ہوں۔ رنگ برنگی روشنیوں میں تھرکتے سائے عجیب سماں باندھ رہے تھے۔ تہذیب کی پوری تاریخ مرتب کرلینے کے باوجود انسان لوٹ کر اپنی ابتدا کی جانب جانا چاہتا ہے۔ اس کے مزاج کو تعلیم' تہذیب' تنظیم اور تکمیل راس نہیں آتی۔"



اعتذار

عمیرہ احمد اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس ماہ "آب حیات" کی قسط نہیں لکھ سکیں' اس بنا پر "آب حیات" کی قسط اس ماہ شامل اشاعت نہیں' آئندہ ماہ آپ "آب حیات" کی قسط پڑھ سکیں گی' ان شاء اللہ۔

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

س۔ پھول نگر

س:۔ میرے گھر والوں نے میرا رشتہ طے کیا ہے ایسی جگہ پر جہاں میں بالکل بھی خوش نہیں ہوں' ابو بھی ناخوش ہیں' دو بہن بھائی خوش ہیں اور دو ناخوش ہیں۔ یہ رشتہ صرف امی طے کر رہی ہیں۔ اپنی بہن کے گھر جذبات میں آکر۔ ورنہ دلی طور پر مجھے وہ بھی خوش نہیں لگتیں کیونکہ میرا کزن بالکل ان پڑھ ہے۔ اسکول تو کیا قرآن تک نہیں پڑھا ہوا۔ اس کے گھر میں کوئی بھی پڑھا لکھا نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ نشہ کرتا ہے سگریٹ' شراب' بیڑی سب کچھ' اور پان تو اتنے زیادہ ابھی سے کھا چکا ہے کہ اس کے منہ میں دانت تو نظر ہی نہیں آتے۔ جاب بھی کوئی اچھی نہیں کرتا۔ کبھی اپنے ددھیال والوں کے ساتھ گنے کے کھیت میں مزدوری تو کبھی کسی فیکٹری میں۔ وہ لوگ کرایے کے گھر میں رہتے ہیں۔ میرے گھر والوں کے کہنے پر قسطوں میں ایک پلاٹ خریدا ہے وہ بھی ایسی جگہ کہ جہاں بجلی تک کی سہولت نہیں ہے۔ آگے آپ خود اندازہ لگالیں۔ بھائی میں نے ابھی پچھلے سال ایف اے کیا ہے اور اب کمپیوٹر کا ڈپلوما کر رہی ہوں' میری پوری فیملی ویل ایجوکیٹڈ اور ویل سٹیلڈ ہے۔ میرا گھر بہترین گھرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ میرے اتنے اچھے رشتے آنے کے باوجود امی نے خالہ کی طرف بات طے کردی۔ اپنے بیگانے جس نے بھی اس رشتے کا سنا' سب نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا' جس کی وجہ سے خالہ نے امی سے کہا ہے کہ ہم لوگ ابھی نکاح کر لیتے ہیں۔ رخصتی بعد میں۔ میں نے اپنی امی سے بھی بات کی ہے' لیکن وہ نہیں مانیں۔ اب آپ مجھے بتائیں میں ایسی جگہ پر کیسے شادی کر سکتی ہوں۔

ج:۔ یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے کہ والدین اپنے رشتوں کو بچانے کے لیے اولاد کی قربانی دے دیتے ہیں' جبکہ وہ اپنی زندگی گزار چکے ہوتے ہیں اور اولاد کے سامنے پوری زندگی ہوتی ہے۔ آپ کی والدہ اپنی زندگی گزار چکی ہیں جبکہ آپ کے سامنے ابھی پوری زندگی ہے۔ وہ لڑکا کسی طور آپ کے قابل نہیں ہے۔ اس کے پاس تعلیم ہے نہ جاب' اگر اسے نظرانداز بھی کردیا جائے تو سب سے بڑا مسئلہ نشہ کی عادت ہے۔ نشہ ایک ایسی عادت ہے جو گھر برباد کردیتا ہے۔ اور مشکل سے ہی چھوٹتا ہے۔ ویسے بھی جب آپ وہاں شادی نہیں کرنا چاہتیں اور اس کی جائز وجوہات بھی ہیں تو یہ شادی کرنا ٹھیک نہیں۔ شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔ اور لڑکے کا ہم پلہ ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ شرعی مسئلہ بھی ہے جب تک لڑکی رضامند نہ ہو' نکاح جائز نہیں۔

آپ کی والدہ کی آنکھوں پر بہن اور بھانجے کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ انہیں کچھ نظر نہیں آرہا ہے' آپ اپنے بہن بھائیوں اور والد سے بات کریں ممکن ہے آپ کی والدہ جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کریں۔ بھوک ہڑتال وغیرہ کی دھمکی دیں' لیکن آپ اس طرح کے جذباتی دباؤ میں نہ آئیں۔ کیونکہ ساری زندگی کے رونے سے بہتر ہے کہ ابھی جی کڑا کرکے فیصلہ کرلیا جائے۔ اس مسئلے پر آپ کے والد کی خاموشی ناقابل فہم ہی نہیں مجرمانہ بھی ہے' انہیں اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے قدم اٹھانا چاہیے۔ جبکہ وہ اس رشتے سے مطمئن بھی نہیں ہیں۔

عموماً" لوگ آج کی نسل کو الزام دیتے ہیں کہ وہ نافرمان ہے۔ والدین کا کہا نہیں مانتی' ان کا احترام نہیں کرتی' لیکن والدین کو بھی سوچنا چاہیے کہ اپنی اولاد کی بہبود ہر رشتے اور تعلق سے زیادہ اہم ہے۔ اپنی اولاد کو اپنی بے جا ضد اور انا پر قربان کرکے اس کی پوری زندگی تباہ نہیں کرنا چاہیے۔

م۔ک۔بسم اللہ پور

اچھی بہن! مرگی اب کوئی ایسا مرض نہیں رہا جس کا علاج نہ ہو سکے۔ بہت سے مرگی کے مریض زندگی کے تمام کام بخوبی انجام دیتے ہیں۔ میٹرک نہ کرنے کی وجہ مرگی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ اس کا پڑھائی کی جانب رجحان نہ ہونا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اسے کوئی ہنر سکھاتیں جس سے وہ مصروف بھی رہتا اور آمدنی کا کوئی ذریعہ بھی ہوتا۔ ذہنی طور پر وہ بالکل صحیح ہے اسے نفسیاتی علاج سے زیادہ مصروفیت کی ضرورت ہے۔ آپ اسے کوئی ہنر سکھائیں' اسے گھر سے باہر لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کی اجازت دیں۔ اس طرح اس کا اعتماد بحال ہوگا۔ فارغ بیٹھنے سے تو اچھے بھلے بندے کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔

ع۔گوجرانوالہ

چوبیس سال پہلے ہماری امی نے تکلیفوں کے باعث اپنے سسرال کا گھر چھوڑا تھا۔ ماموں برداشت نہیں کر سکے تو ہمیں اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے باپ نے ہمارا خیال نہیں رکھا اور ہمارے حقوق و فرائض ادا نہیں کیے۔ نہ ہمارے لیے کماتے ہیں اور نہ ہی ہمیں وراثت سے اپنا شرعی حصہ لے کر دیا آج تک' ہم چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ بھائیوں نے ٹھوکریں کھا کر جیسے ہو سکا کچھ تعلیم حاصل کی اور روزگار کی تلاش میں آج تک لگے ہیں' لیکن دو بھائی کماتے رہے' ہمیشہ اور باقی بھائیوں کو کام نہیں ملتا تھا نہ شادیاں ہی ہوتی ہیں اور نہ ہی رشتہ ملتا ہے۔ نانا ابو کی طرف سے امی کو گھر ملا تھا تو ابو نے باہر جانے کے لیے وہ بھی بیچ دیا۔ ہمارے ددھیال والے ان کے کان آج تک بھرتے ہیں کہ تم لوگوں نے یہاں سے جا کر اچھا نہیں کیا۔ باپ کی وجہ سے ہم ماموں کے گھر ان کے محتاج رہے پھر ماموں کی باتوں کی وجہ سے کرایے کے گھر میں نانا ابو کے کہنے پر اٹھ آئے اور آج تک اپنا مکان نہیں بنا سکے جس کی وجہ سے رشتوں میں مسائل کا سامنا ہے۔ ہمارے خالو نے بھائی کے ساتھ کام کے سلسلے میں زیادتی جس کی وجہ سے ہماری ناراضی ہو گئی ابو بولے تک نہیں' الٹا ماموں نے ان خالو صاحب کا ساتھ دیا ہمارے یہ رشتے بھی گئے۔ پانچ چھ سال ہو گئے ہیں' ناراضی ختم نہیں ہوئی نہ ہمارا ننھیال رہا نہ ہی ددھیال۔ ہم آج سارے جہاں میں اکیلے ہو گئے ہیں' نہ کوئی ہمارے گھر آئے نہ ہم کہیں جائیں۔ کیا ہم ہی برے نصیب لکھوا کر دنیا میں آئے ہیں کہ ہمارے حصے میں کوئی چھوٹی سی خوشی بھی نہ آئے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے ہم پاگل ہو جائیں گے۔

ج:۔ عائشہ بہن! جو کچھ آپ نے لکھا' حد درجہ افسوس ناک ہے۔ آپ کے والد جیسے لوگ دراصل شادی کی ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں ہوتے' گھر والے ان کی شادی کرتے ہیں اور ایک لڑکی کو بیاہ کر لاتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ ان کے بیوی بچوں کی ذمہ داری بھی اٹھائیں۔ ننھیال والوں نے تو پھر بھی آپ کا جتنا ہو سکا' ساتھ نبھایا۔ ماموں کا احسان ہے کہ انہوں نے دس بچوں کے ساتھ بہن کو گھر میں رکھا۔ آپ کی والدہ نے سسرال کا گھر چھوڑا تو انہیں — یہ سوچنا چاہیے تھا کہ ماموں پر اتنا بوجھ ڈالنا مناسب ہے یا نہیں۔ دس بچوں کی ذمہ داری آپ کی والدہ کے سر پر آپڑی۔ وہ آپ لوگوں کو نہ تعلیم دلوا سکیں نہ ہی کوئی ہنر سکھایا۔ بہرحال والد صاحب کا تو اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ماموں آپ کو کچھ کہتے ہیں یا خالو سے کوئی بات ہوئی تھی تو آپ کو برا نہیں ماننا چاہیے تھا۔ کچھ بھی سہی' انہوں نے کم یا زیادہ آپ کا خیال تو رکھا۔ آج کے دور میں جبکہ اپنے بچوں کی ذمہ داری اٹھانا مشکل ہے۔ بہن کے بچوں کا خیال کون رکھتا ہے۔ ویسے بھی آپ کے جو حالات ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کچھ رشتہ داروں کو آپ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ آپ جس طرح بھی ہو' ان سے بنا کر رکھیں تاکہ آپ کی تنہائی کا احساس ختم ہو سکے۔ خاموشی سے سہ لینے میں ہی عافیت ہے۔

آپ بہنیں ہمت کریں۔ اپنے آس پاس نظر ڈالیں' تعلیم حاصل نہیں کی کوئی ہنر تو سیکھ سکتی ہیں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ ہوگا تو آپ کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ بھائیوں کو بھی سمجھائیں۔ باپ نے ساری زندگی کچھ نہیں کیا تو اب ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ انہیں کچھ کہنا بے کار ہے۔ ماں بھی سمجھ دار نہیں تھیں۔ جو کچھ کرنا ہے۔ اب آپ لوگوں نے خود کرنا ہے۔ سنجیدگی سے بیٹھ کر سوچیں' کیا کیا جا سکتا ہے۔

امت الصبور

بیوٹی بکس



ہفتے میں ایک مرتبہ ایک انڈے کی سفیدی میں ایک چمچہ لیموں کا رس اور آدھا چمچہ شہد ملا کر چہرے پر لگائیں اور بیس منٹ بعد صاف پانی سے منہ دھولیں۔

چہرے کے کیلوں کے لیے ہفتہ میں ایک مرتبہ بھاپ لیں۔ کیل نرم پڑجائیں گے، ہلکے سے دبا کر نکال لیں اور چہرے پر برف سے ٹکور کریں۔

فاطمہ.... لاہور

س ۔ میری عمر 16 سال ہے۔ میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرا قد پانچ فٹ اور چار انچ ہے۔ میں اپنا قد ایک فٹ بڑھانا چاہتی ہوں۔ مہربانی کرکے اس کا کوئی حل بتایئے اور جو اخبار میں ہر روز آتا ہے کہ چھوٹے قد والے یہ دوائی کھائیں۔ ان کا قد بڑھ جائے گا۔ ایسی دوائیں کھانے سے کوئی نقصان تو نہیں ہوتا۔

دوسرا مسئلہ میرا یہ ہے کہ میری گردن بہت جلد گندی ہوجاتی ہے۔ گردن اور پاؤں صاف کرنے کا کوئی طریقہ بتایئے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا وزن چالیس کلو کے قریب ہے۔ میں اپنا وزن تھوڑا کم کرنا چاہتی ہوں اور کولہے بھی میرے بہت بڑھ گئے ہیں' انہیں چھوٹا کرنے کی کوئی ورزش بتائیں۔

ج ۔ فاطمہ بہن! شاید آپ غلطی سے چار فٹ کے بجائے پانچ فٹ لکھ گئی ہیں۔ اگر آپ کا قد چھوٹا بھی ہے تو اشتہاری دوائیاں ہرگز استعمال نہ کریں۔ ان کے نقصان دہ اثرات ہوسکتے ہیں کیونکہ قد بڑھانے کی کوئی بھی دوا ایجاد نہیں ہوئی ہے۔

آپ کا وزن بہت زیادہ نہیں ہے' لیکن آپ وزن کم کرنا چاہتی ہیں تو اس کے لیے بہترین ورزش یہ ہے کہ اگر آپ کے گھر میں سیڑھیاں ہیں تو روزانہ بارہ مرتبہ سیڑھیاں چڑھیں اور اتریں۔ وزن کم ہوجائے گا۔

سیما بلوچ.... کراچی

س ۔ عرصہ ایک سال سے میری ناک اور ہونٹوں کے گرد چھائیاں پڑ گئی ہیں اور دن بہ دن بڑھ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ میرے چہرے پر کیل بھی نکلتے ہیں۔ کوئی علاج بتائیں۔

ج ۔ آپ کی یہ جلدی تکلیف جسم میں آئرن اور وٹامن سی کی کمی کی وجہ سے معلوم ہوتی ہے۔

وٹامن سی کی کمی ترش پھل یعنی مالٹے، کینو، چکوترے وغیرہ سے پوری کی جاسکتی ہے اور سیب اور پالک میں کافی مقدار میں آئرن ہوتا ہے۔ ان پھلوں اور سبزیوں کا روزانہ خوراک میں شامل کرلینا لازم ہے۔ علاوہ ازیں آپ کم از کم ایک گلاس کینو یا سیب کا جوس روزانہ پیا کریں۔ اور ایک گلاس دودھ روزانہ پینے سے بھی چہرے پہ نکھار آتا ہے۔